مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد

اسلامیات

چوتھا پرچہ

تہذیب اسلامی کی تاریخ

(ایم۔اے، سال اول)

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

(A Central University established by an Act of Parliament in 1998)

(Accredited "A" Grade by NAAC)

خود اکتسابی مواد برائے

اسلامک اسٹڈیز (سال اول)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد500032

EPABX : 040-23008402/03/04

یونیورسٹی فون نمبر: 040-23006612-15

www.manuu.ac.in

طبع: RCL Technologies Limited 2014

تحریری معاونین

مصنفین:

نام	اکائیاں
مولانا فیروز اختر ندوی	1 تا 5
پروفیسر اشتیاق دانش	6 تا 9
ڈاکٹر محمد انظر ندوی	10 تا 14
پروفیسر عبد العلی	16،19
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	15،17،18
ڈاکٹر محمد ارشد	20 تا 24

مدیرین:

ڈاکٹر محمد ارشد

ڈاکٹر محمد عرفان

مدیر اعلی: (تصحیح، تہذیب، ترتیب)

ڈاکٹر محمد فہیم اختر

اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

فہرست مضامین

بلاک : 1 ماقبل اسلام تا عباسی عہد

بلاک : 2 اندلس اور صقلیہ میں مسلم حکومت

بلاک : 3 خاندانی حکومتیں-1

بلاک : 4 خاندانی حکومتیں-2

بلاک : 5 عثمانی حکومت

پیش لفظ

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، جو پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت 1998ء میں قائم ہوئی، ملک کی واحد مرکزی یونیورسٹی ہے، جہاں اردو زبان کے ذریعے مختلف مضامین کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ یہ یونیورسٹی روایتی اور فاصلاتی دونوں ہی طریقوں سے تعلیم وتدریس کی سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ یونیورسٹی کی جانب سے جہاں روایتی تعلیم کے تحت سائنس اور سماجی علوم کے اندر پانچ سالہ مربوط پی جی پروگرام، سائنس، سماجی علوم، لسانیات، انتظامیہ وکامرس، تعلیم وتربیت اور صحافت وغیرہ کے مختلف مضامین میں یو جی اور پی جی کی سطح سے لے کر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح تک متعدد کورسز چلائے جا رہے ہیں، وہیں فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت انڈر گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ، سرٹی فیکیٹ اور ڈپلومہ کی سطحوں پر مختلف مضامین کے کورسز چلائے جا رہے ہیں، جن کے ذریعہ پورے ملک کے طلبہ وطالبات کی ایک بہت بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو رہی ہے۔ روایتی تعلیم کے تحت جاری کورسز میں ایم اے 'اسلامیات' کا کورس بھی شامل ہے، جس کی دو سالہ تعلیم یونیورسٹی کے مرکزی کیمپس واقع حیدرآباد میں دی جا رہی ہے۔

یونیورسٹی نے چند برسوں قبل فاصلاتی تعلیم کے تحت بی۔ اے کے تین سالہ کورس میں ایک اختیاری مضمون کے طور پر 'اسلامیات' (Islamic Studies) کو شامل کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو یہ اعزاز حاصل ہوا تھا کہ یونیورسٹی کی جانب سے پہلی بار ملک کے اندر اردو زبان میں اسلامیات کا نصابی مواد فاصلاتی تعلیم کے نہج پر پیش کیا گیا تھا۔ بی اے کا یہ کورس کامیابی کے ساتھ جاری ہے، اور طلبہ وطالبات کی ایک بڑی تعداد 'اسلامیات' کے ساتھ بی اے کی تعلیم مکمل کر چکی ہے۔

اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ فاصلاتی نظام کے تحت 'اسلامیات' میں ایم اے کی تعلیم کا آغاز کیا جائے۔ ملک کے مختلف حصوں سے اس کے مطالبے بھی کئے جا رہے تھے۔ اب اسی ضرورت اور طلبہ وطالبات کے تقاضوں کے پیش نظر ایم اے 'اسلامیات' کا آغاز کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی کورس کے لئے تیار کئے گئے 'خود تدریسی مواد' (Self Learning Material) کا مجموعہ ہے۔

ایم اے اسلامیات کورس کے لئے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے جدید دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے نیا اور جامع نصاب تیار کیا ہے۔ اور اس نصاب کے مطابق اسلامیات کے ماہرین کی مدد سے درسی مواد تیار کئے گئے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو اس حوالہ سے دوبارہ یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے کہ ملک میں پہلی مرتبہ اردو زبان میں ایم اے اسلامیات کا درسی مواد معیاری سطح پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اور اس سے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت مکمل ہو رہی ہے۔

اسلامیات کا موضوع بڑا وسیع اور متنوع ہے۔ اس میں اسلام اور مسلمانوں کے ڈیڑھ ہزار برس کے طویل دورانیہ پر مشتمل اور ہندوستان کے بشمول دنیا کے ایک بڑے حصہ میں پھیلے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ وثقافت اور علوم وفنون کے میدانوں کی سرگرمیوں کا احاطہ شامل ہے۔ اس لئے اسلامیات کا موضوع نہ صرف سماج کے ایسے متعدد پہلوؤں کے مطالعہ کا موقع فراہم کرتا ہے جو انسانی زندگی سے گہرا ربط رکھتے ہیں، بلکہ انسانی سماج کے گوناگوں مسائل کے بارے میں گہری بصیرت بھی عطا کرتا ہے۔

ایم اے اسلامیات کا یہ کورس آٹھ پرچوں پر محیط ہے، جسے دو سال کی تعلیم کے دوران مکمل کیا جائے گا۔ سال اول کے چار پرچوں میں اسلام کے تعارف اور بنیادی تعلیمات پر گفتگو کی گئی ہے۔ اسلامی علوم کے تحت قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی وتصوف کے موضوعات کا جامع تعارف پیش کرتے ہوئے ان میدانوں میں ہونے والے علمی کاموں اور اصحاب کار کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ زندگی کے مختلف میدانوں سے متعلق اسلامی افکار ونظریات اور ان کی تشکیل میں حصہ لینے والے مسلم اسکالرس اسلامیات کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس موضوع پر اسلام کے سماجی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی نظریات کے عناوین کے تحت متعدد اکائیوں کے تحت جامع اور تجزیاتی بحث کی گئی ہے۔ اسی ضمن میں عصر حاضر کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اٹھنے والے اہم ترین سوالات اور مسائل جیسے اسلام اور حقوق انسانی، اسلام اور ماحولیات، اسلام اور خواتین اور اسی طرح اسلام اور علم کے موضوعات پر اسلامی تصورات اور تعلیمات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مسلم تہذیب وثقافت کی تاریخ کے ذیل میں ماقبل اسلام عرب سماج کے احوال، اسلام کی آمد واشاعت، خلافت راشدہ، عہد بنی امیہ اور عہد بنی عباس کی ثقافتی تاریخ نیز چھوٹی خاندانی حکومتوں کی تمدنی تاریخ کے علاوہ عہد عثمانی کی جامع تاریخ وثقافت پر گفتگو کی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب سال اول کا چوتھا اور آخری پرچہ ہے، جو ''تہذیب اسلامی کی تاریخ'' کے موضوع پر ہے۔ اس میں پانچ بلاک شامل ہیں، جو ماقبل اسلام، عہد نبوی، عہد خلافت راشدہ، عہد بنی امیہ وبنی عباس کے علاوہ مشرق ومغرب کی چھوٹی خاندانی حکومتوں اور عثمانی دور حکومت کی تہذیبی وتمدنی تاریخ پر محیط ہیں۔ ان پانچ بلاکوں میں چوبیس اکائیوں کے تحت جزیرہ عرب، مغربی ایشیا، افریقہ اور وسط ایشیا کی اسلامی تاریخ وتہذیب کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے، اور ان زمانی ومکانی دائروں میں انجام پانے والی علمی سرگرمیوں اور ثقافتی ورثہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔

یونیورسٹی نے اس نصابی مواد کی تیاری میں ممتاز ماہرین اسلامیات اور دانشورانِ فن سے استفادہ کیا ہے، جنھوں نے بڑی محنت اور استناد کے ساتھ اسے تیار کر کے یونیورسٹی کو اپنا قیمتی تعاون پیش کیا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ یہ کتاب اسلامیات کے طلبہ وطالبات کی ضرورت بہتر طور پر پوری کرے گی، ساتھ ہی اسلامی مطالعات کے باب میں قابل قدر استفادہ کا باعث بنے گی۔

پروفیسر محمد میاں

شیخ الجامعہ

بلاک: 1 ماقبل اسلام تا عباسی عہد

فہرست

اکائی 1 : ماقبل اسلام، عہد نبوی وخلافت راشدہ

اکائی کے اجزاء

1.1 مقصد

1.2 تمہید

1.3 ماقبل اسلام دنیا کے حالات

1.4 عرب کے حالات

1.5 بعثت محمدی

1.6 عہد نبوی کے معاشرہ کی خصوصیات اور اخلاقی و تعلیمی وسماجی حالات

1.7 خلافت راشدہ اور خلفائے راشدین کے کارنامے

1.8 خلافت راشدہ کی خصوصیات

1.9 خلافت راشدہ کے انتظامی، تعلیمی، سماجی اور معاشی حالات

1.10 خلاصہ

1.11 نمونے کے امتحانی سوالات

1.12 فرہنگ

1.13 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھ کر طلبہ اسلام سے پہلے دنیا کی حالت سے واقف ہونگے اور ان کو معلوم ہوگا کہ اسلام کی آمد کے بعد دنیا میں کیسا انقلاب برپا ہوا، نیز عہد نبوی اور خلافت راشدہ کی خصوصیات اور اس زمانہ کے انتظامی، تعلیمی، سماجی اور معاشی حالات سے بھی باخبر ہو جائیں گے۔

1.2 تمہید

اس اکائی میں اسلام سے پہلے دنیا کی مجموعی صورتحال پر روشنی ڈالی جائے گی۔ پھر عرب کی جغرافیائی، سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی و معاشی حالت کا تذکرہ کیا جائے گا نیز عربوں کی ممتاز خوبیوں پر روشنی ڈالی جائے گی جن کی وجہ سے دنیا کی قیادت

لئے ان کا انتخاب ہوا۔ پھر بعثت محمدی کے مقاصد، دنیا پر اس کے دور رس اثرات اور عہد نبوی کی خصوصیات کو بیان کیا جائے گا۔ خلفائے راشدین کے کارناموں، خلافت راشدہ کی خصوصیات اور اس عہد کے انتظامی، تعلیمی، سماجی اور معاشی حالات پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

1.3 ماقبل اسلام دنیا کی حالت

اسلام سے پہلے دنیا تاریخ کے پست ترین دور سے گزر رہی تھی۔ انسانی معاشرہ سیاسی، سماجی اور اخلاقی اعتبار سے بہت سی برائیوں میں مبتلا تھا۔ ظلم، ناانصافی، اخلاقی پستی، شراب نوشی، سودخواری اور بے راہ روی عام تھی۔ دنیا میں روم، ایران اور ہندوستان جیسے بڑے بڑے متمدن ملک موجود ضرور تھے لیکن ہر جگہ ایک اندرونی کشمکش اور نفسیاتی و روحانی بے چینی پائی جاتی تھی۔

سیاست مطلق العنان ہو چکی تھی۔ تعظیم واحترام کے مستحق صرف بادشاہ ہوتے اور رعایا پر ہر طرح کا ظلم روا رکھا جاتا۔ حکمرانوں کے لئے عیش وعشرت کے سارے سامان موجود ہوتے لیکن عام پبلک طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا رہتی۔

اخلاقی حالت بھی دگرگوں تھی۔ ایک ایک عورت کئی کئی مردوں سے شادی کرسکتی تھی۔ شراب گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ بدمستی میں ہر گناہ ثواب بن جاتا تھا۔ پاکدامنی اور عصمت کی کوئی قیمت نہ تھی۔ بڑے بڑے امراء کی عورتیں جامہ عصمت اتار پھینکتی تھیں۔

دنیا کے مختلف مذاہب اپنی اصل بنیادی تعلیم ''توحید'' اور خدا پرستی سے دور ہو کر بت پرستی میں گرفتار ہو گئے تھے۔ چین اور جاپان کے بدھ مت کے ماننے والوں نے توحید کی تعلیم چھوڑ کر خود مہاتما بدھ کو پوجنا شروع کر دیا تھا۔ ایران کے پارسی آتش پرستی اور سورج کی تقدیس میں مشغول ہو گئے تھے۔ ہندستان کے ہندو مذہب میں تو بت پرستی شباب پر تھی۔ روم، حبشہ اور جنوبی ومغربی یورپ کے لوگ خود کو حضرت عیسیٰ کے پیروکار کہتے تھے لیکن وہ بھی حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ حضرت مریم کی تصویریں اور بت بنانے لگے تھے۔ بحیرہ روم کے چاروں طرف کے ملکوں میں اور عرب کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے یہودیوں نے بھی حضرت موسیٰ اور ان کے بعد آنے والے پیغمبر کی تعلیم کو یا تو بھلا دیا تھا یا مسخ کر دیا تھا۔ گویا دنیا ایک حقیقی خدا کو ماننے والوں سے خالی ہو رہی تھی، لیکن اس کے باوجود مختلف مذاہب کے ماننے والے اپنی مذہبی کتابوں کی تعلیمات کی وجہ سے ایک آخری نبی کا انتظار کر رہے تھے جو ان کو صحیح راستہ کی رہنمائی کرنے والا تھا۔

1.4 عرب کے حالات

1.4.1 جغرافیائی حالت

عرب کا ملک جہاں آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی ولادت ہوئی اور جہاں سے آپ نے اسلام کے انقلابی پیغام کو عام فرمایا، وہ جغرافیائی لحاظ سے اسلامی پیغام کو پوری دنیا میں پھیلانے کے لئے بہت موزوں اور مناسب مقام پر واقع تھا کیونکہ عرب کا ملک ایشیا اور افریقہ کے بیچ میں پایا جاتا ہے اور یہاں سے یورپ خشکی اور تری دونوں راستوں سے بہت قریب ہے۔ ہر براعظم میں آنا جانا یہاں سے بہت آسان ہے۔

عرب کا بڑا حصہ ریگستان ہے اور جا بجا متوسط درجہ کے پہاڑی سلسلے بکھرے ہوئے ہیں۔ جن کے درمیان کھجور کے باغات پائے جاتے ہیں، کہیں کہیں سبزہ اور چارہ بھی پایا جاتا ہے۔ ملک کی آب و ہوا گرم اور خشک ہے، یہاں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ تین طرف سے سمندر یا پانی سے گھرے ہونے کی وجہ سے اس کو ''جزیرۃ العرب'' کہتے ہیں۔ اگرچہ جغرافیہ کی جدید اصطلاح کے اعتبار سے یہ ''جزیرہ نمائے عرب'' ہے۔

1.4.2 سیاسی وسماجی حالت

عرب کا سماج قبائلی تھا۔ پورا ملک مختلف قبیلوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر قبیلہ اپنی جگہ آزاد تھا۔ ہر قبیلے کا ایک سردار ہوتا جس کی بات سب تسلیم کرتے۔ یہ قبیلے آپس میں لڑتے بھی رہتے تھے۔ اگر ایک قبیلے کا آدمی دوسرے قبیلے کے آدمی کو مار ڈالتا تو اس کا بدلہ لینا ضروری سمجھا جاتا۔ معمولی باتوں پر بھی لڑائیاں شروع ہو جاتیں اور برسوں جاری رہتیں۔ جس قبیلے کے افراد تعداد میں زیادہ ہوتے وہ سماج میں اعلیٰ درجے کا اور باعزت قبیلہ مانا جاتا۔ اس لئے ہر قبیلہ اپنی تعداد بڑھانے کی فکر کرتا۔

1.4.3 مذہبی حالت

عرب کے لوگ خود کو دین ابراہیمی کے پیروکار کہتے تھے لیکن انہوں نے حضرت ابراہیم کے لائے ہوئے دین کی صورت کو بالکل مسخ کر دیا تھا، حضرت ابراہیم نے صرف ایک خدا کی عبادت کی تلقین کی تھی لیکن انہوں نے ایک خدا کو چھوڑ کر سیکڑوں بتوں کو اپنا معبود سمجھ لیا تھا اور ان ہی کی عبادت کرتے تھے۔ اس طرح توحید کے بجائے شرک میں مبتلا ہو گئے تھے۔ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اجنہ کو الوہیت کا درجہ دیتے تھے۔ بتوں کو مظہر خدا مان کر ان کی پرستش کرتے تھے۔ سینکڑوں بتوں کی پوجا ہوتی تھی۔ ان میں لات، منات، ہبل اور عزیٰ زیادہ باعظمت تھے۔ ہبل خاص خانہ کعبہ کی چھت پر نصب تھا، تمام عرب اس کی پرستش کرتا تھا۔

ہر قبیلے کے الگ الگ بت تھے۔ منات قبیلہ اوس وخزرج کا خاص بت تھا۔ لات ثقیف کا، عزیٰ غطفان کا، عزیٰ کی پرستش ارکان حج میں داخل تھی۔ ان بتوں کے نام پر جانور چھوڑے جاتے تھے۔ ان پر انسانوں کی قربانیاں ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں مختلف قسم کے خدا تھے۔

عقیدۂ رسالت سے واقف تو تھے لیکن رسالت کے بارے میں ان کا تصور بہت ناقص اور طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار تھا۔ آخرت کا تصور بھی تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ بعض قبیلے الحاد ودہریت کی راہ پر چلنے لگے تھے اور دنیا کی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھنے کا رجحان ان میں پایا جاتا تھا۔

1.4.4 اخلاقی حالت

عربوں کی اخلاقی حالت مذہبی حالت سے بھی زیادہ بدتر تھی۔ بات بات پر جنگ کرنا، اپنے دشمنوں سے سخت بدلہ لینا، وحشت وبربریت اور سفاکی وخونریزی میں تمام انسانی حدود کو پار کر جانا ان کی فطرت میں شامل ہو گیا تھا۔ شراب نوشی، بدمستی اور قمار بازی کا بازار گرم تھا۔ زنا کو کچھ زیادہ معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ عورتوں کو کوئی حیثیت نہیں دی جاتی تھی۔ بعض قبیلوں میں لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دینے کا رواج تھا۔

1.4.5 تعلیمی ومعاشی حالت

تعلیم کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ جس کا نتیجہ تھا کہ پورے پورے شہر میں پڑھے لکھے لوگ مشکل سے ملتے تھے۔ مکہ جیسے مرکزی شہر میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد سترہ سے زیادہ نہیں تھی۔ اسی سے اس زمانہ کی تعلیمی صورتحال کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ البتہ علم الانساب میں ماہر تھے لیکن یہ علم زبانی تھا۔ عربی شاعری اور عربی زبان پر ان کو بہت ناز تھا اور اس میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

ان کی معیشت کی دو بنیادیں تھیں۔ بدو عرب کی معیشت کا دارومدار جانور پالنے اور لوٹ مار کرنے پر تھا اور شہری عرب کی معیشت کی بنیاد تجارت پر تھی۔ پانی کی کمی کی وجہ سے زراعت کے امکانات کم تھے۔ پھر بھی کھجور کی اچھی کاشت ہو جاتی تھی۔ متعدد پھل، سبزیاں اور اناج بھی اگائے جاتے تھے۔

1.4.6 چند ممتاز خوبیاں

عرب کے لوگ اگرچہ بہت سی خرابیوں اور برائیوں میں مبتلا تھے لیکن چند ایسی خوبیاں بھی ان میں پائی جاتی تھیں جن کی وجہ سے وہ دیگر قوموں سے بہت ممتاز تھے۔ اعلیٰ درجے کی جرأت و ہمت اور شجاعت و بہادری ان میں پائی جاتی تھی۔ سخاوت و فیاضی میں وہ بے مثال تھے۔ فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ آزادی و حق گوئی کو دل و جان سے پسند کرتے تھے۔ جفاکشی اور محنت کے عادی تھے۔ قوت حافظے میں ان کی مثال نہیں ملتی تھی۔ وفاداری، امانتداری، مساوات اور سچائی میں ضرب المثل تھے۔

ان اوصاف کی وجہ سے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی بعثت ان کے درمیان ہوئی اور دنیا کی رہنمائی کے لئے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔

معلومات کی جانچ

1. اسلام کی آمد سے پہلے دنیا کی کیا حالت تھی؟ بیان کیجئے۔
2. عربوں کی مذہبی حالت بیان کیجئے۔

1.5 بعثت محمدی

اللہ تعالیٰ کا یہ دستور ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت و رہبری کا ہمیشہ انتظام فرماتا رہتا ہے۔ چنانچہ دنیا میں جب گمراہی اور بے راہ روی بہت عام ہوگئی تو لوگوں کی ہدایت کے لئے آخری نبی جناب حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ اس وقت آپ کی عمر چالیس برس تھی۔ عیسوی کلینڈر کے لحاظ سے یہ واقعہ 610ء کا ہے۔

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے دنیا میں ایک صالح انقلاب برپا ہوا۔ لوگوں کے غلط عقیدے درست ہوئے۔ بت پرستی چھوڑ کر لوگوں نے صرف اللہ کی عبادت کرنا سیکھا۔ اخلاق و معاملات اور سیرت و کردار میں نمایاں تبدیلی آئی۔ سیاست کو صحیح رخ ملا۔

یوں سمجھئے کہ بعثت محمدی نے انسانیت کونئی زندگی، نئی روشنی، نئی طاقت، نیا ایمان، نیا تمدن اور نیا معاشرہ عطا کیا۔ بھٹکتی ہوئی مخلوق کوراہ راست پرلگایا اور عرب قوم کونمونہ عمل بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

1.5.1 مکی زندگی

نبوت ملنے کے بعد تیرہ سال تک آپ مکہ مکرمہ میں اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ لوگوں کوتوحید کی خوبی سمجھاتے اور بتوں کی پوجا سے منع فرماتے۔ سچائی، امانتداری اور وفاداری کی تلقین کرتے۔ جھوٹ، خیانت، چوری، ڈاکہ زنی، زنا اور قمار بازی جیسی بری باتوں سے بچنے کا حکم دیتے۔

لیکن ایک ایسی قوم کو جو صدیوں سے شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھی، توحید کی دعوت دینا خصوصا اس حالت مین کہ روسائے قوم کے سالہا سال کے اقتدار کا خاتمہ ہوا جاتا تھا، آسان نہ تھا۔ اس لیے سب سے پہلے آپ نے اپنے خاص لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ وہ آپ کے عادات وصفات سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے بلا تامل اس دعوت کو قبول کرلیا۔ چنانچہ عورتوں میں سب سے اول آپ ﷺ کی رفیقہ حیات حضرت خدیجہ الکبریٰؓ، مردوں میں آپ ﷺ کے قدیم رفیق ومحرم راز حضرت ابوبکرؓ، غلاموں میں آپ کے محبوب غلام زید، نوعمروں میں آپ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ اسلام سے مشرف ہوئے اور آپ تین سال تک خاموشی کے ساتھ اس فرض کو انجام دیتے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ بڑے بااثر تھے ان کے اثر سے حضرت عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن زبیر رضی اللہ عنہم مشرف باسلام ہوئے۔ پھر قبول اسلام کا دائرہ بڑھنے لگا۔ چنانچہ حضرت خباب بن ارت، عمار بن یاسر، سعید بن زید، عبداللہ بن مسعود، عثمان بن مظعون، صہیب اور ارقم رضی اللہ عنہم وغیرہ نے اسلام قبول کیا۔ اور ایک اچھی خاصی جماعت دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی۔ یہ تمام کام پوشیدہ طور پر ہوتا رہا۔

لیکن آپ کا فرض یہیں پرختم نہیں تھا بلکہ پوری دنیا کو ہدایت کے راستے پر لانا تھا، اس لیے تین سال کے بعد اعلانیہ تبلیغ کے احکام نازل ہوئے، یا ایھا المدثر، قم فانذر (اے چادر لپیٹے ہوئے! اٹھو اور ڈراؤ) اور فاصدع بما تؤمر (آپ اللہ کے حکم کا کھلم کھلا اعلان کیجئے) اور وانذر عشیرتک الاقربین (اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے)۔ اس حکم پر آپ نے کوہ صفا پر چڑھ کر آواز دی، ''یا معشر قریش'' اے قریشیو! آپ کی آواز پر لوگ جمع ہوگئے۔ آپ نے ان سے سوال کیا کہ ''اگر میں تم سے کہوں کہ پہاڑ کی پشت سے ایک لشکر جرار آ رہا ہے، توتم کو یقین آئے گا؟ سب نے ایک زبان ہوکر جواب دیا ہم نے ہمیشہ تم کو سچ بولتے پایا ہے''۔ فرمایا تو میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پرسخت عذاب نازل ہوگا۔ (بخاری ج 2 ص 710) یہ غیر متوقع اور اپنے عقائد کے خلاف بات سن کر سب بگڑ گئے۔

اس واقعہ کے چند دنوں بعد آپ ﷺ نے ایک دعوت کا انتظام کیا اور عبدالمطلب کی اولاد کو جمع کرکے ان سے فرمایا ''میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین ودنیا دونوں کی کفیل ہے، اس بار گراں کو اٹھانے میں کون میرا ساتھ دیتا ہے؟ سب خاموش رہے صرف حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ مجھے آشوب چشم کی شکایت ہے میری ٹانگیں پتلی ہیں اور نوعمر ہوں لیکن میں آپ کا ساتھ دوں گا'' ان کے علاوہ سب خاموشی کے ساتھ لوٹ گئے۔

اب مسلمانوں کی تعداد چالیس تک پہنچ چکی تھی۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے ایک دن حرم میں جا کر توحید کا اعلان کیا اس جرم پر مشرکین ٹوٹ پڑے۔ حارث بن ابی ہالہؓ نے آپ کو بچانے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں وہ قتل کر دیے گئے۔

شروع میں مشرکین نے اسلام کی دعوت کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ لیکن جوں جوں اسلام کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، مشرکین کی مخالفت بڑھتی جاتی تھی۔ ان کی مخالفت کے بہت سے اسباب تھے:

☆ اسلام ان کے صدیوں کے عقائد و رسوم کو باطل قرار دیتا تھا۔

☆ ان کے معبودوں کو جن کی وہ پرستش کرتے تھے آگ کا ایندھن بتاتا تھا۔

☆ قرآن اعلانیہ قریش کی بداخلاقیوں کو بیان کرتا تھا اور متولی کعبہ کی حیثیت سے عرب پر ان کا جو اقتدار قائم تھا، اسلام اس کا خاتمہ کرتا تھا۔

ان اسباب کی بنا پر سارا قریش اسلام اور آنحضرت ﷺ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گیا۔ تاہم شروع میں انھوں نے سختی کے بجائے صلح اور آشتی سے آنحضرت ﷺ کو باز رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن جب اس میں مایوسی ہوئی تو معززین قریش کا ایک وفد آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے پاس گیا۔ انھوں نے سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔ لیکن آنحضرت ﷺ اپنے فریضے سے دست کش نہیں ہو سکتے تھے۔ قریش نے جب دیکھا کہ آپ کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تو دوبارہ ابو طالب کے پاس پہنچے اور ان سے کہا تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کو برا کہتا ہے، ہمارے مذہب کی مذمت کرتا ہے، ہمارے معززین کو ناسمجھ بتاتا ہے اس لیے یا تو تم درمیان سے ہٹ جاؤ، ورنہ پھر میدان میں آؤ کہ ہم تم فیصلہ کر لیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر ابو طالب نے رسول اللہ ﷺ کو بلا کر سمجھایا کہ بیٹا! چچا پر ناقابل برداشت بار مت ڈالو اور اپنی قوم کی مخالفت چھوڑ دو۔ آپ ﷺ کا ظاہری سہارا جو کچھ تھے ابو طالب تھے۔ ان کی زبان سے اس قسم کی باتیں سن کر آپ آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا ''چچا جان خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر آفتاب اور دوسرے پر ماہتاب لا کر رکھ دیں تو بھی میں اس فریضے سے دست کش نہیں ہو سکتا، تا آنکہ میں کامیاب ہوں یا اسی راہ میں میرا خاتمہ ہو جائے'' ابو طالب یہ جواب سن کر سخت متاثر ہوئے اور کہا جاؤ جو دل میں آئے کرو میں کسی بھی حالت میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ (سیرۃ ابن ہشام ج 1 ص 89)۔

ابو طالب سے مایوس ہونے کے بعد قریش نے رسول اللہ ﷺ کو طرح طرح کی اذیتیں دینی شروع کر دیں۔ آپ ﷺ کی راہ میں کانٹے بچھا دیتے، نماز پڑھتے میں پشت مبارک پر نجاست کا بار لا کر لاد دیتے، بدزبانیاں کرتے، ایک مرتبہ آپ ﷺ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے عقبہ بن معیط نے گردن مبارک میں اپنی چادر رسی کی طرح ڈال کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ آپ ﷺ ان تمام سختیوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے تھے اور اپنا فرض برابر ادا کرتے رہتے تھے۔

اس مدت میں آپ کو اور آپ کے ماننے والوں کو سخت تکلیفیں پہونچائی گئیں، مصائب کے پہاڑ توڑے گئے لیکن آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب نے اللہ کی خاطر سب کچھ برداشت کیا۔ لیکن جب قریش مکہ کی ایذا رسانیوں نے مسلمانوں کے لئے مکے میں رہنا ناممکن بنا دیا تو آپ ﷺ نے مکے کے مسلمانوں کو مدینہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ مدینہ کی سرزمین اسلام کے لئے پہلے ہی سازگار ہو چکی تھی۔

1.5.2 مدینہ کی ہجرت

پھر ایک دن ایسا آیا کہ خود حضور ﷺ کو اللہ نے مدینہ ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ مکہ سے نکل پڑے اور آٹھ روز کے سفر کے بعد 12 ربیع الاول بروز دوشنبہ نبوت کے تیرھویں سال میں 24 ستمبر 622ء کو مدینہ کے قریب قباء پہنچے۔ یہاں آپ نے ایک مسجد تعمیر فرمائی۔ پھر مدینہ کے لئے روانہ ہوئے۔ مدینہ میں بھی آپ نے سب سے پہلے مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی۔ مدینہ جو اب تک ''یثرب'' کہلاتا تھا، رسول پاک ﷺ کے آجانے کے بعد اس کا نام مدینۃ النبی (نبی کا شہر) ہو گیا۔ لفظ مدینہ اسی کی مختصر شکل ہے۔

1.5.3 میثاق مدینہ اور اسلامی ریاست کی تشکیل

مدینہ پہنچ کر آپ ﷺ نے شہر کے امن امان اور وہاں کے باشندوں کے تعلقات باہمی کو خوشگوار بنانا چاہا۔ اس مقصد کے لئے پہلے آپ ﷺ نے مہاجرین (وطن کو چھوڑ کر آنے والے) اور انصار (باہر سے آنے والوں کے یار و مددگار) کے درمیان مواخات قائم فرمائی۔ اس کے بعد آپ نے مدینہ کے تمام باشندوں کے لئے جن میں مسلمانوں کے ساتھ یہود و مشرکین وغیرہ سب شامل تھے، ایک عہد نامہ مرتب فرمایا جس کو ''میثاق مدینہ'' کہا جاتا ہے، جس میں آپ نے ایک اسلامی جمہوری حکومت کا خاکہ پیش کیا اور سب نے اس کو بخوشی قبول کیا، اس عہد نامہ (میثاق) میں بہت سی باتیں تھیں، جن میں چند باتیں حسب ذیل ہیں:

1. مدینہ پر جب کوئی بیرونی دشمن حملہ کریگا تو تمام مدینہ والے مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔
2. مدینہ کے یہود قریش مکہ یا ان کے حلیفوں کو مسلمانوں کے خلاف پناہ نہ دیں گے۔
3. باشندگان مدینہ میں کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے دین و مذہب اور جان و مال سے تعرض نہ کرے گا۔
4. جنگ کے مصارف اور فوائد میں تمام باشندگانِ مدینہ برابر کے شریک ہونگے۔
5. جن قبیلوں یا قوموں سے مدینہ کے یہود کا معاہدہ ہے اور وہ ان کے دوست ہیں مسلمان بھی ان کو اپنا دوست سمجھیں گے اور دوستوں کی طرح ان کی رعایت کریں گے، اسی طرح جو قبیلے مسلمانوں کے دوست ہیں، مدینہ کے یہودی بھی ان کے ساتھ دوستانہ سلوک کریں گے۔
6. مدینہ کے اندر کشت و خون کرنا حرام سمجھا جائے گا۔
7. مظلوم کی امداد سب پر فرض ہوگی۔
8. اگر دونوں فریقوں کے درمیان کوئی نئی بات پیدا ہوئی یا جھگڑا ہوگا تو فیصلہ خدا اور رسول ﷺ پر چھوڑا جائے گا۔

یہ عہد نامہ ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کا اعلان بھی تھا اور اس کا منشور بھی۔

آپ ﷺ نے مدینہ کے اردگرد کے علاقوں میں رہنے والے قبیلوں کو بھی اس معاہدہ میں شریک فرمایا تاکہ بدامنی اور آئے دن کی خونریزی بالکل ختم ہو جائے۔ اس عہد نامہ کا یہ فائدہ ہوا کہ مختلف قبیلوں کی باہمی جنگیں ختم ہو گئیں اور ایک بے مثال اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست وجود میں آئی۔

مکہ کے کفار و مشرکین کو مدینہ میں آپ ﷺ کی یہ کامیابیاں اور اسلام کا استحکام سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ چنانچہ ایک طرف انہوں نے مدینہ کے یہودیوں سے ساز باز شروع کر دیا اور دوسری طرف مدینہ پر حملہ کی تدبیریں کرنے لگے۔ جس کے نتیجہ میں جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس میں قریش کی قوت ختم ہوتی گئی اور اسلام کا جھنڈا سارے عرب پر لہرانے لگا۔

1.5.4 عہد نبوی کا نظام حکومت

آنحضرت ﷺ کی بعثت کا حقیقی مقصد توحید کی دعوت، اخلاق کی اصلاح اور انسانی معاشرہ کو بہتر بنانا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے کام ضمنی تھے، مگر مذکورہ بالا مقاصد کے حصول اور قیام امن کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی ان کو عملی جامہ پہنانا بھی ضروری تھا۔

اسلام دنیا میں شہنشاہی قائم کرنے کے لیے نہیں بلکہ اسے مٹانے اور اس کی جگہ خلافت الٰہی قائم کرنے کے لیے آیا تھا اور اپنے ساتھ ایک دائمی شریعت اور ایک مکمل قانون لایا تھا، جو انسانوں کی دنیوی اور اخروی فلاح کا ضامن تھا۔ اس قانون کے تحفظ، نفاذ اور قیام امن کے لیے ایک نظام کی ضرورت تھی۔ اس لیے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ ساتھ خلافت الٰہیہ کی بھی تشکیل ہوتی گئی۔ یہ کوئی شہنشاہی نظام نہ تھا بلکہ اسلام کی محدود ضروریات کے مطابق ایک سادہ اور مختصر نظام حکومت تھا، وقتاً فوقتاً جو ضروریات پیش آجاتی تھیں ان کے مطابق نظام بنتا جاتا تھا، جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

فوجی نظام:

چونکہ اسلام جنگ و جدل کے لیے نہیں آیا تھا اس لیے اس کی کوئی باقاعدہ اور منظم فوج بھی نہ تھی، مگر حق و باطل کی معرکہ آرائی کے وقت ہر مسلمان مجاہد تھا اور حضرت ابوبکرؓ سے لے کر ایک معمولی غلام تک میدان جہاد میں سربکف نظر آتا تھا۔ بڑے بڑے معرکوں میں آنحضرت ﷺ بہ نفس نفیس قیادت فرماتے تھے۔ بدر، احد، خیبر اور فتح مکہ وغیرہ میں آپ ﷺ ہی امیر العسکر تھے۔

افتاء:

افتاء کے فرائض آپ ﷺ خود انجام دیتے تھے، کبھی کبھی بعض صاحب علم صحابہ کو بھی اس خدمت پر مامور کیا جاتا۔ مقدمات کا فیصلہ، مدینہ اور حوالی مدینہ کے قضیے آپ خود فیصل فرماتے تھے۔ لیکن دور دراز مقامات پر وہ صاحب علم صحابہ جو معلم بنا کر بھیجے جاتے تھے اس خدمت کو انجام دیتے تھے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو آپ نے یمن کا قاضی مقرر فرمایا تھا۔

کاتب:

آپ ﷺ دعوت اسلام کے خطوط بھیجتے تھے، قبائل و اقوام سے تحریری معاہدے ہوتے تھے، مسلمان قبائل اور عمال و محصلین کو احکام و ہدایات بھیجتے تھے۔ اس لیے کتابت کا شعبہ نہایت ضروری تھا۔ اس کا کوئی باضابطہ محکمہ نہ تھا لیکن بہت سے صحابہ اس خدمت کو انجام دیتے تھے۔ حضرت زید بن ثابت انصاریؓ اور آخر میں امیر معاویہؓ کاتب وحی تھے۔ ان کے علاوہ مراسلات کی تحریر کی خدمت بھی کئی صحابہ کرام انجام دیتے تھے۔

احتساب:

یعنی قوم کے اخلاق وعادات اور بیع وشراء کی نگرانی کا باقاعدہ محکمہ عہد نبوی میں نہ تھا لیکن اس کی بنیاد اسی زمانہ میں پڑ گئی تھی۔ آپ ﷺ بہ نفس نفیس ان امور کی نگرانی فرماتے تھے لوگوں کو جزئیات اخلاق کی تعلیم دیتے تھے اور اس قسم کی غلطیوں پر مواخذہ فرماتے تھے۔ تجارت میں آپ نے بہت سی اصلاحات فرمائیں اور ان پر سختی کے ساتھ عمل کرایا۔

کبھی کبھی تحقیقات کے لیے خود بازار تشریف لے جاتے تھے۔ ایک بار آپ بازار سے گذرے تو غلہ کا ایک انبار نظر آیا، اس کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا تو نمی محسوس ہوئی، دکاندار سے پوچھا، اس نے جواب دیا، بارش سے بھیگ گیا ہے، فرمایا تو اس کو اوپر کیوں نہیں کرلیا کہ ہر شخص کو نظر آتا، جو لوگ فریب دیتے ہیں، وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ (صحیح مسلم کتاب الایمان ج اص ۵۳)

ذمہ داروں کا جائزہ:

فرائض احتساب میں سب سے مقدم فرض ذمہ داروں کا احتساب ہے۔ چنانچہ جب زکوۃ اور صدقہ کے ذمہ دار زکوۃ اور صدقہ وصول کر کے لاتے تھے تو آپ جائزہ لیتے تھے کہ انھوں نے کوئی ناجائز طریقہ تو اختیار نہیں کیا۔ ایک مرتبہ ایک صحابی ابن اللبیۃؓ کا جو صدقہ وصول کر کے لائے تھے، جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ مال مسلمانوں کا ہے اور یہ مجھ کو ہدیہ ملا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا گھر بیٹھے تم کو یہ ہدیہ کیوں نہ ملا۔ اس کے بعد ایک عام خطبہ دیا جس میں اس کی سخت ممانعت فرمائی۔ (بخاری کتاب الاحکام ج2 ص1067)

محصلین:

اگرچہ مسلمانوں کا جوش ایمان ہر قبیلے کو اپنے صدقات وزکوۃ خود لا کر پیش کرنے پر آمادہ کر دیتا تھا لیکن ایک وسیع ملک کے محاصل کو وصول کرنے کے لیے ایک باقاعدہ نظام کی ضرورت تھی، اس ضرورت کے لیے آنحضرت ﷺ نے ہر قبیلے میں صدقہ اور زکوۃ کے محصل مقرر فرمائے۔ عموماً ہر قبیلے کے سردار کو یہ منصب سپرد ہوتا تھا۔

معلومات کی جانچ

1. بعثت محمدی سے دنیا کو کیا فائدہ پہنچا؟
2. میثاق مدینہ کی چند اہم باتیں ذکر کیجئے۔

1.6 عہد نبوی کے معاشرہ کی خصوصیات اور اخلاقی وتعلیمی وسماجی حالات

مدینہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثالی اور متوازن معاشرہ قائم فرمایا جس کی بنیاد چند اہم اصولوں اور خاص عناصر پر تھی، جن میں سے چند عناصر یہ تھے:

1. خدائے واحد پر ایمان: (کارخانۂ عالم کا پیدا کرنے والا اور چلانے والا صرف ایک اللہ ہے)

2. اللہ کی حاکمیت: (حکمرانی یا اقتدار اللہ تعالی کا حق ہے، اس میں بندوں کا کوئی حصہ نہیں ہے)

3. انسانی اخوت: (ساری دنیا کے انسان بھائی بھائی ہیں، رنگ ونسل، قوم ووطن اور زبان کی بنیاد پر کسی کو کسی پر فضیلت حاصل نہیں)

4. قانون کی بالاتری: (قانون کی نگاہ میں چھوٹا بڑا، حاکم ومحکوم سب برابر ہیں، اللہ کے قانون سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے)

5. احتساب نفس: (ہر شخص اپنے عمل کا خود جوابدہ ہے، اس کو اپنے عمل کا حساب دینا ہوگا)

6. امانت ودیانت: (اپنی ذمہ داریوں کو بغیر کسی نگرانی کے مکمل طور پر ادا کرنا)

7. دیگر مخلوقات ومظاہر سے بے خوفی: (ڈرنے کے لائق صرف خدا کی ذات ہے، جو بندہ اللہ کا ہو جائے گا اس کو کائنات کی کوئی چیز نقصان نہیں پہونچا سکتی)

مندرجہ بالا اجزائے ترکیبی سے وجود میں آنے والا معاشرہ ایسا بہترین معاشرہ تھا جس کی بنی نوع انسانی کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ یہ معاشرہ ہر طرح کے ظلم وجبر سے پاک تھا۔ اس میں رنگ ونسل، قوم ووطن اور آقا وغلام کا امتیاز نہ تھا۔ سیاست، معیشت، اخلاق، تعلیم، صنعت وحرفت، زراعت وتجارت اور زندگی کے تمام شعبے ایک خاص رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ جو معاشرہ برائیوں میں مبتلا تھا، اس معاشرہ سے چوری ڈکیتی ختم ہوگئی، راستے محفوظ ہوگئے، لوگوں نے شراب نوشی، قمار بازی اور بے شرمی وبے حیائی کی باتوں سے توبہ کرلی۔ جھوٹ، غیبت، دغا، فریب اور وعدہ خلافی کی جگہ صداقت، وفاداری اور اخلاق نے لے لی۔ تجارت اور کاروبار سے سودی لین دین ختم ہوگیا۔

معاشرہ میں تعلیم کا رجحان نہ صرف عام ہوا بلکہ ایک دینی فریضہ کی طرح اس کے حصول کی طرف مکمل توجہ دی گئی۔ قرآن شریف کی پہلی آیت میں علم اور قلم کا تذکرہ علم کی اہمیت کو بیان کر رہا تھا اور پھر نبی اکرم ﷺ نے اپنی متعدد احادیث میں علم کے حصول کو مسلمان مرد وعورت کے لئے لازمی قرار دیا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ بعثت محمدی کے بعد تعلیم کے میدان میں بہار آگئی اور مختلف علوم وفنون میں بے انتہا ترقی ہوئی۔

عورتوں کو ان کا حق دیا گیا۔ وراثت میں لڑکیوں کا حصہ مقرر ہوا۔ عورتوں کو بھی کمانے کا حق دیکر ان کو معاشی آزادی عطا کی گئی۔ بیوہ عورتوں سے نکاح کی اجازت دیکر ان کے مسائل کو حل کیا گیا۔

غلاموں اور باندیوں کو گھر کے دوسرے افراد کے برابر درجہ دیا گیا۔ ظلم کے خلاف اور حق تلفی کی صورت میں ان کو عدالت سے انصاف طلب کرنے کا حق دیا گیا۔ غلام اور باندی آزاد کرنے کو کار ثواب کا درجہ دیا گیا۔ اس طرح نظام غلامی کو ایسی شکل میں ڈھال دیا گیا کہ بالآخر غلامی کا خاتمہ ہی ہوگیا۔ مذکورہ بالا تمام خصوصیات کے ساتھ جو معاشرہ تیار ہوا تھا تاریخ کا وہ آئیڈیل اور مثالی معاشرہ تھا۔ اور دوست دشمن سب نے اس کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔

معلومات کی جانچ

1. نبوی معاشرہ کے عناصر ذکر کیجئے۔

2. عہد نبوی میں عورتوں کے حقوق پر روشنی ڈالئے۔

1.7 خلافت راشدہ اور خلفائے راشدین کے کارنامے

رسول اللہ ﷺ کی وفات 12 / ربیع الاول 11ھ مطابق 20 جون 632ء کو ہوئی۔ آپ کے انتقال کے وقت پورا عرب اسلام کے زیرنگیں ہو چکا تھا۔ مدینہ کی اسلامی ریاست ایک مرکزی حکومت تھی جس کی حکمرانی پورے عرب پر قائم ہو چکی تھی۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد امت کے مسائل کو حل کرنے اور اسلامی ریاست کے نظم ونسق کو سنبھالنے کے لئے کسی جانشین کی ضرورت تھی۔ آپ نے متعین طور پر کسی کو اپنی جانشینی کے لئے نامزد تو نہیں کیا تھا لیکن کئی طرح کے اشارے ضرور دئے تھے مسلمانوں نے مدینہ میں ایک جگہ جس کو سقیفہ بنی ساعدہ کہا جاتا ہے جمع ہو کر اس مسئلہ پر غور وخوض کیا اور حضور ﷺ کے اشاروں کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو رسول اللہ ﷺ کا جانشین منتخب کر لیا جن کا لقب ''خلیفۃ رسول اللہ'' تھا۔ آپ کی خلافت کی مدت دو برس تین مہینے تھی۔

پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ منتخب کئے گئے۔ آپ کی مدت خلافت دس برس چھ مہینے رہی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے بعد حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ نامزد کئے گئے، آپ کی مدت خلافت گیارہ برس گیارہ مہینے رہی۔ حضرت عثمان غنیؓ کے بعد حضرت علی مرتضیٰؓ خلیفہ منتخب کئے گئے، آپ کی مدت خلافت چار برس نو مہینے رہی، حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد کوفہ کے لوگوں نے حضرت حسن بن علی کو خلیفہ منتخب کیا جبکہ شام کے لوگوں نے حضرت معاویہ کی خلافت کا اعلان کر دیا، لیکن پھر حضرت حسن چند شرطوں کے ساتھ حضرت معاویہ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ حضرت حسن کی خلافت سے دستبرداری تک کی مدت چھ مہینے رہی، اور اس طرح خلافت راشدہ کا دور ختم ہوا جس کی کل مدت تیس سال تھی۔

ذیل میں اختصار کے ساتھ خلفائے راشدین کے حالات اور اہم کارناموں کو بیان کیا جاتا ہے۔

1.7.1 حضرت ابوبکر صدیقؓ

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ڈھائی برس کے قریب حکومت کی لیکن ان کا زمانہ اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے شیرازے کو بکھرنے نہیں دیا اور حکومت کو اس قدر مستحکم کر دیا کہ بعد میں مسلمانوں نے روم وایران سے جہاد کر کے ان کے بہت سے علاقے فتح کر لئے۔ اسی طرح جمع قرآن کا کارنامہ بھی آپ کا بہت اہم کارنامہ ہے۔

حضرت ابوبکر کے زمانہ میں بڑے بڑے فتنے بھی پیدا ہوئے لیکن آپ نے اپنی حکمت وبصیرت سے ان تمام فتنوں کو ختم کر دیا، مانعین زکوۃ کا فتنہ، ارتداد کا فتنہ، جھوٹے نبیوں کے سر اٹھانے کا فتنہ، اس طرح کے کئی فتنے تھے جن کو آپ نے اپنے زمانہ میں ختم کیا۔

آپ کی یہ کوشش ہوتی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جو چیزیں جس طرح تھیں ویسی ہی ان کو برقرار رکھا جائے، چنانچہ ملک کے نظم ونسق اور فوجی و مالی نظام کو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے مطابق ہی باقی رکھا، جو حسب ذیل ہے:

مالی انتظام:

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مالیات کے متعلق جو نظام تھا اسی کو آپ نے بھی برقرار رکھا۔یعنی جو کچھ آتا سب کے درمیان برابر تقسیم کر دیتے،اخیر زمانہ مین بیت المال کی عمارت بنوائی۔لیکن وفات کے بعد جب بیت المال کا جائزہ لیا گیا تو اس میں صرف ایک درہم نکلا۔

فوجی نظام:

فوجی نظام بھی عہد رسالت ہی کی طرح رہا، جب ضرورت پیش آتی مسلمان خود ہی جہاد کے لئے اپنے کو پیش کرتے۔البتہ ضرورت کے لحاظ سے پوری فوج کو چھوٹے چھوٹے دستوں میں بانٹ کر ہر دستہ کا الگ الگ افسر متعین کیا جاتا اور ایک شخص کو امیر الامراء یعنی سپہ سالار اعظم بنایا جاتا۔

حضرت ابو بکرؓ کا معمول تھا کہ فوج کو روانہ کرتے وقت قیمتی نصیحتیں فرماتے،نمونہ کے طور پر ایک نصیحت درج کی جارہی ہے جس سے اسلامی طریقۂ جنگ پر بھی روشنی پڑتی ہے،آپؓ نے ملک شام پر فوجیں بھیجتے ہوئے ان کو یہ نصیحت فرمائی تھی:

1. کسی عورت، بچے یا بوڑھے کو قتل مت کرنا۔
2. ثمر دار درخت کبھی نہ کاٹنا۔
3. کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا۔
4. کھانے کی ضرورت کے سوا بکری، گائے اور اونٹ کو کبھی ذبح نہ کرنا۔
5. نخلستان کو نہ جلانا۔
6. مالِ غنیمت میں خیانت نہ کرنا۔
7. بز دل نہ بننا۔
8. جب کسی قوم پر سے گزر ہو تو نرمی سے اسے اسلام کی طرف بلانا۔
9. یہودیوں اور عیسائیوں میں سے جو لوگ دنیوی تعلقات سے الگ ہو کر عبادت میں لگے ہوئے ہیں، انھیں کچھ نہ کہنا۔

دین کی حفاظت اور قرآن پاک کی تدوین:

خلافت کا مقصد تحفظ دین اور اس کے احکام کا قیام ونفاذ ہے۔اس لیے حضرت ابو بکرؓ کو تحفظ دین میں بڑا اہتمام تھا۔کوئی نئی بات جو عہد خلافت میں نہ تھی، نہ ہونے دیتے تھے، گو عہد رسالت کے قرب کی وجہ سے اس کی ضرورت کم پیش آئی، لیکن جہاں اس کا

ادنی سا شائبہ بھی نظر آتا تھا، اس کا تدارک فرماتے، اس میں احتیاط کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ کتابی صورت میں قرآن کی تدوین سے محض اس بنا پر تامل تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ایسا نہیں فرمایا، حدیثوں کی روایت میں بڑی احتیاط اور چھان بین سے کام لیتے تھے۔ تحفظ دین کے لیے اکابر صحابہؓ کا محکمہ افتاء قائم تھا۔

عہد صدیقی کا ایک کارنامہ کتابی شکل میں قرآن مجید کی تدوین ہے، انھوں نے مختلف لکھے ہوئے اجزاء اور حفاظ قرآن کے سینوں سے قرآن کی سورتوں کو جمع کر کے کتابی صورت میں مدون کر دیا۔

1.7.2 حضرت عمر فاروقؓ

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ ہوئے۔ آپ نے اپنے لئے امیر المؤمنین کا لقب اختیار فرمایا۔ آپ کے دور خلافت میں اسلامی فتوحات کو بہت وسعت حاصل ہوئی۔ روم و ایران کی حکومتوں کا خاتمہ ہوا۔ ہندوستان سے شمالی افریقہ تک اسلام کا پرچم لہرانے لگا اور ہر جگہ رعایا بہت خوشحالی اور امن و امان کی زندگی بسر کرنے لگی تھی۔

آپ کا دور خلافت ایک شاندار دور تھا۔ فتوحات کی کثرت، محاصل کی فراوانی، انتظامات کی خوبی، جور و ظلم کے انسداد، عدل و انصاف اور امن و امان کے قیام، ملک کی خوشحالی اور رعایا کی فارغ البالی وغیرہ تمام اوصاف و کمالات کے لحاظ سے جو کسی حکومت یا فرمانروا کے لیے طغرائے امتیاز ہو سکتے ہیں، دنیا کا کوئی حکمراں فاروق اعظمؓ کے مقابلہ میں نہیں پیش کیا جا سکتا۔

حضرت عمرؓ نے جس وقت مسند خلافت پر قدم رکھا اس وقت کوئی بڑا انظام حکومت نہ تھا۔ آپ نے دس سالہ عہد حکومت میں نہایت وسیع نظام قائم کر دیا تمام مفتوحہ ممالک کو آٹھ صوبوں پر تقسیم کیا۔ مکہ، مدینہ، شام، جزیرہ، بصرہ، کوفہ، مصر اور فلسطین، مشرق میں خراسان، آذربائیجان اور فارس کے تین صوبے علیحدہ تھے۔

ہر صوبہ میں حاکم اعلی، میر منشی، دفتر فوج کا میر منشی، کلکٹر، افسر پولیس، خزانچی اور قاضی ہوتے تھے، بعض حالات میں سپہ سالار بھی الگ ہوتا تھا، لیکن عموماً فوج کی سپہ سالاری بھی حاکم عام سے ہی متعلق ہوتی تھی، اضلاع میں صرف کلکٹر، افسر خزانہ اور قاضی ہوتے تھے۔ (طبری ص 462) چنانچہ کوفہ میں حضرت عمار بن یاسرؓ والی، عثمان بن حنیفؓ کلکٹر، عبداللہ بن خلفؓ میر منشی تھے۔

حضرت عمرؓ نے تعلیم کی بڑی اشاعت کی۔ مذہب اسلام کی بنیاد کلام اللہ پر ہے اس لیے اس کی حفاظت، تعلیم اور اشاعت کا بڑا اہتمام کیا، عہد صدیقی میں آپ ہی کے اصرار سے کلام اللہ کی تدوین ہوئی۔ اپنے زمانہ میں تمام مفتوحہ ملکوں میں قرآن کی تعلیم کے مکتب قائم کیے، اور ان کے لیے تنخواہ دار معلم مقرر کیے، مکتبوں میں کتابت کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔

حفاظ قرآن صحابہ کو مختلف مقامات پر قرآن کا درس دینے کے لیے بھیجا، چنانچہ حضرت عبادہؓ بن صامت، معاذ بن جبلؓ اور ابو درداءؓ شام بھیجے گئے۔

سورہ بقرہ، نساء، مائدہ، حج اور نور کا جن میں احکام ہیں، یاد کرنا ضروری قرار دیا۔ قرآن پاک صحیح پڑھنے اور اعراب کی تصحیح کے لیے ادب و عربیت کی تعلیم کی تاکید کی۔ جو لوگ لغت کے ماہر نہ ہوں انھیں قرآن کی تعلیم دینے کی ممانعت کر دی۔

قرآن کے طلباء کے وظائف مقرر کیے۔ ان تدبیروں سے ہزاروں حفاظ قرآن پیدا ہو گئے۔

حکومت کی تنظیم اور مذہبی خدمات کے علاوہ رفاہ عامہ کے بہت سے کام ہوئے، زراعت کی سیرابی اور رعایا کی ضرورت کے لیے متعدد نہریں کھدوائیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔

نہر ابو موسی: بصرہ میں پانی کی بڑی قلت تھی شہر سے چھ میل کی مسافت سے پانی لایا جاتا تھا حضرت عمرؓ کے حکم سے حضرت ابو موسی اشعریؓ نے دجلہ سے نو میل لمبی نہر نکالی جو انھیں کے نام سے مشہور ہوئی اس سے گھر گھر پانی کا افراط ہو گیا۔

نہر معقل: دوسری نہر معقلؓ کے اہتمام میں تیار ہوئی۔

نہر سعد: یہ نہر اہل انبار کی درخواست پر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے کھدوائی تھی لیکن درمیان میں پہاڑ حائل ہو جانے کی وجہ سے نا مکمل رہ گئی اور حجاج بن یوسف کے زمانے میں پوری ہوئی۔

نہر امیر المومنین: سب سے بڑی نہر، نہر امیر المومنین تھی، 18ھ میں جب عرب میں قحط پڑا اور حضرت عمرؓ نے مصر سے غلہ طلب کیا تو شام اور مصر کا خشکی کا راستہ دور ہونے کی وجہ سے غلہ کسی قدر تاخیر سے پہنچا تھا، اس وقت حضرت عمرؓ نے 99 میل لمبی نہر کھدوا کر نیل کو بحر قلزم سے ملا دیا اور مصر کے جہاز براہ راست مدینہ کی بندرگاہ تک آنے لگے، اس سے مصر کی تجارت کو بھی بڑا فروغ حاصل ہوا۔

بڑے بڑے شہروں میں مسافروں کی سہولت کے لیے مسافر خانے تعمیر کرائے، تاریخوں میں کوفہ اور مدینہ کے مسافر خانوں کی تفصیل ملتی ہے۔

سڑک اور پلوں کی تعمیر کا یہ انتظام تھا کہ عموماً مفتوحہ قوموں کے معاہدہ میں شرط ہوتی تھی کہ وہ پل اور سڑک بنائیں گی، پلوں کی تعمیر، نہروں کی صفائی اور اس قسم کے بعض دوسرے کام بیت المال کے صرفہ سے انجام پاتے تھے۔

مکہ اور مدینہ مرکز اسلام تھے، لیکن ان کے راستے نہایت خراب اور ویران تھے۔ مکہ سے مدینہ تک ہر ہر منزل پر چوکیاں، سرائیں اور حوض تعمیر کرائے۔

رعایا کی خبر گیری کا اتنا اہتمام تھا کہ آج اس کے واقعات افسانہ معلوم ہوں گے باوجود یہ کہ آپ کو مہمات امور سے سابقہ رہتا تھا لیکن رعایا کے چھوٹے چھوٹے حالات کی جانب سے بھی غفلت نہ ہونے پاتی تھی۔

کبھی کوئی حاجب و دربان نہیں رکھا کہ عام لوگوں کو آپ تک پہنچنے میں دقت نہ ہو، روزانہ ہر نماز کے بعد مسجد کے صحن میں بیٹھ جاتے کہ جس کو جو کچھ کہنا سننا ہو آزادی سے کہہ سکے۔ چنانچہ اہل حاجت اپنی ضروریات بیان کرتے تھے۔ اگر کوئی نہ ہوتا تو تھوڑی دیر بیٹھ کر اٹھ جاتے۔

باہر سے جو وفود آتے تھے تمام حکام کو طلب کرتے تھے اور اعلان عام ہوتا تھا کہ جس کو جس عامل کے خلاف شکایت ہو پیش کرے، مدینہ اور اس کے اطراف میں خود گھوم پھر کر حالات کا پتہ لگاتے تھے۔

آپ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے ایسی عادلانہ اور منصفانہ حکومت فرمائی جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ ملکی و مالی، سیاسی و انتظامی، معاشرتی و تمدنی سطح پر آپ نے بہت سی اصلاحات کیں جن کو "اولیات عمرؓ" کہا جاتا ہے، یعنی وہ کام جو سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے کئے، ان میں سے چند درج ذیل ہیں :

1. بیت المال یعنی خزانہ قائم کیا۔
2. عدالتیں قائم کیں اور قاضی مقرر کیے۔
3. اسلامی کلینڈر کا آغاز کیا۔
4. فوجی محکمہ اور فوجی دفتر قائم کیا۔
5. پوری مملکت کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا۔
6. مالیات کا محکمہ باضابطہ طور پر قائم فرمایا۔
7. پولیس کا محکمہ قائم کیا۔
8. ملک کی پیمائش کا قاعدہ جاری کیا۔
9. مردم شماری کرائی۔
10. جیل خانہ تعمیر کرایا۔
11. راستے اور مسافروں کے لئے کنویں اور سرائے خانے تعمیر کرائے۔
12. رضا کاروں کی تنخواہیں مقرر کیں۔

یکم محرم 24ھ مطابق 7 نومبر 644ء کو حضرت عمر کا انتقال ہوا، انتقال سے پہلے چھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی تھی اور تلقین کر دی تھی کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لیا جائے۔

1.7.3 حضرت عثمان غنیؓ

حضرت عمر کی شہادت کے بعد چھ افراد پر مشتمل کمیٹی کے مشورہ سے حضرت عثمان غنی کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ آپ نے تقریباً 12 سال حکومت کی۔ آپ کے زمانہ میں کثرت سے فتوحات ہوئیں اور اسلامی حکومت کا دائرہ مزید بڑھتا گیا۔ آپ نے فوجی تنظیم کی طرف توجہ کی۔ بری فوج کے ساتھ آپ نے بحری فوج بھی ترتیب دی۔ آپ کے زمانے میں رعایا کے اندر مزید خوشحالی آگئی۔ مال غنیمت میں بے حد اضافہ ہوا، لوگوں کے وظیفے بڑھا دئے گئے۔

عثمانی عہد میں رفاہ عام کے بھی بہت سے کام انجام پائے۔ خصوصاً تعمیرات میں بڑا اضافہ ہوا۔ دفاتر کے لیے وسیع عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ رعایا کی آسائش کے لیے سڑک، پل اور مسافر خانے بنوائے، کوفہ میں عقیل اور ابن ہبار کے مکانات خرید کر ایک وسیع

مہمان خانہ بنوایا، مدینہ اور نجد کی راہ میں ایک سرائے تعمیر کرائی اور اس سے منسلک ایک بازار بسایا اور شیریں پانی کا ایک کنواں کھدوایا۔ اس کے علاوہ بیئر سائب، بیئر عامر اور بیئر عریس کئی کنویں کھدوائے۔

مدینہ خیبر کی سمت سے نشیب میں ہے اس لیے کبھی کبھی یہاں سیلاب آجاتا تھا، جس سے شہر کو بڑا نقصان پہنچتا تھا، حضرت عثمانؓ نے مدینہ سے تھوڑے فاصلے پر مدری کے قریب بند بندھوایا اور نہر کھدوا کر سیلاب کا رخ دوسری طرف پھیر دیا، اس سے مدینے کی آبادی بالکل محفوظ ہوگئی۔

مسجد نبوی کی تعمیر:

تعمیرات اور مذہبی خدمات کے سلسلے میں حضرت عثمانؓ کا سب سے روشن کارنامہ مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق اس کی توسیع کرائی تھی، مگر حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب یہ بھی ناکافی ثابت ہوئی تو آپؓ نے 29ھ میں اس کی دوبارہ تعمیر و توسیع کرائی، عمارت کے لیے چونا اور پتھر بطن نخل سے منگایا۔ ساری عمارت میں منقش پتھر استعمال کیے۔ ستونوں کو سیسے سے مضبوط کیا، حضرت عثمانؓ نے طول میں 20 گز کا اور عرض میں 30 گز کا اضافہ کیا۔

آپ کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو قرآن مجید کی ایک قرأت پر متحد کر دیا، جس کی وجہ سے آپ کو ''جامع القرآن'' کہا جاتا ہے۔

آپ کا ابتدائی چھ سالہ دورِ خلافت امن و سکون سے گزرا، پھر نت نئے فتنوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا، زمانۂ نبوت سے دوری کی وجہ سے شر پسند افراد کی تعداد بڑھتی گئی، انہوں نے حضرت عثمان پر بیجا الزامات لگانا شروع کر دئے۔ آپ نے ان الزامات کی تحقیق کے لئے ایک غیر جانبدار تحقیقاتی کمیشن قائم فرمادیا، جس نے ان الزامات کی تحقیق کی اور سارے الزامات غلط ثابت ہوئے، لیکن شر پسندوں نے آپ کے خلاف ایک محاذ کھول دیا تھا، وہ ہر قیمت پر حضرت عثمان کو بدنام کر کے امت اسلامیہ میں افرا تفری کا ماحول پیدا کرنا چاہتے تھے، جن میں سب سے آگے عبداللہ بن سبا نام کا ایک یہودی تھا جو بظاہر مسلمان ہوگیا تھا لیکن دل میں اسلام سے عناد رکھتا تھا، ادھر حضرت عثمان کا معاملہ یہ تھا کہ وہ بڑے نیک، نرم دل اور حلیم تھے، کسی پر بھی سختی کے روادار نہ تھے، جس کی وجہ سے فتنہ انگیزوں کے حوصلے بلند ہوتے گئے، اخیر میں حضرت عثمان شر پسند لوگوں کے ہاتھوں شہید کر دئے گئے۔

1.7.4 حضرت علی مرتضیٰؓ

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد تین دنوں تک خلافت کا منصب خالی رہا، سب کی نظر میں خلافت کے مستحق حضرت علیؓ تھے، اور وہ آپ سے خلیفہ بننے کے لئے درخواست بھی کر رہے تھے، لیکن آپ انکار کرتے رہے، پھر لوگوں کے اصرار پر اور امت اسلامیہ کے مفاد کا لحاظ کر کے خلافت قبول فرمائی، لیکن یہ شرط بھی لگائی کہ میری بیعت خفیہ طریقہ پر نہیں ہوگی، چنانچہ مجمع عام میں مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

آپ نے جس وقت خلافت کی ذمہ داری سنبھالی اس وقت حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ حکومت کا نظم ونسق متاثر تھا، کئی طرح کے فتنے بھی سر اٹھائے کھڑے تھے، گروہ بندیاں شروع ہو چکی تھیں۔ آپ نے سب سے پہلے حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی، لیکن سب سے بڑا مسئلہ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو سزا دینا تھا، آپ نے اس طرف توجہ کی اور اس کی بہتر حکمت عملی اختیار کرنا چاہتے تھے، لیکن مشکل یہ تھی کہ کسی قاتل کا نام معلوم نہیں تھا اور فسادی جو ہزاروں کی تعداد میں تھے خود حضرت علی کی فوجوں میں شامل ہو چکے تھے، اس لئے قصاص لینا مشکل ہو رہا تھا اور تاخیر ہو رہی تھی، اس صورتحال کو نہ سمجھ کر بعض حضرات کی طرف سے جلد قصاص لینے کا مطالبہ زور پکڑتا گیا جس کے نتیجہ میں جنگ جمل، پھر جنگ صفین پیش آئی جس میں ہزاروں مسلمان شہید ہوئے۔

خارجیوں کا فتنہ بھی اسی زمانہ میں زور وشور سے اٹھا، جن کا کہنا تھا کہ دینی معاملات میں انسان کو حکم بنانا کفر ہے، وہ مسلمانوں کی خانہ جنگیوں کا اصل سبب حضرت علی، حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص کو سمجھتے تھے، اس لئے وہ ان کو قتل کر دینا چاہتے تھے، یہ ایک بہت بڑا فتنہ تھا جو قابو سے باہر ہو رہا تھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ان تینوں حضرات کو قتل کرنے کا خطرناک منصوبہ بنایا، حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص تو بچ گئے لیکن حضرت علی ایک خارجی کے ہاتھوں شہید کر دیے گئے۔

آپ نے تقریباً ساڑھے چار برس حکومت کی، لیکن یہ ساری مدت باہمی لڑائیوں میں بسر ہوگئی، کوئی نیا ملک فتح نہیں کیا جا سکا۔ آپ کے دور خلافت میں حکومت کا نظم ونسق بڑی حد تک حضرت عمرؓ کے نظم ونسق کی طرح تھا، آپ نے اپنا دار الخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل کر دیا تھا تاکہ مدینہ میں خون خرابہ نہ ہو۔

حضرت علی مرتضیٰؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسن بن علیؓ خلیفہ منتخب ہوئے لیکن حضرت حسن نے چند شرطوں کے ساتھ حضرت معاویہ کے حق میں خلافت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا تاکہ امت انتشار سے بچ جائے، آپ نے دستبرداری کے اعلان کے موقع پر جو تقریر کی اس میں فرمایا:

> ''یہ خلافت ہمارے اور معاویہ کے درمیان جھگڑے کا باعث بنی ہوئی ہے، دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا ہم اس کے حق دار ہیں یا یہ معاویہ کا حق ہے، میں دونوں صورتوں میں اسے چھوڑتا ہوں، غرض صرف یہ ہے کہ محمد ﷺ کی امت میں پھوٹ باقی نہ رہے اور آپس کی لڑائی اور خونریزی سے بچے رہیں''۔

حضرت حسنؓ صرف چند مہینے خلیفہ رہے، ان کی دستبرداری کے اعلان کے ساتھ خلافت راشدہ کا دور ختم ہوگیا۔

معلومات کی جانچ

1. خلافت راشدہ کی مدت کتنی ہے؟ بیان کیجئے۔
2. حضرت ابوبکرؓ کے دور حکومت پر روشنی ڈالئے۔
3. حضرت عمرؓ کی اولیات کیا ہیں؟

1.8 خلافت راشدہ کی خصوصیات

عہد نبوی میں جو معاشرہ تیار ہوا تھا وہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ آگے بڑھتا رہا، البتہ عہد نبوی میں چونکہ اسلام کی اشاعت عرب میں ہوئی تھی اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں اسلام کی سرحدیں ایشیا اور افریقہ کے بڑے علاقوں تک وسیع ہوگئی تھیں، اس لحاظ سے خلافت راشدہ کا معاشرہ زیادہ پھیل گیا تھا، لیکن اس کے باوجود خلافت راشدہ کے مزاج میں تغیر نہیں آیا، خلفائے راشدین عہد نبوی کی تمام خصوصیات کے ساتھ حکمرانی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ خلافت راشدہ کی چند خصوصیات یہ تھیں:

1. خلیفہ کا انتخاب شورائی انداز پر یا تمام مسلمانوں کے مفاد کے پیش نظر عمل میں آتا۔
2. خلیفہ بھی ایک عام فرد کی طرح ہوتا جو اپنے کو عوام اور رعایا کا خادم سمجھتا۔
3. بیت المال میں تمام رعایا کا حق سمجھا جاتا، خلیفہ صرف اس کا نگراں ہوتا جو رعایا کے مفاد میں خرچ کرتا۔
4. لوگوں کو خلیفہ سے محاسبہ کرنے کی مکمل آزادی تھی اور خلیفہ اپنے کو عوام کا جوابدہ سمجھتا تھا۔
5. عدالت کے فیصلوں میں خلیفہ بھی مداخلت نہیں کرسکتا تھا، بلکہ قاضی کو یہ اختیار تھا کہ اگر خلیفہ کے خلاف کوئی مقدمہ پیش ہو تو خلیفہ کو بھی حاضر عدالت ہونے کا حکم صادر کردے۔
6. شوریٰ کو بنیادی اہمیت حاصل تھی، کسی بھی اہم فیصلہ کے وقت ملت اسلامیہ کے مفاد میں اہل شوریٰ سے مشورہ کیا جاتا۔
7. قانون کو ہر طرح سے بالاتری حاصل تھی، خلفاء نہ تو خود شرعی قانون سے تجاوز کرتے نہ کسی کو تجاوز کرنے کی اجازت دیا کرتے۔

1.9 خلافت راشدہ کے انتظامی، تعلیمی، سماجی اور معاشی حالات

1.9.1 انتظامی حالات

خلافت راشدہ کے زمانہ میں نظم ونسق کا یہ حال تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے انتظام کے جو شعبے اور محکمے قائم فرمائے تھے، خلفائے راشدین نے نہ صرف ان کو باقی رکھا بلکہ اپنے زمانہ کے حالات اور ضرورتوں کے تقاضوں کے مطابق ان کو وسعت وترقی بھی دی۔ چنانچہ خلافت راشدہ میں دیوان الجند (محکمۂ فوج) دیوان الخراج (محکمۂ مالیات) دیوان البرید (ڈاک کا محکمہ) دیوان الرسائل (خط وکتابت کا محکمہ) جیسے سارے محکمے باضابطہ کام کررہے تھے۔

فوجی نظام میں بھی ترقی ہوئی، عہد نبوی کا نظام تو اس دور میں جاری ہی رہا، البتہ ایک نیا محکمہ 'بحری محکمہ' کے نام سے اس زمانہ میں قائم ہوا، اسی طرح سرحدی صوبوں میں فوجی چھاؤنیاں بھی اسی زمانہ میں قائم کی گئیں۔

1.9.2 تعلیمی حالات

خلافت راشدہ کے دور میں تعلیم کی طرف پوری توجہ دی گئی۔ اسلامی علوم کی تدوین کے ابتدائی نقوش اسی زمانہ میں تیار ہوئے۔ قرآن کی تعلیم وتجوید، قرآن کی تفسیر، حدیث، فقہ جیسے خالص اسلامی علوم کی بنیادیں اسی زمانہ میں مستحکم ہوئیں۔ سیرت و تاریخ، عربی زبان وادب کے فروغ کی طرف بھی توجہ دی گئی، نومسلموں کی تعلیم وتربیت کا بھی اس دور میں انتظام کیا جاتا تھا۔

تعلیم عام طور پر مساجد میں دی جاتی اور صحابۂ کرام کے اپنے گھر بھی مکاتب و مدارس کا کام کرتے اور سب سے بڑھکر یہ کہ ان کی زندگیاں خود چلتا پھرتا مدرسہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔

1.9.3 سماجی حالات

خلافت راشدہ کا معاشرہ تاریخ کا بہترین معاشرہ تھا، اسلام کی آمد سے پہلے سماج کا جو قبائلی اور طبقاتی نظام رائج تھا، خلفائے راشدین نے اپنے زمانہ میں اس کو بالکل ختم کر دیا اور اسلامی تعلیم کی روشنی میں ایک انسانی سماج کا خاکہ پیش کیا، جس میں ہر طرح کی سماجی برابری پائی جاتی تھی، رنگ و نسل، وطن و قومیت اور زبان کی بنیاد پر کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاتی تھی۔

1.9.4 معاشی حالات

معاشی طور پر لوگ بہت خوشحال تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں ایک طرف فتوحات کی کثرت ہو رہی تھی تو دوسری طرف معاشی عدل و انصاف کے تقاضوں کو بھی پورا کیا جاتا تھا۔ حکومت کی آمدنی کو سماج کے تمام طبقات اور رفاہی کاموں میں صرف کیا جاتا جس کا فائدہ سب کو پہونچ رہا تھا۔

1.10 خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ بعثت محمدی سے پہلے دنیا کی حالت اخلاقی، مذہبی اور سیاسی و سماجی لحاظ سے بہت خراب ہو چکی تھی، اور سب کسی آخری آنے والے نبی کا انتظار کر رہے تھے جو ان کی صحیح رہنمائی کرنے کا فریضہ انجام دے۔

عرب کا ملک اس آخری نبی کے آنے کے لئے اور ان کے بین الاقوامی پیغام کو عام کرنے کے لئے بہت موزوں و مناسب تھا، وہاں کے لوگوں میں ہزار برائیوں کے باوجود جرأت و ہمت، شجاعت و بہادری، سخاوت و فیاضی، فصاحت و بلاغت، آزادی و حق گوئی، وفاداری و امانت اور سچائی و مساوات جیسی ممتاز خوبیاں پائی جاتی تھیں، چنانچہ وہیں 610ء میں حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی۔

آپ ﷺ کی بعثت سے دنیا میں ایک صالح انقلاب برپا ہوا، لوگوں کو نئی زندگی اور نئی روشنی ملی۔ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے نبوت ملنے کے بعد تیرہ برس تک مکہ میں لوگوں کے عقائد و اخلاق درست کرنے میں محنت کی اور مدینہ پہونچ کر دس سال میں ایک اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست کی تشکیل فرمائی، اسلامی ریاست کا جو منشور آپ نے میثاق مدینہ کی شکل میں پیش کیا وہ ایک اسلامی جمہوری اور شورائی مملکت کا اعلان تھا جس میں اللہ کی حاکمیت تسلیم کی گئی تھی۔

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی کوششوں سے ایک ایسا مثالی معاشرہ وجود میں آیا، جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ لوگوں کی اخلاقی حالت درست ہوئی، تعلیم کی طرف رجحان ہوا، عورتوں کو ان کا حق دیا گیا، غلاموں اور باندیوں کے ساتھ گھر کے دیگر افراد کی طرح برتاؤ کیا جانے لگا اور سماج سے ساری برائیاں ختم ہو گئیں۔

پھر 12 ربیع الاول 11ھ مطابق 20 جون 633ء کو آپ ﷺ کی وفات ہوئی، آپ کی وفات کے بعد امت کے مسائل کو حل کرنے اور اسلامی ریاست کے نظم و نسق کو سنبھالنے کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ بنایا گیا۔ آپ نے امت کے شیرازہ کو

بکھرنے سے روکا اور اسلامی ریاست کو مستحکم بنیادیں عطا کیں، پھر حضرت عمرؓ نے خلافت سنبھالی، آپ نے اسلامی حکومت کا دائرہ بہت وسیع کیا اور ایسی عادلانہ ومنصفانہ حکومت کا نمونہ پیش کیا، جس کی مثال تاریخ نہیں پیش کرسکتی۔ پھر حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ ہوئے، آپ کے دور میں بھی کثرت سے فتوحات ہوئیں اور رعایا بہت خوشحال ہوئی، پھر فتنوں نے سر اٹھانا شروع کیا، آپ بہت نرم دل تھے، شرپسند آپ کی نرمی کی وجہ سے دلیر ہوگئے اور پھر شہادت عثمانؓ کا افسوسناک واقعہ پیش آیا، پھر حضرت علیؓ نے خلافت سنبھالی، لیکن آپ کا وقت فتنوں سے مقابلہ کرنے میں ہی گزرا، خارجیوں کا فتنہ بھی بڑے زور وشور سے اٹھا، اور بالآخر ایک خارجی کے ہاتھوں آپ شہید کردئے گئے، پھر حضرت حسنؓ کے ہاتھوں پر لوگوں نے خلافت کی بیعت کی لیکن حضرت حسنؓ حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوگئے اور یہیں پر خلافت راشدہ کا زمانہ ختم ہوگیا۔

خلافت راشدہ کا زمانہ ایک بے مثال تاریخی زمانہ تھا جس میں خیر غالب تھا۔ خلیفہ کا انتخاب شورائی طرز پر ہوتا۔ خود خلیفہ ایک عام فرد کی طرح زندگی بسر کرتا اور اپنے کو عوام کا جوابدہ سمجھتا، قانون کی برتری پائی جاتی، معاشی عدل وانصاف اور سماجی برابری و مساوات کا پورا خیال رکھا جاتا تھا، حکومت کا نظام بہت مضبوط بنیادوں پر استوار تھا۔

1.11 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجئے۔

1. عرب کے حالات بیان کیجئے۔
2. عہد نبوی کے معاشرہ کی خصوصیات ذکر کیجئے۔
3. حضرت عمر فاروقؓ کے کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. عربوں کی ممتاز خوبیاں بیان کیجیے۔
2. میثاق مدینہ کسے کہتے ہیں؟ لکھیے اور اس کے نتائج سے بحث کیجیے۔
3. خلافت راشدہ کے تعلیمی حالات بیان کیجیے۔

1.12 فرہنگ

متمدن	تہذیب یافتہ
مطلق العنان	بے لگام
تقدیس	پاکی بیان کرنا

اجنہ	جنات
قادرالکلامی	بات پر قدرت
قماربازی	جوا کھیلنا
دست کش	ہاتھ کھینچنے والا
میثاق	معاہدہ
مواخات	بھائی چارہ
حلیف	دوست، ساتھی
مصارف	اخراجات
کشت وخون	خونریزی
منشور	دستاویز
استحکام	مضبوطی
ارتداد	اسلام چھوڑ دینا
نخلستان	کھجور کا باغ
عناد	دشمنی
قصاص	بدلہ (خون کے بدلہ خون)

1.13 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. نبی رحمت — مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
2. خلفاء راشدین — حاجی معین الدین ندوی
3. تاریخ تہذیب اسلامی — پروفیسر یسین مظہر صدیقی
4. مختصر تاریخ اسلام — غلام رسول مہر
5. تاریخ اسلام — اکبر شاہ نجیب آبادی
6. سیرت النبی — علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی

اکائی 2 : اموی حکومت کا قیام اور خلفاء کے حالات

اکائی کے اجزاء

2.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھکر طلبہ اموی حکومت کے قیام کی تفصیلات، اموی خلفاء کے حالات اور کارناموں سے واقف ہونگے نیز ان کو معلوم ہوگا کہ اموی دورحکومت میں کیا فتوحات ہوئیں، کیا علم وتمدن کی خدمت انجام پائی اور اسلامی مملکت کا دائرہ کس قدر پھیل گیا۔

2.2 تمہید

اس اکائی میں بنو امیہ کی حکومت کے قیام پر روشنی ڈالی جائے گی اور خلفائے بنی امیہ کے حالات اور کارنامے بیان کئے جائیں گے۔ نیز اس دور میں کیا کیا فتوحات ہوئیں اور مملکت کا دائرہ کس قدر پھیلا، ان سب پر روشنی ڈالی جائے گی۔

2.3 اموی حکومت کا قیام

41ھ مطابق 661ء میں حضرت حسنؓ بن علیؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبرداری کا اعلان کیا اور لوگوں نے متفقہ طور پر حضرت امیر معاویہؓ کے ہاتھوں پر خلافت کی بیعت کی اور اموی حکومت کا آغاز ہوا۔

حضرت امیر معاویہؓ بن ابوسفیان کا تعلق قریش کی اہم شخصیت عبد شمس کے بیٹے امیہ سے ہے جن کے بیٹے حرب ہیں اور ان کے بیٹے ابوسفیان اور ان کے بیٹے حضرت امیر معاویہؓ ہیں۔

اموی حکومت میں اگرچہ خلافت راشدہ کی ممتاز خوبیاں نہیں تھیں۔ لیکن فتوحات کی وسعت، مملکت اسلامیہ کے بہتر نظم ونسق اور رعایا کی خوشحالی وفارغ البالی، تہذیب وتمدن کے ارتقاء اور علوم وفنون کی بنیادیں رکھنے کے اعتبار سے یہ تاریخ کا ایک اہم زمانہ مانا جاتا ہے۔

اس حکومت کا آغاز 661ء میں ہوا اور 749ء تک جاری رہا، اس لحاظ سے اس کی مدت تقریباً نوے سال یعنی ایک صدی کے قریب رہی۔ جس میں یکے بعد دیگرے چودہ خلفاء آئے جن میں حضرت امیر معاویہؓ کے خاندان کے تین خلفاء ہیں۔ بقیہ مروان اموی کے خاندان سے ہیں۔ ان میں عبد الملک اور ولید نے اور پھر حضرت عمر بن عبد العزیز نے زیادہ شہرت پائی اور لازوال کارنامے انجام دیئے۔

ذیل میں ان خلفائے بنی امیہ کا مختصر تذکرہ پیش کیا جاتا ہے، اس کے مطالعہ سے اموی حکومت کی کارکردگی اور کارناموں سے واقفیت ہوگی۔

معلومات کی جانچ

1. اموی حکومت کب سے کب تک رہی؟

2. اموی حکومت کی خوبیاں بیان کیجئے۔

2.4 خلفاء کے حالات

2.4.1 حضرت امیر معاویہؓ

بنوامیہ کی حکومت کے بانی حضرت امیر معاویہؓ نے پورے بیس سال حکومت کی ۔آپ کے زمانہ میں کئی علاقے اسلام کے زیر نگین ہوئے۔ مسلمانوں کی حکومت کا رقبہ وسیع ہوا اور اسلامی دنیا نے بڑی ترقی کی۔

آپ نے جس وقت خلافت کی باگ ڈور سنبھالی اس وقت حالات بہت نازک تھے۔کئی طرح کی مخالفتیں درپیش تھیں۔آپ نے اپنی بے نظیر حکمت و تدبیر سے ان سب اندرونی و بیرونی مخالف طاقتوں کو زیر کیا۔آپ کے زمانہ میں دو گروہ تھے جن سے آپ کی حکومت کو خطرہ تھا۔ایک حضرت علیؓ کے حامیوں کا گروہ تھا جو شیعان علی کہلاتے تھے اور دوسرا گروہ خوارج کا تھا۔حضرت علیؓ کے حامی حضرت حسنؓ کے اعلان دستبرداری کے بعد زیادہ ابھر نہ سکے۔البتہ خوارج ابھی بھی قابو سے باہر ہورہے تھے۔انہوں نے حضرت علیؓ کو شہید کرہی دیا تھا۔حضرت امیر معاویہؓ کو بھی یہ اپنا نشانہ بنائے ہوئے تھے حضرت معاویہؓ نے اس کی تدبیر یہ کی کہ کوفہ میں جہاں ان کا سب سے زیادہ اثر تھا حضرت مغیرہ بن شعبہ کو والی بنا کر بھیجا۔حضرت مغیرہ بن شعبہ نے اپنی تدبیر اور جرأت سے ان خوارج کا ایسا مقابلہ کیا کہ وہ پھر زیادہ ابھر نہ سکے۔

حضرت امیر معاویہؓ نے اندرونی مخالفتوں پر قابو پانے کے بعد بیرونی دشمنوں کی طرف توجہ کی اور مسلمان فوجوں کو سندھ، ترکستان اور شمالی افریقہ بھیجا۔ان کی کوششوں سے سندھ، ترکستان اور شمالی افریقہ کا بڑا حصہ فتح ہوگیا اور یہ سب اسلام کے زیر نگین آگئے۔آپ نے شمالی افریقہ میں ''قیروان'' نام سے ایک شہر بسایا اور اس کو اس علاقہ کی چھاؤنی بنا دیا۔یہاں مسلمان فوجی موجود رہتے تاکہ وہاں کے باشندے اگر شورش اور فتنہ برپا کریں تو ان کا تدارک وہیں سے ہوجایا کرے۔اس کی وجہ سے افریقہ میں بغاوت کے خطرہ کا امکان بھی بڑی حد تک ختم ہوگیا۔

رومیوں سے مقابلہ کے لئے آپ نے بحری بیڑے تیار کرائے۔آپ کو روم فتح کرنے کا بہت شوق تھا اور رسول اللہ ﷺ کی پیشنگوئی اور فاتح قسطنطنیہ کے بارے میں آپ کی بشارت کی وجہ سے آپ نے قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاری کی۔پورے اہتمام کے ساتھ آپ نے فوج تیار کی جس میں بڑے اور ممتاز صحابہ شامل تھے۔حضرت ابوایوب انصاریؓ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے میزبان تھے، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس جیسے ممتاز اہل علم صحابہ نے بھی شرکت فرمائی۔مسلمانوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا تھا لیکن اس کی فصیل بہت اونچی تھی اور مسلمان نیچے تھے، رومی اس کا فائدہ اٹھا کر اوپر سے مسلمانوں پر آگ برساتے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کا بہت نقصان ہورہا تھا۔اخیر میں محاصرہ ختم کرکے لوٹنا پڑا۔حضرت ابوایوب انصاری محاصرہ کے دوران ایسے بیمار

ہوئے کہ زندگی کی امید باقی نہ رہی۔ آپ نے مسلمانوں کو وصیت کی کہ جہاں تک ہوسکے دشمن کی سرزمین میں لیجا کر دفن کرنا۔ چنانچہ جب آپ کا انتقال ہوگیا تو قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے آپ کو دفن کیا گیا۔ بعد میں آپ کے مزار کے قریب ''جامع ابوایوب انصاری'' کے نام سے ایک بڑی مسجد بنائی گئی جو آج بھی مشہور ہے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ حکومت میں ہر طرف امن و امان تھا۔ انہوں نے اس کا خیال رکھا کہ سلطنت کے مختلف حصوں میں اچھے اور قابل والیوں کا تقرر کیا جائے تا کہ ہر علاقہ کا نظم ونسق بہتر رہے۔ آپ نے رفاہ عام کے کاموں کی طرف بھی توجہ دی۔ آب پاشی کے لئے نہر اور تالاب بنوائے۔

آپ نے ڈاک کا نظام قائم فرمایا، جس کی شکل یہ تھی کہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر چوکیاں قائم فرمائیں جہاں تیز رفتار گھوڑے ہر وقت تیار رہتے، ان کے ذریعہ سے خطوط ایک جگہ سے دوسری جگہ بہت جلد پہونچ جاتے تھے۔

بحری فوج کی ترتیب بھی آپ کا اہم کارنامہ ہے۔ آپ نے جہاز بنانے کے کارخانے بھی قائم فرمائے، بہت سے نئے قلعے بنوائے، پرانے قلعوں کی مرمت کرائی، جنگی آلات میں منجنیق کا اضافہ کیا۔

آپ نے تعلیم کو عام کرنے کی بھی کوشش فرمائی، مسلمانوں میں سب سے پہلے فن تاریخ پر ایک کتاب تصنیف کرائی جس میں قدیم تاریخ کی کہانیاں، عجم کے بادشاہوں کے تذکرے اور مختلف زبانوں کے آغاز وارتقاء کی تاریخ درج تھی۔ یہ کام آپ نے اپنی حکومت کے ایک فرد عبید بن شریہ سے کرایا جس کی عجم کی تاریخ پر نگاہ تھی اور جو حضرت امیر معاویہ کو مختلف بادشاہوں کی کہانیاں اور داستانیں اور رزم و بزم کے حالات سنایا کرتا تھا۔

حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ میں عدل وانصاف اور رعایا کی خوشحالی اور دادرسی کا بھی بڑا اہتمام تھا۔ وہ دربار میں آنے سے پہلے روزانہ مسجد میں جاکر رعایا کی شکایتیں سننے کے لیے بیٹھتے اور ان کے سامنے کمزور وناتوان، دیہاتی عورتیں، بچے اور لاوارث ہر طبقہ کے لوگ پیش کیے جاتے، یہ سب اپنی اپنی شکایتیں بیان کرتے۔ امیر معاویہؓ اسی وقت اس کے تدارک کا حکم دیتے تھے۔ اس کے بعد دربار میں جاتے اور اشراف کو بلاتے اور ان سے کہتے کہ تم لوگ اشراف اس لیے کہلاتے ہو کہ تم کو دربار میں کم رتبہ لوگوں پر شرف عطا کیا گیا ہے۔ اس لیے جو لوگ میرے پاس نہیں آپاتے ان کی ضرورت مجھ سے بیان کیا کرو۔

آپ نے شام کے مشہور شہر دمشق کو اپنا دارالخلافہ بنایا تھا جو مدینہ اور کوفہ کے بعد اسلام کا تیسرا دارالخلافہ قرار پایا تھا۔

حضرت امیر معاویہؓ کا اصول تھا کہ حلم کے موقع پر حلم سے اور سختی کے موقع پر سختی سے کام لیتے تھے۔ لیکن حلم کا پہلو غالب تھا، ان کے حلم کے بہت سے واقعات ہیں، وہ جب تک سختی کے لیے مجبور نہ ہوجاتے تھے، اس وقت تک سختی سے کام نہ لیتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا اصول یہ تھا ''جہاں میرا کوڑا کام دیتا ہے وہاں تلوار کام میں نہیں لاتا، اور جہاں زبان کام دیتی ہے وہاں کوڑا کام میں نہیں لاتا، اگر میرے اور لوگوں کے درمیان بال برابر بھی رشتہ قائم ہو تو میں اس کو نہیں توڑتا، جب لوگ اس کو کھینچتے ہیں تو میں ڈھیل دے دیتا ہوں اور جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو میں کھینچ لیتا ہوں''۔

جب ان کے مخلصین ان کے غیر معمولی حلم پر انھیں ٹوکتے تو یہ جواب دیتے کہ میں اس وقت تک لوگوں کی زبان نہ روکوں گا جب تک وہ میری حکومت اور میرے درمیان مزاحمت نہ کریں۔ ان کا یہ اصول اپنے عمال اور رعایا دونوں کے لیے تھا۔ زیاد کے ایک عامل کے رقبہ حکومت میں خراج کی آمدنی گھٹ گئی۔ وہ زیاد کے خوف سے امیر معاویہؓ کے پاس بھاگ گیا۔ زیاد کو معلوم ہوا تو اس نے امیر معاویہؓ کو لکھا کہ اس طریقہ سے دوسرے لوگ نڈر ہو جائیں گے، امیر معاویہؓ نے جواب دیا کہ سب کے ساتھ ایک ہی سیاست برتنا میرے اور تمہارے کسی کے لیے مناسب نہیں ہے۔ نہ ہم کو سب کے ساتھ نرمی کرنی چاہئے کہ لوگ سرکش ہو جائیں اور نہ سب پر سختی کرنی چاہئے کہ ان کا جینا دوبھر ہو جائے، تم سختی کے لیے رہو، میں نرمی کے لیے۔

آپ نے اپنے بعد اپنے لڑکے یزید کو جانشین مقرر فرما دیا تھا اور اس کے لیے اپنی زندگی میں ہی بیعت لینا شروع کر دیا تھا۔

2.4.2 یزید بن معاویہ

حضرت معاویہؓ کے انتقال کے بعد یزید تخت خلافت پر بیٹھا، لیکن چونکہ اس کی بیعت کچھ دباؤ کے تحت تھی اس لیے بہت سے لوگوں نے اس کی مخالفت کی، اس کی وجہ یہ تھی کہ باپ کے بعد بیٹے کی جانشینی کو مسلمان اسلامی طریقہ نہیں سمجھتے تھے اور اس لیے بھی کہ یزید کو اس کی صفات و اخلاق کے اعتبار سے اتنا بہتر نہیں سمجھتے تھے کہ اس کو اس سے بہتر لوگوں کی موجودگی میں مسلمانوں کا خلیفہ بنایا جائے، مخالفت کرنے والوں میں پانچ ممتاز حضرات صحابہ تھے جن کے نام یہ ہیں: حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت حسین بن علی، حضرت عبد اللہ بن زبیر اور حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکر۔ یزید کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہی آیا کہ ان بزرگوں سے کسی طرح بیعت لی جائے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکر سے زیادہ خوف نہ تھا، اصل مسئلہ حضرت حسین اور حضرت عبد اللہ بن زبیر کا تھا۔ اس لیے یزید نے خلافت سنبھالتے ہی ولید بن عتبہ حاکم مدینہ کو ان دونوں حضرات سے بیعت لینے کا تاکیدی حکم بھیجا۔ ولید نے دونوں کو بلا کر گفتگو کی۔ حضرت حسینؓ نے فرمایا کہ جب عام لوگ بیعت کریں گے اس وقت میں بھی آجاؤں گا اور حضرت عبد اللہ بن زبیر نے ایک دن کی مہلت لی اور مکہ چلے گئے۔ بعد میں حضرت حسینؓ بھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ مکہ روانہ ہو گئے اور وہاں شعب ابی طالب میں قیام فرمایا۔

اہل کوفہ یزید کی خلافت کو پسند نہیں کرتے تھے اس لیے انھوں نے حضرت حسینؓ سے خلیفہ بننے کی درخواست کی۔ حضرت حسین بن علیؓ نے ان کی مسلسل درخواست کی بنا پر کوفہ جانے کا ارادہ فرما لیا لیکن عین وقت پر کوفہ کے لوگوں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا اور کربلا کا غیر معمولی واقعہ پیش آیا، حضرت حسین اور ان کا پورا خاندان اس معرکہ کربلا میں شہید ہو گیا، صرف عورتیں اور حضرت زین العابدین جو ابھی لڑکے تھے اور بیمار تھے وہ بچ گئے۔

اس واقعہ کا حجاز کے لوگوں پر گہرا اثر پڑا۔ وہ یزید سے اور بدظن ہو گئے۔ بہت سے لوگوں نے یزید کی بیعت ختم کر کے حضرت عبد اللہ بن زبیر کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر لی۔ یزید نے اس کے مقابلہ کے لیے ایک بھاری فوج مدینہ بھیجی۔ یزید کی فوج نے مدینہ فتح کرنے کے بعد دس دنوں تک مدینہ میں خوب لوٹ مار کی۔ تاریخ میں اس واقعہ کو حرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مدینہ کے بعد یہ فوج مکہ روانہ ہوئی جہاں حضرت عبد اللہ بن زبیر پناہ گزیں تھے لیکن اس درمیان یزید کا انتقال ہو گیا اور اس کی فوج دمشق واپس چلی گئی۔

یزید کی خلافت چار سال رہی، اس عرصہ میں کوئی فتح وکامیابی مسلمانوں کو حاصل نہیں ہوئی، یزید کے دامن پر سب سے بڑا داغ حضرت حسین بن علیؓ کی شہادت کا ہے۔

2.4.3 معاویہ ثانی

یزید کے بعد اس کے لڑکے معاویہ (ثانی) کے ہاتھوں پر لوگوں نے بیعت خلافت کی لیکن معاویہ عابد وزاہد آدمی تھے۔ خلافت کے کچھ زیادہ خواہش مند بھی نہ تھے اور بیمار بھی رہا کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے تین مہینہ کے بعد خلافت سے دست برداری کا اعلان کردیا اور مسلمانوں کو اختیار دے دیا کہ وہ جس کو چاہیں خلیفہ منتخب کرلیں۔ انھوں نے اپنی آخری تقریر میں کہا کہ مجھ میں حکومت کا بار اٹھانے کی طاقت نہیں ہے، میں نے چاہا کہ ابوبکرؓ کی طرح کسی کو اپنا جانشین بنادوں یا عمرؓ کی طرح چھ آدمیوں کو نامزد کرکے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب شوریٰ پر چھوڑ دوں۔ لیکن نہ عمرؓ جیسا کوئی نظر آیا اور نہ ویسے چھ آدمی ملے، اس لیے میں اس منصب سے دست بردار ہوتا ہوں۔ تم لوگ جسے چاہو اپنا خلیفہ بنالو۔

اس کے بعد حضرت امیر معاویہؓ کے خاندان کی حکومت ختم ہوگئی اور مروان برسراقتدار آئے۔ یہ بھی امیہ ہی کے خاندان سے تھے، اس لیے ان سب کو بنوامیہ کہا جاتا ہے۔

2.4.4 عبداللہ بن الزبیر و مروان

معاویہ ثانی کے اعلان دست برداری کے بعد مسلمانوں نے عبداللہ بن الزبیر کو خلافت کا مستحق سمجھا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی لیکن شام میں ''مرج راہط'' کے مقام پر عبداللہ بن الزبیر اور بنوامیہ کے حامیوں کے درمیان لڑائی ہوئی جس میں بنوامیہ کامیاب ہوئے اور شام سے عبداللہ بن الزبیر کا اقتدار ختم ہوگیا لیکن عراق وحجاز ابھی ان کی خلافت کے ماتحت ہی تھے۔ پھر مروان کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک بن مروان تخت خلافت پر بیٹھا۔

2.4.5 عبدالملک بن مروان

عبدالملک بن مروان اپنے زمانہ کا بڑا عالم، مدبر، حوصلہ مند، مستقل مزاج اور بہادر تھا۔ وہ مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک موقع پر بھی گھبراتا نہ تھا۔ اس کے تخت خلافت پر بیٹھتے وقت عالم اسلام کی صورت حال یہ تھی کہ عراق وحجاز میں عبداللہ بن الزبیر کی حکومت تھی اور مصر وشام عبدالملک بن مروان کے ماتحت تھے۔ عبدالملک بن مروان نے پہلے عراق میں عبداللہ بن الزبیر کے بھائی اور عراق کے والی حضرت مصعب کو شکست دی پھر حجاج بن یوسف کو مکہ بھیجا تا کہ حضرت عبداللہ بن الزبیر کی حکومت ختم کردے۔ حجاج نے سخت حملہ کرکے عبداللہ بن الزبیر کی فوج کو شکست دی اور خود حضرت ابن الزبیر اس جنگ میں شہید ہوگئے۔ اس کے بعد پوری دنیائے اسلام پر عبدالملک کی حکومت قائم ہوگئی۔

عراق میں اکثر بغاوتیں ابھرتی رہتی تھیں اس لیے عبدالملک نے حجاج بن یوسف کو عراق کا والی بنایا جس نے اپنی سختی سے سب کو درست کردیا۔ خارجیوں سے بھی لڑائیاں ہوئیں اور آخر میں ان کی بھی طاقت ختم ہوگئی۔

عبدالملک کا ابتدائی زمانہ آپسی اختلاف اور جنگوں کا رہا جس کے نتیجہ میں شروع میں قیصر روم سے دب کر صلح بھی کرنی پڑی تھی۔لیکن جب امن وامان ہوا تو رومیوں سے سخت جنگ ہوئی اوران کو شکست ہوئی۔شمالی افریقہ اگر چہ حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ میں فتح ہو چکا تھا لیکن وہاں بغاوت ہوتی رہتی تھی۔عبدالملک نے اپنے لائق سپہ سالار موسی بن نصیر کے ذریعہ اس کو دوبارہ فتح کیا اور وہاں اسلام کی تبلیغ کرائی جس کے نتیجہ میں پورا شمالی افریقہ مسلمان ہو گیا۔

عبدالملک بڑا دوراندیش اور منتظم حکمراں تھا اس کے زمانے تک ایران کی دفتری زبان فارسی اور شام ومصر کی دفتری زبان یونانی تھی اس نے عربی زبان کو دفتری زبان قرار دیا۔اسی طرح اسلامی ملکوں میں اب تک رومی سکوں کا ہی رواج تھا۔عبدالملک بن مروان نے خود اپنے سکے ڈھالنے کی کوشش کی۔اس کے لیے ٹکسالیں قائم کیں اور پھر ممالک اسلامیہ میں اسلامی سکوں کو رواج دیا۔

عبدالملک نے اپنے زمانہ میں کئی نئے شہر بھی بسائے جن میں عراق کا شہر ''واسط'' مشہور ہے۔بیت المقدس میں جہاں سے رسول اللہ ﷺ معراج کے لیے تشریف لے گئے تھے اس جگہ پر ایک خوبصورت قبہ بنوایا جس کو ''قبۃ الصخرۃ'' کہا جاتا ہے۔

اس کے دور میں رفاہ عام کے بھی بہت سے کام انجام پائے، 80ھ میں مکہ میں بہت بڑا سیلاب آیا تھا، جو ''سیل جارف'' کے نام سے مشہور ہے، اس سے مکہ کی ساری آبادی تہ آب ہوگئی اور اہل مکہ کو بڑا جانی و مالی نقصان پہنچا۔عبدالملک نے آئندہ اس سے حفاظت کے لیے ان تمام مکانوں میں جو وادی کے کنارے تھے اور مسجدوں اور گلیوں میں مستحکم حصار اور بند بنوائے۔

اس کی مدت خلافت اکیس سال ہے، شروع کے آٹھ سالوں تک عراق وحجاز پر حضرت عبداللہ بن الزبیر کی حکومت تھی۔حضرت عبداللہ بن الزبیر کی شہادت کے بعد تمام اسلامی علاقوں پر اس کی حکومت ہوگئی۔اس نے اپنے انتقال سے پہلے اپنے دو بیٹوں ولید اور سلیمان کو یکے بعد دیگرے ولی عہدی کے لیے نامزد کر دیا تھا۔

2.4.6 ولید بن عبدالملک

عبدالملک کے انتقال کے بعد ولید بن عبدالملک خلیفہ بنا۔ولید کا زمانہ فتوحات کی وسعت، دولت کی فراوانی، تعمیراتی کاموں کی کثرت کی وجہ سے پوری اموی حکومت میں بے مثال ہے۔اس نے جب خلافت کی باگ ڈور سنبھالی اس وقت عالم اسلام میں امن کی فضا قائم ہو چکی تھی، آپسی انتشار اور خانہ جنگی کا بڑی حد تک خاتمہ ہو چکا تھا۔خوش قسمتی سے اس کو محمد بن قاسم، مسلمہ بن عبد الملک، قتیبہ بن مسلم، موسی بن نصیر اور طارق بن زیاد جیسے چند لائق اور بہادر سپہ سالار ملے۔جنھوں نے اپنی بے نظیر شجاعت اور حکمت عملی سے اسلامی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع کر دیا اور ایسا کارنامہ انجام دیا کہ خلافت راشدہ کے زمانہ کی یاد تازہ ہوگئی۔

محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کر کے سندھ سے ملتان تک کا سارا علاقہ فتح کر لیا۔مسلمہ بن عبدالملک نے رومیوں کو شکست پر شکست دی۔قتیبہ بن مسلم نے سمرقند سے کاشغر تک قبضہ کر لیا اور آگے بڑھ کر چین کے بادشاہ کو خراج دینے پر مجبور کر دیا۔موسی بن نصیر اور طارق بن زیاد نے افریقہ سے گزر کر اسپین (اندلس) کو فتح کر لیا اور آگے بڑھ کر فرانس پر بھی چڑھائی کی۔

ولید بن عبدالملک نے ان علاقوں میں عوام کی خیر خواہی اور خوشحالی کا ایسا انتظام کیا اور ایسی صاف ستھری عادلانہ ومنصفانہ حکومت کی کہ وہاں کے باشندے اپنی پچھلی حالت پر شرمندہ ہونے لگے اور مسلمانوں کی حکومت کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ولید نے فوجی نظام کو بھی بہت ترقی دی۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک وقت میں کئی کئی محاذوں، ہندستان، وسط ایشیاء اور یورپ میں جنگ چھڑی ہوئی تھی اور سب میں کامیابی ہوئی۔ فوج کی جزوی ضروریات کی فراہمی کا اتنا اہتمام تھا کہ سندھ کی فوج کشی میں حجاج نے سوئی دھاگہ تک ساتھ کر دیا تھا۔ خوردونوش کے سامان کا اتنا مکمل انتظام تھا کہ روٹی سرکہ میں بھگو کر خشک کر کے ساتھ کر دی گئی تھی کہ ضرورت پڑنے پر پانی میں بھگو کر سرکہ تیار کر لیا جائے۔

جگہ جگہ جہاز سازی کے کارخانے بنائے۔ رفاہ عامہ کے بہت کام کیے۔ سڑکوں کی تعمیر کرائی، نہریں جاری کرائیں، کنویں کھدوائے، بڑی تعداد میں مہمان خانے اور شفا خانے بنوائے، یتیموں اور معذوروں کی پرورش اور کفالت کا حکومت کی طرف سے انتظام کیا۔

تعلیم کے میدان میں بھی اس کی خدمات ناقابل فراموش رہی۔ حفظ قرآن کو بہت رواج دیا۔ تعلیم قرآن کے حلقے لگوائے۔ اہل عجم کی سہولت کے لیے اسی دور میں حجاج بن یوسف نے قرآن شریف پر نقطے اور اعراب لگوائے۔

فن تعمیر سے ولید کی دلچسپی حیرت انگیز حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے ایسی تعمیری یادگاریں چھوڑیں جن پر آج بھی بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ ان میں دمشق کی جامع اموی بہت مشہور ہے، جس کی تعمیر کے لیے ہندوستان، فارس، مغرب اور روم وغیرہ مختلف ملکوں سے کاریگر اور تعمیر کا سامان منگایا گیا تھا۔ صرف جزیرہ قبرص سے اٹھارہ جہازوں پر سونا اور چاندی آیا تھا۔ قیصر روم نے علیحدہ منبت کاری کا سامان بھیجا تھا۔ سنگ مرمر اور سنگ سماق وغیرہ جن جن مقاموں کا مشہور تھا، وہاں سے منگایا تھا۔ یہ سامان اتنا قیمتی تھا کہ پتھر کے بعض ستونوں کی قیمت کئی کئی سو اشرفی تھی۔

بارہ ہزار مزدور کام کرتے تھے اور پورے آٹھ یا نو سال میں عمارت بن کر تیار ہوئی۔ یہ اتنی وسیع تھی کہ بیک وقت بیس ہزار آدمی سما سکتے تھے۔ پوری عمارت سنگ مرمر کی تھی جس میں مختلف رنگ کے پتھروں سے بوقلمونی پیدا کی گئی تھی۔ در و دیوار پر طلائی اور لاجوردی کام اور مختلف رنگوں کی منبت کاری تھی۔ نقش و نگار اور طغرے صنعتی نزاکت و نفاست کا بہترین نمونہ تھے۔ محرابوں میں تناسب کے ساتھ بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ چھت منقش ساج کی تھی۔ اوپر سے سیسہ کی چادر چڑھی ہوئی تھی۔

خارجی تزئین و آرائش کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ صرف چھ سو قندیلیں سونے کی زنجیروں میں آویزاں تھیں۔

غرض یہ عمارت عظمت و شان اور آرائش و زیبائش ہر لحاظ سے اس دور کے عجائبات میں تھی اور دنیا کی بڑی عمارتوں میں اس کا پانچواں نمبر شمار کیا جاتا تھا۔

اس نے مسجد نبوی کی بھی توسیع کرائی اور اس کی تعمیر میں بھی غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

2.4.7 سلیمان بن عبدالملک

ولید کے بعد سلیمان بن عبدالملک تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس کے دور میں بیرونی فتوحات تو کچھ زیادہ نہیں ہوئیں۔ البتہ اندرونی اصلاحات کی طرف اس نے مکمل توجہ دی۔ اس سے پہلے کے خلفائے بنی امیہ کے ذریعہ یہ ایک نئی بدعت شروع ہوگئی تھی کہ وہ نمازیں عموماً بہت تاخیر کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ سلیمان بن عبدالملک نے نمازوں کو اول وقت میں ادا کرنے کا سلسلہ پھر سے جاری کیا۔

سلیمان بن عبدالملک کا سب سے بڑا اصلاحی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے بعد ولیعہدی کے لئے اپنے کسی بیٹے کے بجائے حکومت وخلافت کی اہلیت رکھنے والے اور حکومت کو صحیح روش پر لانے والے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو نامزد کیا۔ جنھوں نے اپنے کارناموں کے ذریعہ خلافت راشدہ کے زمانہ کی یاد تازہ کردی۔ اسی وجہ سے سلیمان بن عبدالملک کو ''مفتاح الخیر'' یعنی ''بھلائی کی کنجی'' بھی کہا جاتا ہے۔ البتہ اس کے زمانہ کا یہ بہت افسوسناک واقعہ بھی ہے کہ اس نے ولید کے زمانہ کے مشہور سپہ سالار قتیبہ بن معلم ، محمد بن قاسم اور موسیٰ بن نصیر کو کچھ تو ان کی مطلق العنانی اور کچھ غلط فہمی کی بناء پر قتل کروادیا۔ جس کی وجہ سے اسلامی فتوحات کا سلسلہ جو ان سپہ سالاروں کی سرکردگی میں تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا وہ رک گیا اور عالم اسلام اپنے بہترین سپہ سالاروں سے محروم ہو گیا۔

2.4.8 حضرت عمر بن عبدالعزیز

سلیمان بن عبدالملک کے بعد اس کی وصیت کے مطابق حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے۔ یہ خلفاء بنوامیہ میں سب سے زیادہ نیک، عادل اور عوام کے خیرخواہ خلیفہ تھے۔ ان کا طرز حکومت خلفائے راشدین کے طرز حکومت کی طرح تھا۔

بنوامیہ کے حکمران اگرچہ بہت اچھے اور قابل لوگ تھے لیکن عوام اور رعایا پر ان کے زمانہ میں زیادتیاں بھی ہو رہی تھیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حکومت کو ایک جمہوری اور عوام پسند حکومت بنایا۔ ظلم وزیادتی کو بالکل ختم کردیا۔ بیت المال کو جو حکام کا ذاتی خزانہ سمجھا جانے لگا تھا اس کو رعایا اور عوام کی ملکیت قرار دیا۔ اموی دور حکومت میں خلفاء کے خاندان سے تعلق رکھنے والوں کو بڑی بڑی جاگیریں دے دی جاتی تھیں۔ آپ نے ان تمام جاگیروں کو ان سے واپس لیا اور مسلمانوں کی عام ملکیت میں شامل کردیا۔ ناجائز قسم کے جتنے بھی ٹیکس تھے سب ختم کردیے۔ ذمیوں اور غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ کیا۔ جزیہ کی وصولی میں جو بے احتیاطی ہو رہی تھی اس کو درست کرایا۔ دفتری اخراجات میں کمی کی۔ ہر معاملہ میں عدل وانصاف کو ہمیشہ مقدم رکھا۔

آپ نے رعایا کی خوشحالی اور رفاہ عام کے بڑے بڑے کام کیے۔ جگہ جگہ سڑکیں اور سرائے خانے بنوائے۔ دودھ پیتے بچوں کے لیے وظیفہ جاری کیا۔ غریب ونادار قرضداروں کے قرض کی ادائیگی کا انتظام فرمایا۔ مجبور ومعذور لوگوں کے لیے وظیفہ مقرر کیا۔ آپ کے زمانہ میں رعایا اس قدر خوشحال ہوگئی تھی کہ پورے پورے ملک میں صدقہ لینے والا مشکل سے ملتا تھا۔

معاشرہ میں جو غیر اسلامی اور غیر اخلاقی باتیں پیدا ہوگئی تھیں ان کو ختم کیا اور اسلامی اصول اپنانے کی تلقین کی۔ حمام میں عورتوں کے جانے پر پابندی لگائی۔ مردوں کو ننگے نہانے سے روکا۔

آپ نے علم کی اشاعت کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ علم حاصل کرنے والے طلبہ اور علمی خدمات انجام دینے والے علماء کے لیے وظیفے مقرر فرمائے۔ حدیث شریف کی حفاظت اور اشاعت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اپنے والیان حکومت کو حکم دیا کہ وہ اپنے علاقے کے علماء کے ذریعہ احادیث نبوی کو جمع کرنے کا اہتمام کریں۔ اس کے نتیجے میں احادیث کے کئی مجموعے مرتب ہوئے، امام زہری اور ابن حزم سے بھی احادیث کے مجموعے تیار کرائے۔ حضرت سعید بن المسیب سے کہہ کر قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھوائی اور حضرت عاصم بن عمر بن قتادہ سے سیرت ومغازی کا مجموعہ تیار کرایا۔ فن طب میں ایک یونانی طبیب کی کتاب کا ترجمہ نقل کرا کے مختلف صوبوں میں بھیجا تاکہ اس سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔

آپ کو حکومت کرنے کا بہت کم موقع ملا، صرف دو سال پانچ مہینے میں آپ نے یہ سب کارنامے انجام دیئے اور ۳۹ رسال کی عمر میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

2.4.9 یزید بن عبدالملک

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد سلیمان کی وصیت کے مطابق یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا۔ اس نے شروع میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے نظام سلطنت کو جاری رکھنا چاہا۔ لیکن چند دن بھی نہ گذرے کہ پھر وہی پرانا نظام چل پڑا۔

یزید کے دور میں ایک بڑا کام یہ ہوا کہ اس نے عراق کی آراضی کا از سر نو بندوبست کرایا جو حضرت عمر فاروقؓ کے بعد سے اب تک نہ ہوسکا تھا۔ اس کی مدت حکومت چار سال چار مہینے ہے۔

2.4.10 ہشام بن عبدالملک

یزید کے بعد ہشام بن عبدالملک خلیفہ بنا۔ اس نے بیس سال حکومت کی۔ وہ بڑا منتظم، بیدار مغز اور اولوالعزم حکمراں تھا۔ اس کے بعد اس پایہ کا حکمراں بنوامیہ میں کوئی نہ ہوسکا۔ اس کے دور حکومت میں مشرق و مغرب میں بڑے بڑے انقلابات وحوادث پیش آئے لیکن اس نے سارے حالات پر قابو پالیا۔ مشرق میں ترک وتاتار اور مغرب میں بربر کی طاقت وقوت کو ختم کیا۔ رومیوں کو ایسا سبق سکھایا کہ ان کو اسلامی حدود کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی پھر ہمت نہ ہوئی۔ خوارج نے سر اٹھانے کی کوشش کی تو ان کو بھی کچل دیا۔

ایشیائے کوچک میں رومیوں سے سخت معرکہ رہا۔ شمالی افریقہ کی بغاوتوں کو ختم کیا۔ مراکش کے جنوب میں سوڈان تک فوج کشی کی۔ اس کے زمانہ میں سندھ کا گورنر جنید بڑا باحوصلہ اور قابل آدمی تھا۔ اس نے کشمیر تک تمام علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کرلیا، مارواڑ، اجین، گجرات اور بھڑوچ تک کا علاقہ اس نے فتح کرلیا تھا لیکن بعد میں یہ علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے۔

ہشام کے زمانہ میں مسلمان اندلس سے گزر کر فرانس میں داخل ہوئے۔ انھوں نے وہاں کئی حملے کیے اور پیرس کے قریب ٹورس تک پہنچ گئے لیکن اسلامی فوج کا سپہ سالار امیر عبدالرحمٰن بن عبداللہ غافقی معرکے کے دوران شہید ہوگیا جس کے بعد مسلمانوں کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑا۔

ہشام نے ملک کے اندرونی انتظامات بھی بہتر بنائے۔ ویران علاقوں کو آباد کرنے میں اس نے بڑی دلچسپی لی۔ دفتری نظام کو مرتب کیا، فوج کے نظام کو مزید بہتر بنایا، نئے نئے قلعے تعمیر کرائے۔ بحری بیڑے کی ترقی کے لیے جہاز بنانے کے کارخانے قائم کیے۔

مذہبی اور علمی خدمات کے میدان میں بھی اس کا نمایاں کردار رہا۔ غلط عقائد کی اشاعت کا دروازہ بند کرایا۔ حدیث کا ایک مجموعہ بھی اس نے امام زہری سے تیار کرایا۔ ایرانیوں کے علوم وفنون اور سیاسی واقعات وحالات پر مشتمل ایک کتاب کا ترجمہ کرایا تھا جس سے اس کے علم وفن سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

2.4.11 ولید ثانی

ہشام کے بعد ولید بن یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا لیکن یہ نااہل قسم کا خلیفہ تھا۔ اس کے زمانہ میں حکومت کے انتظامات خراب ہوگئے، عربوں میں قبائلی عصبیت بڑھ گئی جس کے نتیجہ میں وہ خود مارا گیا۔ اس کی مدت خلافت ایک سال دو مہینے ہے۔

ولید کی زندگی اگرچہ رندی و سرمستی میں غرق رہا کرتی تھی لیکن اس کے بعض قابل ذکر اوصاف بھی تھے۔ اس نے حکومت کی جانب سے محتاجوں کی پرورش اور معذور اپاہجوں کی خدمت کا انتظام کیا تھا۔

شعروسخن کا اچھا ذوق رکھتا تھا۔ خود خوشگو شاعر تھا۔ خصوصاً خمریات میں اسے بڑا کمال حاصل تھا۔ ابونواس نے جو عربی زبان کا خیام سمجھا جاتا ہے، اپنے کلام میں ولید کے خمریات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ طبعاً بڑا فیاض اور سیر چشم تھا۔ شعراء کی قدردانی میں اس کی فیاضی اسراف کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔

2.4.12 یزید ثالث

ولید ثانی کے بعد یزید ثالث خلیفہ ہوا۔ اس کو یزید الناقص بھی کہتے ہیں کیوں کہ اس نے فوج کی تنخواہ گھٹا دی تھی۔ یہ ایک نیک انسان تھا لیکن چھ مہینے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اور کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہ دے سکا۔

2.4.13 ابراہیم بن ولید

یزید ثالث کے بعد اس کا بھائی ابراہیم جانشین ہوا لیکن اس وقت شاہی خاندان میں سخت قسم کی خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ مروان بن محمد نے جو عبدالملک کا بھتیجا تھا ابراہیم کو شکست دی اور خود خلیفہ بن گیا۔ لوگوں نے بھی اس کو خلافت کا مستحق سمجھا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

2.4.14 مروان بن محمد

مروان بن محمد بنوامیہ کا آخری تجربہ کار اور باصلاحیت خلیفہ تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ اس نے ایسے حالات میں کاروبار خلافت سنبھالا جب بنوامیہ کی حکومت زوال پذیر تھی۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن حالات کو بدل نہ سکا۔ جگہ جگہ شورش اور بغاوت ہو رہی تھی، اموی خاندان میں خود آپسی لڑائیاں زور و شور سے چل رہی تھیں۔ دوسری طرف بنوامیہ کے حریف بنوعباس بہت مضبوط ہو چکے تھے اور ان کو ابومسلم خراسانی کی شکل میں ایک انقلابی شخص مل گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنوعباس کے مقابلہ میں بنوامیہ ٹک نہ سکے اور اخیر میں مروان بن محمد مصر کے مقام بوصیر میں مارا گیا۔ اس کے بعد اموی حکومت کا چراغ گل ہو گیا اور بنوعباس نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی، یہ واقعہ 26/ذی الحجہ 132ھ مطابق 5/اگست 750ء میں پیش آیا۔

معلومات کی جانچ

1. ولید بن عبدالملک کے کارناموں پر روشنی ڈالیے۔
2. حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت کی خوبیاں بیان کیجئے۔

2.5 اموی دور میں مملکت کی وسعت

خلافت بنی امیہ کے زمانہ میں فتوحات کی بہت کثرت ہوئی، جس کی وجہ سے اسلامی مملکت کی سرحدیں اس قدر پھیل گئی تھیں کہ

ایرانی اور رومی بھی اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں اتنی بڑی سلطنت حاصل نہیں کر سکے تھے۔

مشرق میں ایران، افغانستان، ترکستان اور سندھ تک اس کی حدیں پہونچ چکی تھیں۔ مغرب میں پورا شمالی افریقہ اسلامی مملکت کے دائرہ میں آچکا تھا۔ جہاں قیروان نامی ایک شہر بھی بسایا گیا تاکہ اس کو چھاؤنی بنا دیا جائے اور وہیں سے اس علاقہ کا بندوبست کیا جائے اور یہاں کے بربروں کی بغاوتوں کو بھی یہیں سے کنٹرول کیا جاسکے۔ اسی طرح اسلامی فوجیں اس زمانہ میں اندلس سے آگے بڑھکر فرانس تک پہنچ چکی تھیں۔ ایک انگریز مؤرخ کے بقول ''پیمبر عرب کا نام خدائے قادر کے نام کے ساتھ ساتھ جنوبی و مغربی یورپ، شمالی افریقہ اور وسطی و مغربی ایشیا کے ہزاروں میناروں سے دن میں پانچ وقت پکارا جاتا تھا''۔

اسلامی مملکت کی اس قدر توسیع بنوامیہ کا ایسا کارنامہ ہے جو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

2.6 خلاصہ

41ھ مطابق 661ء میں حضرت حسنؓ نے جب حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبرداری کا اعلان کیا اور حضرت امیر معاویہؓ مسلمانوں کے خلیفہ ہوئے اس وقت اموی حکومت کا قیام عمل میں آیا جو تقریباً نوے سال تک چلتی رہی۔ بنوامیہ کا دورِ حکومت خلافت راشدہ کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا البتہ فتوحات کی وسعت، مملکت اسلامیہ کے نظم و نسق، تہذیب و تمدن کے ارتقاء اور علوم و فنون کی بنیادیں رکھنے کے اعتبار سے یہ تاریخ کا ایک اہم زمانہ سمجھا جاتا ہے۔

اموی حکومت میں چودہ خلفاء ہوئے۔ جن میں تین حضرت امیر معاویہؓ کے خاندان سے تھے۔ بقیہ مروان کے خاندان کے تھے۔ ان سب کو بنوامیہ کہا جاتا ہے۔

حضرت امیر معاویہ کے زمانہ میں سندھ، ترکستان اور شمالی افریقہ کا بڑا حصہ فتح ہوا۔ قسطنطنیہ پر بھی فوج کشی کی گئی لیکن کامیابی نہیں مل سکی۔ بحری فوج آپ ہی کے زمانہ میں مرتب ہوئی۔ جہاز بنانے کا کارخانہ بھی اس زمانہ میں قائم ہوا۔ آپ نے دمشق کو اپنا دارالخلافہ بنایا تھا۔ آپ نے وفات سے پہلے اپنے بیٹے یزید کی ولیعہدی کی بیعت لی تھی جو ایک نئی چیز تھی۔

یزید کی خلافت کے دور میں حضرت حسینؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا جو اس کے دامن کا بدنما داغ ہے۔ عبدالملک اور ولید کے زمانہ میں فتوحات کی بہت کثرت ہوئی۔ ساتھ میں عوام کی فلاح و بہبود کے بہت کام ہوئے۔ ولید کو فن تعمیر سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ دمشق کی جامع اموی اس کی بہترین یادگار ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز بنوامیہ کے خلفاء میں سب سے زیادہ نیک اور عادل خلیفہ ہوئے جن کے کارناموں کو دیکھ کر لوگ خلافت راشدہ کا زمانہ یاد کرنے لگے تھے۔ ہشام کا زمانہ بھی فوجی، سماجی، مذہبی اور علمی خدمات کی وجہ سے ممتاز زمانہ ہے۔ اس کے بعد بنوامیہ کی حکومت زوال کی شکار ہوئی اور بالآخر اموی خاندان کا آخری حکمراں مروان بن محمد قتل کیا گیا اور بنوامیہ کی جگہ بنوعباس تخت خلافت کے وارث ہوئے۔

بنوامیہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی فتوحات کے ذریعہ اسلامی مملکت کے حدود کو اس قدر پھیلا دیا تھا کہ بقول ایک انگریز مؤرخ ''پیمبر عرب کا نام خدائے قادر کے نام کے ساتھ جنوبی و مغربی یورپ، شمالی افریقہ اور وسطی و مغربی ایشیا کے ہزاروں میناروں سے دن میں پانچ وقت پکارا جاتا تھا''۔

2.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. حضرت امیر معاویہؓ کے حالات اور کارناموں پر روشنی ڈالیے۔
2. ہشام بن عبدالملک کے دور خلافت پر روشنی ڈالیے۔
3. اموی حکومت میں اسلامی فتوحات کا کیا حال تھا؟ بیان کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کا پندرہ پندرہ سطروں میں جواب لکھیے۔

1. سلیمان بن عبدالملک کو ''مفتاح الخیر'' کیوں کہا جاتا ہے؟ لکھیے
2. حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور حکومت پر روشنی ڈالیے۔
3. اموی حکومت کیسے ختم ہوئی؟ بیان کیجیے۔

2 8 فرہنگ

تدارک	تلافی
منجنیق	ایک آلہ جس سے بڑے بڑے پتھر پھینکے جاتے تھے
بوقلمونی	رنگارنگی
حمام	غسل خانہ
آراضی	زمین
خانہ جنگی	آپس کی لڑائی

2.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. تاریخ اسلام	شاہ معین الدین ندوی
2. تاریخ اسلام	اکبر شاہ نجیب آبادی
3. ہماری بادشاہی	مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی
4. تاریخ الامت	محمد اسلم جیراجپوری
5. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ	ثروت صولت

اکائی نمبر 3 : اموی دور میں نظام حکومت

اکائی کے اجزاء

3.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھکر طلبہ بنوامیہ کے دائرہ حکومت سے واقف ہو جائیں گے۔ نیز ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اموی حکومت میں نظم ونسق کی کیا صورت تھی؟ دفاعی اور مالیاتی نظام کیسا تھا، عدل وانصاف کے تقاضے کیسے پورے کئے جاتے تھے؟ نیز اس زمانہ میں تعلیمی، معاشی اور تمدنی احوال کیسے تھے۔ بنوامیہ کے دور حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ کیسے تعلقات تھے اوران کے ساتھ کیسا رویہ اپنایا جاتا تھا۔

3.2 تمہید

اس اکائی میں بنو امیہ کے دائرہ حکومت پر روشنی ڈالی جائے گی ۔ نیز بنو امیہ کے دور حکومت میں مملکت اسلامیہ کی مجموعی صورتحال کیا تھی ۔تعلیمی وتہذیبی اعتبار سے کیا کیا ترقیاں ہوئیں ۔ان کا مالیاتی اور دفاعی نظام کیسا تھا۔ان سب سے بحث کی جائے گی ، نیز ان کے سماجی ومعاشرتی حالات اور غیر مسلموں کے ساتھ ان کے رویہ اور تعلقات پر بھی روشنی ڈالی جائے گی ۔

3.3 بنوامیہ کا دائرہ حکومت

اموی دور میں فتوحات کو جس قدر وسعت ہوئی ، اسلام کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی ۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں اگرچہ اسلام کی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا تاہم یہ حدود عرب ، دیار شام اور مصر وایران سے آگے نہ بڑھ سکی تھیں ۔لیکن خلافت بنی امیہ کے دور میں مشرق میں سندھ ، چین اور ترکستان تک ، شمال میں بحر خزر ، آذر بائیجان اور بلاد روم تک اور مغرب میں اندلس تک اس کا دائرہ پھیل گیا تھا۔

خلافت بنوامیہ کا زمانہ تہذیب وتمدن ، عدل وانصاف اور علم وہنر کے اعتبار سے تاریخ کا ایک یادگار زمانہ ہے۔اس میں حکومت کے نظم ونسق کو بہتر بنایا گیا۔دفاعی اور فوجی نظام کو ترقی دی گئی ۔تعلیم کے میدان میں پیش رفت ہوئی۔سماجی ومعاشرتی حالات بہتر ہوئے ۔ذیل میں ان سب کی تفصیلات دی جارہی ہیں ۔

3.4 نظم ونسق

بنوامیہ کی حکومت کا دائرہ بہت وسیع تھا اس لیے سہولت کی خاطر نظم ونسق کو دو بنیادی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

(1) مرکزی انتظامیہ (2) صوبائی انتظامیہ

مرکزی انتظامیہ:

مرکزی انتظامیہ کا براہ راست تعلق خلیفہ سے تھا۔جس کے تحت چند بنیادی محکمے تھے جو خلیفہ کی ماتحتی میں امور مملکت انجام دیتے ۔ان میں اہم محکمے یہ تھے :

(1) دیوان الخاتم (دفتر کتابت یعنی سکریٹریٹ)

اس محکمے کا سربراہ کاتب یعنی چیف سکریٹری کہلاتا تھا۔خلیفہ کی ڈاک دیکھنا ، اس کی طرف سے فرمان جاری کرنا اور ان فرامین پر مہر لگانا اس محکمے کی اہم ذمہ داری ہوتی ۔اس کا ایک کام یہ بھی تھا کہ خلیفہ کی طرف سے جو احکام وفرامین جاری کیے جاتے ان کی نقل رکھنے کا اہتمام کیا جائے ، تاکہ ان احکام میں کسی طرح کے ردوبدل کا امکان نہ رہے ۔

(2) دیوان القضاء (محکمہ انصاف/ عدالت)

اس شعبہ کا سربراہ قاضی کہلاتا تھا۔ جو اپنے محکمے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ دار الخلافہ کے قاضی کو خلیفہ خود منتخب کرتا تھا۔ فیصلہ کرنے میں قاضی کو پورا اختیار حاصل رہتا، قاضیوں کی تنخواہیں بھی اچھی ہوا کرتیں تھیں۔ اوقاف اور یتیموں کے مال کی نگرانی بھی کبھی کبھی ان کے ذمہ کر دی جاتی تھی۔

(3) دفتر خراج (محکمۂ مالیات)

اس محکمہ کے تحت حکومت کی آمدنی وخرچ کا حساب ہوتا تھا۔ دفتر کی زبان ایران میں فارسی، شام میں سریانی اور مصر میں قبطی تھی، اموی خلیفہ عبدالملک کے زمانہ میں دفتری زبان عربی قرار پائی۔

(4) دیوان البرید (محکمۂ ڈاک)

اس محکمہ کے تحت پورے ملک میں خبررسانی اور خطوط پہنچانے کا ایک تیز رفتار نظام بنایا گیا تھا۔ بارہ بارہ میل پر چوکیاں قائم کی گئیں جہاں تیز رفتار گھوڑے موجود ہوتے جن کے ذریعے خبررسانی میں آسانی ہوتی۔ پہلے اس شعبہ کے تحت سرکاری ڈاک کی ترسیل ہوتی تھی۔ پھر عوام کو بھی اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا گیا۔ اس شعبہ کا ایک اعلیٰ افسر ہوتا جو پورے نظام کی دیکھ بھال کرتا اور وہی خلیفہ کو تمام حالات سے باخبر بھی رکھتا۔

(5) دیوان الجند (دفتر فوج)

بنوامیہ کی بڑھتی ہوئی فتوحات کے پیش نظر اس محکمے کو بہت فعال اور منظم کیا گیا۔ جب فتوحات کی وسعت کی وجہ سے فوجیوں کی تعداد میں کمی محسوس کی گئی تو اموی حکمران عبدالملک نے جبری فوجی بھرتی کا قانون بنایا تاکہ فوجیوں کی کمی نہ ہو سکے۔ فوج میں عربی عنصر زیادہ تھا۔ افریقہ اور اندلس کی فتح کے بعد بربر قوم سے بھی فوجی خدمات لی گئیں۔

(6) حاجب

یہ عہدہ بنوامیہ کے زمانہ میں قائم کیا گیا۔ حاجب ایک اعلیٰ عہدے دار ہوتا جو خلیفہ اور رعایا کے درمیان واسطے کا کام کرتا تھا۔ اس عہدے پر فائز شخص کو حاجب کہا جاتا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر کوئی شخص خلیفہ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے انتخاب میں خلفاء بڑی دوراندیشی سے کام لیتے تھے۔ عبدالملک بن مروان نے اپنے بھائی عبدالعزیز گورنر مصر کو نصیحت کی تھی کہ دیکھو! حاجب کے فرائض اپنے اہل ترین آدمی کے سپرد کرنا، وہ تمہاری زبان اور دل ودماغ ہے، اسے ہدایت کرنا کہ وہ ملاقات کے خواہش مند کے مرتبے، پورے حالات اور ضروریات کی اہمیت سے پہلے آگاہ کرے اس کے بعد اگر تم ضرورت سمجھو تو بلالو ورنہ واپس کردو۔

(7) دیوان المستغلات

غلہ اور دوسری پیداوار کے انتظام کا محکمہ، اسی طرح پولیس اور جیل وغیرہ جیسے دیگر محکمے بھی تھے جو سرگرم عمل رہا کرتے تھے۔

صوبائی انتظامیہ:

اموی عہد حکومت میں نظم ونسق کو بہتر بنانے کے لیے پوری مملکت کو چھ صوبوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہر صوبے میں ایک صوبے دار (والی) مقرر کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ایک ہی صوبے دار کئی صوبوں کا ذمہ دار اور والی ہوتا۔ صوبوں کی تقسیم حسب ذیل تھی۔

1. حجاز: اس صوبہ میں مکہ، مدینہ، طائف وغیرہ کے شہر تھے۔ یمن کو کبھی حجاز کے ساتھ ملحق کر دیا جاتا تھا اور کبھی وہاں ایک مستقل امیر ہوتا۔
2. عراق: اس صوبہ میں کوفہ سے لے کر مشرقی حدود تک کا علاقہ شامل تھا۔ خراسان بھی اس کے ماتحت تھا۔ یمامہ کے علاقے کبھی حجاز میں شامل کر دیئے جاتے اور کبھی عراق میں۔
3. جزیرۂ آرمینیہ: اس میں موصل سے لے کر آذربائیجان اور آرمینیہ تک کا تمام علاقہ شامل تھا۔
4. شام: اردن، حمص، دمشق، قنسرین وغیرہ پر مشتمل تھا۔
5. افریقہ: طرابلس، تیونس، الجزائر، مراکش پر مشتمل تھا، اس میں اسپین، جنوبی فرانس اور بحر روم کے جزائر بھی شامل تھے، ان سب کا صدر مقام قیروان تھا۔
6. مصر: مصر کے دونوں علاقے (مصر زیریں اور مصر بالا) ایک ہی والی کے ماتحت ہوتے تھے۔

ہر صوبے کا والی اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوتا تھا۔ صرف بیرونی اور سیاسی امور میں خلیفہ سے اسے اجازت لینی پڑتی تھی۔

معلومات کی جانچ

1. بنو امیہ کا دائرۂ حکومت بیان کیجیے۔
2. حاجب کسے کہتے ہیں؟ اور اس عہدہ کی کیا اہمیت تھی؟

3.5 دفاعی وفوجی نظام

اموی حکومت کا دفاعی نظام بہت مستحکم اور مضبوط تھا۔ چین کے علاوہ کوئی ملک اس زمانہ میں اس کے دفاعی نظام کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اموی حکمراں بیک وقت دو دو لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ فوج میدان جنگ میں اتار سکتے تھے۔ اتنی بڑی تعداد میں اس وقت دیگر ممالک کے پاس فوجیں نہیں تھیں۔ بنو امیہ کی فوجی تنظیم بھی اعلی پیمانے پر تھی۔ جدید ترین اسلحہ ان کے پاس ہر وقت موجود رہتا تھا۔

بنو امیہ کی حکومت میں بحری طاقت میں بھی بیحد اضافہ ہوا۔ مسلمانوں کے پاس جہاز بنانے کے بڑے بڑے کارخانے موجود تھے۔ سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ میں قسطنطنیہ پر جب حملہ کیا گیا اس وقت اس میں اٹھارہ سو جہاز استعمال کیے گئے تھے، اتنی بڑی تعداد میں شاید ہی جہازوں نے کسی بحری مہم میں حصہ لیا ہو۔

تیر کمان، تلوار اور برچھا تو عام ہتھیار تھے ہی، بھاری قلعوں کو توڑنے کے لیے تین قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، جن کے نام تھے: عرادہ، منجنیق، دبابہ۔

محمد بن قاسم نے دیبل پر جو منجنیق استعمال کی تھی اس کو پانچ سو آدمی مل کر چلاتے تھے۔

کسی ملک پر حملہ کرتے وقت پوری فوج پانچ بنیادی بازوؤں پر مشتمل ہوا کرتی تھی، مقدمہ، میمنہ، میسرہ، مؤخرہ/ ساقہ، قلب لشکر۔

فوجوں میں کچھ پیدل فوج ہوتی کچھ شہسوار اور کچھ تیر انداز۔

فوج کی دو قسمیں ہوتیں۔ (1) مستقل فوج (2) رضا کار فوج

مستقل فوج کو اچھی تنخواہ دی جاتی۔ ان کے قیام کے لیے مختلف علاقوں میں چھاؤنیاں ہوتیں۔ خراسان میں مرو، افریقہ میں برقہ اور قیروان اہم چھاؤنی کے طور پر آباد تھے۔ جہاں فوجوں کے ساتھ جنگی سامان بھی ہر وقت مہیا رہتے۔

معلومات کی جانچ

1. بنو امیہ کی بحری طاقت پر روشنی ڈالیے۔

2. اموی دور حکومت کے ہتھیار کیا کیا تھے؟

3.6 مالیاتی نظام

بنو امیہ کا مالیاتی نظام مستحکم تھا۔ ان کے عہد میں حکومت کی آمدنی کے اہم ذرائع یہ تھے:

خراج (غیر مسلموں سے زرعی زمین پر لیا جانے والا محصول) جزیہ (غیر مسلموں کی جان و مال کے تحفظ کے لیے لیا جانے والا محصول) زکاۃ (یہ مسلمانوں سے لی جاتی) مال غنیمت، عشر (زمین کا ٹیکس) خمس (مال غنیمت کا پانچواں حصہ جو حکومت کے خزانہ میں جمع کیا جاتا)۔

اموی دور میں فتوحات کی کثرت کی وجہ سے آمدنی میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ حضرت امیر معاویہؓ کے بعد یہ نظام بنا کہ ہر صوبے کی آمدنی وہیں صرف کی جائے اور مرکزی حکومت جس کا پایۂ تخت دمشق تھا اس کا دار و مدار شام کی آمدنی پر رکھا گیا۔ لیکن یہ حکم دیا گیا کہ ہر صوبے کی آمدنی میں سے ایک خاص رقم مرکزی خلافت کے لیے دمشق کے بیت المال میں بھیجی جائے۔

مذکورہ ذرائع آمدنی کے علاوہ تحفہ تحائف، شادی بیاہ کے موقع پر نکاح خوانی کی اجرت، مہرجان و نوروز کے ہدایا، سرکاری کاغذات کی تیاری پر اسٹامپ فیس جیسے محصول سے بھی ان کی آمدنی میں اضافہ ہوتا تھا۔

بنو امیہ نے خراج کی وصولی کا نظم اعلیٰ پیمانہ پر کیا تھا۔ اس کے لیے ایماندار افسر مقرر کرتے۔ اگر کسی افسر کی کوئی شکایت ملتی تو بڑی باریک بینی سے اس کی تحقیق کی جاتی اور بدعنوانی ظاہر ہونے پر ایسے افسروں کو برطرف کر دیا جاتا۔

جزیہ جو ذمیوں سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے لیے لیا جاتا ہے وہ اسلام لانے پر معاف ہو جاتا، جزیہ کی رقم بہت معمولی ہوتی، نیز غریبوں، بیکسوں، بے بسوں، معذوروں، عورتوں، بچوں اور راہبوں سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ جزیہ وصول کرنے میں عدل وانصاف اور نرمی کا برتاؤ کیا جاتا۔

عشر، زکاۃ، خمس وغیرہ کے کچھ اصول تھے جن کے مطابق یہ حاصل کیے جاتے۔

معلومات کی جانچ

1. حکومت کے ذرائع آمدنی بیان کیجئے۔

2. ذمیوں سے جزیہ کیوں لیا جاتا ہے؟ بیان کیجئے۔

3.7 نظام قضاء

بنو امیہ کے زمانہ کا نظام قضاء خلفائے راشدین کے زمانہ ہی کی طرح تھا۔ دار الخلافہ کے لیے خود خلیفہ قاضی مقرر کرتا اور دوسرے صوبوں کے لیے وہاں کے والی اور صوبے دار قاضیوں کا تقرر کرتے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ خود دار الخلافہ سے ہی قاضی مقرر کر کے وہاں بھیج دیئے جاتے۔ یہ قاضی کتاب وسنت کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرتے۔ اوقاف اور یتیموں کے مال کی نگرانی بھی ان کے ذمہ ہوتی۔ البتہ شرعی حدود کا اجراء یعنی قصاص میں کسی کو قتل کرنے یا چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنے کا حکم دینا خلفاء و امراء کے اختیار میں ہوتا۔

3.8 معاشی وتمدنی احوال

بنی امیہ کے دور میں معاشی وتمدنی ترقی بھی بہت ہوئی۔ معاشی خوشحالی کا یہ حال تھا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور حکومت میں لوگ اشرفیوں کی تھیلیاں لیکر نکلتے تھے اور صدقہ لینے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ زیاد وحجاج وغیرہ ظلم وسفا کی میں بدنامی کی حد تک مشہور ہو چکے تھے لیکن ان کی یہ تمام سختیاں اور زیادتیاں اپنے مخالفوں کے ساتھ ہوتیں۔ عوام اور رعایا کی فکر ان کو بھی ایسی تھی کہ زیاد نے کوفہ میں اعلان کر دیا تھا کہ جس کا جس قدر مال چوری ہو جائے وہ مجھ سے آ کر وصول کرے۔ اس کے عہد میں امن وامان کا یہ حال تھا کہ کوفہ میں لوگ راتوں کو بھی اپنے مکانوں کا دروازہ بند کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے تھے۔

اموی حکومت میں تمدنی ترقی زندگی کے تمام شعبوں میں نمایاں ہوئی۔ رفاہ عام اور رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے تمام ضروری اقدامات کئے گئے۔ خلفائے بنی امیہ نے ملکوں کو ترقی کے راستہ پر لگایا۔ آبپاشی کے ذرائع کو بہت وسعت دی۔ نہریں کھدوائیں، کنویں کھدوائے۔ حوض وتالاب بنوائے، امیر معاویہ نے پہاڑوں کی بعض گھاٹیوں کے گرد بند بندھوا کر ان کو بھی تالاب کی صورت میں بدل دیا جس سے پیداوار میں کافی ترقی ہوئی۔ سلیمان بن عبد الملک نے آب شیریں کا چشمہ جاری کیا۔ بنی امیہ کے عمال نے بصرہ میں کثرت سے نہریں کھدوائیں۔ ملک کے مختلف علاقوں میں متعدد سڑکیں بنائی گئیں۔ بڑے بڑے شہروں کو سڑک کے ذریعہ

دارالخلافہ دمشق سے جوڑا گیا تاکہ آمدورفت میں آسانی رہے۔ ولید بن عبدالملک نے مختلف شہروں کے راستے درست کرائے۔ ان پر میل کے نشانات (سنگ میل) پتھر نصب کرائے۔ راستوں کی حفاظت کا سامان کیا۔ مسافروں کے لئے سرائیں بنوائیں۔ شہروں میں مہمان خانے اور شفا خانے بنوائے۔

اسی طرح بنوامیہ کے عہد حکومت میں متعدد نئے شہر بھی بسائے گئے۔ حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ میں افریقہ میں ایک نیا شہر قیروان کے نام سے آباد کیا گیا۔ زیاد بن ابی سفیان نے خراسان کی سرحد پر عربوں کی مستقل آبادی قائم کی۔ عبدالملک کے زمانہ میں کوفہ اور بصرہ کے درمیان ایک نیا شہر واسط بنایا گیا۔ سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ میں رملہ شہر آباد کیا گیا جو خلیفۂ وقت کا دوسرا پایۂ تخت تھا۔ ہشام نے رصافہ آباد کیا جو اس کا دوسرا دارالحکومت قرار پایا تھا۔

تعمیرات کے اعتبار سے بھی اس دور میں نمایاں ترقی ہوئی۔ امیر معاویہ نے اپنے دور میں شاندار عمارتیں بنوائیں وہ اپنی نو تعمیر عمارتوں کے بارے میں لوگوں کی رائے بھی معلوم کرتے تھے۔ امیر معاویہؓ نے تعمیرات میں مٹی کی جگہ پتھروں کا استعمال شروع کر دیا تھا اور رفتہ رفتہ سنگ مرمر اور موزیک کا استعمال بھی تعمیرات میں شروع ہو گیا تھا۔ امیر معاویہؓ کے زمانے میں بصرہ، کوفہ اور فسطاط (مصر) میں پختہ اور شاندار مسجدیں بھی تعمیر کی گئیں۔

بصرہ کی جامع مسجد اور دارالامارت وہاں کے گورنر زیاد نے تعمیر کرائے تھے۔ بصرہ کی اس مسجد کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ پتھر کے ستون استعمال کیے گئے۔ اس مسجد میں ایک مینار بھی بنایا گیا تھا جو غالباً اسلامی دنیا کا پہلا مینار تھا۔ کوفہ کی جامع مسجد زیاد نے ایک ایرانی معمار سے بنوائی تھی۔ اس میں ساٹھ ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے تھے۔ امیر معاویہؓ کے زمانہ میں مصر کی جامع مسجد عمرو بن عاص میں توسیع کی گئی اور اس میں چار میناروں کا اضافہ کیا گیا۔

عبدالملک بن مروان نے بیت المقدس میں قبۃ الصخرۃ تعمیر کرائی جو فن تعمیر کا ایک یادگار نمونہ ہے۔ اس کے لڑکے ولید بن عبدالملک نے مدینہ کی مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع بڑے پیمانہ پر کرائی اور دمشق کی جامع مسجد تو اس کی بہترین یادگار ہے۔ اس مسجد کی تعمیر میں سنگ مرمر کثرت سے استعمال کیا گیا تھا۔ مسجد میں روشنی کے لئے چھ سو قندیلیں سونے کی زنجیروں سے آویزاں تھیں۔ روم کے سفیر نے جب اس کو دیکھا تھا تو اس نے کہا تھا کہ ''ہم لوگ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا عروج چند روزہ ہے۔ لیکن اس عمارت کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ مسلمان ایک زندہ رہنے والی قوم ہے''

اسی زمانہ میں مکہ معظمہ میں روئی سے کاغذ بنانے کا کارخانہ قائم کیا گیا۔ موسیٰ بن نصیر فاتح افریقہ نے مغرب کے علاقوں میں کتاب وغیرہ سے کاغذ بنانے کا طریقہ رائج کیا۔ بعض جگہوں پر ریشم سے بھی کاغذ تیار کرنے کا کارخانہ بنایا گیا۔ اس زمانہ میں صنعتی ترقی بھی خوب ہوئی۔ اسلحہ سازی، جہاز سازی، ظروف سازی اور کپڑے کی صنعت نے کافی ترقی کی۔

زراعت کے فن کو ترقی دینے میں اموی خلفاء کا بڑا کردار رہا۔ نہروں کی تعمیر سے زراعت کو بہت فائدہ پہنچا۔ ویران زمینوں کو آباد کر کے پیداوار کو بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ حجاج بن یوسف نے کھیتی باڑی کی سہولت کے لیے یہ حکم دیا تھا کہ بیلوں کو بالکل ذبح نہ کیا جائے تاکہ ان کی کمی سے زراعت متاثر نہ ہو۔

تجارت کو بھی اس زمانہ میں فروغ حاصل ہوا۔ قریبی ممالک کے ساتھ تجارتی روابط قائم ہوئے۔ تقریباً تمام شہروں میں تجارت کی بڑی بڑی منڈیاں قائم تھیں جن سے تجارت کو استحکام حاصل ہوا۔

معلومات کی جانچ

1. عہد اموی کے نظام قضاء پر روشنی ڈالیے۔

2. عہد اموی کے تعمیراتی کارنامے بیان کیجئے۔

3.9 تعلیمی حالات

اموی دور میں اسلامی علوم وفنون کی ترتیب وترویج اور ترقی واشاعت کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ اس دور کے ابتدائی حصے میں صحابۂ کرام نے علم دین کی اشاعت کی۔ رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ کو فروغ دیا جن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم کے نام نمایاں ہیں۔ بعد کے دور میں تابعین نے اس ذمہ داری کو سنبھالا جن میں چند نام یہ ہیں:

1. سعید بن مسیّب:

یہ بڑے محدث اور فقیہ تھے، سید التابعین ان کا لقب تھا، شعر وسخن سے بھی شغف رکھتے تھے۔

2. عروہ بن زبیر:

یہ مغازی یعنی عہد رسالت کی جنگوں کی تاریخ پر سب سے زیادہ عبور رکھتے تھے۔

3. حسن بصری:

یہ جامع العلوم تھے، ان کی تقریریں ادب عالیہ کا نمونہ ہیں۔

4. مجاہد بن جبیر:

یہ حدیث اور فقہ کے امام تھے۔

5. شعبی:

ان کو قرآن، حدیث اور فقہ کے علاوہ مغازی، ریاضی، ادب اور شاعری میں بھی مہارت حاصل تھی۔

6. امام زہری:

یہ اپنے دور کے سب سے بڑے مصنف تھے۔ احادیث کو جمع کرنے میں ان کا بڑا کردار ہے۔ انہوں نے مدینہ کے ایک ایک گھر میں جا کر مردوں اور عورتوں سے احادیث نبوی ﷺ اور اقوال صحابہ جمع کیے اور قلم بند کیے۔

7. قتادہ:

یہ تفسیر اور حدیث کے علاوہ لغت، ایام عرب یعنی اسلام سے پہلے کی تاریخ اور انساب کے ماہر تھے۔

8. مکحول:

یہ فقہ کی اولین کتابوں کے مصنف ہیں۔ حدیث کی تلاش کے لیے بڑی جدوجہد کی۔

9. یزید بن حبیب:

یہ مصر کے قاضی القضاۃ تھے۔ علوم شرعیہ کے ساتھ تاریخ مصر پر گہری نظر رکھتے تھے۔

10. حماد الراویہ:

یہ عربوں کی قدیم تاریخ، انساب اور اشعار کے ماہر تھے۔

11. عیسی بن عمر نحوی:

یہ عربی صرف ونحو کے بانی خلیل اور سیبویہ کے استاد تھے۔

ان کے علاوہ خاندان نبوت کے تین بڑے عالم اور بزرگ امام زین العابدینؒ، امام باقر اور امام جعفر صادقؒ بھی اسی دور سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا گھر مدینہ میں علم کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

قرآن مجید پر اعراب بھی اسی زمانہ میں لگایا گیا۔ حفظ قرآن کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ اس پر بڑی رقم بھی خرچ کی جاتی تھی۔

فن قراءت کے سات مشہور قراء نے اسی دور میں اس فن کی خدمت انجام دی جن کو قراء سبعہ کہا جاتا ہے، ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

1. ابو عبدالرحمٰن نافع متوفی 169ھ (مدینہ)۔
2. ابو معبد عبداللہ متوفی 120ھ (مکہ)۔
3. ابو عمرو بن العلا متوفی 154ھ (بصرہ)۔
4. ابو عمران عبداللہ متوفی 118ھ (دمشق)۔
5. ابو بکر عاصم متوفی 127ھ (کوفہ)۔
6. ابو عمارہ حمزہ متوفی 157ھ (کوفہ)۔
7. ابو الحسن علی متوفی 189ھ (کوفہ)۔

تفسیر کا فن بھی اسی زمانہ میں مدون ہوا۔ عبدالملک کے حکم سے سعید بن جبیر نے تفسیر کی پہلی کتاب لکھی۔

حدیث کے مجموعے اس زمانہ میں کثرت سے تیار ہوئے۔ حضرات تابعین نے پوری احتیاط کے ساتھ احادیث کی حفاظت واشاعت کا انتظام کیا اور جمع وتدوین اور درس وتعلیم کے ذریعہ ان کو پھیلایا۔ بعض جامعین حدیث کے نام یہ ہیں:

1. خالد بن معدان: ان کے پاس حدیثوں کا ایک صحیفہ تھا۔
2. عطاء بن ابی رباح: انھوں نے اپنی تمام سنی ہوئی حدیثوں کو قلم بند کر لیا تھا۔
3. حضرت عبداللہ بن مسعود کے پڑپوتے عبدالرحمٰن: ان کے پاس ان کی احادیث کا صحیفہ تھا۔
4. سلیمان بن قیس: انھوں نے صحابی رسول حضرت جابرؓ کا صحیفہ نقل کیا تھا۔
5. سمرہ بن جندب: ان کے پاس حدیثوں کا ایک مجموعہ تھا۔
6. وہب بن منبہ: ان کے پاس حدیث کی بیاضیں تھیں۔
7. امام زہری: خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے ان سے چار سو حدیثوں کا ایک مجموعہ مرتب کرایا تھا۔

حدیث کی تدوین اور اشاعت میں سب سے بڑا کارنامہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ہے۔ انھوں نے علماء سے حدیثوں کے مجموعے مرتب کرائے اور ان کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ میں شائع کیں۔ اس طرح اس زمانہ میں حدیثوں کی تدوین کا آغاز ہوا۔

مغازی کے موضوع پر مستقل تالیف بھی اسی زمانہ میں وجود میں آئی۔ نحو وصرف اور لغت اور تاریخ کی طرف بھی پوری توجہ دی گئی۔

طب کی متعدد کتابوں کا عربی میں اسی زمانہ میں ترجمہ ہوا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسرائیلی طبیب ماسرجویہ سے یونانی مصنف اہرن کی قرابادین کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ ہشام نے ایران کی تاریخ اور ایرانی علوم سے متعلق ایک کتاب کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ ایک اموی شہزادہ خالد بن یزید نے یونانیوں سے فلسفہ، طب اور علم کیمیا کی تعلیم حاصل کی اور خود بھی علم کیمیا پر کتابیں لکھیں۔

امیر معاویہؓ کو تاریخ سے خاص ذوق تھا۔ وہ روزانہ عرب کی جنگوں، ان کی قدیم تاریخ، سلاطین عجم کے حالات اور ان کے طرز حکمرانی، ان کی لڑائیوں، رعایا کے ساتھ ان کی سیاست اور مختلف قدیم قوموں کے عروج وزوال کے حالات سنا کرتے تھے۔ اس زمانہ کے مشہور یمنی عالم عبید بن شربہ نے جو ان کو سلاطین عرب وعجم کے حالات، زبانوں کی پیدائش اور مختلف ملکوں میں آبادی کی تاریخ سنایا کرتے تھے، کتاب الامثال اور کتاب الملوک واخبار الماضین جیسی کتابیں تالیف کیں۔ اسی دور کے ایک اور مورخ عوانہ بن حکم کلبی المتوفی 147ھ نے کتاب التاریخ اور سیرت معاویہ بھی لکھی۔

ہشام کو بھی علوم وفنون سے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے فارسی کی ایک اہم کتاب کا جو ایرانیوں کے مختلف علوم، ان کے فرمانرواؤں کے حالات اور سیاسی واقعات پر مشتمل تھی، ترجمہ کرایا تھا۔

انشاء پردازی نے اس دور میں مستقل ایک فن کی شکل اختیار کی جس کو اس زمانہ میں فن کتابت کہا جاتا تھا اور انشاء پرداز کو کاتب کہا جاتا تھا۔ خلیفہ عبدالملک کا کاتب عبدالحمید بن یحییٰ اس فن کا موجد مانا جاتا ہے۔

عربی ادب و شاعری نے بھی اس دور میں کافی ترقی کی۔ جریر و فرزدق اور اخطل جیسے شعراء اسی زمانہ میں بزم شاعری کی رونق بڑھا رہے تھے۔

3.10 سماجی و معاشرتی حالات

بنو امیہ کے زمانہ کا سماج اور معاشرہ مختلف علاقائی، لسانی اور تمدنی طبقوں پر مشتمل تھا۔ عرب، ایران، بربر، عراقی، شامی، قبطی، خراسانی، ترک، افغانی اور ہندوستانی، یہ سب مسلم سماج کے حصے تھے۔ یہ سب دو بڑے حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔

(1) عرب (2) غیر عرب (عجمی/موالی)

بنو امیہ کا خاندان چونکہ سیاسی اعتبار سے سب پر فائق تھا اس لیے سماج میں ان کی حیثیت بھی سب سے بڑھ کر تھی۔ خلافت کے حقدار یہی سمجھے جاتے تھے۔ البتہ دیگر اعلی مناصب میں عرب کے دوسرے خاندان شریک ہوا کرتے تھے۔ علمی و دینی لحاظ سے عرب اور غیر عرب یعنی موالی کے درمیان مساوات پائی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عرب علماء کے دوش بدوش موالی نے بھی علوم وفنون میں اپنی مہارت و قابلیت کا لوہا منوایا۔ قتادہ، عکرمہ، نافع، ابن اسحاق، عطاء بن رباح، موسی بن عقبہ اور مجاہد وغیرہ جیسے متعدد محدثین ،مفسرین اور فقہاء و مؤرخین موالی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

اس دور کی عورتیں بلند مقام کی حامل تھیں۔ ازواج مطہرات اہم دینی و علمی خدمات انجام دے ہی رہی تھیں۔ ان کے علاوہ بھی متعدد خواتین علم و دین کی نشر و اشاعت میں مشغول تھیں۔ حضرت عمرہ بنت عبد الرحمٰن اعلی درجہ کی محدثہ اور حضرت رابعہ بصری مشہور صوفی خاتون اسی دور سے تعلق رکھتی تھیں۔

البتہ بنو امیہ کے زمانہ میں نومسلموں کی صحیح تعلیم و تربیت اور ان کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا کام اس پیمانے پر نہیں کیا گیا جس پیمانے پر لوگ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نومسلم افراد کے ذریعے بہت سے غیر اسلامی عقائد ونظریات اور توہمات وآداب زندگی بھی مسلم سماج میں داخل ہو گئے جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

رومی و ایرانی اثرات کے تحت شراب نوشی، موسیقی اور رقص مسلم معاشرے کے ایک حصہ میں داخل ہو گیا جس سے بداخلاقی اور عیاشی کی راہ ہموار ہوئی۔

معلومات کی جانچ

1. اموی دور کی تعلیمی حالت بیان کیجیے۔
2. مسلم معاشرہ میں غیر اسلامی رسم ورواج کیسے آئے؟ بیان کیجیے۔

3.11 غیر مسلموں سے تعلقات

اموی دور میں فتوحات کی کثرت اور وسعت کے نتیجے میں معاشرہ دینی اعتبار سے دو بڑے گروہ میں تقسیم ہو گیا تھا۔

(1) مسلم (2) غیر مسلم

غیر مسلم میں یہودی، عیسائی، مجوسی، بودھ، ہندو وغیرہ تھے۔ جن کو اہل الذمہ کہا جاتا تھا۔ ان کو ہر طرح کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور تمدنی آزادی حاصل تھی۔ ان کے لائق اور ماہرین فن کو ان کی صلاحیت کے لحاظ سے اموی حکومت میں بڑے عہدوں پر فائز کیا جاتا۔ حضرت معاویہ کے زمانہ میں ایک عیسائی شامی شخص سرجون بن منصور کو وزیر مالیات بنایا گیا۔

عدل وانصاف کے معاملے میں خلفاء بنی امیہ خصوصاً حضرت عمر بن عبدالعزیز مسلم اور غیر مسلم میں کچھ بھی فرق نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے عہد حکومت میں ذمیوں اور غیر مسلموں کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا۔ انہوں نے ذمی کے خون کی قیمت مسلمانوں کے خون کے برابر قرار دی تھی۔ جس کا نتیجہ تھا کہ کوئی مسلمان ذمیوں کی جان و مال پر دست درازی نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جب شاہی خاندان سے زمینیں لے کر ان کے اصل مالکوں کو واپس دلائیں تو بعض ایسے گرجوں کو بھی عیسائیوں کو واپس دلایا جو غلط طریقے سے لے لیے گئے تھے۔ جب شہزادہ عباس بن ولید کو اس کی زمین واپس کرنے کا حکم دیا جو ایک عیسائی سے چھینی گئی تھی تو عباس نے اپنے حق کے ثبوت میں کہا کہ یہ میرے باپ ولید نے دی تھی۔ لیکن عمر بن عبدالعزیز نے اس دلیل کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ "اللہ کی کتاب ولید کی سند پر مقدم ہے" اور ذمی کو زمین واپس دلا دی۔

اموی دور حکومت میں غیر مسلموں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ مسلمان قاضی صرف مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے، غیر مسلموں کے مقدمات کا فیصلہ ان کے مذہبی پیشواؤں سے کرایا جاتا۔ ان کی جان و مال کی ہر طرح حفاظت کا انتظام کیا جاتا۔ غیر مسلم رعایا کی جان و مال کے تحفظ کے بدلہ میں ان سے جزیہ لیا جاتا تھا جو بہت معمولی رقم ہوتی۔ مالدار سے چار دینار یا اڑتالیس درہم سالانہ، متوسط آمدنی والے سے دو دینار یا چوبیس درہم سالانہ، کم آمدنی والے سے ایک دینار یا بارہ درہم سالانہ کی شرح سے جزیہ لیا جاتا۔ جو لوگ نادار اور بے بس ہوتے ان سے جزیہ معاف ہو جاتا۔ عورتوں اور بچوں سے بھی جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔

غیر مسلم بوڑھوں، ناداروں اور لاوارثوں کے اخراجات کا انتظام بیت المال سے کیا جاتا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ذمی خون کی قیمت مسلم کے برابر قرار دی تھی۔ ذمی کا مال غصب کرنے والوں کے لیے سخت سزا مقرر کی۔ مقدمات میں مسلم اور غیر مسلم رعایا کا فرق نہیں کیا جاتا۔

3.12 خلاصہ

بنو امیہ کی خلافت کا زمانہ فتوحات کی کثرت، تہذیب و تمدن، عدل وانصاف، علم و ہنر کی ترقی کے اعتبار سے تاریخ اسلامی کا ایک یادگار زمانہ ہے۔ اس میں حکومت کے نظم ونسق کو بہتر بنانے پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی گئی۔ آسانی کی خاطر پوری مملکت کے نظام کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا، (1) مرکزی انتظامیہ، (2) صوبائی انتظامیہ۔

مرکزی انتظامیہ کے تحت چند بنیادی دفاتر اور محکمے تھے، مثلاً دفتر کتابت رسکریٹریٹ، محکمۂ انصاف، دفتر خراج رمحکمۂ مالیات ،محکمۂ ڈاک، دفتر فوج وغیرہ، صوبائی نظام کا ذمہ دار ہر صوبہ کا والی ہوتا جو خلیفہ کی ہدایات کی روشنی میں اپنے اپنے صوبوں کے معاملات دیکھتا۔

بنوامیہ کا فوجی نظام بہت مستحکم اور مضبوط تھا۔ اس دور میں مسلمانوں کی بحری طاقت میں بھی اضافہ ہوا۔ مالیاتی نظام کو ایسا بہتر بنا گیا کہ رعایا خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگی۔ قضاء کا نظام عدل وانصاف پر مبنی تھا۔ معاشی وتمدنی حالات بہت بہتر ہو گئے۔ عوام کے لئے رفاہ عام کے بہت کام کئے گئے۔ ملک میں سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا اور تمام بڑے شہروں کو دارالخلافہ دمشق سے سڑک کے ذریعہ جوڑ دیا گیا۔ آب پاشی کے ذرائع اور نظام کو وسعت دی گئی۔ نئے نئے شہر بسائے گئے۔ فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔

تعمیراتی کاموں کے لحاظ سے بنوامیہ کا زمانہ ایک یادگار زمانہ تھا۔ ولید کے ذریعہ تعمیر کردہ دمشق کی جامع اموی اس کی ایک مثال ہے۔ اس زمانہ میں صنعتی اور زرعی میدان میں بھی ترقی کے بہت کام ہوئے۔ اسلامی علوم وفنون کی ترتیب، تدوین اور ترقی و اشاعت میں بھی بنوامیہ کا بڑا کردار رہا ہے۔

سماجی اعتبار سے معاشرہ دو بڑے طبقوں عرب اور غیر عرب رموالی میں بٹا ہوا تھا۔ تاہم علمی و دینی لحاظ سے ان میں مساوات پائی جاتی تھی۔ جس کا نتیجہ تھا کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے علماء، فقہاء، محدثین، مفسرین اور مؤرخین موالی یعنی غیر عرب سے تعلق رکھنے والے تھے۔ البتہ رومی و ایرانی اثرات اور کچھ نومسلموں کی اپنی سابقہ عادات کی وجہ سے مسلم معاشرہ میں غیر اسلامی چیزیں داخل ہو گئی تھیں۔ شراب نوشی، موسیقی اور رقص بھی ایک طبقہ میں داخل ہو گیا تھا۔ جس سے بداخلاقی اور عیاشی کی راہ ہموار ہوئی۔

اموی دور حکومت میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ خلفاء کا برتاؤ غیر جانبدارانہ ہوتا۔ غیر مسلم رعایا کو ہر طرح کی مذہبی، سماجی اور تمدنی آزادی حاصل تھی۔ ان کے مقدمات کا فیصلہ بھی ان کے مذہبی پیشواؤں کے ذریعہ کرایا جاتا۔ غیر مسلموں کی جان و مال کا ہر طرح سے تحفظ کیا جاتا۔ جس کے بدلہ میں ان سے جزیہ کے نام پر معمولی رقم لے جاتی تھی۔ جونا داروں اور پریشان حال لوگوں سے معاف بھی ہو جاتی اور عورتوں، بچوں سے تو لئے جانے کا دستور ہی نہیں تھا۔

3.13 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. اموی حکومت کے نظم ونسق کی صورت حال پر روشنی ڈالیے۔
2. اموی دور کا مالیاتی نظام کیسا تھا؟ ذکر کیجیے۔
3. اموی حکومت کے فوجی نظام پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. خلفائے بنی امیہ کے تعلقات غیر مسلم رعایا کے ساتھ کیسے تھے؟ بیان کیجیے۔

2. بنی امیہ کے دور حکومت میں تعلیم کے میدان میں کیا خدمات انجام دی گئیں؟ بیان کیجیے۔

3. بنی امیہ کے دور میں سماج کے مختلف طبقوں سے بحث کیجیے۔

3.14 فرہنگ

فرامین	شاہی احکام
ترسیل	بھیجنا
اسلحہ	آلات جنگ
مقدمہ	آگے کی فوج
میمنہ	دائیں بازو کی فوج
میسرہ	بائیں بازو کی فوج
مؤخرہ	پیچھے کی فوج
ساقہ	پیچھے کی فوج
قلب لشکر	درمیانی فوج
رضا کار	اپنی مرضی سے اپنے آپ کو پیش کرنے والا
موالی	غلام، عجمی لوگ

3.15 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. تاریخ تہذیب اسلامی — پروفیسر یسین مظہر صدیقی

2. تاریخ اسلام — شاہ اکبر نجیب آبادی

3. تاریخ اسلام — شاہ معین الدین ندوی

4. تاریخ الامت — محمد اسلم جیراجپوری

5. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ — ثروت صولت

اکائی 4 : عباسی حکومت کا قیام اور خلفاء

اکائی کے اجزاء

4.1 مقصد

4.2 تمہید

4.3 عباسی حکومت کا قیام

4.4 ابتدائی خلفاء

4.4.1 ابوالعباس عبداللہ السفاح

4.4.2 ابوجعفر منصور

4.4.3 مہدی

4.4.4 ہادی

4.4.5 ہارون رشید

4.4.6 امین

4.4.7 مامون رشید

4.4.8 معتصم باللہ

4.4.9 واثق باللہ

4.4.10 متوکل علی اللہ

4.5 آخری دور کے حکمراں

4.6 خلاصہ

4.7 نمونے کے امتحانی سوالات

4.8 فرہنگ

4.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

4.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھکر طلبہ عباسی حکومت کے قیام کی تفصیلات، اس زمانہ کے اہم واقعات اور عباسی خلفاء کے حالات اور کارناموں سے واقف ہو جائیں گے۔ نیز ان کو معلوم ہوگا کہ عباسی حکومت کا دور تاریخ کے ایک روشن اور زریں دور کے طور پر کیوں جانا جاتا ہے۔

4.2 تمہید

اس اکائی میں عباسی حکومت کے قیام کی تفصیلات پیش کی جائیں گی۔ اس کے دور عروج اور دور زوال سے بھی بحث کی جائے گی نیز عباسی خلفاء کے حالات اور کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

4.3 عباسی حکومت کا قیام

عباسی حکومت قائم کرنے کی کوششیں اموی دور حکومت میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ سے ہی شروع ہوگئی تھیں جو رفتہ رفتہ طاقتور ہوتی گئیں بالآخر 132ھ مطابق 750ء میں خلافت بنی امیہ کا خاتمہ ہوا اور بنو عباس کی حکومت قائم ہوئی۔

خلافت کے اصل دعویدار تو اہل بیت نبوی یعنی حضرت علی اور حضرت فاطمہ کی نسل سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے لیکن اہل بیت کے امام ابو ہاشم عبداللہ جب سخت بیمار ہوئے اور ان کی جانشینی کا مسئلہ آیا تو اس وقت ان کے خاندان کا کوئی فرد ان کے پاس نہ تھا بلکہ حضرت عبداللہ بن عباس کے پوتے محمد بن علی موجود تھے۔ امام ابو ہاشم نے ان ہی کو امامت کے منصب پر فائز کر دیا۔ اس طرح یہ امامت علویوں سے عباسیوں میں منتقل ہوگئی۔ پھر ابو مسلم خراسانی اس تحریک سے وابستہ ہوا جو زبردست تنظیمی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے بنو امیہ کی حکومت ختم کرنے میں پورا زور صرف کر دیا۔ بالآخر بنو امیہ کا آخری حکمراں مروان بن محمد قتل کیا گیا اور ابو العباس عبداللہ بن محمد السفاح کو خلیفہ مقرر کیا گیا۔

عباسی حکومت تقریباً پانچ سو برس تک قائم رہی۔ لیکن اس کے پورے دور کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، پہلا عروج و ترقی کا دور ہے جو ابو العباس عبداللہ بن محمد السفاح سے معتصم باللہ 227ھ مطابق 833ء تک ہے۔ دوسرا واثق باللہ سے آخر تک جو زوال و انحطاط کا دور کہلاتا ہے۔

عباسی خلافت کا پہلا دور مذہبی و سیاسی اہمیت، تہذیب و تمدن کے فروغ اور علوم و فنون کی ترقی کے اعتبار سے ایک شاندار اور زریں دور تھا لیکن آخری دور میں خلفاء کی خود مختاری میں نمایاں کمی آگئی تھی۔ تاہم خلیفہ کی مرکزی حیثیت قائم رہی۔ دور زوال میں کئی حکومتیں عباسی حکومت سے علیحدہ ہو کر قائم ہوئیں، مثلاً سامانی حکومت، غزنوی حکومت، سلجوقی حکومت، خوارزم شاہی حکومت، لیکن یہ سب عباسی خلیفہ سے حکمرانی کا پروانہ لیتے تھے اور جمعہ و عیدین کے خطبہ میں انھیں کا نام لیتے تھے۔

4.4 ابتدائی دور کے خلفاء

4.4.1 ابوالعباس عبداللہ السفاح

پہلا عباسی خلیفہ ابوالعباس عبداللہ بن محمد السفاح تھا۔ اس نے چار سال تک حکومت کی۔ بنو امیہ کے زمانہ میں دارالخلافہ (پایہ تخت) دمشق ہوا کرتا تھا۔ اس نے دمشق کے بجائے اپنا دارالسلطنت کوفہ کو قرار دیا۔ پھر کچھ مدت کے بعد ایک نیا شہر ہاشمیہ کے نام سے آباد کر کے اسی کو دارالخلافہ بنایا۔

اس کی پوری زندگی بنو امیہ کو ہر طرح سے مٹانے اور ان کے حامیوں کو ختم کرنے میں گزری۔ اس نے بنو امیہ کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے اس قدر خونریزی کی کہ اس کا لقب ہی السفاح (خونریز) پڑ گیا۔ لیکن وہ بڑا مدبر اور فیاض و سخی حکمراں تھا۔

اس نے اپنے دور خلافت میں وزارت کا ایک نیا عہدہ قائم کیا۔ بنو امیہ کے زمانہ میں یہ عہدہ نہیں پایا جاتا تھا۔ ابوالعباس السفاح نے اس عہدہ پر کوفہ کے ایک بڑے ذی علم اور عالی دماغ شخص ابوسلمہ کو مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد خالد بن برمک اس عہدہ پر فائز ہوا۔ عباسی حکومت میں یہ عہدہ بڑا ہی اہم مانا جاتا تھا۔ سلطنت کے تمام امور دراصل وزیر ہی انجام دیتے اور خلیفہ صرف نگرانی کرتا۔

ابوالعباس عبداللہ بن محمد السفاح چار برس نو مہینے تک حکومت کرنے کے بعد 8 / جون 752ء میں انتقال کر گیا۔ اس نے اپنے بعد اپنے بھائی ابوجعفر منصور اور اس کے بعد عیسیٰ بن موسیٰ بن محمد بن علی کو اپنا ولی عہد نامزد کیا۔

4.4.2 ابوجعفر منصور

ابوالعباس عبداللہ السفاح کے بعد ابوجعفر منصور تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اس وقت اس کی عمر اکتالیس سال تھی۔

منصور بڑا مدبر، دانشمند، جری اور بیدار مغز خلیفہ تھا۔ عباسی حکومت کا پہلا خلیفہ اگرچہ عبداللہ السفاح ہے لیکن عباسیوں کا پہلا نامور حکمراں یہی ابوجعفر منصور ہے۔ اس کے زمانہ میں کئی طرح کی بغاوتوں نے سر اٹھایا لیکن اس نے اپنی بیدار مغزی سے تمام فتنوں کو دبا دیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے چچا عبداللہ بن علی کی بغاوت کو کچلا جو خلافت کا دعویدار بن کر سامنے آیا تھا۔ پھر ابومسلم خراسانی کا کام تمام کیا جو اپنے کو عباسی سلطنت کا بانی سمجھتا اور عباسی خلیفہ کو اپنے حکم کے مطابق چلانا چاہتا تھا۔ پھر جن جن لوگوں سے اس کو خطرہ تھا ان سب کو گرفتار کیا اور ان کے فتنوں کو دبا دیا۔

منصور کے زمانہ میں رومیوں سے بھی جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی اور قیصر روم کو پھر جزیہ دینا پڑا۔

منصور نے اپنے لیے نیا دارالخلافۃ بنانا چاہا، اس لیے کہ وہ ابوالعباس عبداللہ السفاح کے بنائے ہوئے دارالخلافہ ہاشمیہ کو غیر محفوظ سمجھتا تھا۔ اس نے دجلہ کے ساحل پر بغداد شہر آباد کیا اور اس کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا۔ اس کی تعمیر کے لیے منصور نے بڑا اہتمام کیا۔ مختلف مقاموں کی آب و ہوا اور مٹی کا اہتمام کرنے کے بعد ارض بابل و نینوا کا ایک خوش سواد اور سرسبز و شاداب قطعہ جسے دجلہ سیراب کرتا تھا منتخب کیا گیا۔ اور بڑے بڑے مہندسین نے شہر کا نقشہ بنایا اور اس کی تعمیر کے لیے دنیا کے مختلف حصوں سے معمار، سنگتراش، نجار اور نقاش وغیرہ ہر صنف کے صناع و کاریگر جمع کیے گئے اور جن ملکوں میں جو سامان تعمیر مل سکتا تھا فراہم کیا گیا۔

شہر کا نقشہ دائرہ نما تھا۔ درمیان میں منصور کا محل قصر الخلد تھا۔ اس کے بعد حکومت کے دفاتر کی عمارتیں اور عمائد وارکان سلطنت اور امراء کے محلات تھے۔ آخر میں عام آبادی اور بازار و باغات تھے۔ لیکن پھر کچھ دنوں کے بعد بغداد سے متصل اور اس سے الگ کرخ کے نام سے عوام کی ایک الگ آبادی قائم کر دی تھی۔ ابتداء میں شہر میں دو جامع مسجدیں تھیں۔ ایک شاہی، دوسری عام آبادی کے لیے۔ شہر کے گرد 25 گز بلند دوہری سنگین شہر پناہ اور اس کے بعد وسیع خندق تھی۔ بیرونی اور اندرونی دونوں فصیلوں کے سمت چار بڑے بڑے پھاٹک باب الکوفہ، باب الشام، باب البصرہ اور باب الخراسان تھے۔ پھاٹکوں کے اوپر اونچے اونچے برج تھے۔ اندرونی فصیل کے پھاٹکوں پر پچاس پچاس گز بلند گنبد اور شہ نشینیں تھیں۔ گنبدوں کی چوٹی پر مختلف مجسمے تھے جو ہوا کے رخ کے ساتھ ساتھ پھرتے تھے۔

قصر الخلد اپنی خوبصورتی، زیب وزینت اور آرائش وزیبائش کے لحاظ سے خلد کا نمونہ تھا۔ اس کا وسطی گنبد زمین سے اسی گز بلند تھا اور اس کے کلس پر ایک نیزہ بردار شہسوار کا مجسمہ نصب تھا۔ شہر کی آبادی میں ہر قبیلہ اور ہر طبقہ کے محلے الگ الگ اور مختلف چیزوں کے بازار جدا جدا ان کے ناموں سے موسوم تھے۔ کل سڑکیں اور گلیاں مختلف ناموں اور نسبتوں سے منسوب تھیں۔ شوارع عام چالیس چالیس گز چوڑی تھیں۔ دجلہ سے کاٹ کر بہت سی نہریں شہر میں جاری کی گئی تھیں۔

اس نے بغداد کو دنیا کا خوبصورت ترین شہر بنایا اور مختلف علاقوں سے اہل علم وفن اور اہل صنعت وحرفت کو وہاں بلا کر بسایا۔ جس کی وجہ سے بغداد علم اور علماء کا مرکز بھی قرار پایا۔

منصور کا دور حکومت علوم وفنون کی ترقی کے لحاظ سے ایک ممتاز دور ہے۔ اس کے زمانہ میں تصنیف وتالیف کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس کے پاس ہر علم وفن کے ماہرین جمع رہتے تھے۔ اسی نے پہلی مرتبہ باضابطہ سریانی، یونانی، فارسی اور سنسکرت میں لکھی ہوئی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ علم وادب کی بڑے پیمانہ پر سرپرستی کی۔ وہ خود بھی حدیث وفقہ کا ماہر اور فلسفہ ونجوم میں مہارت رکھتا تھا۔

ابو جعفر منصور بڑا بارعب خلیفہ تھا۔ وقت کی قدردانی خوب جانتا تھا اور مسلسل کام کرنے سے تھکتا نہ تھا۔ فجر سے عصر تک فوج کے انتظام اور رعایا کے معاملات میں مصروف رہتا۔ عشاء کے بعد بھی دیر تک کام کرتا رہتا تھا۔ اس وقت مختلف جگہوں سے آئے ہوئے خطوط واطلاعات کو پڑھتا پھر سوتا۔ تہجد کے وقت اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھتا۔ فجر کی نماز مسجد میں جا کر خود پڑھاتا اور فجر کے بعد ہی سے ایوان خلافت میں آ کر بیٹھ جاتا اور کام شروع کر دیتا۔

وہ دنیا کے عظیم ترین سلاطین میں تھا۔ خلوت میں وہ خوش مزاج اور خوش اخلاق رہتا تھا۔ لغو اور مزاحیہ باتوں کو بھی برداشت کر لیتا تھا۔ لیکن جب لباس شاہی زیب تن کر کے دربار میں آتا تو بالکل رنگ بدل جاتا۔ آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور اس کے تمام اوصاف یکسر بدل جاتے۔ اس نے اپنے لڑکوں تک سے کہہ دیا تھا کہ جب میں اپنے شاہی لباس میں مجلس میں آجاؤں تو میرے قریب نہ آیا کرو۔ ممکن ہے تمہیں کوئی نقصان پہنچ جائے۔

سب سے اول اسی نے عباسی حکومت کی جڑوں کو مضبوط کیا۔ اس کا نظام قائم کیا۔ اس کے قواعد مرتب کئے اور انھیں نافذ کیا۔ اس کو جس معاملہ میں نفع کی توقع ہوتی تھی۔ اس میں بے دریغ روپیہ صرف کر دیتا اور جہاں روپیہ ضائع ہوتا وہاں معمولی رقم بھی خرچ نہ کرتا۔

اس کا ایک خاص وصف تھا کہ نازک سے نازک موقعوں پر بھی وہ گھبراتا نہ تھا۔ اس کا دماغ امن وسکون اور شورش وفساد دونوں موقعوں پر یکساں کام دیتا تھا۔ اس لیے اس کے عہد میں کوئی انقلابی سازش کامیاب نہ ہوسکی۔

منصور کا قول تھا کہ خلیفہ کو صرف تقوی درست رکھ سکتا ہے، سلطان کو اطاعت اور رعایا کو عدل۔ جو سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کے لیے عفو ودرگذر زیادہ مناسب ہے اور وہ بڑا کم عقل ہے جو اپنے زیردستوں پر ظلم کرتا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ سلطنت کے ارکان چار ہیں، جن کے بغیر حکومت نہیں چل سکتی۔ ایک قاضی جو بغیر کسی خوف کے منصفانہ فیصلہ کرے، دوسرے پولیس جو قوی کے مقابلہ میں کمزور سے انصاف کرے، تیسرے تحصیل دار جو پورا خراج وصول کرے، لیکن رعایا پر ظلم نہ ہونے پائے، چوتھے پرچہ نگار جو ان لوگوں کی صحیح اطلاع دیتا رہے۔

سیاسی اعتبار سے بنوامیہ میں جو حیثیت عبدالملک بن مروان کی ہے وہی حیثیت عباسی خلافت میں ابوجعفر منصور کی ہے۔ اس کی مدت خلافت بائیس سال ہے۔ ذی الحجہ 158ھ مطابق اکتوبر 775ء میں حج کو جاتے ہوئے راستے میں ہی اس کا انتقال ہوگیا۔

4.4.3 مہدی

ابوجعفر منصور کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا مہدی تخت خلافت پر بیٹھا۔ وہ انتہائی نرم دل، فیاض اور فرض شناس حکمراں تھا۔ منصور نے اپنے زمانہ میں جن لوگوں کو گرفتار کیا تھا اور جن کی جائدادیں ضبط کرلی تھیں مہدی نے ان سب کو آزاد کردیا اور ان کی جائدادیں واپس کردیں۔ لوگ اس سے بہت خوش ہوئے۔

مہدی کا زمانہ رعایا کی خوشحالی کا زمانہ تھا۔ ملک میں ہر جگہ امن وامان تھا۔ اس لیے اس کو ملکی اصلاحات کی طرف توجہ کرنے کا پورا موقع ملا۔ اس نے مکہ کے راستے میں قافلوں کے ٹھہرنے کے لیے سرائیں بنوائیں، کنویں کھدوائے۔ حوض کو پانی سے ہر وقت بھرے رہنے کا انتظام کیا تاکہ قافلہ اور ان کے جانوروں کے لیے پریشانی نہ ہو۔ پوری مملکت میں کوڑھیوں کے لیے بیت المال سے وظیفہ کا انتظام کیا۔ نادار قیدیوں کے اہل وعیال کے لیے وظائف جاری کیے۔ مکہ، مدینہ، یمن، بغداد میں ڈاک کا وسیع تر نظام بنایا، مسجد حرام اور مسجد نبوی کی توسیع کرائی۔

اس کے زمانہ میں رومیوں سے بھی جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کو کامیابی ملی اور رومیوں کو خراج دینے کا وعدہ کرنا پڑا۔ اس جنگ کی قیادت مہدی کے لڑکے ہارون کے ہاتھ میں تھی جو بعد میں خلیفہ بنا۔

مہدی سے پہلے اکثر سرحدی علاقوں کے غیر مسلم حکمراں عباسی حکومت کے باغیوں سے مل جاتے تھے جس سے بڑی مشکلات پیش آتی تھی۔ اس لیے 164ھ میں مہدی نے اپنے ماتحت باجگزاروں اور سرحدی فرمانرواؤں کے پاس سفراء بھیج کر ان سے صلح اور مفاہمت کرکے اس خطرہ کا سد باب کیا۔ اس سلسلہ میں کابل، طبرستان، سغد، طخارستان، بامیان، فرغانہ، اشروسنہ، سجستان، ترک، تبت، سندھ اور چین کے فرمانرواؤں اور ہندوستان کے بعض راجاؤں نے اطاعت کا معاہدہ کیا۔

اس کے زمانہ میں مقنع (نقاب پوش) نامی ایک شخص کا فتنہ اٹھا جس نے خدائی کا دعوی کیا تھا۔ مہدی نے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لیے دفن کردیا۔

مہدی عقائد میں بہت پختہ اور مذہب کے معاملہ میں بڑا متشدد تھا۔ عقائد اسلامی میں وہ کسی قسم کی آزادی اور رخنہ اندازی پسند نہ کرتا تھا۔ اس کے زمانہ میں عجمیوں کے اثر سے ملحدوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی تھی۔ جو اپنے عقائد کی اشاعت بھی کرتی تھی اور اس کا اچھا خاصہ لٹریچر پیدا ہوگیا تھا۔ مہدی نے ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرایا اور ان کی کتابیں جہاں مل سکیں جلائیں۔

مذہبی اصلاح کے سلسلہ میں مہدی نے بعض مفید علمی خدمات انجام دیں اور الحاد وزندقہ کے تدارک کے لیے حکماء کو مناظرانہ کتابوں کی تالیف کا حکم دیا۔ جس سے علم کلام کی بنیاد پڑی۔ اس طرح اس عظیم الشام فن کی ایجاد کا سہرا جو مسلمانوں کے لیے سرمایہ فخر ہے مہدی کے سر ہے۔ علم کلام کے علاوہ بعض ادبی کتابیں بھی لکھوائیں۔ چنانچہ مفضل نے اس کے حکم سے امثال وایام عرب پر ایک کتاب لکھی۔

مہدی نے اپنے بعد اپنے دو بیٹوں موسی ہادی اور ہارون الرشید کو ولیعہد نامزد کیا، اور 22/محرم 169ھ مطابق 4/اگست 785ء کو انتقال کر گیا، اس کی مدت خلافت تقریبا دس سال ہے۔

4.4.4 ہادی

مہدی کے بعد اس کا بیٹا ہادی خلیفہ ہوا۔ وہ نہایت طاقتور اور بہادر خلیفہ تھا۔ امور سلطنت بھی تندہی سے انجام دیتا تھا۔ جب وہ نکلتا تھا تو عصا بردار اور سپاہی اس کے آگے آگے ننگی تلواریں اور کھچی ہوئی کمانیں لے کر چلتے تھے۔ اس کے عمال نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس لیے اس کے زمانہ میں اسلحہ عام ہوگیا۔ پرائیویٹ صحبتوں میں وہ بہت بے تکلف رہتا تھا۔ لیکن دربار میں آتے ہی رنگ بدل جاتا تھا۔

رعایا پروری میں وہ مہدی کے نقش قدم پر تھا۔ اس کی سہولت اور دادرسی کے لیے اس نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ کسی شخص کو میرے پاس آنے سے نہ روکو، اس سے برکت جاتی رہتی ہے اور میرے سامنے کوئی ایسا معاملہ نہ پیش کرو جو تحقیقات کے بعد غلط نکلے کہ یہ حکمراں اور رعایا دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔

ہادی کے ساتھ زندگی نے وفا نہ کی اور وہ ایک سال ایک مہینہ کے بعد دنیا سے رخصت ہوگیا۔

4.4.5 ہارون الرشید

اس کے بعد ہارون الرشید تخت خلافت پر بیٹھا۔ ہارون کا زمانہ خلافت عباسیہ کا بہترین زمانہ مانا جاتا ہے۔ اس کے 23/ سالہ دور حکومت میں بغداد اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ رعایا کی خوشحالی، علم وفن کے عروج اور تمدن وثقافت کی ترقی کے اعتبار سے یہ تاریخ اسلام کا زریں دور ہے۔

بیرونی فتوحات کے اعتبار سے بھی یہ زمانہ ممتاز رہا۔ ہارون رشید کا روم پر حملہ تاریخ کا بڑا اہم واقعہ ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ قسطنطنیہ کی ملکہ خلیفہ ہارون رشید کو خراج دیتی تھی۔ رومیوں نے اس کو معزول کر کے ایک دوسرے سردار کو تخت حکومت پر بیٹھایا۔ اس نے ہارون کو نہ صرف خراج دینے سے انکار کیا بلکہ دھمکی آمیز انداز میں ایک خط بھی لکھ کر بھیج دیا کہ ''خیریت چاہتے ہو تو وصول کی

ہوئی رقم فوراً واپس کردو' خط پڑھ کر ہارون غصہ سے لال ہو گیا اور اپنے قلم سے لکھا ''اے رومی کتے! تم اس کا جواب سن کر کیا کرو گے آنکھوں سے دیکھ لینا'' اس کے بعد فوراً فوج لے کر روانہ ہو گیا اور رومیوں کو ایسی شکست دی کہ خراج دینا ہی پڑا۔

ہارون بڑا دیندار حکمراں تھا۔ بائیس برس میں اس نے دس مرتبہ حج کیا۔ اس کا معمول تھا کہ ایک سال حج کرتا اور ایک سال جہاد کرتا۔ اس نے اعلی پیمانہ پر سلطنت کا نظم کیا تھا۔ حکومت کے تمام شعبوں کو فعال اور سرگرم کیا۔ خراج ومحصول کی وصولی کے سلسلے میں اس نے قاضی ابو یوسف سے ایک کتاب لکھوائی جو کتاب الخراج کے نام سے معروف ومشہور ہے۔ اس میں خراج، صدقات، جزیہ اور دیگر محاصل کے قوانین کے ساتھ، حکومت ورعایا کے تعلقات، ذمی اور مسلمان رعایا کے حقوق وفرائض، حکومت کے کارندوں اور عہدیداروں کے اختیارات اور اسلامی حکمرانی سے متعلق بہت سی اہم باتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے عہد میں سلطنت نہایت مضبوط، ملک شاد آباد اور خزانہ بھرا ہوا تھا۔ رعایا خوشحال اور فارغ البال تھی۔ اس کو رعایا کی اصلاح وبہبود کی اتنی فکر رہتی تھی کہ وہ بہ نفس نفیس اس کے حالات کی جستجو کرتا تھا۔ اس کی جستجو کے واقعات نے افسانے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ لیکن یہ حقیقت سے خالی نہیں۔ اپنے زمانہ میں اس نے حکومت کے استحکام، عدل وانصاف کے قیام اور رعایا کی فلاح کے بہت سے کام انجام دیئے۔

اس کے زمانہ میں تجارت کو بہت ترقی حاصل ہوئی۔ ہر طرف امن وامان کا دور دورہ تھا۔ بری وبحری راستے سب محفوظ تھے۔ حکومت کی طرف سے تجارتی قافلوں کے آرام وراحت اور ان کی حفاظت وسلامتی کے انتظامات بھی بہتر طریقے پر کیے گئے تھے جس کی وجہ سے تاجروں کو اپنی تجارت کو فروغ دینے کا پورا موقع ملا اور ملک میں خوشحالی اور دولت وثروت کا سیلاب آ گیا۔

جس طرح ہارون رشید رفاہ عام کے کاموں میں فراخ دلی سے روپیہ خرچ کرتا تھا اس کی بیوی زبیدہ بھی اسی طرح فیاض اور فراخ دل تھیں۔ انھوں نے کئی سرائے اور نہریں بنوائیں، جن میں مکہ مکرمہ کی ''نہر زبیدہ'' مشہور ہے۔

ہارون رشید کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے علم کے فروغ کے لیے مستقل ایک ادارہ قائم کیا جس کا نام بیت الحکمت رکھا۔ اس میں مختلف زبانوں کے ماہرین اور مختلف علوم وفنون کی مشہور شخصیتوں کو جمع کر لیا تھا۔ ان کو اچھی تنخواہیں دیتا اور ان سے دنیا کی مختلف زبانوں میں پائے جانے والے علوم وفنون کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا کام لیتا۔ اس طرح بے شمار کتابیں منظر عام پر آئیں۔

ہارون کی خوش قسمتی سے اس کو وزراء بھی ایسے ملے تھے جو کسی فرمانروا کو مشکل سے میسر آ سکتے ہیں۔ برمکی خاندان نہ صرف عباسی وزارت میں بلکہ دنیا کی تاریخ میں اپنے اوصاف وکمالات اور کارناموں میں ممتاز ہے۔ وہ ہارون سے بھی زیادہ علم دوست، علماء نواز، بلند نظر، خوش مذاق، مخیّر اور فیاض تھے۔ ان کا آستانہ ہر صنف کے اصحاب کمال کا مرجع تھا۔ انھوں نے جو کارنامے انجام دیئے اور عباسی حکومت کو علم وتمدن کے جس درجہ تک پہنچایا وہ ناقابل فراموش ہیں۔

ہارون رشید مجموعہ اوصاف تھا۔ اس میں متضاد اوصاف جمع تھے۔ ایک طرف اس کی زندگی بڑی پرشکوہ اور عیش پرستانہ تھی۔ دوسری طرف وہ بڑا دین دار اور پابند شریعت، علم دوست اور علماء نواز تھا۔

ہارون نے وفات سے پہلے ہی اپنے لڑکوں امین، مامون اور مؤتمن کو بالترتیب ولیعہد نامزد کر دیا تھا۔

4.4.6 امین

ہارون رشید کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کا لڑکا امین خلیفہ بنا وہ نہایت حسین، بلند قامت اور بہادر تھا۔ علمی استعداد بھی اچھی تھی۔ فصاحت و بلاغت اور ادب و انشاء میں مہارت رکھتا تھا۔لیکن تدبیر و سیاست سے خالی اور عیش پرستی کا دلدادہ تھا۔ چنانچہ حکومت ملنے کے بعد لہو ولعب، سیر و تماشا، عیش و عشرت میں ایسا ڈوبا کہ فرائض سلطنت کی بھی خبر نہ رہی۔ خواجہ سراؤں کو بڑی بڑی قیمتوں پر خرید کر ان کی تنخواہیں مقرر کیں۔ ان کو اپنا محرم راز اور امور سلطنت میں مشیر کار بنایا۔ تمام ممالک محروسہ سے مسخروں کو جمع کر کے ان کے بڑے بڑے مشاہرے مقرر کیے۔ ہر قسم کے افسران فوج کو دربار سے الگ کر دیا۔ ان کی تحقیر و تذلیل کی۔ بیت المال کا کل نقد و جنس خواجہ سراؤں اور اپنے ہم نشینوں میں تقسیم کر دیا۔ عیش پرستی اور تفریحی مشاغل کے لیے طرح طرح کی تفریح گاہیں بنوائیں۔ دجلہ کی سیر کے لیے شیر، ہاتھی، عقاب، سانپ اور گھوڑوں کی شکل کے قیمتی بجرے بنوائے جن پر بیٹھ کر دجلہ کی سیر کا لطف اٹھاتا تھا۔ شبانہ روز حسین عورتوں اور مسخروں کے ساتھ انہی کے رنگ رلیوں میں مصروف رہتا تھا۔

دوسری طرف ہارون نے اپنی سلطنت کے دو حصے کر کے ایک حصہ کا فرمانروا امین کو اور دوسرے حصہ کا فرمانروا مامون کو بنایا تھا۔ یہ ایک سیاسی غلطی تھی جس کے نتائج اس کی آنکھ بند ہوتے ہی نکلنے لگے۔ مامون خراسان کا مستقل فرمانروا تھا۔ صرف خطبہ کی حد تک اس کو بغداد کی مرکزی حکومت سے تعلق تھا۔ خراسان کی مہم میں ہارون کے ساتھ جو خزانہ، فوج اور خدم و حشم تھا، وہ سب مرنے سے پہلے مامون کو دے دیا گیا تھا۔ اس سے امین کے دل میں مامون کے خلاف جذبات پیدا ہو گئے۔ لیکن باپ کی زندگی میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے مرض الموت کی خبر سن کر فضل بن ربیع اور ان ارکان سلطنت کے پاس جو ہارون کے ہم رکاب تھے خفیہ کہلا بھیجا کہ امیر المومنین کے انتقال کے بعد کل خزانہ، فوج اور خدم و حشم اس کے پاس بغداد بھجوا دیا جائے۔

فضل بن ربیع مامون کو ناپسند کرتا تھا۔ اس کا بڑا سبب تو یہ تھا کہ امین میں کوئی صلاحیت نہ تھی۔ اس کے مقابلہ میں مامون مدبر اور دانش مند تھا، اس لیے فضل بن ربیع امین پر آسانی کے ساتھ حاوی ہو سکتا تھا اور مامون کے یہاں اس کا چراغ جلنا مشکل تھا۔ دوسرے برامکہ کی تباہی میں فضل بن ربیع کا بھی ہاتھ شامل تھا اور مامون پر اس خاندان کا بھی بڑا اثر تھا۔ اس لیے فضل کو اس کی جانب سے انتقام کا بھی خطرہ تھا۔ اس لیے وہ اندرونی طور سے مامون کے خلاف تھا۔ امین کے حکم سے اسے اعلانیہ مخالفت کا موقع مل گیا اور وہ ہارون کی وصیت کے خلاف جملہ سامان لے کر امین کے پاس بغداد روانہ ہو گیا جس کی وجہ سے دونوں بھائیوں میں ایک زبردست جنگ چھڑ گئی۔ بالآخر امین مامون کی فوج کے ہاتھوں مارا گیا اور مامون نے کاروبار خلافت سنبھالا۔

4.4.7 مامون رشید

مامون رشید کا نام عبداللہ اور لقب مامون تھا۔ یہ ہارون رشید کے بیٹوں میں سب سے زیادہ لائق، قابل، ذہین، مدبر، معاملہ فہم، دور اندیش اور علم و فضل میں ممتاز تھا۔ ہارون نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بڑے بڑے علماء اور ماہرین فن کو لگایا تھا۔ کسائی، فراء، یزیدی مامون کے اساتذہ میں تھے۔ امام مالک کے پاس امین اور مامون کو ہارون رشید خود لے کر گیا تھا کہ ان سے مؤطا کا درس لیں اور فیض حاصل کریں۔ کچھ بڑے ہونے کے بعد جعفر برمکی کو اس کا اتالیق مقرر کیا۔ جس کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک

طرف تدبیر وسیاست، عقل ودانش اور فہم وفراست میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا تو دوسری طرف قرآن، تفسیر، فقہ، فرائض، ادب، شاعری، طب، فلسفہ، نجوم اور ریاضی جیسے علوم میں اسے مکمل مہارت حاصل تھی۔

مامون علم دوست اور علماء پرور بھی تھا۔ وہ اپنے دربار میں علماء وفضلاء اور ہرفن کے ماہرین کو رکھتا جس سے علم کی اشاعت میں مدد ملتی۔ روم کے بادشاہ کو ہدیہ وتحفہ بھیج کر بدلے میں فلسفہ کی کتابیں وہاں سے منگوائیں۔ جن میں افلاطون، ارسطو، بقراط، جالینوس، اقلیدس اور بطلیموس کی بیش قیمت اور نادر کتابیں تھیں۔ مامون نے ان کتابوں کا ماہرین زبان سے عربی میں ترجمہ کرایا۔ مامون کا یہ ذوق دوسرے وزراء وامراء میں بھی منتقل ہوا اور انھوں نے بھی علم سے دلچسپی لی اور علم کے نشرواشاعت کی سرپرستی کی۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ مامون نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا ارسطو! پوچھا بھلائی کیا ہے؟ جواب ملا، جسے عقل اچھا کہے۔ پوچھا اس کے بعد، کہا جس کو شرع اچھا بتائے۔ اس خواب نے اس کے علمی شوق کو اور تیز کردیا اور اسی وقت اس نے رومی کتب خانوں کی قدیم کتابوں کی فرمائش میں سلاطین روم کے پاس خطوط لکھے اور حجاج بن مطر، ابن البطریق اور بیت الحکمت کے ناظر کو بھیجا کہ یہ لوگ خود جاکر کتابیں انتخاب کرکے لائیں۔ ان کے آنے کے بعد یوحنا بن ماسویہ ان کے ترجمہ پر مامور ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عقلی علوم روما میں ایک مصیبت سمجھے جاتے تھے اور یہاں سے علم وفن کا چرچا اٹھ چکا تھا۔ چنانچہ جب مامون کا خط قیصر کے پاس پہنچا اور اس نے کتابوں کی تلاش شروع کی تو ایک خانقاہ نشین راہب نے پتہ بتایا کہ فلاں مقام پر ایک مقفل مکان ہے جس میں قسطنطین نے تمام یونانی کتابیں بند کرادی تھیں۔ اس وقت سے جو بادشاہ ہوتا ہے وہ اس پر ایک قفل کا اور اضافہ کرتا ہے۔ قیصر نے اعیان سلطنت سے مشورہ کیا۔ سب نے کھولنے کا مشورہ دیا۔ پھر راہب سے پوچھا کہ اگر یہ کتابیں اسلامی ملک میں بھیج دی جائیں تو مجھ پر دنیا میں کوئی وبال یا آخرت میں مواخذہ تو نہ ہوگا۔ تجربہ کار راہب نے جواب دیا، وبال ومواخذہ نہیں بلکہ ثواب ملے گا کیوں کہ یہ چیزیں جس مذہب میں داخل ہوئیں اس کی بنیادیں ہلادیں۔ چنانچہ مقفل خزانہ کھولا گیا اور اس میں سے بے شمار قدیم یونانی کتابیں نکلیں اور وہ سب مسلمانوں کے ملک میں روانہ کی گئیں۔ مامون نے ان سب کا ترجمہ کرایا۔

مامون ترجمہ کرنے والوں کو ترجمہ کی ہوئی کتابوں کے وزن کے برابر چاندی یا سونا انعام میں دیا کرتا تھا۔ اس کو علم ہیئت، ریاضی اور الجبراء سے بھی شوق تھا۔ ان سب موضوعات پر ان کے ماہرین سے کتابیں لکھوائیں۔ سنسکرت کی علمی کتابوں کے ترجمے کرائے۔ اس نے اپنے آدمی بھیج بھیج کر مختلف جگہوں سے یونانی علماء کی کتابیں منگوائیں۔ ریاضی دانوں اور ہیئت دانوں سے دو مرتبہ زمین کے محیط کی پیمائش بھی معلوم کرائی۔

مامون عدل وانصاف کے معاملہ میں بھی بہت ممتاز تھا۔ اس کی عدالت میں بڑے چھوٹے سب برابر تھے۔ معمولی آدمی بھی شہزادوں تک سے اپنا حق لے سکتا تھا۔ جب کبھی خود اسے فریق کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تو اس کے ساتھ بھی کوئی امتیازی برتاؤ نہ کیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے اس پر بیس ہزار کا دعوی کیا۔ مامون کو قاضی کی عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ خدام نے اس کے لیے قالین بچھایا۔ قاضی القضاۃ نے روک دیا کہ عدالت میں مدعی اور مدعی علیہ دونوں برابر ہیں۔ کسی کے ساتھ امتیازی برتاؤ نہیں کیا جاسکتا۔ مامون نے قاضی کی اس حق پرستی کے صلہ میں تنخواہ بڑھادی۔

وہ عمال کے ظلم وزیادتی کی پوری نگرانی کرتا اور خلاف ورزی کی صورت میں ان کو سزا بھی دیتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک سپاہی نے ایک شخص کو بیگار میں پکڑا۔ اس کی زبان پر بے ساختہ حضرت عمرؓ کا نام آ گیا۔ مامون کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ اس نے فوراً اس آدمی کو طلب کر کے پوچھا تم کو عمرؓ کا عدل یاد آیا؟ اس نے کہا، ہاں، مامون نے کہا خدا کی قسم! اگر میری رعایا عمرؓ کی رعایا جیسی ہوتی تو میں ان سے زیادہ عادل ہوتا اور اس آدمی کو انعام دے کر سپاہی کو موقوف کر دیا۔ اس کا قول تھا کہ بغاوت ہمیشہ عمال کی زیادتیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس لیے عمال کو ہمیشہ قیام عدل اور ظلم وزیادتی سے باز رہنے کی ہدایت کرتا تھا۔ وہ اتوار کے دن صبح سے ظہر تک رعایا کی شکایتیں سننے کے لیے خود بیٹھتا تھا۔

فلسفہ کے مطالعہ اور مختلف قوموں کے علماء سے میل جول رکھنے اور ان سے آزادانہ دینی بحثیں کرنے کی وجہ سے اس کے دینی خیالات کچھ متاثر ہو گئے تھے۔ وہ خلق قرآن کا قائل تھا اور شدت سے لوگوں کو اس عقیدہ کے اختیار کرنے پر مجبور کرتا تھا، جس کی وجہ سے علماء حق کو اس کے زمانہ میں سخت اذیتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔

رعایا کی خبر گیری میں بھی وہ ماہر تھا۔ عباسی خلفاء میں وہ پہلا شخص تھا جس نے مصر و شام کا تفصیلی دورہ کیا اور وہاں کے حالات سے بذات خود آگاہ ہوا۔ اس نے خبر رسانی اور پرچہ نگاری کے شعبہ کو بڑی وسعت و ترقی دی اور ہر صیغہ کے علیحدہ علیحدہ خفیہ نویس اور پرچہ نگار مقرر کیے۔ ملک کے معمولی سے معمولی واقعہ سے باخبر رہتا تھا۔ اس کی وسعت اطلاع کے بہت سے واقعات کتابوں میں مذکور ہیں۔

اس نے اپنے بعد ولی عہد کے طور پر حضرت امام علی رضا کو نامزد کیا تھا جو اس کی نگاہ میں خلافت کے زیادہ مستحق تھے لیکن بنو عباس اس سے بہت سخت ناراض ہوئے کیونکہ اس طرح خلافت ان کے خاندان سے نکل کر اہل بیت کی طرف منتقل ہو رہی تھی لیکن امام علی رضا کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔

مامون کے ساتھ بھی زندگی نے کچھ زیادہ وفا نہ کی۔ وہ روم پر فوج کشی کے بعد واپس آ رہا تھا کہ راستہ میں ایک دریا کی سیر کو گیا اور تفریحاً دریا میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا اور پانی کی ٹھنڈک اور صفائی کی تعریف کرنے لگا۔ اسی دوران میں سرکاری ہرکارہ پہنچا اور عراق کا تازہ تازہ کھجور لایا۔ مامون اور اس کے ساتھیوں نے یہیں بیٹھے بیٹھے کھجور کھائے اور دریا کا پانی پیا۔ معلوم نہیں اس میں کیا اثر تھا کہ یہاں سے اٹھتے اٹھتے سب کو بخار آ گیا۔ مامون کو ایسا سخت بخار آیا کہ پھر نہ اترا۔ شاہی طبیب ہم رکاب تھے۔ ہر طرح کی تدبیر کی مگر کوئی علاج کارگر نہ ہوا اور بہت جلد معمولی بخار نے مرض الموت کی شکل اختیار کر لی۔ اس کا لڑکا عباس اور بھائی معتصم ساتھ تھے۔ فقہاء اور قضاۃ کے روبرو معتصم کو ولی عہد نامزد کر کے ضروری وصیتیں کیں۔ یہ وصیت بہت طویل ہے۔ اس کے بعض ٹکڑے یہ ہیں، ''میری حالت سے سبق حاصل کرو۔ خلق قرآن کے مسئلہ میں میرا طریقہ اختیار کرنا۔ جب تم پر خلافت کی ذمہ داری آئے تو خدا کے طالب اور اس کے عذاب و عتاب سے خائف کی طرح عمل کرنا۔ اس کی ڈھیل سے دھوکے میں نہ آنا اور یہ سمجھتے رہنا کہ موت سر پر سوار ہے۔ رعایا کے امور سے کبھی غافل نہ رہنا۔ مسلمانوں کی نگرانی اور ان کے فائدہ سے غفلت نہ کرنا۔ ان کے بارہ میں خدا کا خوف کرنا۔ اپنی خواہشات کے مقابلہ میں ہمیشہ ان کے مفاد اور صلاح و فلاح کو ترجیح دینا۔ زبردستوں سے زیردستوں کا حق دلانا۔ ان پر بار نہ ڈالنا۔ ان میں باہم انصاف سے کام لینا۔ انھیں مانوس کرنا، قریب لانا۔ اس سے فراغت کے بعد حالت اور

بگڑ گئی اور لوگوں نے کلمہ شہادت کی تلقین کی، مگر طاقت جواب دے چکی تھی، کچھ بولنا چاہا، لیکن زبان نے یاری نہ دی، بمشکل اتنا کہا کہ ''اے وہ جسے کبھی موت نہ آئے گی اس پر رحم فرما جو مر رہا ہے'' یہ کہہ کر جمادی الثانی 218ھ میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ لاش طرطوس لے جا کر دفن کر دی گئی۔ وفات کے وقت 48 سال کی عمر تھی۔ مدت خلافت بیس سال پانچ مہینہ رہی۔

مامون کو عباسی خاندان کا سب سے بڑا خلیفہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے زمانہ میں عباسی حکومت کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی۔ اسی عظمت کے بل پر دور زوال کے عباسی خلفاء لوگوں سے عزت و احترام حاصل کرتے رہے۔

4.4.8 معتصم باللہ

مامون کی وفات کے بعد معتصم خلیفہ ہوا، وہ مامون کے برخلاف بہت کم پڑھا لکھا تھا۔ لیکن بہادری و جنگی فنون میں بہت ماہر تھا۔ لوگ اس کو سپاہی خلیفہ کہتے تھے۔ اس کے زمانہ میں فوجی طاقت میں بہت اضافہ ہوا۔ اس کو بزم کے بجائے رزم سے دلچسپی تھی۔ بڑی بڑی مہموں میں خود نکلتا تھا۔ اس کو صرف دو چیزوں کا شوق تھا۔ حکومت کی شان وشکوہ اور میدان کارزار کے مناظر، اس کا روپیہ انہی چیزوں میں صرف ہوتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا بجٹ دفاعی اور فوجی بجٹ تھا۔

اس کی فوجی قوت اور جنگی مصارف کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ عموریہ کے معرکہ میں سوار فوج کی تعداد پانچ لاکھ سے اوپر تھی۔ اور صرف شام کی سرحد کی حفاظت کا خرچ ایک لاکھ اشرفی سالانہ تھا۔ اس نے اپنی آٹھ سالہ مدت خلافت میں تمام اندرونی و بیرونی مخالف طاقتوں کا قلع قمع کر دیا جس طاقت نے سر اٹھایا، کچل کر رکھ دیا۔ اس نے ترکوں کی مستقل فوج تیار کی، ان کے لئے ایک شہر بھی بسایا جس کا نام سرمن رأی (جو دیکھے وہ خوش ہو) تھا جو بعد میں سامرا کے نام سے زبان زد خاص و عام ہوا۔

اس کے زمانہ کا خاص واقعہ روم پر حملہ اور عموریہ کی فتح ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ایک دن معتصم دربار میں بیٹھا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ رومیوں نے سرحد پر حملہ کر کے چند مسلمانوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ ان میں ایک بوڑھی عورت بھی ہے جس نے گرفتاری کے وقت ''وامعتصماہ'' (کہاں ہے معتصم؟ میری مدد کرے) کہہ رہی تھی۔ اس نے سنا تو اسی وقت ''لبیک'' (یعنی تمہاری مدد کے لئے حاضر ہوں) کہا اور فوراً لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ ایک نجومی نے بتایا کہ یہ وقت لشکر کشی کے لئے منحوس ہے۔ ابھی لشکر کشی ملتوی کر دیجئے۔ لیکن معتصم نے ایک نہیں سنی اور لشکر لیکر نکل کھڑا ہوا۔ اس کی فوجوں نے ایشیائے کوچک کو تہ و بالا کر ڈالا اور انگورہ و عموریہ فتح کرتے ہوئے اس بوڑھی عورت کو آزاد کرا کے لوٹا۔

معتصم نے ترکی فوج کو رکھ کر بظاہر اپنی حکومت کو مزید مستحکم کرنا چاہا لیکن یہی ترک بعد میں عباسی خلافت کی کمزوری کا سبب بھی بنے۔ کیونکہ خلافت کے کاموں میں دخل دینے لگے اور اپنا اثر و رسوخ اس قدر بڑھا لیا کہ بعد کے دور میں عباسی خلفاء برائے نام رہ گئے۔

معتصم نے مسئلہ خلق قرآن میں مامون سے بھی زیادہ شدت اختیار کی۔ اس نے سارے ممالک میں یہ فرمان جاری کر دیا کہ تمام علماء سے قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار لیا جائے اور بچوں کو اس عقیدہ کی تلقین کی جائے۔ امام احمد بن حنبل جو کتاب و سنت سے دلیل کا مطالبہ کر رہے تھے اور قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل نہ تھے۔ معتصم نے ان پر بہت سختیاں کیں لیکن آپ ثابت قدم رہے، بعد میں اس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔

معتصم کو زمین کی آبادی اور رعایا کی آسودہ حالی کا بڑا خیال تھا۔ اس لیے اس کے زمانہ میں بکثرت افتادہ زمینیں آباد ہوئیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ زمین کی آبادی میں بہت سے فوائد ہیں۔ اس سے مخلوق کی زندگی قائم ہے۔ خراج بڑھتا ہے۔ ملک کی دولت وثروت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مویشیوں کے لیے چارہ مہیا ہوتا ہے۔ نرخ ارزاں ہوتا ہے۔ کسب معاش کے ذریعے بڑھتے ہیں۔ معاش میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اپنے وزیر کو عام حکم دے دیا تھا کہ جس پرتی زمین پر دس درہم خرچ کرنے سے ایک سال کے بعد گیارہ درہم ملنے کی امید ہو، اس کے آباد کرنے کے لیے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔

معتصم کی وفات محرم 227ھ مطابق اکتوبر 841ء میں ہوئی اس نے اپنے بعد اپنے بیٹے ہارون کو جانشین نامزد کیا تھا، جو واثق باللہ کے لقب سے مشہور ہوا۔

4.4.9 واثق باللہ

واثق باللہ ایک عقلمند، فاضل خلیفہ تھا۔ اس کے اوصاف اپنے والد سے نہ مل کر مامون سے ملتے تھے۔ اس لئے لوگ اس کو چھوٹا مامون کہتے تھے۔ واثق باللہ اپنے والد معتصم سے بڑھ کر ترک نواز تھا۔ اس کے زمانہ میں ترکوں کو مزید عروج حاصل ہوا۔ اس کے زمانہ میں چند بغاوتیں اور شورشیں اٹھیں، لیکن اس نے سب پر غلبہ پایا۔ واثق کو بھی علمی مجلسیں لگانے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس کے دربار میں علماء جمع ہوتے اور آزادانہ طور پر ہر طرح کے موضوع پر اظہار خیال ہوتا، طبعیات، مابعد الطبعیات اور الہیات، خصوصا طب کی نظری اور تجربی حیثیت پر بہت طویل مکالمہ ہوتا تھا۔ اس نے مشہور فلسفی وطبیب حنین بن اسحاق سے طب پر ایک کتاب لکھوائی جس کا نام کتاب المسائل الطبیعیہ تھا۔

مسئلہ خلق قرآن میں یہ بھی سختی برتتا تھا۔ یہ تو عوام الناس سے بھی اس مسئلہ میں اقرار لیتا تھا۔ البتہ امام احمد بن حنبل پر اس نے براہ راست کوئی سختی نہیں کی بلکہ ان کو شہر سے باہر رہنے کو کہا کہ کوئی گزند نہ پہونچے۔

اس نے رفاہ عام کے بھی بہت کام کئے۔ بحری ٹیکس کو معاف کر دیا تھا۔ حرمین شریفین کے باشندوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتا۔ ان کو داد و دہش کے ذریعہ خوشحال رکھتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے دور میں مکہ و مدینہ میں کوئی مانگنے والا نہ ملتا۔

تقریبا پانچ برس تک حکومت کرنے کے بعد ذی الحجہ 232ھ مطابق جولائی 847ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنے بعد کسی کو ولیعہد نامزد نہیں کیا۔

4.4.10 متوکل علی اللہ

واثق کے انتقال کے بعد امرائے سلطنت کے مشورے سے معتصم کے دوسرے بیٹے اور واثق کے بھائی جعفر کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ جس کا لقب متوکل علی اللہ تھا۔

یہ رعایا کے معاملات میں بہت نرمی برتتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگلے خلفاء رعایا پر اس لئے سختیاں کرتے تھے کہ وہ مطیع وفرمانبردار رہیں اور میں نرمی کرتا ہوں تا کہ وہ مجھ سے محبت کریں۔ عدل وانصاف اور خوشحالی اور عیش وعشرت کے سامان کی

فراوانی کے لحاظ سے اس کا زمانہ ممتاز تھا۔ اس نے خلق قرآن کی بحثوں پر روک لگادی تھی۔ اور جولوگ اس کی وجہ سے گرفتار کئے گئے تھے ان سب کو چھوڑ دیا اور ہمیشہ کے لئے یہ فتنہ ختم ہو گیا۔

متوکل کے زمانہ تک ترک فوجوں کا حکومت کے معاملات میں عمل دخل بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس نے ان کا زور توڑنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اس نے اپنے بعد اپنے دولڑکوں کو ولیعہد نامزد کیا۔ پھر ان میں سے ایک پر زیادہ مہربان ہو گیا اور دوسرے کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے ناراض بیٹے نے ترک فوجوں سے ملکر اپنے باپ ہی کو قتل کروا دیا۔ یہ واقعہ شوال 247ھ مطابق دسمبر 861ء کا ہے۔

4.5 آخری دور کے حکمراں

متوکل علی اللہ کے قتل کے بعد عباسی خلافت کے اقبال وعروج کا دور ختم ہوتا ہے اور زوال کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی عباسی خلافت چار سو برس تک چلتی رہی۔ جس میں عباسی خلفاء برائے نام رہ گئے۔ اصل حکومت ترک سپہ سالار کرتے تھے۔ وہ جس کو چاہتے خلیفہ بناتے اور جب چاہتے معزول کر دیتے یا قتل کر دیتے تھے۔

عباسی خلفاء کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر مختلف صوبوں کے امیروں اور صوبیداروں نے اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم کرلیں۔ یہ عباسی خلفاء کے نام کا صرف خطبہ پڑھتے لیکن حکومت کے معاملات میں خلفاء کا کوئی عمل دخل نہ ہوتا۔ جن میں سامانیہ سلطنت، اخشیدی سلطنت، غزنوی سلطنت، خوارزم شاہی سلطنت اور آل بویہ وغیرہ کی حکومتیں قابل ذکر ہیں۔ ان کی تفصیل آپ دوسری کتاب میں پڑھیں گے۔

دور زوال میں دسیوں خلفاء آئے لیکن ان میں سے کوئی بھی بنوعباس کی قدیمی شان وشوکت واپس نہ لاسکا۔ البتہ 279ھ تا 289ھ مطابق 892ء تا 902ء تخت سلطنت پر فائز رہنے والا معتضد باللہ بڑے جاہ وجلال کا خلیفہ تھا۔ مدتوں کے بعد اس دل ودماغ اور حوصلہ وہمت کا خلیفہ عباسی تخت پر بیٹھا تھا۔ تدبیر وسیاست کے ساتھ وہ اخلاق سے بھی آراستہ تھا۔ اپنی دس سالہ حکومت میں اس نے عباسی حکومت کے مردہ جسم میں جان ڈال دی اور ہر حیثیت سے اس کے عہد عروج کی یاد تازہ کر دی۔

معتضد کے تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی فتنہ وفساد دب سا گیا۔ ملک کی حالت درست ہوگئی۔ لڑائیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ چیزوں کا نرخ ارزاں ہوگیا۔ مخالفین نے صلح کر لی۔ تمام اموراس کے قابو میں آگئے۔ مشرقی ومغربی علاقے اس کے زیرنگیں ہو گئے۔ مخالفین مغلوب ہو گئے۔

معتضد نہایت عقلمند، سمجھدار، فاضل اور اچھی صفات سے آراستہ خلیفہ تھا۔ اس کی تخت نشینی کے وقت سلطنت ویران ہو رہی تھی۔ سرحدیں بیکار ہو چکی تھیں۔ اس نے بڑی خوبی سے اس کی اصلاح کی۔ اس کے حسن انتظام سے اس کی سلطنت پھر آباد ہوگئی۔ آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ سرحدیں مضبوط ہوگئیں۔ وہ سیاست میں نہایت مضبوط اور فتنہ پرستوں کے لیے نہایت سخت تھا۔ رعایا کے مال میں فوجوں کی دست درازی اور ظلم کو اس نے ختم کر دیا۔ معتضد نے ایک بار پھر عباسی حکومت کے منتشر شیرازہ کو متحد کر دیا اور رعایا میں عدل وانصاف قائم کیا اور مرتے وقت بڑی دولت چھوڑ گیا۔

اس نے خلافت کا نہایت بہترین انتظام کیا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کا بڑا رعب تھا۔ اس کی ہیبت کی وجہ سے سارے فتنے دب گئے۔ اس نے بہت ٹیکس بند کر دیئے۔ وہ خلافت عباسیہ کی تجدید کی وجہ سے سفاح ثانی کہلاتا تھا۔

دولت عباسیہ کی تباہی کا سب سے بڑا سبب ترکی امراء اور افسران فوج تھے۔ عباسی حکومت اس طرح ان کے پنجہ اقتدار میں آ گئی تھی کہ خلفاء تک کو ان کی مرضی کا پابند رہنا پڑتا تھا۔ ورنہ حکومت بلکہ جان تک سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ معتضد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ترکوں کا زور توڑ کر سلطنت اور رعایا دونوں کو ان کے پنجہ ظلم سے آزاد کر دیا۔ ان کی قوت توڑنے کے لیے اس نے نہایت سخت پالیسی اختیار کی تھی۔

معتضد باللہ کے بعد اس شان وشوکت کے خلفاء تخت سلطنت پر نہ آسکے جس کی وجہ سے عباسی حکومت زوال کی شکار ہوتی گئی۔

بغداد کا آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ ہے جو 1258ھ میں ہلاکو خان کے ہاتھوں مارا گیا۔ جس کے بعد بغداد میں عباسی خلافت ختم ہوگئی لیکن ظاہر بامراللہ کا ایک بیٹا کسی طرح مصر پہنچ گیا۔ وہاں کا سلطان ملک بیبرس نے اس کی بڑی عزت کی اور خاندان خلافت کے ایک فرد ہونے کی وجہ سے اس کے ہاتھ پر بیعت خلافت کی۔ اس نے مستنصر باللہ کا لقب اختیار کیا۔ اس کے بعد اس خاندان کا دوسرا فرد حاکم بامراللہ کے لقب سے خلیفہ بنا۔ اور اس طرح یکے بعد دیگرے سولہ خلفاء مسند نشین ہوئے۔ لیکن ان کے پاس نہ اختیارات تھے نہ کوئی ملک تھا۔ وظیفہ پر ان کا گزر بسر ہوتا۔ آخری خلیفہ متوکل علی اللہ ثالث ہوا جسے سلطان سلیم عثمانی اپنے ساتھ قسطنطنیہ لے آیا۔ وہ سلطان سلیم کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوگیا۔ اور اس طرح عباسی خلافت ترکی عثمانی خلافت میں منتقل ہوگئی۔ یہ واقعہ 1517ء کا ہے۔

4.6 خلاصہ

عباسی حکومت کا قیام 132ھ مطابق 750ء میں عمل میں آیا۔ یہ حکومت تقریباً پانچ سو برس تک قائم رہی۔ لیکن عباسی دور کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، پہلا دور عروج وترقی کا ہے اور دوسرا دور زوال کا۔

عباسی حکومت کا پہلا دور سیاسی اہمیت، تہذیب وتمدن کے فروغ اور علوم وفنون کی ترقی کے اعتبار سے ایک زریں اور شاندار دور تھا۔ لیکن آخری دور میں خلفاء کی خود مختاری میں نمایاں کمی آگئی اور اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر مختلف صوبوں کی حکومتیں عباسی حکومت سے علیحدہ ہو کر مستقل حکومت کی حیثیت سے کام کرنے لگیں۔ البتہ عباسی خلیفہ سے اپنی حکومت کے لیے علامتی پروانۂ حکمرانی ضرور حاصل کرتے تھے اور جمعہ وعیدین کے خطبہ میں ان کا نام لیتے تھے۔

عباسی حکومت کا پہلا خلیفہ ابوالعباس السفاح تھا جو بڑا مدبر اور فیاض حکمراں تھا لیکن اس نے بنوامیہ کو ختم کرنے میں اس قدر خونریزی کی کہ اس کا لقب ہی السفاح (خونریز) پڑ گیا۔ اس کے بعد اس کا بھائی ابوجعفر منصور خلیفہ ہوا جو بڑی شان وشوکت کا خلیفہ اور بیدار مغز حکمراں تھا۔ اس نے بغداد شہر کی تعمیر کر کے اس کو دنیا کا خوبصورت ترین شہر بنایا تھا اور اسی کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا تھا۔ اس کے زمانہ میں علم وفن کی بہت ترقی ہوئی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مہدی خلیفہ ہوا۔ وہ نرم دل لیکن فرض شناس حکمراں تھا۔ اس نے

رعایا کی خوشحالی اور رفاہ عام کے کام کی طرف بہت توجہ دی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ہادی خلیفہ ہوا۔ لیکن وہ صرف ایک سال کے بعد انتقال کر گیا۔ پھر ہارون رشید تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس کا زمانہ عباسی حکومت کا بہترین زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ جس میں رعایا بہت خوشحال ہوئی۔ علم وفن کو فروغ حاصل ہوا اور تمدن وثقافت نے خوب ترقی کی۔ اس کے زمانہ میں بغداد مرکز علم کے ساتھ مرکز تجارت بھی بن گیا تھا۔ ہارون رشید کے بعد اس کا بیٹا امین پھر اس کا دوسرا بیٹا مامون خلیفہ ہوا۔ مامون بڑا قابل، ذہین، دوراندیش اور علم وفضل کا حامل خلیفہ تھا۔ اس کے زمانہ میں علم وفن اور تہذیب وثقافت نے بے انتہا ترقی کی۔ اس نے ارسطو، بقراط، جالینوس، اقلیدس اور بطلیموس کی کتابوں کا ترجمہ کر کے ان کے علوم کو مسلمانوں میں رائج کیا۔

مامون کو عباسی خاندان کا سب سے بڑا خلیفہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے زمانہ میں عباسی حکومت کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی۔ بعد کے دور میں اس عظمت میں فرق آتا گیا۔ پھر معتصم نے اپنے دور خلافت میں ترک فوجوں کی بھرتی کر کے بظاہر عباسی حکومت کو مضبوط و مستحکم کرنا چاہا لیکن یہ ترک ہی عباسی خلفاء کی کمزوری کا سبب بنے جو خلافت کے کاموں میں دخل دینے لگے۔ اور اپنا اثر ورسوخ اس قدر بڑھالیا کہ عباسی خلفاء برائے نام رہ گئے۔

عباسی خلفاء کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر مختلف صوبوں کے امیروں اور صوبیداروں نے اپنے اپنے علاقے میں خود مختار حکومتیں قائم کرلیں۔ تاہم عباسی خلیفہ کی مرکزیت باقی رہی کہ وہ جمعہ وعیدین کے خطبہ میں ان کا نام لیتے تھے اور ان سے اپنے لیے پروانۂ حکمرانی بھی حاصل کرتے تھے۔

4.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. عباسی حکومت کے قیام کی تفصیلات پر روشنی ڈالیے۔
2. ابوجعفر منصور کے دور خلافت اور اس کے کارناموں کو بیان کیجئے۔
3. مامون رشید کے دور میں علمی ترقی کی رفتار پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. عباسی حکومت کے پہلے خلیفہ کو ''السفاح'' کیوں کہا جاتا ہے؟ بیان کیجئے۔
2. ہارون الرشید کے زمانہ کے تجارتی احوال بیان کیجیے۔
3. فتح عموریہ کا واقعہ لکھئے۔

4.8 فرہنگ

فعال	سرگرم
اتالیق	مربی
گزند	تکلیف
فراوانی	کثرت
زریں	سنہرا، بیش قیمت

4.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. تاریخ اسلام — اکبر شاہ نجیب آبادی
2. تاریخ اسلام — شاہ معین الدین ندوی
3. تاریخ الامت — محمد اسلم جیراجپوری
4. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ — ثروت صولت
5. مختصر تاریخ اسلام — مولانا غلام رسول مہر

اکائی 5 : عباسی دور میں نظام حکومت

اکائی کے اجزاء

5.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ عباسی حکومت کے نظم ونسق کی کیفیت، اس کے دفاعی، مالیاتی اور تعلیمی نظام، اس زمانہ میں عدل وقضاء کی صورتحال اور معاشی وتمدنی حالات سے واقف ہوجائیں گے۔ نیز ان کو معلوم ہوگا کہ عباسی خلفاء کا غیر مسلم رعایا کے ساتھ کیسا برتاؤ اور ان کے ساتھ کیسے تعلقات تھے۔

5.2 تمہید

اس اکائی میں عباسی دور کے نظام حکومت پر روشنی ڈالی جائیگی۔ اس زمانہ کے دفاعی وفوجی نظام، مالیاتی نظام، عدل وقضاء کی صورتحال اور تعلیمی، معاشی اور تمدنی حالات سے بحث کی جائیگی، نیز اس دور میں سماجی ومعاشرتی حالات کیسے تھے اور عباسی خلفاء کے غیر مسلم رعایا کے ساتھ کیسے تعلقات تھے ان سب کو بھی بیان کیا جائے گا۔

5.3 نظم ونسق

عباسی دور خلافت میں حکومت کا نظم ونسق اموی دور کی طرح ہی تھا۔ آسانی کی خاطر نظام حکومت کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

(1) مرکزی نظام (2) صوبائی نظام

مرکزی نظام:

مرکزی نظام کا تعلق براہ راست خلیفہ سے ہوتا اور دیگر صوبوں کے ذمہ دار وہاں کے والی ہوتے۔ جو خلیفہ کی طرف سے نامزد کیے جاتے۔ مرکزی نظام میں سربراہ اعلی خلیفہ تھا۔ لیکن عباسی خلفاء نے اپنے زمانہ میں وزیر کا ایک نیا عہدہ قائم کیا جو خلیفہ کے تمام امور ومعاملات کو اس کی طرف سے انجام دیتا۔ خلفاء اس عہدہ کے لیے ملک کے ممتاز ترین اور ذہین ترین لوگوں کا انتخاب کرتے۔ عباسی خلافت کے ابتدائی دور میں اس عہدہ پر برامکہ فائز رہے جن کی حکمت ودانش، علم وفضل، صلاحیت وقابلیت اور سخاوت وفیاضی سے ایک طرف حکومت کی نیک نامی میں اضافہ ہوا تو دوسری طرف رعایا کو بھی ان کی داد ودہش اور عطا وبخشش سے بہت فائدہ پہنچا۔ لیکن جب عباسی خلفاء نے یہ محسوس کیا کہ اس طرح برامکہ ہی سیاہ وسفید کے مالک ہو رہے ہیں اور ان کے سامنے خلفاء کی کچھ زیادہ عظمت نمایاں نہیں ہو سکے گی تو انھوں نے برامکہ کا زور توڑ دیا اور پھر دوسرے افراد کو اس عہدہ پر مقرر کیا۔

وزارت کے عہدہ کے علاوہ بنیادی عہدے اور محکمے جن کو دیوان کہا جاتا تھا، درج ذیل تھے۔

دیوان الجند: (دفتر فوج)

بنوامیہ کی طرح عباسی خلافت میں بھی یہ محکمہ بڑا مرتب اور منظم تھا۔ اس کا ایک سربراہ ہوتا جو امیر الجند کہلاتا وہ فوج کے تمام انتظامات کا نگراں ہوتا۔ فوج میں تین طبقے ہوا کرتے تھے: پیدل فوج، تیر انداز اور شہسوار، امیر الجند سب کا ذمہ دار ہوتا۔

دیوان الخراج: (دفتر مالیات)

اس محکمے کے تحت حکومت کی آمدنی ومصارف کا انتظام کیا جاتا۔ یہ حکومت کا بہت اہم محکمہ سمجھا جاتا تھا۔ آمدنی کے ذرائع پیداوار کا عشر، مختلف حکومتوں سے ملنے والا خراج، جزیہ، زکاۃ اور تجارتی مال کا ٹیکس اور مال غنیمت وغیرہ تھے۔ اس آمدنی کو فوج کے اخراجات، رفاہ عام کے کام اور ملکی انتظامات میں خرچ کیا جاتا۔

دیوان القضاء: (محکمۂ عدل وانصاف)

اس محکمہ کے تحت رعایا اور عوام کے مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا۔ اس کا سربراہ قاضی القضاۃ کہلاتا۔ عباسی خلفاء قاضیوں کے معاملات میں دخل نہیں دیا کرتے تھے۔ ہارون رشید کے زمانہ میں جب اس محکمہ کا سربراہ امام ابو یوسف کو بنایا گیا اس وقت سے عدالتی نظام مزید مستحکم ہوگیا۔

دیوان البرید: (محکمۂ ڈاک)

یہ محکمہ بھی امویوں کے زمانہ سے چلا آرہا تھا۔ جس کے تحت پوری مملکت میں خبر رسانی کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اس کے لیے دار الحکومت بغداد سے تمام صوبوں کے لیے براہ راست سڑکوں کی تعمیر کی گئی۔ جن پر ڈاک چوکی کا انتظام تھا اور ہر وقت تازہ دم گھوڑے، خچر اور اونٹ موجود رہتے۔ جن سے خبر پہنچانے کے علاوہ فوجی ساز وسامان کی منتقلی کا بھی کام لیا جاتا تھا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ دار الخلافہ بغداد کے محکمۂ ڈاک میں پوری مملکت کے راستوں کے نقشے (Road Map) موجود رہتے۔ جن سے مسافروں کو سفر میں مدد ملتی۔ جاسوسی کا نظام بھی اس محکمہ سے متعلق کردیا گیا تھا۔

مملکت کے تمام حدود میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے ''دیوان الشرطۃ'' (دفتر پولیس) سرگرم رہتا جس کا سربراہ حکومت کا کوئی اہم شخص ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح کاتب اور حاجب کے جو عہدے بنوامیہ کے زمانہ میں تھے وہ عباسی حکومت میں بھی بدستور باقی رہے۔ کچھ نئے عہدوں کا بھی اضافہ کیا گیا جن میں چند یہ ہیں:

دیوان النفقات:

شاہی محل کے مصارف، انعامات اور وظیفوں کے انتظامات دیکھنے کا محکمہ۔

دیوان النظر فی المظالم:

اس محکمہ کا کام حکومتی اہلکاروں کے کام کی تفتیش وجانچ اور ان کے رجسٹروں کو چیک کرنا اور ان کی بدعنوانیوں کو دور کرنا اور عوام کی شکایت سن کر اس کا تدارک کرنا تھا۔

دیوان الأنہار:

اس محکمہ کے فرائض میں پورے ملک میں آب پاشی کے نظام کو درست رکھنا، اس کے وسائل میں اضافہ کرنا اور زراعت کو ترقی دینا تھا۔

صوبائی نظام:

صوبائی نظام کا تعلق ہر صوبہ کے والی سے ہوتا۔ وہ خلیفۂ وقت کے مشورہ سے اپنے اپنے صوبہ کا انتظام کرتا۔ پوری مملکت کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا لیکن ان کی حدود بدلتی رہتی تھیں۔

ان صوبوں میں بعض وقت مرکزی خلافت کے تحت نیم خودمختار حکومتیں بھی قائم ہوئیں۔ان صوبوں کا ذمہ دار والی یا عامل (گورنر) کہلاتا۔

بنوعباس کے زمانہ میں مختلف محکموں کے اعلی افسران جو وزراء کہلاتے تھے،ان کے اختیارات بہت بڑھ گئے تھے۔بعض وقت خلیفہ سے زیادہ وزیر صاحب اختیار دیکھا جاتا تھا۔جس سے عباسی خلافت میں زوال کے راستے کھلے۔ترکوں کا جب غلبہ ہوا تو امیر الأمراء کا ایک نیا عہدہ نکلا جو آگے چلکر سب سے زیادہ اختیارات کا حامل بنا۔

معلومات کی جانچ

1. عباسی دور میں وزیر کے کیا فرائض تھے؟

2. عباسی دور میں نظام مملکت کے کتنے حصے تھے؟

5.4 دفاعی اور فوجی نظام

عباسی دور حکومت میں فوج کے دو حصے ہوا کرتے:

(1) مستقل فوج (2) رضا کار فوج

مستقل فوج باضابطہ طور پر چھاؤنیوں میں رہتی اوران کو تنخواہ دی جاتی۔رضا کار فوج کو وقت ضرورت پر استعمال کیا جاتا۔ البتہ جب ان سے خدمات لی جاتیں تو ان کو تنخواہ بھی دی جاتی پھر کام ختم ہونے کے بعد یہ اپنے گھروں کو چلے جاتے۔

ابتدائی خلفاء کی فوج عربی وخراسانی لوگوں پر مشتمل تھی۔معتصم کے زمانہ سے ترک فوجیوں کی بڑے پیمانہ پر بھرتی کی گئی۔ معتصم کے زمانہ مین فوجی تنظیم اورفوج کی تعداد عروج پر تھی۔

فوج میں تین طبقے ہوتے، پیدل فوج، تیرانداز،شہ سوار،ان سب کا ذمہ دار امیر الجند کہلاتا تھا۔جنگی ہتھیار میں نیزہ، تیر،تلوار اور منجنیق کے ساتھ کسی شہر کا محاصرہ کرتے وقت استعمال کئے جانے والے عرادے اور دبابے بھی تھے جن کو قلعہ اوراس کے دروازہ کو توڑنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔نفط کا استعمال بھی اس زمانہ میں ہونے لگا تھا۔''نفط'' دراصل تیل کو کہتے ہیں۔ یہ تیل پچکاریوں کے ذریعہ دشمنوں کے علاقہ میں پھینکا جاتا اور پھر انگارے پھینک کر آگ لگائی جاتی جس سے قلعہ کے اندر آگ لگ جاتی اور دشمن بھاگنے پر مجبور ہو جاتے۔

فوج کے لئے خاص وردیاں ہوتیں جن میں خلفاء اپنے اپنے ذوق کے مطابق تبدیلی کرتے رہتے۔معتصم نے ترک فوجوں کے لئے خاص وردی بنوائی تھی جن پر لیس لگے ہوئے تھے اوران کی پٹیاں سنہری ہوتیں۔فوج کے ساتھ طبیب اور جراح بھی ہوتے۔ زخمیوں کو اٹھانے اور لانے کے لئے معقول انتظام رہتا تھا۔

5.5 مالیاتی نظام

مالیات کا محکمہ 'دیوان الخراج' سے متعلق تھا۔ یہ حکومت کا اہم محکمہ تھا جس کے تحت حکومت کی آمدنی وخرچ کا انتظام ہوتا۔ آمدنی کے ذرائع جزیہ، زکوۃ، تجارتی ٹیکس، زرعی پیداوار کا خراج اور لگان وغیرہ تھا۔ یہ آمدنی حکومت کے افسران اور کارکنان اور عوام کے رفاہی کاموں میں استعمال کی جاتی۔ اس آمدنی سے شہروں اور قلعوں کی تعمیر کے علاوہ مدرسے، سرائیں، پل، نہریں، کنویں، مسجدیں وغیرہ بھی تعمیر ہوتی رہتی تھی۔ انجینیر وں اور کاریگروں کو بھی اس میں سے بڑے بڑے انعامات دئے جاتے۔ حکیموں، طبیبوں، شاعروں اور فقیہوں کو بھی انعامات سے نوازا جاتا تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو۔ اسلحہ سازی، پارچہ بافی (کپڑا بنانا) دواسازی وغیرہ کے بڑے بڑے کارخانے قائم کیے جاتے اور ان کی دیکھ ریکھ بھی اس آمدنی سے ہوتی۔

عباسی دور میں مالیاتی نظام بہت ہی مستحکم ہوگیا تھا جس کی وجہ سے رعایا بڑی خوشحال زندگی گزار رہی تھی۔ عیش وعشرت کے سامان کی ایسی فراوانی ہوئی کہ معاشرہ کا ایک طبقہ عیش ولذت پرستی کی ان برائیوں میں مبتلا ہونے لگا جو مال ودولت کی کثرت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

5.6 عدل وقضاء

نظام قضاء (محکمۂ انصاف) عباسی خلافت میں مضبوط بنیادوں پر استوار تھا۔ قاضی عدل وانصاف کے پابند ہوتے۔ خلیفۂ وقت بھی ان کے فیصلوں میں مداخلت نہ کرتا تھا۔ مہدی، ہارون اور مامون کے زمانہ کی عدالتی کارروائیاں حیرت انگیز حد تک عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتی تھیں۔ خلیفۂ وقت کے خلاف بھی اگر کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو خلیفہ اور عام آدمی کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ ہارون رشید نے اپنے زمانہ کے بڑے عالم امام ابو یوسف کو قاضی القضاۃ بنایا تھا اور ان کو بہت وسیع اور جامع اختیارات بھی دیئے تھے۔

ہر شہر میں قاضی مقرر ہوتے جو عوام کے مقدمات کا فیصلہ کرتے۔ غیر مسلموں کے مقدمات کا فیصلہ ان کے علماء اور مذہبی لوگوں کے ذریعہ کرایا جاتا تاکہ مذہبی طور پر وہ کسی تنگی کا سامنا نہ کریں۔ اگر ایک فریق مسلم اور دوسرا فریق غیر مسلم ہوتو فریقین کی رضامندی سے جس عدالت سے چاہتے وہ مقدمات فیصل کرواتے۔ لیکن عام طور پر غیر مسلم بھی اپنے مقدمات مسلم قاضی ہی کے پاس لے کر جاتے۔ اس لیے کہ ان کو وہاں انصاف ملنے کا پورا یقین ہوتا۔

اس دور میں قاضیوں کے لیے مخصوص لباس بھی ہوا کرتے تھے جو ان کے عہدہ کے وقار میں اضافہ کرتے۔

معلومات کی جانچ

1. عباسی دور حکومت میں آمدنی کے ذرائع اور مصارف بیان کیجیے۔

2. محکمۂ انصاف کی خصوصیات بیان کیجیے۔

5.7 معاشی وتمدنی حالات

عباسی خلافت میں تمدن اپنے آخری نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ خصوصاً ہارون رشید کا زمانہ تمدنی ترقی کے اعتبار سے بہت ممتاز تھا۔ تمدنی ترقی زندگی کے تمام شعبوں میں نمایاں تھی۔ تمدنی ترقی کا دارومدار عام طور پر تجارت وزراعت پر ہوا کرتا ہے اور یہ دونوں شعبے عباسی خلافت میں عروج پر پہنچے ہوئے تھے۔ شروع میں تجارت پر یہودیوں اور عیسائیوں کا قبضہ تھا۔ پھر مسلمانوں نے اس طرف توجہ کی اور تجارت کو اس قدر فروغ دیا کہ مغرب میں مراکش واندلس تک اور مشرق میں چین تک ان کا کاروبار پھیل گیا۔ تجارتی جہاز سامان سے لدے لدے ہر سمندر میں پھرنے لگے۔ روم، چین، ہندوستان سے بھی تجارتی تعلقات قائم تھے۔ ہندوستان سے ہاتھی دانت، آبنوس کی لکڑی اور صندل، چین سے کاغذ، دوات، سونے چاندی کے برتن اور ریشمی کپڑے آتے تھے۔

بغداد جس طرح تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کا مرکز تھا اسی طرح وہ تجارت کا بھی مرکز بن گیا تھا۔ خود خلیفہ اور وزراء چاہتے تھے کہ بغداد دنیا کا سب سے بڑا شہر اور تجارت کا مرکز بن جائے۔ چنانچہ بغداد میں تجارت نے کافی ترقی کی۔ بحری وبری راستوں کی حفاظت اور ملکوں میں امن وامان کی وجہ سے پوری مملکت میں تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ بغداد کا ایک محلّہ ''کرخ'' جو چار میل لمبا اور دو میل چوڑا تھا نہ صرف بغداد کا بلکہ دنیا کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا جہاں ہر چیز کے بازار الگ الگ لگتے، کاغذ اور کتابوں کے بھی بازار لگتے تھے۔

عباسی دور میں زراعت کے میدان میں بھی ترقی ہوئی۔ آبپاشی کا نظام بہتر سے بہتر بنایا گیا اور کسانوں پر ٹیکس کم سے کم رکھا گیا۔ عباسی خلفاء کی یہ کوشش ہوتی کہ کسانوں کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ معتصم کے زمانہ میں بکثرت افتادہ زمینیں آباد ہوئیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ زمین کی آبادی میں بہت سے فوائد ہیں: اس سے مخلوق کی زندگی قائم ہے۔ ملک کی دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مویشیوں کے لیے چارہ مہیا ہوتا ہے۔ نرخ ارزاں ہوتا ہے۔ کسب معاش کے ذریعے بڑھتے ہیں۔ معاش میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ زمین کی آبادی کے متعلق خلیفہ معتصم نے اپنے وزیر کو عام حکم دے دیا تھا کہ جس زمین پر دس درہم خرچ کرنے سے ایک سال کے بعد گیارہ درہم ملنے کی امید ہو اس کو آباد کرنے کے لیے اس سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

صنعتی میدان میں بھی نمایاں ترقی ہوئی۔ بغداد میں کپڑے، زیور، خوشبودار تیل، عطر، صابن، شیشہ وغیرہ کی صنعت زوروں پر تھی۔ کوفہ ریشمی، سوتی اور اونی کپڑوں کے لیے مشہور تھا۔ اسلحہ سازی، ظروف سازی اور گلدان سازی بھی کوفہ کی خاص صنعت تھی۔ لوہے اور لکڑی کی صنعت نے بھی ترقی کی۔ لوہے سے ہتھیار کے علاوہ کرسی، برتن، صندوق، سائنس وریاضی کے آلات بنائے جاتے۔ لکڑی سے مختلف سامانوں کے علاوہ کشتیاں بنائی جاتیں۔ عراق کے بڑھئی 36 قسم کی مختلف کشتیاں بنانا جانتے تھے۔

تعمیرات کے اعتبار سے عباسی دور تاریخ کا ممتاز ترین دور تھا۔ خود دار الخلافہ بغداد کی تعمیر ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ عراق میں دریائے دجلہ کے کنارے گول دائرہ کی شکل میں یہ شہر بنایا گیا تھا۔ جس کے بیچ میں شاہی محل تھا۔ پھر سرکاری دفاتر اس کے بعد امراء اور کارکنان کے محل اور مکانات پھر بازار تھے۔ اس کی سڑکیں نہایت چوڑی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ عروج کے زمانہ میں بغداد کے اندر سترہ ہزار حمام، اس سے زیادہ مسجدیں اور دس ہزار سڑکیں اور گلیاں تھیں۔ باغوں کی کثرت، شاندار محلات اور

کوٹھیوں کے علاوہ کھیل کا میدان بھی تھا۔ بعد میں ایک چڑیا گھر بھی بنایا گیا۔ اس زمانہ کا مشہور مقولہ تھا ''بغداد کے علاوہ ساری دنیا دیہات ہے'' اور ''جس نے بغداد نہیں دیکھا اس نے دنیا نہیں دیکھی'' اسی طرح کرخ، مہدیہ، سامرا جیسے شہر بڑی وسعت اور رونق کے ساتھ بسائے گئے۔ ملک کے طول وعرض میں بڑے بڑے باغات لگائے گئے۔

اس دور میں رفاہ عام کے بھی بے شمار کام ہوئے۔ سڑکوں، پل، نہروں، کنوں کی تعمیر کے ساتھ جگہ جگہ بیمارستان کے نام سے شفاخانے بنائے گئے۔ مہدی نے قافلوں کے جانوروں کے لیے حوض بنوائے اوران میں ہر وقت پانی رہنے کا انتظام کیا۔ اس نے کوڑھیوں کے لیے سرکاری خزانہ سے وظیفے جاری کرائے۔ نادار قیدیوں کے گھر والوں کے لیے بیت المال سے وظیفے مقرر کیے۔ ہارون رشید محتاجوں اور ناداروں کا پتہ لگا لگا کر ان کے روزینے اور وظیفے مقرر کرتا تھا۔

معلومات کی جانچ

1. عباسی دور حکومت میں صنعتی ترقی کی کیا کیفیت تھی؟

2. عباسی حکومت میں تجارتی حالات کیسے تھے؟ بیان کیجیے۔

5.8 تعلیمی حالات

تعلیمی ترقی کے اعتبار سے عباسی دور حکومت نہایت ہی شاندار اور ممتاز ہے کہ اس زمانہ میں دینی اور نقلی علوم قرآن، حدیث، فقہ، فرائض، سیرت، مغازی کے ساتھ ساتھ خالص عقلی علوم کو بھی ترقی حاصل ہوئی۔

عباسی خلفاء میں سب سے پہلے ابوجعفر منصور نے علم کی اشاعت کی طرف توجہ کی۔ اس نے ایک طرف حدیث کے موضوع پر امام مالک سے موطا لکھنے کی فرمائش کی تو دوسری طرف طب اور نجوم سے متعلق بھی بعض کتابیں اس کے حکم سے لکھی گئیں۔ جالینوس اور سقراط کی کتابوں کا ترجمہ بھی اس کے دور میں ہوا۔

ہارون رشید کے زمانہ میں ''بیت الحکمت'' کے نام سے باضابطہ ایک ادارے کی بنیاد رکھی گئی جس کے تحت مختلف قوموں اور زبانوں میں پائی جانے والی اہم کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا کام انجام دیا گیا۔ مامون کا زمانہ علمی ترقی کا نقطۂ عروج ہے کہ وہ عباسی خلفاء میں خود بھی سب سے زیادہ صاحب علم وفضل تھا اور علم کی اشاعت سے غیر معمولی دلچسپی رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے یونانی، فارسی، سریانی، سنسکرت زبانوں میں پائی جانے والی طب، فلسفہ، منطق، حساب، ہیئت، الجبرا، لحن، موسیقی جیسے موضوع پر کتابیں منگوا کر ترجمہ کرایا جس کی وجہ سے یہ علوم وفنون عربی زبان میں منتقل ہوئے اور مسلمانوں میں پھیلے۔

اسی دور میں علم نحو کی تدوین عمل میں آئی۔ علم حدیث کی بھی تدوین اسی زمانہ کی مرہون منت ہے۔ اصول حدیث پر بھی اس زمانے میں کتابیں لکھی گئیں۔ علم فقہ اور علم کلام باضابطہ مدون ہوا۔ طب میں تشریح الابدان پر بڑی بڑی کتابیں وجود میں آئیں۔ علم ہیئت میں بھی عباسیوں کے بڑے کارنامے ہیں۔ مامون رشید نے تو باضابطہ دو بار زمین کے محیط کی پیمائش معلوم کرائی۔

دینی علوم کو دیکھیں تو صحاح ستہ (حدیث شریف کی چھ اہم صحیح ترین کتابیں) اسی زمانہ میں مرتب ہوئیں۔ فقہ کے ائمہ اربعہ (ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد بن حنبل) اسی زمانہ میں ہوئے۔ تفسیر میں طبری اور تاریخ میں مسعودی بھی اسی دور کے ہیں۔ طبری نے چودہ جلدوں میں ایک تاریخی کتاب لکھی ہے جس میں پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ سے اپنے زمانہ تک تین سو برس کی تاریخ تفصیل سے لکھی ہے۔ انھوں نے قرآن مجید کی ایک بہت بڑی تفسیر بھی لکھی ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ وہ کئی بڑی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں۔ طبری کو اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا مصنف مانا جاتا ہے۔ انھوں نے جتنی کتابیں لکھیں آج تک کسی نے نہیں لکھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ روزانہ 14 صفحے لکھا کرتے تھے اور یہ سلسلہ تمام عمر جاری رہا۔

عقلی علوم طب، ریاضی، فلکیات، علم کیمیا، فلسفہ اور دوسرے سائنسی علوم نے بھی اس دور میں بہت ترقی کی۔ یہ علوم مسلمانوں نے پہلی مرتبہ یونانی، سنسکرت اور دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں سے سیکھے لیکن جلد ہی وہ ان علوم پر اس طرح حاوی ہو گئے کہ جیسے یہ ان کے اپنے علوم ہوں۔ انھوں نے ان علوم میں ایسی ایسی کتابیں لکھیں کہ آج بھی وہ اپنے فن کی بنیادی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔

طب میں ابوبکر رازی و بوعلی سینا، فلسفہ میں کندی، فارابی، ریاضیات میں خوارزمی، البیرونی اور خیام اسی زمانہ میں اپنا جوہر کمال دکھاتے نظر آتے ہیں۔

خوارزمی تو اس دور کے سب سے بڑے ریاضی داں تھے۔ انھوں نے ریاضی، الجبرا اور علم فلکیات پر بڑی معیاری کتابیں لکھیں اور ان علوم میں نیا اضافہ کیا۔ یورپ والوں نے گنتی کے ہندسوں اور صفر کا استعمال ان ہی کی کتابوں سے سیکھا۔

رازی کو نہ صرف اسلامی تاریخ میں سب سے بڑا طبیب تسلیم کیا گیا بلکہ دنیا کے سب سے بڑے طبیبوں اور ڈاکٹروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے علم طب پر جو کتابیں لکھیں ان کا بعد میں یورپ کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور ان کی مدد سے یورپ نے علم طب سیکھا۔

عباسی حکومت کے دارالخلافہ بغداد کی علمی ترقی کا یہ حال تھا کہ اس زمانہ کے علماء جب تک بغداد آکر وہاں کے علماء سے علم حاصل نہ کرتے وہ اپنے علم کو نامکمل سمجھتے۔

5.9 سماجی و معاشرتی حالات

عباسی خلافت کے زیر اثر عرب، ترک، ایرانی، پٹھان، سندھی، رومی، مصری، حبشی، بربر اور ہندوستانی قومیں آباد تھیں۔ اسی طرح عیسائیت، بدھ مت، ہندومت، یہودیت وغیرہ مذاہب کے ماننے والے بھی اس زمانہ میں بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ان تمام قوموں کے میل جول سے ایک نئی تہذیب وجود میں آئی اور یہی تہذیب عباسی دور کی سماجی تہذیب تھی۔ اس میں اسلامی روح کے ساتھ غیر اسلامی اثرات کا بھی امتزاج ہو گیا تھا۔ چنانچہ دینی علوم تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام وغیرہ اور عقلی علوم طب، ریاضی، فلسفہ، ہیئت، منطق وغیرہ کے ساتھ موسیقی، مصوری اور گانے کا رجحان بھی سماج میں فروغ پایا۔ رقص و سرود کی محفلیں بھی سجائی جاتیں اور اس پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا جاتا۔ ایرانی اثرات کے نتیجہ میں نجومیوں، کاہنوں اور رمالوں کی طرف بھی لوگ رجوع کرتے اور ان کے

مشورے سے فیصلے کرتے۔ سماج اور معاشرہ پر خالص اسلامی یا عربی رنگ کے بجائے عجمی رنگ کا غلبہ تھا۔ لوگوں کے مکانات عالیشان ہوتے۔ گرمی میں ان کو مختلف طریقے سے ٹھنڈا رکھنے کا اہتمام کیا جاتا اور سردی میں گرم رکھنے کے طریقے اپنائے جاتے۔ کھانے پینے میں تکلفات اور لباس میں خوش پوشی اور عیش پسندی کا مظاہرہ ہوتا۔

حمام کا رواج بکثرت تھا۔ ایک ایک شہر میں بے شمار حمام ہوتے۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا محکمہ بھی حماموں سے خالی نہ ہوتا۔ بعض حمام صرف عورتوں کے لیے ہوتے تھے۔ بعض حمام ایسے تھے جن میں مردوں کے لیے الگ اور عورتوں کے لیے الگ دن متعین ہوتے۔

عورتوں میں پردے کا رواج پایا جاتا تھا۔ باندیاں رکھنے کا بھی بہت رواج ہو گیا تھا اور ان کو گھر کی ضروریات کے علاوہ گانا بھی سکھایا جاتا تھا۔ جس سے معاشرہ میں گانے کا رواج بڑھا اور فسق وفجور اور لہو ولعب کا ماحول بنا۔

عباسی خلافت میں سماج میں عربی اور غیر عربی کی چپقلش اور ایک کو دوسرے سے کمتر سمجھنے کا رجحان پیدا ہوا اور یہ رجحان دن بدن بڑھتا گیا جس نے بعد میں شعوبیت کے نام سے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ جس کا نظریہ تھا کہ عرب دوسروں سے افضل نہیں ہیں۔ اس رجحان کا اثر سماج کے فکر وخیال، ادب وثقافت اور سیاسی زندگی پر بھی پڑا۔ جس کے نتیجہ میں عربوں اور ایرانیوں کی کشمکش اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ شعوبی تحریک کا آغاز تو اس بحث سے ہوا تھا کہ عربوں کو غیر عرب پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے لیکن بہت جلد اس تحریک نے عربوں کی مخالفت کا رنگ اختیار کر لیا اور عرب کی مذمت حتی کہ قریش سمیت ان کے ایک ایک قبیلے کی مذمت میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ انتہا پسند گروہ عربوں سے گزر کر خود اسلام پر حملے کرنے لگے اور غیر عرب حکام نے ان کی ہمت افزائی کی۔ جس کے نتیجے میں لادینیت اور زندقہ کا ایک محاذ کھل گیا جو صرف اعتقادی گمراہیوں تک محدود نہ تھا بلکہ عملاً اخلاقی حدود سے آزادی بھی اس میں شامل ہو گئی۔

معلومات کی جانچ

1. عباسی دور حکومت میں علوم وفنون کے میدان میں کیا ترقی ہوئی؟ بیان کیجیے۔

2. معاشرے پر شعوبیت کی تحریک کا کیا اثر پڑا؟ بیان کیجیے۔

5.10 غیر مسلموں سے تعلقات

عباسی سلطنت ایک وسیع سلطنت تھی جس میں مختلف قومیں اور مختلف مذاہب کے ماننے والے آباد تھے۔ عباسی خلفاء اپنی غیر مسلم رعایا کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ ان کو مکمل مذہبی آزادی حاصل رہتی تھی۔ ان کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کا سامان کیا جاتا۔

ابو جعفر منصور نے حکومت کے نظم ونسق کو بہتر بنانے کے لیے مختلف دفاتر اور محکمے قائم کیے تھے۔ ان میں ایک محکمہ غیر مسلم قوموں کے حقوق کی حفاظت کا بھی تھا۔ اس محکمہ کا ایک افسر مقرر کیا جاتا جس کا کام غیر مسلم قوموں کے حالات بہتر بنانا اور ان کی خوشحالی اور ترقی کا انتظام کرنا تھا۔

حکومت کے متعدد شعبوں میں قابل اور لائق غیر مسلموں کو بھی اچھے عہدوں پر مقرر کیا جاتا۔ ہارون رشید کے زمانہ میں یہودی اور عیسائی علماء کی دربار خلافت میں بڑی قدر ہوتی تھی۔ اس نے عیسائیوں کو فوج کے اعلی عہدوں پر بھی فائز کیا۔ ان کو اپنی خاص مجلس میں جگہ دیتا۔ اس کے زمانہ میں ہندوستان کے علماء سندھ کے گورنر کے ذریعے اور خود براہ راست بھی بغداد پہنچے جہاں ان کی عزت افزائی کی گئی۔

عباسی خلیفہ معتصم نے فضل بن مروان کو اپنا وزیر مقرر کیا تھا جو مذہبا عیسائی تھا۔ وہ حساب و کتاب میں ماہر اور خوشخط تھا۔ اس لیے معتصم نے اس کو وزیر بنا کر تمام ملکی معاملات بھی اس کے سپرد کر دیئے تھے۔

عباسی خلفاء غیر مسلم عالموں، حکیموں، طبیبوں اور شاعروں کی بہت قدر کرتے اور ان کو گرانقدر انعامات دیتے تھے۔ اس داد و دہش کی وجہ سے بعض عیسائی اور یہودی طبیب بغداد میں اس قدر مالدار ہوگئے تھے کہ خلیفہ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص مال و دولت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ متوکل نے اپنے زمانہ میں عیسائیوں کو ایک خاص لباس پہننے کا حکم دیا تھا تا کہ وہ مسلمانوں سے الگ معلوم ہوں۔ لیکن اس کے اس عمل کو کسی اور خلیفہ نے قبول نہیں کیا اور نہ ہی اس کو جاری رکھا۔

عباسی خلفاء غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی مروت اور رواداری کا معاملہ کرتے تھے۔ ان کے مقدمات کے لیے ان کے مذہبی پیشواؤں کو مقرر کر دیا کرتے تا کہ وہ انھیں کے پاس اپنے مقدمات لے جائیں اور فیصلہ کرائیں۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو سیاست تک میں اس قدر عمل دخل حاصل تھا کہ تاریخ پر نظر رکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے۔

5.11 خلاصہ

عباسی دور کا نظام مملکت اموی دور ہی کی طرح مرکزی اور صوبائی انتظامیہ پر مشتمل تھا۔ البتہ وزیر کا ایک نیا عہدہ اس دور میں قائم کیا گیا جو خلیفہ کے جملہ امور و معاملات کو اس کی طرف سے انجام دیتا۔ اس عہدہ پر ذہین ترین اور علم و فضل اور تدبر میں ممتاز افراد کو فائز کیا جاتا۔ عباسی دور کے آغاز میں برامکہ اس عہدہ پر فائز رہے جو بڑے ذہین، ہوشیار، علم و فضل میں ممتاز اور سخی و فیاض لوگ تھے۔ لیکن جب عباسی خلفاء نے یہ محسوس کیا کہ برامکہ کا اثر عوام پر خلفاء سے بھی زیادہ ہو رہا ہے تو انھوں نے ان کا زور توڑا اور دوسرے افراد کو اس عہدے کے لیے نامزد کیا۔

بنو عباس کا فوجی و دفاعی نظام بہت مستحکم تھا۔ جس میں شروع میں عربی و خراسانی عنصر پایا جاتا تھا۔ معتصم کے زمانہ میں ترک فوج کی بھرتی کی گئی اور فوجی تنظیم کو بہتر بنایا گیا۔ مالیاتی نظام ایسا مضبوط تھا کہ رعایا میں خوشحالی بہت عام ہوگئی تھی اور لوگ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے لگے تھے۔

عدل و انصاف کا محکمہ مضبوط بنیادوں پر استوار تھا۔ ہارون رشید کے زمانہ میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) امام ابو یوسف تھے جنھوں نے کتاب الخراج نام سے ایک کتاب ہارون رشید کی فرمائش پر لکھی تھی جس میں خراج، صدقات اور جزیہ وغیرہ کے قوانین تھے اور حکومت و رعایا کے تعلقات، ذمیوں اور مسلمانوں کے حقوق و فرائض اور حکومت کے اعلی عہدیداروں کے اختیارات اور اسلامی حکمرانی کے اصول سے متعلق بڑی قیمتی بحثیں تھیں۔

عباسی حکومت کا تمدن نہایت شاندار تمدن تھا۔ تجارت اور زراعت کو اس دور میں بہت فروغ حاصل ہوا۔ صنعتی میدان میں نمایاں ترقی ہوئی۔ تعمیراتی کاموں کے اعتبار سے بھی یہ دور بہت ممتاز تھا۔ دارالخلافہ ''بغداد'' کو اس طرح بنایا گیا تھا کہ وہ دنیا کا خوبصورت ترین شہر بن گیا تھا۔ کثرت سے رفاہ عام کے کام ہوئے۔ جگہ جگہ اسپتال اور شفا خانے تعمیر ہوئے جن کو بیمارستان کہا جاتا تھا۔

علوم وفنون کی ترقی کے لحاظ سے عباسی دور حکومت ایک زریں دور تھا کہ اس میں علوم عقلیہ اور علوم نقلیہ کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دی گئیں۔ مختلف زبانوں میں پائی جانے والی کتابوں کا اس دور میں عربی زبان میں ترجمہ کرایا گیا اور ان کتابوں کو پڑھنے کی ترغیب دی گئی۔ جس کی وجہ سے لوگوں میں علم سے دلچسپی بڑھی۔ دارالخلافہ بغداد کی علمی ترقی کا یہ حال تھا کہ اس زمانہ کے علماء جب تک بغداد آکر وہاں کے علماء سے علم حاصل نہ کرتے اپنے علم کو نامکمل سمجھتے۔

سماج میں مختلف قوموں اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے میل جول سے اسلامی روح کے ساتھ غیر اسلامی اثرات کا بھی امتزاج ہو گیا تھا۔ بنوامیہ کے زمانہ میں معاشرہ پر عربی رنگ گہرا تھا۔ بنوعباس کے زمانہ میں عجمی رنگ کا غلبہ ہوا۔ شعوبیت کے نام سے ایک تحریک بھی اٹھی جس کا نظریہ تھا کہ عرب دوسروں سے افضل نہیں ہیں۔

عباسی حکومت میں غیر مسلم رعایا کا ہر طرح خیال رکھا جاتا۔ ان کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ایک محکمہ غیر مسلم قوموں کے حقوق کی حفاظت کے لئے باضابطہ قائم کیا گیا تھا۔ اچھے اور قابل غیر مسلموں کو اچھے عہدوں پر بھی فائز کیا جاتا۔ عباسی خلفاء غیر مسلم عالموں، حکیموں، طبیبوں اور شاعروں کی بہت قدر کرتے اور ان کو گرانقدر انعامات دیتے تھے۔ اس داد و دہش کی وجہ سے بعض عیسائی اور یہودی طبیب بغداد میں اس قدر مالدار ہو گئے تھے کہ خلیفہ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص مال و دولت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

5.12 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. عباسی حکومت میں عدل وقضاء کی صورت حال پر روشنی ڈالیے۔
2. عباسی دور میں سماجی حالات کیا تھے؟ بیان کیجیے۔
3. بغداد کی علمی ترقی کی وجہ پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. عباسی دور حکومت میں غیر مسلم رعایا کی کیا حالت تھی؟ بیان کیجیے۔
2. عباسی دور حکومت میں جنگی ہتھیار کیا کیا تھے؟ ذکر کیجیے۔
3. تعمیری لحاظ سے بغداد کی اہمیت بیان کیجیے۔

5.13 فرہنگ

طبیب	ڈاکٹر، حکیم
جراح	سرجن
اسلحہ سازی	آلات جنگ بنانا
پارچہ بافی	کپڑا بنانا
زراعت	کھیتی باڑی
افتادہ	ویران
ثروت	دولت
نرخ	قیمت
ارزاں	سستا
کسب معاش	روزی کمانا
ظروف سازی	برتن بنانا
تشریح الابدان	بدن کے اعضاء کا علم
چپقلش	جھگڑا

5.14 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ — ثروت صولت
2. تاریخ اسلام — شاہ معین الدین ندوی
3. تاریخ اسلام — اکبر شاہ نجیب آبادی
4. تاریخ الامت — محمد اسلم جیراجپوری
5. مختصر تاریخ اسلام — غلام رسول مہر
6. تاریخ ملت — مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی

بلاک:2 اندلس اور صقلیہ میں مسلم حکومت

فہرست

اکائی 6 : اندلس کی حکومت

اکائی کے اجزاء

6.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ سے آپ یہ جانیں گے کہ اسپین یا اندلس کی فتح کب اور کیسے ہوئی۔ مختصراً طارق بن زیاد اور موسی بن نصیر کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے اندلس میں امویوں کی حکومت کے قیام کا ذکر ہوگا۔ یہ بھی بتایا جائے گا کہ عبدالرحمٰن الداخل سے پہلے اندلس پر کن اہم حکمرانوں نے حکومت کی۔

عبدالرحمٰن الداخل کے حالات کا مختصراً تذکرہ کرتے ہوئے اموی حکومت پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔ یہ بھی بتایا جائے گا کہ کس اموی حکمراں نے باقاعدہ خلیفہ ہونے کا اعلان کیا اور اس نے کیا کارنامے انجام دیے۔ اگر چہ زوال بنوامیہ پر باقاعدہ گفتگو نہیں ہوگی لیکن انحطاط کی جانب بڑھتے قدموں کی نشان دہی کی جائے گی۔ اس ضمن میں حاجب المنصور کے کردار پر بحث کرتے ہوئے اس غیر اموی وزیر کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

6.2 تمہید

فتح اندلس (اسپین) کے وقت وہاں ایک ظالم عیسائی حکومت قائم تھی جس سے عوام بالخصوص پریشان تھے۔ اکثریت غلاموں کی سی زندگی بسر کر رہی تھی۔ ملک پر مسلمانوں کی فتح ان لوگوں کے لیے آزادی کا مژدۂ جانفزا ثابت ہوئی۔ آغاز میں مسلم اسپین پر ان امراء نے حکومت کی جن کی تقرری شمالی افریقہ کا وائسرائے کرتا یا پھر دمشق سے خلیفہ خود ان کا انتخاب کرتا۔ یہ انتظام اپنی اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ عبدالرحمٰن الداخل کی حکومت کے قیام تک باقی رہا۔ عبدالرحمان الداخل نے خود کو امیر کہلانا پسند کیا۔ اسپین کی اموی امارت کو عبدالرحمٰن ثالث نے خلافت میں بدل دیا یا یوں کہیں کہ اس نے خلیفہ ہونے کا اعلان کیا جس کے بعد جمعہ کے خطبوں میں اس کا نام پڑھا جانے لگا۔ اموی امراء وخلفاء میں بعض بڑے اچھے اور بعض نااہل تھے۔

اخیر زمانے کے خلفاء بس نام کے خلیفہ تھے۔ اصل اقتدار وزراء اور امراء کے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔ دیکھا جائے تو حاجب المنصور نے ہی اموی خلافت کا خاتمہ کر دیا تھا اگرچہ صاحب اقتدار ہوتے ہوئے بھی اس نے کبھی اپنی خلافت کا اعلان نہیں کیا۔

6.3 فتح اندلس

اندلس یا اسپین پر مسلمانوں کی فتح کے وقت اس ملک کے حالات انتہائی خراب تھے۔ جزیرہ نمائے اسپین پر گوتھ (Goth)، جنھیں عرب مورخوں نے قوط یا قوطی لکھا ہے، نسل کے سلاطین رومن امپائر کی طرف سے حکومت کر رہے تھے۔ آٹھویں صدی کے آغاز میں وِٹیزا (Witiza 702-711ء) نامی قوطی حکمراں کو قتل یا معزول کر کے ایک معمر سردار راڈرک بادشاہ بن بیٹھا تھا جو قوطی نسل سے نہیں تھا۔ یہ نہایت سفاک اور مذہبی جنونیت کا علمبردار تھا۔ اس نے عوام وخواص پر مظالم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ بہت سے قوطی شہزادے اندر ہی اندر اس کے مخالف ہو گئے تھے یا اسے ناپسند کرتے تھے۔

مگر بہت سے عیسائی مذہبی رہنما اس کے حامی تھے کیوں کہ راڈرک یہودیوں کا سخت دشمن تھا۔ دراصل اس نے یہودیوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا جو اندلس میں بڑی تعداد میں آباد تھے۔ راڈرک کی بادشاہت سے پہلے ہی سے یہ یہودی قوطی عیسائی حکمرانوں کے مظالم کا شکار رہتے تھے۔ ایک بار مظالم سے نجات پانے کے لیے انھوں نے بغاوت بھی کی جسے سختی سے کچل دیا گیا۔ ان کے مال واسباب ضبط کر لیے گئے۔ ان گنت لوگ تہِ تیغ کر دیئے گئے اور جو قتل عام کے دوران بچ گئے، انھیں غلام بنا لیا گیا یا ان کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک کیا جانے لگا۔ بوڑھے یہودیوں کو تو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی مگر نوجوانوں اور نومولودوں کو عیسائی مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ یہودیوں کی باہم شادی پر پابندی عائد کر دی گئی اور خاص طور سے یہودی غلام کو عیسائی غلام سے شادی کرنے پہ مجبور کیا جاتا۔ بہت کم خوش نصیب یہودی تھے جو عیسائی حکمرانوں اور پادریوں کے مظالم سے بچ کر مراکش میں پناہ گزیں ہو گئے تھے جو ان دنوں عرب حکمرانوں کے تحت گہوارۂ امن بنا ہوا تھا اور ترقی وخوشحالی کی راہ پر گامزن تھا۔

صرف یہودی ہی نہیں عام عیسائیوں کا حال بھی برا تھا۔ عیسائی عوام کی اکثریت بھی یا تو غلام تھی یا بندھوا مزدور۔ امراء اور پادریوں کا طبقہ تو خوشحال تھا۔ خاص طور سے امراء اپنے محلوں میں عیش کر رہے تھے۔ ان کی دولت وجائداد پر ٹیکس نہیں لگتا تھا لیکن عیسائیوں کا متوسط طبقہ طرح طرح کے ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ نتیجتاً لوگ اپنے حکمرانوں سے مایوس اور بیزار تھے۔ صنعت

وتجارت سرد مہری کا شکار تھی۔ زراعت کا بھی برا حال تھا۔ کھیتوں میں بندھوا مزدوروں اور غلاموں سے کوڑے مار مار کر جبراً کام لیا جاتا اور کھانے کو بس اتنا دیا جاتا کہ وہ زندہ رہ سکیں۔ غلاموں اور مزدوروں کو کسی بھی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے۔ ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا جسے وہ اپنا کہہ سکتے۔ شادی بھی وہ اپنے آقا کی مرضی سے کرتے تھے۔ اگر دو پڑوسی جاگیروں کے مزدور باہم شادی کر لیتے تو ان کی اولادیں دونوں جاگیرداروں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم ہو جاتیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ غلاموں اور مزدوروں کا طبقہ شدید قسم کے مذہبی اوہام ورسوم میں جکڑا ہوا تھا۔ حالات کی بہتری کے کوئی آثار نہیں تھے۔ لوگ بہتری کے لیے تڑپ رہے تھے مگر ہر طرف گھور اندھیرا تھا اور کہیں امید کی کرن نظر نہیں آتی تھی۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا بعض لوگ راڈرک اور پادریوں کے ظلم سے تنگ آ کر مغربی افریقہ (مراکش) میں پناہ گزین ہو گئے تھے جہاں موسیٰ بن نصیر کی حکومت میں امن، عدل اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ یہ اسپینی موسیٰ بن نصیر سے مسلسل اپیل کر رہے تھے کہ ان کے ملک کو راڈرک کے مظالم سے نجات دلائی جائے۔ موسیٰ کو اس اپیل پر اس وقت سنجیدگی سے غور کرنا پڑا جب اندلس کے ساحلی صوبے سبتہ (Ceuta) کے گورنر جولین (Julian) نے بھی اس سے مدد کی درخواست کی۔ جولین معزول و مقتول بادشاہ Witiza کا داماد تھا اور اس کی بیٹی فلورنڈا تعلیم و تربیت کے لیے راڈرک کے محل میں موجود تھی۔ جب وہ جوان ہوئی تو راڈرک اس کے حسن پر فدا ہو گیا اور اس کی عصمت تار تار کر دی۔ اس لیے جولین انتقام کی آگ میں جل رہا تھا اور فتح اندلس میں اس نے کافی مدد کی۔

موسیٰ بن نصیر نے سارے حالات سے دمشق میں خلیفہ ولید کو باخبر کرنے کے بعد اسپین پر حملے کی اجازت چاہی۔ خلیفہ نے احتیاط کی تاکید کے ساتھ اجازت دے دی۔ موسیٰ بن نصیر نے بھرپور حملے سے پہلے ایک جانباز اور مہم جو فوجی سردار طریف بن مالک نخعی کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے اسپین بھیجا۔ طریف نے جنوبی اسپین کے ساحلوں پر ادھر ادھر معمولی حملے کر کے حالات کا اندازہ لگایا اور یہ نتیجہ نکالا کہ اسپین پر بھرپور حملہ کیا جا سکتا ہے۔

موسیٰ بن نصیر نے طنجہ کے والی طارق بن زیاد کو اندلس پر حملے کے لیے منتخب کیا۔ طارق پہلے موسیٰ کا غلام تھا اور اس کی صلاحیتوں کی وجہ سے انھوں نے اسے آزاد کر دیا تھا۔ 711ء میں طارق بن زیاد صرف سات ہزار فوجیوں کے ساتھ اندلس میں داخل ہوا۔ وہ جگہ جہاں سب سے پہلے مسلم فوجیں اتریں، اسے جبل الطارق یا جبرالٹر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ایک ذہین جنرل کی طرح طارق نے سب سے پہلے جبل الطارق کے علاقے میں خود کو ہر طرح سے مضبوط کیا اور اس کے بعد قریبی جزیرہ الخضراء (Algeciras) صوبے پر چڑھائی کی جہاں راڈرک کی طرف سے Theodomir تدمیر گورنر تھا۔ اس نے مزاحمت کی مگر مسلمانوں نے اسے زبردست شکست دی۔ اس نے راڈرک کو خبر دی کہ "ہماری سرزمین پر ایک قوم اتر پڑی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ آسمان سے نازل ہوئی ہے یا زمین سے نکل پڑی ہے"۔

تدمیر (Theodomir) کو شکست دینے کے بعد طارق نے طلیطلہ (Toledo) کی طرف مارچ کیا۔ راڈرک اس وقت شمالی اسپین میں برپا ایک بغاوت کو کچلنے میں مصروف تھے۔ مسلمانوں کے حملے کی خبر سن کر وہ واپس ہوا اور اپنے سارے گورنروں اور دوسرے ماتحتوں کو قرطبہ میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ راڈرک کی تیاریوں کی خبر سن کر طارق بن زیاد نے موسیٰ بن نصیر سے مزید فوج کی درخواست کی جس کے نتیجے میں اصل معرکے سے پہلے پانچ ہزار فوجیوں کی کمک پہنچ گئی۔

راڈرک کی فوج کا اندازہ ایک لاکھ لگایا گیا ہے جو بہترین فوجی ساز و سامان سے لیس تھی۔ 92ھ یا ستمبر 711ء میں وادی لکہ میں دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں۔ مقابلہ شروع ہوا تو پہلے ہی حملے کے بعد معزول مقتول بادشاہ Witiza کے لڑکوں اور بعض دوسرے شہزادوں نے راڈرک کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مگر راڈرک کی فوج اب بھی بڑی طاقتور تھی۔ مسلمانوں کا دوسرا بھرپور وار بھی راڈرک کا بال بیکا نہ کر سکا۔ لیکن تیسرا حملہ بہت زبردست تھا جس کی قیادت طارق بن زیاد خود کر رہا تھا۔ بڑی ہوشیاری سے لڑتا ہوا طارق راڈرک کے ساتھ آ گیا۔ مقابلہ کرنے کے بجائے راڈرک نے راہ فرار اختیار کی مگر طارق نے اسے گھیر لیا۔ جان بچانے کے لیے وہ دریا میں کود گیا اور ڈوب کر مر گیا۔

راڈرک کی موت کی خبر کے پھیلتے ہی باقی ماندہ فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ طارق کو زبردست تاریخ ساز کامیابی ملی۔ اس نے فوراً موسیٰ بن نصیر کو فتح کی خوشخبری ارسال کی اور آس پاس کے شہروں اور علاقوں کو فتح کرنا شروع کر دیا۔ فتح کی خبر سننے کے بعد موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کو آگے بڑھنے سے منع کیا۔ مگر طارق راڈرک کی شکست خوردہ فوج کو ازسرِنو منظم ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ وائسرائے کے حکم کو نظر انداز کر کے اس نے پیش قدمی جاری رکھی۔ شذونہ (Sidonia) اور قرمونہ (Carmona) آسانی سے فتح ہو گئے، استجہ (Ecija) جہاں راڈرک کی شکست خوردہ باقی ماندہ فوج نے پناہ لے رکھی تھی، نے ابتداء مزاحمت کی مگر پھر ایک صلح نامے کے ذریعے شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا گیا۔

طارق بن زیاد نے اپنی فوج چار حصوں میں تقسیم کی۔ ایک فوجی ٹکڑی یا ڈویژن کو قرطبہ، دوسری کو مالقہ (Malaga) تیسری کو غرناطہ اور ایلویرا کو فتح کرنے کے لیے روانہ کیا جب کہ چوتھی ڈویژن، جو سب سے اہم تھی، اسے خود لے کر قوطی حکومت کے دارالحکومت طلیطلہ (Toledo) کی طرف بڑھا۔ غرناطہ، مالقہ (Malaga) اور قرطبہ آسانی سے فتح ہو گئے۔ قوطی فوجیوں کے دل جیسے خوف و دہشت سے بھر گئے تھے۔ وہ کہیں بھی جم کر نہ لڑ سکے۔ طارق کی فوج کی تیز رفتاری انھیں حیران کیے دیتی تھی اور اس کے حملوں کی شدت ان کی برداشت سے باہر تھی۔ امراء و روساء ایک شہر سے دوسرے شہر بھاگے بھاگے پھر رہے تھے اور مذہبی علماء فرار ہو کر روم چلے گئے تھے۔ عام لوگوں، خصوصاً یہودیوں، مزدوروں اور غلاموں نے آگے بڑھ کر طارق کی فوجوں کا ہر جگہ استقبال کیا۔ طارق جب طلیطلہ پہنچا تو قوطی فوج، امراء و روساء اور مذہبی رہنما سبھی شہر چھوڑ کر فرار ہو چکے تھے۔ شہر کی ذمہ داری معزول و مقتول بادشاہ Witiza کے ایک بھائی کی نگرانی میں دے کر طارق نے پسپا ہو رہی قوطی فوج کا تعاقب جاری رکھا۔

دریں اثناء موسیٰ بن نصیر 18000 فوجیوں کے ساتھ اندلس میں داخل ہوئے جن میں بہت سے تابعین اور بعض اہم یمنی خاندانوں کے روٴساء شامل تھے۔ وہ اشبیلیہ (Seville) اور ماردہ (Merida) کو فتح کرتے ہوئے طلیطلہ پہنچے اور وہاں ان کی ملاقات طارق بن زیاد سے ہوئی۔ روایتوں کے مطابق دونوں جنرلوں میں بحث مباحثہ بھی ہوا کیوں کہ طارق بن زیاد نے حکم عدولی کی تھی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ موسیٰ نے طارق کو سزا بھی دی مگر یا تو دوسرے امراء کی کوششوں سے یا پھر خود ایک جہاں دیدہ جنرل ہونے کی وجہ سے موسیٰ نے طارق کی فوجی مصلحتوں کا ادراک کر لیا اور اس طرح دونوں فاتحین بغل گیر ہو گئے۔ پھر دونوں فوجیں ایک ساتھ اسپین کے باقی شہروں اور علاقوں کی فتح کے لیے نکل پڑیں۔

ارغون (Aragon) کی طرف بڑھتے ہوئے مسلم فوج نے سرقسطہ (Saragossa) طرکونہ (Tarragona)، بارسلونا اور شمالی اسپین کے دوسرے شہروں کو فتح کیا۔ دو سال سے کم عرصے میں موسی اور طارق کی قیادت میں تقریباً پورا اسپین، جنوب سے شمال تک یعنی Pyrenees (جبل البرانس یا جبل البرتات) تک فتح ہو گیا۔ وہ علاقے جنھیں پرتگال کہا جاتا ہے، چند سال بعد فتح ہوئے اور اسے ایک نئے صوبے الغرب کا نام دیا گیا۔ اب عیسائی اسپینی صرف شمال کے پہاڑوں میں چھپنے پر مجبور ہو گئے تھے اور مزاحمت بھی کر رہے تھے۔

موسیٰ بن نصیر نے باقی ماندہ مزاحم علاقوں کی فتح کی ذمہ داری طارق کو سونپتے ہوئے اسے جلیقیہ (Galicia) میں رہنے کا حکم دیا اور خود فرانس کی طرف آگے بڑھا اور ان علاقوں کو فتح کر لیا جو قوطی بادشاہت کا حصہ تھے۔ جہاں دیدہ جنرل نے یہاں سے پورے یوروپ کو فتح کرنے کا خواب دیکھا اور اپنی اسکیم سے خلیفہ ولید کو دمشق میں آگاہ کیا۔ اس وقت پورا یوروپ منتشر تھا اور کوئی بھی عیسائی حکمراں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ موسی بن نصیر کی پیش قدمی کو روک پاتا۔ اس لیے غالب امکان یہی تھا کہ اگر موسیٰ بن نصیر کو اجازت مل جاتی تو شاید وہ پورا مغربی یوروپ فتح کر لیتے۔ ولید یوروپ کے اس میدان جنگ سے بہت دور تھا اور شاید نئے علاقوں میں وہ مسلمان فوجیوں کو ان خطروں میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا جن کا اسے پورا علم نہیں تھا۔ واضح رہے کہ اس نے فتح اسپین کی اجازت بھی ہچکچاہٹ کے ساتھ دی تھی۔ موسیٰ بن نصیر فرانس کو فتح کر کے اٹلی میں داخل ہونے کے لیے بالکل تیار تھے کہ ولید کی طرف سے حکم آیا کہ آگے نہ بڑھا جائے۔ اس حکم سے کسی کا فائدہ یا نقصان ہوا ہو یا نہ ہوا لیکن ایک بات تو طے ہے کہ خلیفہ ولید کی ہچکچاہٹ کی وجہ سے مغربی یوروپ کئی سو سالوں کے لیے علم وتہذیب کی روشنی سے محروم ہو گیا۔

یوروپ فتح کرنے کی اجازت نہ ملنے کے بعد موسی بن نصیر جلیقیہ (Galicia) لوٹ آئے اور اَستوریا (استوراس) کے پہاڑوں میں چھپے گوریلاؤں کی سرکوبی کی مہم چھیڑ دی۔ یکے بعد دیگرے انھوں نے کئی گوریلا گروپوں کی سرکوبی کی اور صرف بلائی (Pelayo) اپنے چند حامیوں کے ساتھ بچا تھا۔ بلائی (Pelayo) کے ہتھیار ڈالتے ہی اسپین کی فتح مکمل ہو جاتی اور جس طرح وہ چاروں طرف سے گھر گیا تھا، اس کے پاس ہتھیار ڈالنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ مگر عین اسی وقت موسی اور طارق کے لیے ولید کا حکم آیا کہ وہ دونوں دمشق کے دربار خلافت میں حاضری دیں۔ ولید کے حکم کے پیچھے جو بھی مصالح رہے ہوں، لیکن بلائی (Pelayo) کو سرنگوں کیے بغیر دونوں جنرلوں کی واپسی بعد کی مسلم حکومتوں کے لیے ایک مصیبت ثابت ہوئی۔ ان پہاڑوں کو پناہ بنا کر عیسائیوں نے مزاحمت جاری رکھی اور پھر کئی سو سال بعد اندلس سے مسلمانوں کو نکال کر ہی دم لیا۔

6.4 موسی بن نصیر اور طارق بن زیاد کی واپسی

موسی بن نصیر صرف طارق بن زیاد کے شریک فاتح اندلس نہیں تھے۔ وہ افریقہ میں اموی حکومت کے مقرر کردہ والی تھے۔ خلیفہ کے حکم کے مطابق دمشق واپسی سے پہلے انھوں نے اندلس اور افریقہ میں حکومت کا باقاعدہ انتظام کیا۔ اشبیلیہ کو دارالحکومت بنا کر انھوں نے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اندلس کا وائسرائے بنایا۔ اپنے دوسرے بیٹے عبداللہ کو جو جانباز فوجی جنرل تھے، افریقہ کا انتظام سونپا اور مراقش (مغرب اقصی) کی حکومت اپنے تیسرے بیٹے عبدالملک کے حوالے کی جب کہ عبدالصالح کو ساحلی علاقوں میں بحری بیڑے کی ذمہ داری دی۔ یہ سارا انتظام کرنے کے بعد وہ طارق بن زیاد کے ساتھ دمشق کے لیے روانہ ہو گئے۔

موسی بن نصیر ابھی راستے میں تھے کہ انہیں ولید کا دوسرا خط ملا جس میں خلیفہ کی بیماری کی خبر تھی اور ان سے جلد پہنچنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اس خط کے بعد موسی بن نصیر کو دوسرا خط ولی عہد سلیمان بن عبدالملک کی طرف سے ملا جس میں یہ ہدایت تھی کہ وہ دمشق پہنچنے میں عجلت نہ کریں۔ ایسا لگتا ہے کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک نے موسی کو خاص مقصد سے بلایا تھا۔ وہ اپنے والد عبدالملک کی وصیت میں تبدیلی چاہتے تھے تاکہ ان کے بعد سلیمان خلیفہ نہ بن سکے۔ موسی باثر یمنی تھے۔ ان کے والد امیر معاویہ کے حامی تھے اگرچہ حضرت علی کے خلاف جنگ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ شاید خلیفہ ولید موسی کے ذریعے یمنی عربوں کا تعاون چاہتے تھے جنھیں حجاج بن یوسف نے حاشیہ پر ڈال دیا تھا۔ شاید سلیمان نے اسے بھانپ لیا تھا اور اسی لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ موسی بیمار خلیفہ سے ملاقات کریں۔

موسی بن نصیر سلیمان کے حکم کو نظر انداز کر کے ولید سے ملنے دمشق پہنچ گئے۔ بیمار خلیفہ نے ان کا والہانہ استقبال کیا۔ مگر سلیمان کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ چنانچہ ولید کے انتقال کے بعد اس نے ان سے بھرپور بدلہ لیا۔ ان کے کارناموں کو نظر انداز کر کے ان کے سارے اعزازات چھین لیے۔ ان کے بیٹے عبدالعزیز کو زہر دے کر مروانے میں بھی اس کا ہاتھ بتایا جاتا ہے۔ بہر حال موسی بن نصیر کی باقی زندگی غربت و بے بسی میں گزری۔ سلیمان شاید تاریخ انسانی کے گنے چنے حکمرانوں میں ہوگا جس نے قتیبہ بن مسلم، محمد بن قاسم، موسی بن نصیر اور طارق بن زیاد جیسے عظیم الشان جنرلوں کو بے عزت کیا، انہیں یا تو قتل کرا دیا یا ذلت و گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔

6.5 عبدالرحمٰن الداخل

عبدالرحمٰن الداخل کی کہانی بڑی رومانی ہے۔ جب عباسیوں کو امیوں کے مقابلے فتح حاصل ہوئی اور اموی شہزادے ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیے جانے لگے تو وہ کسی طرح بچ کر شمالی افریقہ پہنچ گیا اور وہاں بربروں کے درمیان پناہ حاصل کی۔ پڑوسی ملک اسپین میں بہت سے عرب خاندان آباد تھے جن کے بنو امیہ سے گہرے تعلقات تھے۔ عبدالرحمان الداخل بہت جلد ان کے رابطہ میں آ گیا۔

موسی بن نصیر کی اسپین سے واپسی اور بنو امیہ کے زوال کے درمیان تقریباً ۴۰ سال کا عرصہ ہے۔ اس دوران 22 سے زائد گورنروں نے اسپین پر حکومت کی۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، پہلا گورنر خود موسی بن نصیر کا بیٹا عبدالعزیز تھا جسے زہر دے کر قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۲۱ مزید اور گورنر ہوئے جن میں سے ایک آدھ کو خود اندلسی فوج نے منتخب کیا۔ مگر زیادہ تر کا انتخاب یا تو دمشق کا خلیفہ خود کرتا یا افریقہ میں اس کا وائسرائے کرتا۔ گورنروں کی بار بار کی تبدیلی اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ دارالخلافہ کے حالات اچھے نہیں تھے یا شاید خلفاء یا افریقہ میں ان کے والیان کو ہمیشہ یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ اندلس کا گورنر کہیں اتنا طاقتور نہ ہو جائے کہ اپنی آزادی کا اعلان کر دے۔

جب عبدالرحمٰن الداخل نے بربروں کے درمیان پناہ حاصل کی تو اسے اسپین کے حالات معلوم ہوئے۔ یہاں مسلمان تین گروپوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ (1) عرب تھے جنھیں اسلام کی تعلیمات کے برخلاف اپنے عرب ہونے پر بڑا غرور تھا۔ حکومت کے زیادہ مناصب انہیں کے پاس تھے۔ (2) دوسرے بربر مسلمان تھے جو بڑی تعداد میں فوج میں موجود تھے لہٰذا انہیں عربوں کا نسلی غرور ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ چنانچہ جب بھی موقع ملتا، یہ عربوں کے خلاف بغاوت کر دیتے۔ (3) پھر اسپینی نسل کے مقامی لوگ تھے

• جنہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ انہیں عربوں اور بربروں دونوں سے شکایت تھی۔ عربوں سے ان کی نسلی برتری کے بیجا غرور کی وجہ سے اور بربروں سے ان کی وحشت اور لاقانونیت کی وجہ سے۔ پھران تینوں گروہوں میں آپسی ٹکراؤ بھی تھے خصوصاً یمنی اور مصری عربوں کے درمیان۔ شاید اندلس میں مسلمانوں کے زوال میں ان باہمی جھگڑوں کا اتنا ہی رول ہے جتنا عیسائی حکمرانوں کی سازشوں اور حملوں کا۔

6.6 اندلس میں اموی حکومت کا قیام

عبدالرحمٰن الداخل جب بچ بچا کر شمالی افریقہ پہنچا ہے تو یہاں عباسی انقلاب کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔ والی افریقہ عبدالرحمٰن بن حبیب ابھی بھی امویوں کا وفادار تھا اور اس نے بظاہر عبدالرحمٰن الداخل کا استقبال بھی کیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد اس نے عبدالرحمان کے عزائم کو بھانپ لیا اور اس کا مخالف ہوگیا۔ اس نے عبدالرحمٰن کو گرفتار کرنے کی کوشش بھی کی مگر اسے ناکامی ہوئی۔ عبدالرحمٰن الداخل پہلے ہی اسپین کے بعض یمنی سرداروں کے رابطے میں آچکا تھا اور انہیں کی دعوت پر ستمبر 755ء میں المنکب نامی ساحل پر اترا۔ یمنی عربوں نے بڑھ کر گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ بعض بربر اور دوسرے قبائل کے عرب بھی اس سے آملے۔

اس وقت اسپین میں یوسف فہری گورنر تھے جو نام کے لیے عباسیوں کے ساتھ ہوگئے تھے ورنہ ہر معاملے میں وہ خود مختار تھے۔ مئی 756ء میں عبدالرحمٰن اور یوسف فہری کی فوجیں مصارہ کے میدان میں متصادم ہوئیں۔ عبدالرحمٰن الداخل کو غیر معمولی کامیابی ملی۔ یوسف فہری کو نہ صرف شکست ہوئی بلکہ ان کے بہت سے فوجی مارے گئے یا انھیں اپنی جان بچانے کے لیے خودسپردگی کرنی پڑی۔

جنگ مصارہ میں کامیابی کے بعد عبدالرحمٰن الداخل نے جولائی میں قرطبہ کو فتح کیا جہاں اس نے اپنی حکومت کا اعلان کردیا۔ اس نے عباسی خلیفہ سے کوئی رشتہ نہیں رکھا۔ جمعہ کے خطبے سے اس کا نام ساقط کردیا لیکن خود خلافت کا دعویٰ کرنے کے بجائے امیر کا لقب اختیار کیا۔

عبدالرحمٰن الداخل شام سے فرار ہوکر شمالی افریقہ میں بربروں کے درمیان رہائش اور اسپین میں حکومت حاصل کرنے تک کے پرمشقت سفر کے دوران نوجوان ہوتے ہوئے بھی تجربات کے لحاظ سے بوڑھا ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس نے عہد کیا کہ وہ ان غلطیوں کو نہیں دہرائے گا جو سابق اموی حکمرانوں سے سرزد ہوتی رہی تھیں۔ عربیت پر بیجا فخر کرنے کے بجائے اس نے تمام مسلمانوں کے درمیان عدل وانصاف سے کام لینے کو ترجیح دی۔ حکومت سنبھالتے ہی اس نے اعلان کردیا کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور حکمراں ہونے کے ناطے یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ سب کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کرے۔

مگر بدقسمتی سے مسلم معاشرہ نسلی وقبائلی تعصبات میں پھنسا ہوا تھا۔ خود عبدالرحمٰن کے اپنے بعض ساتھیوں کو اس کی عدل وانصاف والی پالیسی ہضم نہیں ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے اس کے خلاف بغاوت کردی۔ چھوٹی بڑی دوسری بغاوتیں بھی ہوئیں مثلاً یوسف فہری اور اس کے داماد کی بغاوت۔ ان ساری بغاوتوں کو عبدالرحمٰن الداخل نے سختی سے کچل دیا۔

عبدالرحمٰن الداخل کو دو بڑی جنگیں لڑنی پڑیں۔ 763ء میں عباسی خلیفہ المنصور نے شمالی افریقہ میں اپنے والی علاء بن مغیث کو امیر عبدالرحمٰن الداخل کی سرکوبی کا حکم دیا۔ المنصور نے الداخل کو خارجی اور کافر بھی قرار دیا۔ مگر میدان جنگ میں اس کا پلہ بھاری

رہا اور اس نے عباسی فوج کو زبردست شکست دی۔ علاء بن مغیث اپنے قریبی ساتھیوں کے ساتھ مارے گئے اور اس طرح الداخل نے عباسیوں کے چیلنج کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

عبدالرحمٰن الداخل کو دوسری بڑی جنگ اس وقت پیش آئی جب بعض مسلمان باغیوں کی حمایت میں شاہ فرانس شارلیمان (Chorlemagne) نے اسپین پر حملہ کر دیا۔ عبدالرحمٰن الداخل کے ایک سردار یحیٰی انصاری نے جو سرقسطہ (Saragossa) کے گورنر تھے، شارلیمان کی فوج کو زبردست شکست دی اور اسے معاہدہ امن پر دستخط کرنے پر مجبور کر دیا۔

عبدالرحمٰن الداخل تمام عمر اندرونی بغاوتوں کو کچلنے اور خارجی حملوں سے ملک کو محفوظ رکھنے میں مصروف رہا۔ دوست دشمن سبھی اس کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ بلاشبہ بعض بغاوتوں کو کچلنے کے دوران اس کا رویہ سخت رہا لیکن بنیادی طور پر وہ نرم فطرت کا انسان تھا۔ وہ آرٹ اور شعر و ادب کا دلدادہ تھا۔ سید امیر علی نے اپنی کتاب A short History of the Saracens میں ابن اثیر کے حوالے سے لکھا ہے کہ الداخل لمبے قد کا دبلا پتلا انسان تھا جس کی ناک شکرے کی چونچ جیسی تھی یعنی لمبی، اونچی اور آخری حصہ ذرا جھکا ہوا۔ شاید اسی مشابہت کی بنیاد پر اس کا معاصر عباسی حکمران المنصور اسے صقر قریش یعنی قریش کا باز کہتا تھا۔ وہ عالم، علم دوست اور شاعر تھا۔ ذہین، بردبار، صاحب بصیرت، سخی اور آزاد خیال تھا۔ ہر وقت کام میں مصروف رہتا اور کبھی تکان کا شکوہ نہ کرتا، اس نے دارالحکومت قرطبہ میں پارک اور عالی شان عمارتیں تعمیر کروائیں۔ اس نے مسجد قرطبہ کی تعمیر کا آغاز بھی کیا گو اس کی تکمیل اس کی موت کے بعد ہوئی۔ مسلسل جنگوں میں مصروف رہنے کے باوجود وہ اپنی رعایا کی طرف سے غافل نہ تھا۔ عدل کے قیام پر اس نے خصوصی توجہ دی۔ شہروں میں امن قائم کیا جس سے تجارت کو فروغ ملا۔ اس کی عدل پروری کی وجہ سے بعض امراء ناراض رہتے کہ وہ انھیں ظلم سے باز رہنے کی تلقین کرتا تھا۔

عبدالرحمٰن الداخل اپنے آباء و اجداد کی طرح مرکزی حکومت کے استحکام میں یقین رکھتا تھا۔ مگر عرب امراء مضبوط مرکزی حکومت کے بجائے ایک کمزور فیڈریشن چاہتے تھے تاکہ بادشاہ ان کے معاملات میں مداخلت نہ کرے اور وہ اپنے قوانین کے مطابق رعایا سے پیش آئیں۔ یہ صرف عبدالرحمٰن الداخل کا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ مسئلہ ان عیسائی حکمرانوں کو بھی درپیش تھا جو مضبوط مرکزی حکومت چاہتے تھے۔ اس تشریح کی روشنی میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بادشاہوں کے خلاف ان کے اپنے والی اور امراء اکثر و بیشتر بغاوت کیوں کرتے تھے۔

33 سال حکومت کرنے کے بعد عبدالرحمٰن الداخل کا انتقال ہوا اور اس کی وصیت کے مطابق اس کا تیسرا بیٹا ہشام تخت نشین ہوا۔ اسے سب سے پہلے خود اپنے بھائیوں کی سرکوبی کرنی پڑی جو باغی ہو گئے تھے۔ بعض دوسری بغاوتیں بھی کچلنے کے بعد اسے ذرا اطمینان ملا۔ ہشام نرم مزاج مگر عدل پرور اور فیاض حکمران تھا۔ وہ عالی ظرف اور بہترین اخلاق کا مذہبی شخص تھا۔ بعض لوگوں نے اس کا موازنہ عمر ابن عبدالعزیز سے کیا ہے۔ وہ بھیس بدل کر سڑکوں پر نکل جاتا اور غرباء کے حالات بذات خود معلوم کر کے ان کی مدد کرتا۔ یہ کام وہ بارش اور برف باری کے دوران بھی کرتا۔ وہ اکثر مریضوں کی تیمارداری کرنے خود جاتا، غرباء کے گھر جا کر بذات خود ان کی روداد سنتا، وہ عامتہ الناس سے ملتا اور ان کی شکایتیں سن کر انھیں دور کرتا۔ وہ مظلوموں کی دادرسی کرتا اور ظالموں کو سزائیں دیتا۔ وہ فتنہ و فساد برداشت نہ کرتا اور بغاوتوں کو سختی سے کچل دیتا لیکن اپنی رعایا کے تئیں نہایت نرم دل اور ان کا خیال رکھنے والا تھا۔ اس کا دور اسی لیے کافی خوشحال تھا۔ اس نے جامع قرطبہ کی تعمیر مکمل کی اور شہر کو مزید خوبصورت بنانے کے لیے کئی پارک اور عالی شان عمارتیں تعمیر کروائیں۔

رعایا کے تئیں نرمی، عدل پروری اور باغیوں کے ساتھ سختی کی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے ملک میں امن و امان قائم ہو گیا۔ ہشام اس کے بعد شمالی اسپین میں سرگرم عیسائی گوریلاؤں کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ سرحدی گاؤں اور شہروں پر حملہ کرتے اور کافی تباہی مچاتے۔ صرف لوٹ مار نہ کرتے بلکہ معصوم عوام کا قتل بھی کرتے۔ ہشام نے ان کی سرکوبی کے لیے اقدامات کیے اور اسے کامیابی بھی ملی۔ لیکن یہ جیسے نہ ختم ہونے والا دردِ سر تھا جس سے تقریباً تمام ہی مسلمان حکمرانوں کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح دوسرا دردِ سر اندرونی بغاوتوں کا تھا جو وقتاً فوقتاً مختلف اسباب سے پھوٹتی رہتیں۔ بعض باغیوں کو فرانسیسی حکمرانوں کی اعانت حاصل ہوتی۔ دراصل وہی اکثر لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرتے۔ چنانچہ ہشام نے ان کے خلاف فوجی کاروائی کی اور انھیں سبق سکھایا۔

ہشام علم دوست تھا اور علماء کی بڑی قدر کرتا۔ اسے امام مالکؒ سے خاص عقیدت تھی چنانچہ اس نے اسپین میں مالکی فقہ کو رائج کیا۔ اس کی کوششوں سے مالکی فقہ ایک طرح سے مسلم اسپین کا ریاستی مذہب بن گئی۔ اس کے دور میں علماء کو نہ صرف اس کے دربار میں بلکہ عوام میں بھی بڑا وقار حاصل ہوا۔

ہشام کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا حکم تخت نشیں ہوا۔ یہ عقلمند، بہادر اور اولوالعزم تھا۔ اگر چہ اس کی طبیعت عیش و آرام کی طرف آمادہ تھی اور اپنے والد کے برعکس جاہ و شوکت کا دلدادہ تھا۔ سادگی پسند بالکل نہ تھا۔ اپنے والد کی طرح اسے بھی اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسے اس زمانے کا معمول بن گیا تھا۔ جب بھی کوئی حکمراں تخت پر بیٹھتا اسے دوسرے امیدواروں کی طرف سے بغاوت کا سامنا کرنا پڑتا۔ حکم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس کے سامنے ایک نیا چیلنج بھی آیا یعنی علماء کا چیلنج جنھیں اس کے والد کے دور میں کافی عروج حاصل ہوا تھا۔ اس نے کئی عالموں کو تختہ دار پر چڑھا دیا اور بہت سے علماء قرطبہ سے ہجرت کر گئے۔ آخری عمر میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چنانچہ توبہ و استغفار کے علاوہ وہ اکثر وقت تلاوت کلام پاک میں مصروف رہتا۔ حکم کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تنخواہ دار فوج ملازم رکھی اور ایک ہزار گھوڑ سواروں کا ایک دستہ ہر وقت اس کے محل کے سامنے کھڑا رہتا جس کی وجہ سے وہ بڑی تیزی سے فوجی کاروائی کرتا۔

حکم کے بعد اس کا بیٹا عبدالرحمٰن ثانی تخت پر بیٹھا۔ اس کے بعد کئی اور اموی امراء حکمراں ہوئے اور سبھوں کو کم و بیش انھیں مسائل سے دوچار ہونا پڑا جو عبدالرحمٰن الداخل، ہشام اور حکم کو پیش آئے تھے۔ ان حکمرانوں میں سے بعض نے کامیابی سے چیلنجوں کا سامنا کیا اور ملک کو ترقی کے راستے پر آگے بڑھایا۔ مثلاً عبدالرحمٰن ثانی نے اندرونی و بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ملک میں تجارت کے فروغ کے لیے شاہراہیں بنوائیں۔ مگر بعض دوسرے حکمراں اتنے اہل نہ تھے۔ چنانچہ وہ خانہ جنگیوں اور بیرونی حملوں کا کامیابی سے مقابلہ نہ کر سکے۔

6.7 عبدالرحمٰن الثالث

اندلس میں امویوں کی تاریخ میں اس وقت بڑا موڑ آیا جب 912ء میں عبدالرحمان الثالث تخت نشیں ہوا۔ تخت پر بیٹھتے وقت اس کی عمر صرف 22 سال تھی۔ اسے وراثت میں ایک کمزور حکومت ملی تھی۔ سرکاری خزانہ تقریباً خالی تھا۔ ریاستوں کے گورنر خود مختار ہو گئے تھے۔ روزانہ نت نئی بغاوتیں سر اٹھا رہی تھیں۔ اندرونی شورشوں اور بغاوتوں کے علاوہ سرحد پر حالات قابو سے باہر تھے۔

شمالی افریقہ میں فاطمی شیعوں نے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا تھا جو اندلس پر بری نگاہ رکھتے تھے۔ شمالی اسپین کی سرحدوں پر پرتگال اور فرانس کے علاقوں سے عیسائی حکمراں حملے کر رہے تھے۔

نوجوان امیر نے سارے چیلنجوں کا بڑی پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ وہ بڑا اولوالعزم، بہادر اور مخلص حکمراں تھا۔ اس میں قیادت کی فطری صلاحیت موجود تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے تمام بغاوتوں کو فرو کیا۔ ان صوبوں کو دوبارہ زیرنگیں کیا جنھوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ البیرہ، مالقہ، استجہ اور جیان پر اس کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ شمالی اسپین کے پہاڑوں میں چھپے گوریلاؤں کے خلاف بھی اس نے موثر کاروائی کی جس کی وجہ سے وہاں آباد شہروں میں امن وامان کی فضا قائم ہوئی۔ شمالی سرحدوں پر یوروپ کی عیسائی ریاستیں حملے کرتی رہتی تھیں۔ عبدالرحمٰن ثالث نے ان کے خلاف چڑھائی کی اور کئی معرکوں میں انھیں شکست دی۔

اندرونی شورشوں کو فرو کرنے اور بیرونی حملوں سے سرحدوں کو محفوظ کرنے میں عبدالرحمٰن الثالث کو 15 سال لگ گئے۔ ذرا سکون ملا تو اس نے ملک کی ترقی پر توجہ دی۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خود اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب عباسی خلفاء کے ہاتھوں سے اقتدار نکل کر وزراء اور امراء کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔ اس کا فائدہ اٹھا کر فاطمیوں نے شمالی افریقہ پر قبضہ کر کے وہاں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ عبدالرحمٰن ثالث کو اپنے جد امجد عبدالرحمٰن اول کی یہ پالیسی کہ مسلمانوں میں ایک ہی خلیفہ رہنا چاہیے، اب بے معنی نظر آنے لگی۔ چنانچہ اس نے اسپین میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اس نے اپنے لیے خلیفہ الناصر لدین اللہ کا لقب پسند کیا اور حکم جاری کیا کہ جمعہ کے خطبوں میں اس کا نام امیرالمومنین کی حیثیت سے لیا جائے۔ اس نے نئے سکے جاری کیے جن پر اس کا نام بطور خلیفہ درج تھا۔ اس نے سونے کے دینار تیار کرائے اور ان پر اپنا نام اور لقب کندہ کرایا تاکہ عوام و خواص سب آگاہ ہو جائیں کہ وہ مسلمانوں کا خلیفہ ہے۔

عبدالرحمٰن ثالث کو یقین تھا کہ فاطمی حکمراں اسپین پر بری نظر رکھتے ہیں۔ بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ بعض آزاد عیسائی امراء اور مسلمان روساء سے وہ رابطے میں بھی تھے اور عبدالرحمٰن ثالث کے خلاف بغاوتوں کو ہوا دیتے تھے۔ عبدالرحمٰن الثالث نے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے افریقہ کے شیعہ مخالفین کی حمایت شروع کر دی اور حملہ کر کے ایک بڑے علاقہ پر قبضہ بھی کر لیا۔ اسی طرح ان کے کسی ممکنہ حملہ کو روکنے اور لوٹ مار کرنے والے قزاقوں سے حفاظت کے لیے اس نے زبردست بحری بیڑہ تیار کیا جس سے دوست دشمن سبھی خوف کھاتے تھے۔ اس نے سڑکیں تعمیر کرائیں اور تجارت کو فروغ دیا۔ پارک بنوائے۔ عالیشان عمارتیں بھی بنوائیں۔ اس نے پولس کے شعبہ پر کافی توجہ دی اور اس نظام کو اتنا بہترین بنایا کہ تاجر اور سیاح بلا خوف پورے ملک میں سفر کرنے لگے جس سے ملک میں خوشحالی آئی۔ اس نے مارکیٹ پر بھی خصوصی نظر رکھی جس کی وجہ سے جمع خوری ختم ہوئی اور اشیاء سستے داموں ملنے لگیں۔ عام خوشحالی کا یہ عالم تھا کہ کسان بھی اچھے لباس پہنتے جو ان میں سے اکثر کو پہلے میسر نہیں تھے۔ عام لوگوں کے پاس بھی اتنا پیسہ ہو گیا تھا کہ وہ گھوڑسواری کا شوق پالنے لگے اور اسے پورا بھی کرتے۔ اس نے زراعت کے شعبے پر بھی خصوصی توجہ کی۔ چنانچہ کھیت لہلہانے لگے، پیداوار بڑھ گئی۔ خوب باغ لگائے گئے جس سے بازاروں میں غلوں اور پھلوں کی بہتات تھی۔ یہ سب خود بخود نہیں ہو گیا تھا۔ عبدالرحمٰن الثالث نے غیر زرعی زمینوں کی آب پاشی کا نہروں کے ذریعہ انتظام کیا جس سے اضافی زرعی زمینیں اور باغات حاصل ہوئے۔ کسانوں کو اپنی محنت کا پھل ملنے لگا۔ اس لیے انھوں نے بھی خوب محنت کی اور زرعی پیداوار کو بہت بڑھا دیا۔

عبدالرحمٰن الثالث نے زراعت کے ساتھ صنعت اور تجارت کو خوب فروغ دیا۔ قرطبہ اور دوسرے شہروں میں نئی صنعتیں قائم کیں جن کی پیداوار سے پورے اسپین کی معیشت کو فائدہ پہنچا۔ تجارت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ صرف کسٹم ڈیوٹی سے سرکاری خزانے کو 120 لاکھ دینار ملتے تھے۔ عبدالرحمٰن الثالث نہایت ذمہ دار حکمران تھا۔ اس نے سرکاری خزانے کو اپنے اوپر خرچ کرنے کے بجائے اس سے رفاہ عام کا کام کیا۔ آرٹ، سائنس اور دوسرے علوم کی سرپرستی کی۔ سڑکیں تعمیر کرائیں، صنعتوں کو فروغ دیا۔ زبردست فوج تیار کی اور اتنا ہی زبردست بحری بیڑہ بھی تیار کیا تاکہ دشمنوں کو ملک پر حملہ کرنے اور بدامنی پھیلانے سے روکا جاسکے۔ اس کے حصے میں ناکامیاں بھی آئیں مثلاً عربوں کے بجائے فوج میں غلاموں کی بھرتی اور ان پر بھروسے کی وجہ سے اسے بعض جنگوں میں بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو بلاشبہ وہ بجا طور پر عبدالرحمٰن اعظم کہلائے جانے کا مستحق تھا۔ صحیح معنوں میں وہ اندلس میں اموی گھرانے کا سب سے بڑا اور عظیم الشان حکمران تھا۔ اس کی شہرت اندلس سے باہر بھی تھی۔ یورپ کے بڑے بڑے بادشاہوں مثلاً جرمنی، فرانس اور اٹلی کے حکمرانوں نے اپنے سفراء اس کے دربار میں روانہ کیے۔ قسطنطنیہ یا بازنطینی سلطنت کا سفیر بھی اس کے دربار میں موجود رہتا۔ وہ خود نہایت ذہین تھا اور ہر معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا مگر پھر بھی وہ اہل رائے سے مشورے کرتا۔ اس کے معاونین میں عیسائی، یہودی اور مسلمان سبھی تھے اور وہ سبھوں سے کام لینا جانتا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی سے زیادہ وہ جدید دور کا حکمران لگتا تھا۔

6.8 مستنصر باللہ

اکتوبر 961ء میں عبدالرحمٰن الثالث کا انتقال ہوا۔ اس کا بیٹا حکم اس کا جانشین ہوا اور اس نے اپنے لیے المستنصر باللہ کا لقب پسند کیا۔ اس نے بھی اپنے باپ کی طرح اندلس کو ترقی کی راہ پر قائم رکھنے کی کوشش کی۔ بعض عیسائیوں نے بغاوت کی جسے اس نے کچل دیا۔ اندرونِ ملک زیادہ تر امن قائم رہا۔ مستنصر باللہ بڑا علم دوست تھا، کتابوں سے اسے خاص شغف تھا۔ اس نے شاہی کتب خانے کو بڑی ترقی دی جس میں چار لاکھ سے زیادہ کتابیں موجود تھیں۔ کتابیں نقل کرنے کے کام میں دس ہزار سے زیادہ خطاط مصروف رہتے، اس کے اہل کار اسپین سے نکل کر شمالی افریقہ، مصر، شام اور عراق کا سفر کرتے اور تمام اہم کتب خرید کر یا نقل کر کے اس کے پاس بھیجتے۔ حکم سے پہلے کے اموی امراء و خلفاء علم کے دلدادہ تھے۔ لیکن حکم یا مستنصر باللہ، بس یوں کہیے کہ ادب اور سائنس سے پیار کرتا تھا۔ اہل علم کی صحبت پسند کرتا اور ان پر انعامات و اکرامات کی بارش کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اندلس کو کتابوں کے ایک بڑے بازار میں تبدیل کر دیا تھا۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں کوئی بھی کتاب شائع ہوتی، وہ اس کی کاپی فوراً حاصل کرتا اور کوشش ہوتی کہ اس کی کاپیاں پورے اسپین میں آسانی سے دستیاب ہوں۔ اس کی علم دوستی و سرپرستی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ابوفرج اصفہانی نے کتاب الاغانی لکھی تو اس کی ایک کاپی مستنصر باللہ کو بھیجی، غالباً یہی پہلی کاپی تھی۔ خلیفہ نے خوش ہوکر اسے ایک ہزار دینار انعام میں دیے۔ قرطبہ کی لائبریری کا کیٹلاگ 40 جلدوں میں تھا۔ خلیفہ مستنصر نے اپنے محل کے بعض کمرے کتابوں کے لیے مخصوص کرا دیے تھے۔ یہاں اس کی پسند کی کتابیں لکھی جاتیں، ان کی جلدیں بنتیں اور پھر اسے پیش کی جاتیں۔ محل کے اندر اس قسم کی سرگرمی سے اس کی علم دوستی اور علمی سرپرستی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

مستنصر باللہ کو محض کتابیں جمع کرنے کا شوق نہیں تھا۔ وہ بڑے انہماک سے انھیں پڑھتا اور نوٹ بھی لیتا تھا۔ وہ بڑا آزاد خیال اور وسیع الذہن بھی تھا۔ وہ علماء اور فلسفیوں کو اظہار خیال کی آزادی دیتا اور محض مختلف رائے کی وجہ سے ان کے ستائے جانے کا مخالف تھا۔ اس نے صرف مسلم علماء و فلاسفہ کی قدر دانی نہیں کی بلکہ عیسائی و یہودی اسکالرس کی بھی اس کے دربار میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ حکم یا مستنصر باللہ سے پہلے بھی اموی حکمرانوں نے اندلس میں اسکول یا مدارس کھولے تھے۔ سرکاری خزانے سے انھیں مدد ملتی یا ان کے لیے جائدادیں وقف کی گئی تھیں تاکہ انھیں مالی دشواریوں کا سامنا نہ ہو۔ ان مدارس کے دروازے سب کے لیے کھلے تھے۔ مستنصر ذرا مختلف تھا۔ وہ غریب پرور تھا اور چاہتا تھا کہ غرباء کے بچے بھی زیور تعلیم سے آراستہ ہوں۔ چنانچہ اس نے دارالحکومت میں 27 ایسے اسکول کھولے جہاں غریب والدین کے بچے مفت تعلیم حاصل کر سکیں۔ ان اسکولوں میں کتابیں بھی سرکاری خزانے سے فراہم کی جاتیں۔

مستنصر کے زمانے میں جامعہ قرطبہ اپنے عروج پر تھی۔ مصر کی جامعہ ازہر یا بغداد کے نظامیہ کالج سے یہ کسی بھی طرح کم نہیں تھی۔ خلفاء کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بہت سے امراء و رؤساء بھی علم دوستی کا مظاہرہ کرتے اور اپنے زیر اثر علاقوں میں تعلیم کو فروغ دیتے۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اندلس کے اکثر مسلمان —— بہت سے یہودی اور عیسائی بھی —— لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اور یہ سب اس وقت ہو رہا تھا جب یوروپ میں صرف مذہبی علماء پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ بادشاہ شہزادے اور سرکاری افسران نہ صرف علم دوست نہ تھے بلکہ ان میں سے کئی لکھنے پڑھنے کی صلاحیت سے بھی عاری تھے۔

مستنصر صرف علم دوست نہیں تھا۔ وہ لڑنا بھی جانتا تھا اور اسے باغیوں اور دشمنوں کو سبق سکھانا بھی آتا تھا۔ چنانچہ اگر بغاوت ہوتی یا امن عامہ کو خطرہ لاحق ہوتا تو وہ تیزی سے حرکت میں آتا اور ان کی سرکوبی کرتا۔ اس کے تخت پر بیٹھتے ہی شمالی اندلس کے عیسائیوں نے شورش برپا کی تو وہ بذات خود میدان جنگ میں اترا اور اس فتنے کو سختی سے کچل دیا۔ اس عمل کا اس کی فوج اور فوجی جنرلوں پر مثبت اثر پڑا اور وہ چشم زدن میں اس کا حکم بجالاتے۔

افریقہ میں فاطمیوں کے عروج کو حکم یا مستنصر باللہ کے والد بھی خطرہ تصور کرتے تھے۔ مستنصر کو تقریباً یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن فاطمی اسپین پر حملہ کریں گے۔ دراصل فاطمیوں کے اشارے پر صقلیہ کے بعض بحری بیڑوں نے اندلس کے ساحلی علاقوں میں دخل اندازی کی بھی تھی۔ فاطمی حکومت اموی حکومت کے بعض مخالفین کے رابطے میں بھی تھی۔ اس خطرے سے نپٹنے کے لیے خلیفہ مستنصر نے اپنے جنرل غالب کی کمان میں افریقہ میں ایک فوج بھیجی جو مغرب اقصی کے بعض علاقوں پر مہم کے آغاز میں قابض بھی ہوگئی۔ کئی بربر قبائل نے قاہرہ میں قائم فاطمی حکومت کے خلاف بغاوت کردی اور جمعہ کے خطبے میں مستنصر باللہ کا نام پڑھا جانے لگا۔ مگر شمالی اندلس میں عیسائیوں کی شورش نے مستنصر کو افریقہ میں قدم بڑھانے یا جمانے سے باز رکھا۔

6.9 حاجب المنصور

حکم یا مستنصر باللہ کے بعد اندلس میں کوئی اور طاقتور اموی حکمراں نہیں ہوا۔ کسی حد تک اس کی ذمہ داری خود حکم پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے خاندان میں دوسرے اہلیت والے افراد موجود تھے۔ مگر اس نے انہیں زمام حکومت دینے کے بجائے اس امر کی کوشش

کی کہ اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا کرسی اقتدار یا تخت خلافت پر متمکن ہو۔ اس کی موت کے وقت اس کے بیٹے کی عمر صرف گیارہ یا بارہ سال تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس کا نوخیز بیٹا حکمرانی کا بار نہیں اٹھا سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنے حاجب مشعفیٰ اور ریاست کے سکریٹری محمد بن ابی عامر کو اس کا نگراں بنایا۔ اسے امید تھی کہ اپنی باصلاحیت ماں ملکہ صبح اور مذکورہ وفادار امراء کی سرپرستی میں اس کا بیٹا امن وسکون کے ماحول میں حکومت کرسکے گا۔ چنانچہ 11 یا 12 سال کی عمر میں ہشام ثانی کو خلیفہ بنادیا گیا اور اس نے المؤید کا لقب اختیار کیا۔

مستنصر باللہ نے محمد بن ابی عامر کو پرکھنے میں سخت غلطی کی تھی۔ وہ اس کے زمانے میں اس کا وفادار تھا۔ مگر اس کی موت کے بعد اس نے خود اقتدار پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھنا شروع کردیا۔ اسے اندازہ تھا کہ عوام اسے خلیفہ کے طور پر تسلیم نہیں کریں گے خصوصاً عرب اور مقامی اسپینی مسلمان۔ اس لیے اس نے خلیفہ ہونے کا اعلان تو نہیں کیا لیکن بتدریج سازش اور طاقت کے بل پر سارے اقتدار پر قابض ہوگیا۔ اس نے سب سے پہلے حاجب مشعفی سے نجات حاصل کی اور پھر ان والیوں اور امراء کو درکنار کیا، معزول کیا یا قتل کرادیا جو اس کے عروج واقبال کی راہ میں حائل تھے یا روڑے ڈال سکتے تھے۔ اپنے مخالفین کو راستے سے ہٹانے کے بعد اس نے نوجوان خلیفہ کو محل میں ایک طرح سے قید کردیا۔ کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں تھی، یہاں تک کہ خلافت کے بڑے عہدیداروں کو بھی۔ صرف تہواروں کے مواقع پر افسران خلیفہ سے ملتے، بس سلام کرتے اور رخصت ہوجاتے۔

محمد بن ابی عامر نے وزارت پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے لیے حاجب المنصور کا لقب پسند کیا۔ اس نے اپنے لیے ایک خاص عالی شان محل بنوایا جس کا نام ظاہرہ تھا۔ اس نے سکوں پر اپنا نام کندہ کروایا اور تمام احکام وفرامین اس کے دستخط اور مہر سے جاری ہونے لگے۔ اس نے یہ حکم بھی جاری کیا کہ جمعہ کے خطبے میں خلیفہ کے ساتھ اس کا نام بھی پڑھا جائے۔

امراء ووالیوں اور ان دوسرے افسران کو راستہ سے ہٹانے کے بعد جن سے اسے مخالفت کا اندیشہ تھا، المنصور نے فوج پر اپنا کنٹرول قائم کرنے کی کوشش شروع کردی۔ اس کے نشانے پر خاص طور سے عرب سردار اور جنرل تھے۔ اس نے یکے بعد دیگرے انہیں ان کے عہدوں سے ہٹا کر ان کی جگہ پر بربروں کا تقرر کردیا۔ اس کا خیال تھا کہ عرب امراء اور فوجی جنرل اس کے عروج واقبال کی وجہ سے اس سے حسد کرتے ہیں، اس لیے وہ ناقابل اعتبار ہیں۔ اسے یقین تھا کہ اس کی وجہ سے فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے والے بربر اس کے ہمیشہ وفادار رہیں گے۔ تقریباً تین سو سالوں میں عرب پہلی بار فوج میں دوسرے مقام پر ڈھکیل دیے گئے تھے۔

المنصور کی سازشیں اپنی جگہ، اور اگر خلیفہ کو ''نظر بند'' کرنے کے عمل کو نظر انداز کردیا جائے تو وہ بڑا لائق حکمراں اور فوجی جنرل تھا۔ اسپین میں اموی حکومت وخلافت کی داستان اس کے کارناموں کے ذکر بغیر ادھوری رہے گی۔ وہ بہترین فوجی مدبر اور سپہ سالار بھی تھا۔ محض انتظامی امور کا ماہر یا سیاستداں نہیں۔ امیر علی نے ابن خلدون کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس نے 52 فوجی مہموں میں حصہ لیا اور ہر ایک میں اسے کامیابی ملی۔ کسی بھی فوجی مہم کے دوران اس کے فوجیوں نے دشمنوں کو اپنی پشت نہیں دکھائی اور نہ ہی کبھی اس کا علم سرنگوں ہوا۔ مستنصر باللہ کے انتقال کے فوراً بعد بعض عیسائیوں نے سر اٹھایا اور اسلامی اندلس کی سرحدوں میں گھس کر لوٹ مار شروع کردی۔ حاجب منصور نے زبردست فوجی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے فوراً ان کی سرکوبی کی۔ یہاں تک کہ حصن لوذون (Leon) اور نبرہ (Navarre) جیسی عیسائی ریاستوں کو نہ صرف خراج دینے پر مجبور کیا بلکہ ان کے دارالحکومتوں میں

اپنی فوجی چھاؤنیاں بھی قائم کر دیں۔ پھر اس کی توجہ بارسلونا اور بعض دوسری ریاستوں کی طرف ہوئی، خاص طور سے ان علاقوں پر چڑھائی کی جہاں فرانس کے شہزادوں اور جاگیرداروں نے اپنے قبضے جما لیے تھے۔ حاجب منصور نے اپنی فوجی مہموں کے ذریعے ان سب کو مار بھگایا اور فرانس کے ان علاقوں کو ایک بار پھر اسلامی اندلس میں شامل کر لیا۔

صرف اندلس، پرتگال اور فرانس کے سرحدی علاقوں ہی میں نہیں بلکہ افریقہ میں بھی حاجب منصور کی فوج نے اپنے جوہر دکھائے۔ موریطانیہ میں اس کی فوجی مہم کافی کامیاب رہی۔ اس کے جنرلوں نے مغربی افریقہ کے بڑے حصے پہ قبضہ کر لیا۔ ان فتوحات یا فوجی کامیابیوں سے حاجب منصور کی طاقت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اپنے دور کے دوسرے اندلسی حکمرانوں اور امراء کی طرح حاجب منصور کی کمزوری بھی خاندان پروری یا اولاد کی محبت تھی۔ 991ء میں اس نے حاجب کے آفس کو موروثی بنانے کی کوشش کی۔ وہ اتنا طاقتور تھا کہ چاہتا تو خلیفہ کو معزول کر کے خود اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیتا اور اس طرح براہ راست زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ لیکن اسے اندلسی مسلمانوں سے خوف تھا کہ وہ اسے بطور خلیفہ تسلیم نہ کریں گے۔ کیونکہ عوام کے دلوں میں بنوامیہ کی بڑی قدر تھی اور ان کی اولادوں کو ہی عہدۂ خلافت کا حق دار سمجھتے تھے۔ امراء اور افسران جن میں عرب بھی شامل تھے، شاید اس وقت حکومت کی تبدیلی کو گوارا کر لیتے کہ بنوامیہ میں انھیں کوئی قابل شہزادہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن عوام خاص طور سے اندلس کے مقامی مسلمان، یہاں تک کہ امراء بھی حاجب منصور کی خلافت برداشت نہ کرتے اور بغاوت پر آمادہ ہو جاتے۔ کیونکہ انھیں عزت و ثروت ہی نہیں بلکہ عیسائی حکمرانوں کی غلامی سے نجات بنوامیہ نے دلائی تھی۔ اس لیے وہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور عہدۂ حکومت پر ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ حاجب منصور نے اسلامی اندلس کو وہ عظمت اور خوشحالی دی تھی جس کی مثال نہیں، لیکن اندلسی نسل کے مسلمان اس بات پر اس سے خفا رہتے کہ خلیفہ کو اس نے ایک طرح سے قیدی بنا رکھا تھا۔ وہ نہ صرف اپنے نئے مذہب اسلام کے شیفتہ تھے بلکہ خلیفہ کی قدر و عزت بھی جیسے ان کا جزء ایمان تھی۔ حاجب منصور عوام کے ان جذبات سے پوری طرح باخبر تھا۔ چنانچہ وہ المویدباللہ کو معزول کرنے سے باز رہا۔ لیکن اس نے بہرحال اپنے بیٹے عبدالملک کو خلیفہ کے حکم سے اپنا جانشین ضرور مقرر کر دیا۔ اس سے پہلے وزارت کی جانشینی کا تصور نہیں ملتا، خاص طور سے بادشاہ یا خلیفہ کے دستخط سے اس کا اعلان نہیں ہوتا تھا۔ 996ء میں حاجب منصور نے خود سید یعنی سردار اور ملک کریم یعنی سخی بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا تھا۔

حاجب منصور بلاشبہ ایک قابل منتظم اور وزیر تھا۔ وہ ایک ذہین فوجی جنرل بھی تھا۔ شمالی اسپین کے عیسائیوں نے موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کی فتوحات کے بعد ہر اندلسی حکمراں کو تنگ کیا۔ بہت سے حکمرانوں نے ان کی سرکوبی کی اور پہاڑوں میں چھپنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن ان حکمرانوں میں سب سے زیادہ وہ حاجب المنصور سے خوف کھاتے تھے۔ اپنی فوجی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ سپاہیوں میں بڑا مقبول تھا اور ماہرین جنگ اس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے۔ وہ صرف فوج میں تنظیم اور ڈسپلن پر توجہ نہ دیتا بلکہ ان کی فلاح و بہبود کے بارے میں بھی سوچتا جس کی وجہ سے پوری فوج اس کی مداح اور وفادار تھی۔ اسپین اس کے دور میں اتنا طاقتور تھا کہ شاید عبدالرحمٰن الثالث کے دور میں بھی اسے اتنی طاقت حاصل نہ تھی۔

حاجب المنصور نے کئی مواقع پر فقیہوں کے دباؤ میں بعض فلسفیوں اور آزاد خیال اہل قلم کو سزائیں دیں یا ان پر پابندی لگادی۔ لیکن جہاں وہ یہ محسوس کرتا کہ کسی صاحب قلم کو بلاوجہ پریشان کیا جا رہا ہے تو وہ اس کی حفاظت بھی کرتا۔ دراصل بہترین منتظم اور جنرل ہونے کے ساتھ وہ علم وہنر کا بھی دلدادہ تھا۔ اسے صنعت وحرفت میں بھی بڑی دلچسپی تھی۔ اس کی کوششوں سے اسپین نے ان سارے میدانوں میں بڑی ترقی کی اور ملک میں بے مثال خوشحالی آئی۔ قابل اموی حکمرانوں کی طرح اس نے علم دوستی کا بھی ثبوت دیا اور اہل علم کی فیاضانہ سرپرستی کی۔ بلاشبہ اس نے اقتدار غلط طریقے سے حاصل کیا تھا لیکن اس کا استعمال اکثر عوام کی بہتری کے لیے کیا۔ وہ اپنے دشمنوں اور مخالفین کے معاملے میں سخت تھا لیکن عوام کے لیے عدل پرور تھا اور عہد کی پابندی کرتا۔ اس کا انتقال 1002ء میں ہوا۔

حاجب المنصور کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کا بیٹا عبدالملک حاجب ہوا۔ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس نے بھی کئی جنگوں میں کامیابی حاصل کی۔ اپنے باپ کی طرح اس نے بھی صنعت وحرفت اور تجارت کو فروغ دیا جس سے ملک میں خوشحالی کا دور دورہ رہا۔ مگر دولت اپنے ساتھ مسائل بھی لائی۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ بعض لوگ حاجب المنصور سے اس بات پر ناراض تھے کہ اس نے خلیفہ کو اقتدار سے محروم کر رکھا تھا۔ اس کی اولاد، جو تاریخ میں بنو عامر کے نام سے مشہور ہے، نے بھی اسی پالیسی کو جاری رکھا یعنی، سارا اقتدار اپنے پاس رکھا یا رکھنا چاہا۔ بنوامیہ اقتدار کی مرکزیت کے قائل تھے لیکن اس مرکزی اقتدار میں امراء، اہل علم اور فقہاء بھی شامل تھے۔ مگر بنو عامر نے ان سب کو نظر انداز کیا بلکہ انہیں اپنا دشمن بنا لیا۔ حاجب المنصور نے فوج کی نئی ترتیب وتنظیم میں بربروں اور غلاموں کو اعلیٰ عہدے دیے تھے جس کا فائدہ اٹھا کر یہ لوگ امیر ہو گئے تھے۔ اپنے عہدے اور دولت واقتدار کو قائم رکھنے کے لیے یہ لوگ زیادتیاں بھی کرتے جس سے عرب اور اندلسی شرفاء بڑے نالاں تھے۔

حاجب المنصور اور اس کے بیٹے عبدالملک کی کوششوں سے پورے ملک بالخصوص قرطبہ میں بڑی خوشحالی تھی۔ اس خوشحالی کی اصل وجہ صنعتی ترقی تھی۔ قرطبہ میں مختلف قسم کی صنعتیں تھیں جن میں ہزاروں لوگ روزگار سے لگے ہوئے تھے۔ صنعتوں کے مالکان اور تاجروں پر مبنی ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو کافی امیر تھا۔ مالکوں اور مزدوروں کے درمیان چپقلش شروع ہوگئی۔ الغرض سماج میں خوشحالی آئی تو اپنے ساتھ سماجی تنازعات اور مسائل بھی لائی۔ عبدالملک نے ان مسائل کو بھی سلجھانے کی کوشش کی مگر اس کا کم عمری میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بھائی عبدالرحمٰن سنچول حاجب یا وزیر بنا۔ لوگ پہلے ہی اس سے اس کی اخلاق باختہ حرکتوں سے نالاں تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس نے خلیفہ کو مجبور کیا کہ اسے اپنا جانشین بنائے۔ اس سے لوگوں کا غصہ اور بڑھا اور اس وقت پھوٹ پڑا جب وہ یعنی سنچول ایک فوجی مہم پر قرطبہ سے باہر گیا۔ لوگوں نے اس کا محل لوٹ لیا۔ اور اس میں آگ لگادی۔ کٹھ پتلی خلیفہ نے ایک اموی شہزادے محمد کے حق میں عہدۂ خلافت چھوڑ دیا۔ محمد نے المہدی کا لقب اختیار کیا۔ اس کی اور دوسرے شہزادوں کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے نئے اسپین کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور انجام کار ناکام ہو گئے۔

قرطبہ میں جو انقلاب شروع ہوا وہ پورے ملک میں پھیل گیا۔ یہ ایک طرح کا عوامی انقلاب تھا اور ضرورت تھی کہ عوام کے مختلف طبقوں کو اقتدار میں شریک کرنے کے راستے نکالے جاتے۔ مگر برسر اقتدار طبقے کے پاس ایسی کوئی سوچ نہیں تھی۔ نتیجتاً عوامی انقلاب بہت جلد عمومی بے چینی اور انارکی میں بدل گیا۔ اس بے چینی سے سماج دشمن عناصر نے فائدہ اٹھایا۔ لوٹ مار شروع ہوگئی

جس میں بربر اور غلام سپاہیوں اور افسروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان لوگوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بادشاہ گری کا کام بھی شروع کردیا، بالکل بنو عامر کی طرح۔ چنانچہ اموی خلفاء کچھ اپنی کم صلاحیت اور طالع آزماؤں کی حرکتوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے یکے بعد دیگرے ناکام ہوتے گئے۔ ایک وقت تھا جب بنو امیہ اور ان کی قائم کردہ حکومت کے لیے لوگوں کے دلوں میں بڑی قدر تھی۔ مگر نا اہل خلفاء کی کارکردگی اس قدر غیر اطمینان بخش تھی کہ لوگ ان سے بدظن ہوگئے۔ جس طرح پہلے لوگ بنو عامر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے، اب بنو امیہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ بالآخر 1031ء میں اموی خلافت کا خاتمہ ہوگیا۔

6.10 خلاصہ

اسپین میں اموی حکومت کے زمانے کو تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ پہلا دور فتح اندلس سے لے کر عبدالرحمٰن الداخل کی آمد تک ہے۔ اس مختصر دور میں 22 والی مقرر کیے گئے۔ والیوں کا تقرر کبھی براہ راست مرکزی حکومت دمشق سے کیا جاتا تو کبھی افریقہ میں بنو امیہ کا وائسرائے یہ کام انجام دیتا۔ والیوں کے بار بار تبدیل کیے جانے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دمشق میں بیٹھے خلفاء اور افریقہ میں رہنے والے ان کے وائسرائے کے درمیان مسافت کی دوری کی وجہ سے وہ پالیسی یا Understanding نہیں بن پا رہی تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ اور دوسری وجہ غالباً یہ تھی کہ خلفاء اور وائسرائے دونوں یہ نہیں چاہتے تھے کہ اسپین میں کوئی بھی والی اتنا مضبوط اور طاقتور ہوجائے کہ اپنی خودمختاری کا اعلان کردے۔

دوسرا دور اندلس میں عبدالرحمٰن الداخل کی حکومت کے قیام سے شروع ہوتا ہے۔ عبدالرحمٰن الداخل نے مرکزی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بغداد کے عباسی خلفاء کو تسلیم نہیں کیا لیکن خود خلیفہ ہونے سے بھی باز رہا اور امیر کا لقب اختیار کیا۔ الداخل اور اس کے کئی جانشینوں نے اسپین کے اکثر علاقوں کو ایک مرکزی حکومت کے ذریعہ متحد کرنے کی کوشش کی اور اگر شمالی علاقوں کی عیسائی شورشوں کو نظر انداز کردیا جائے تو وہ اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہے۔

تیسرا دور عبدالرحمٰن ثالث کے اعلان خلافت سے شروع ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کی رائے میں اس کے کارنامے عبدالرحمٰن الداخل کے کارناموں سے کہیں زیادہ شاندار تھے۔ عبدالرحمٰن ثالث کے بعد اس کے کئی جانشیں اچھے حکمراں ثابت ہوئے۔ مستنصر باللہ خود کامیاب خلیفہ تھا مگر اپنے گیارہ سالہ بیٹے کو بنو عامر کے تعاون سے اپنے بعد خلیفہ بنانا اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اس کا ہی وفادار افسر حاجب المنصور خلیفہ کے سارے اختیارات چھین کر ایک طرح سے خود اسپین کا حکمراں بن گیا۔ مستنصر باللہ کے بعد کوئی بھی اموی شہزادہ خود کو اہل خلیفہ ثابت نہ کرسکا بلکہ وہ بنو عامر اور دوسرے طالع آزماؤں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے تھے۔ انجام کار 1031ء میں اموی حکومت وخلافت کا خاتمہ ہوگیا۔

6.11 نمونے کے امتحانی سوالات

1. فتح اندلس کو تفصیلاً بیان کریں اور اس میں طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کے رول کی وضاحت کریں۔

2. عبدالرحمٰن الداخل کے کردار پر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

3. اندلس میں اموی خلافت کس نے قائم کی، اس کے کردار اور کارناموں پر روشنی ڈالیں۔

4. حاجب المنصور کون تھا۔ اس کی شخصیت اور کارناموں کو تفصیلاً بیان کریں۔

6.12 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. تاریخ اندلس (حصہ اول)	ریاست علی ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
2. مسلمان اندلس میں	رشید اختر ندوی
3. تاریخ اسلام	اکبر شاہ خان نجیب آبادی
4. اندلس کا تاریخی جغرافیہ	محمد عنایت اللہ دہلوی
5. نفح الطیب (اردو ترجمہ)	علامہ المقر دای
6. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (حصہ اول)	شروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی
7. عبرت نامہ اندلس	این ہارٹ ڈوزی
8. تاریخ ملت عربی (اردو ترجمہ)	پی کے حتّی

اکائی 7 : اندلس میں نظام حکومت

اکائی کے اجزاء

7.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو یہ بتانا ہے کہ اسپین کی فتح کے بعد وہاں مسلمانوں نے کون سا نظام حکومت قائم کیا۔نظم ونسق کا کیا انتظام تھا۔مسلمانوں کی سیاسی وسماجی زندگی کیسی تھی اور ملک کی معاشی حالت اچھی یا خراب تھی۔آخر میں طلبہ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اسپین میں مسلمانوں نے ایک بہترین نظام عدل قائم کیا تھا۔سماجی حالات کا ذکر کرتے ہوئے ضمناً مگر قدرے تفصیل سے علمی سرگرمیوں کا بھی ذکر ہوگا۔

7.2 تمہید

اندلس میں مسلمانوں نے جو نظام حکومت اختیار کیا وہ کم وبیش وہی تھا جو بنوامیہ نے اپنی وسیع سلطنت میں رائج کیا تھا۔واضح رہے کہ فتح اندلس سے وہاں با قاعدہ عبدالرحمٰن الداخل کے ذریعے اموی امارت یا حکومت کے قیام کے دوران یعنی تقریباً 43 سال

تک یہ علاقہ براہ راست افریقہ کے وائسرائے کے دائرہ اختیار میں تھا۔ بنو امیہ نے اپنی وسیع سلطنت کو پانچ حصوں میں بانٹ رکھا تھا اور ہر حصے میں ایک نیم خود مختار وائسرائے ہوتا تھا۔ یہ پانچوں حصے پھر چھوٹے چھوٹے صوبوں یا انتظامی یونٹوں میں تقسیم کیے گئے تھے اور ہر صوبے کا ذمہ دار ایک والی ہوتا۔ عبدالرحمٰن الداخل کے ذریعے اندلس میں اموی امارت وحکومت کے قائم ہونے سے پہلے یہاں 22 والیوں نے حکمرانی کی۔

عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس میں اپنے قدم جمانے کے بعد کم وبیش اپنے آباء واجداد کا نظام حکومت اختیار کیا۔ یہ ایک لچکدار نظام حکومت تھا اور ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ عبدالرحمٰن مضبوط مرکز کا حامی تھا۔ واضح رہے کہ مرکزی حکومت کا مطلب تھا بادشاہ یا امیر اور اس کے مختلف افسران۔ صوبوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ نگران کے سربراہ کو والی کہا جاتا تھا۔ ہرے بڑے شہر میں پولس کا انتظام تھا۔ اسی طرح تمام ہی شہروں میں دارالقضاء کا اہتمام تھا جو بالعموم مسلمانوں کے مقدمات سنتے اور فیصلہ کرتے کیوں کہ غیر مسلموں کو اپنے دین اور شریعت پر چلنے کی آزادی تھی اس لیے وہ دارالقضا کے دائرہ اختیار سے باہر تھے الّا یہ کہ وہ کسی مسلمان کا قتل کرتے یا دین اسلام، خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا ارتکاب کرتے۔

7.3 اندلس میں اموی نظام حکومت

اسپین میں امویوں کا نظام حکومت کم وبیش ویسا ہی تھا جیسا ان کے آباء واجداد نے مشرق میں قائم کیا تھا۔ قابل فہم طور پر سربراہ حکومت امیر یا خلیفہ ہوتا۔ یہ امارت یا خلافت موروثی تھی۔ امیر یا خلیفہ بذات خود یا اپنے امراء ووزراء اور فوجی جنرلوں کے مشورے سے اپنا ولی عہد نامزد کرتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ فوج، وزراء اور امراء شہزادوں میں سے کسی کو امیر منتخب کرتے۔ امویوں کے آخری عہد میں خلفاء طاقتور وزیروں اور بسا اوقات طالع آزماؤں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے تھے۔ لیکن موروثی خلافت میں لوگوں کا یقین اس قدر گہرا تھا کہ بنو امیہ کے علاوہ کسی اور کو خلیفہ تسلیم نہیں کر سکتے تھے چاہے وہ کتنا ہی قابل ہو۔

خلیفہ کے بعد حکومت میں دوسرا بڑا عہدہ حاجب کا تھا۔ حاجب سے نیچے وزراء تھے۔ حاجب امیر یا خلیفہ اور وزراء کے درمیان ربط کا کام کرتا، اسی لیے اس کے اختیارات کافی زیادہ تھے۔ مگر حاجب کا عہدہ مستقل نہیں تھا۔ بعض امیروں یا خلفاء نے حاجب کی ضرورت نہیں سمجھی اور براہ راست وزراء اور دوسرے افسران حکومت سے رابطہ رکھتے تھے۔ فوج بالعموم امیر یا خلیفہ کے ماتحت ہوتی تھی۔ وزیروں کے بعد کئی درجے کے افسران تھے جنھیں کتاب یعنی سکریٹری کہا جاتا۔ وزراء اور کتاب یعنی سکریٹری مل کر دیوان یا کونسل بناتے جہاں حکومت کے تعلق سے سارے کام انجام پاتے۔ کونسل کے ممبر بعض امراء بھی ہوتے تھے۔ امویوں کے عروج کے دور میں اسپین قرطبہ کے علاوہ 6 صوبوں میں تقسیم تھا۔ ہر صوبے کا ایک والی یا گورنر ہوتا تھا۔ والی کے پاس بالعموم شہری اور فوجی اختیارات دونوں ہوتے تھے۔ بعض بڑے شہروں کو بھی کچھ امیروں یا خلفاء نے براہ راست ایک والی کے ماتحت رکھا تھا۔

عدل وانصاف کا محکمہ خلیفہ کے پاس ہوتا۔ لیکن روزینہ کے مقدمات کو سننے اور ان کا فیصلہ کرنے کے لیے دارالقضا قائم تھے۔ اکثر امیروں اور خلفاء نے اپنے عدالتی اختیارات قاضی کو دے دیے تھے۔ چیف جسٹس یا قاضی القضاۃ کا دفتر بھی تھا۔ دارالقضاء کے ساتھ بعض جگہوں پر صاحب الشرطہ تھے۔ یہ خصوصی جج تھے جو پولس سے متعلق شکایات اور قانونی معاملات کو دیکھتے اور فیصلہ کرتے۔

قرطبہ جیسے بڑے شہروں میں صاحب المظالم کا عہدہ بھی تھا جس کا کام سرکاری افسران کے خلاف عوام کی شکایات سننا اور فیصلہ دینا ہوتا۔ دا القضا میں عموماً مسلمانوں کے مقدمات آتے جب کہ صاحب الشرطہ اور صاحب المظالم کی عدالتوں میں غیر مسلم بھی دادرسی کے لیے آتے تھے۔ بعض امیروں یا خلفاء نے محتسب کا منصب یا عہدہ بھی قائم کیا تھا جو پولس کا نظام دیکھنے کے ساتھ تجارت اور بازار پر بھی نظر رکھتا۔ محتسب کا کام شراب نوشی، جوئے بازی اور ایسی دوسری برائیوں کو ختم کرنے کے ساتھ لوگوں کو سلیقہ مند لباس پہننے کی تلقین کرنا بھی تھا۔ ہر بڑے شہر میں پولس کا الگ نظام تھا۔ اس کا خاص کام رات میں شہروں کی حفاظت اور نگرانی ہوتا تھا۔

7.4 سیاسی حالات

جب مسلمان اندلس میں آئے تو وہاں عیسائیوں کی حکومت تھی۔ ایک ظالم زمیندارانہ (جاگیردارانہ) نظام قائم تھا جس کے تحت حکمراں طبقہ کو ساری مراعات حاصل تھیں جب کہ عامۃ الناس، خاص طور سے کھیتوں پر کام کرنے والے مزدور اور غلام مصائب و مشکلات کی چکی میں پس رہے تھے۔ بنوامیہ جنھوں نے اسپین پر حکمرانی کا آغاز کیا، صحابہ و تابعین جیسے مسلمان نہیں تھے، لیکن عیسائی حکمرانوں کے مقابلے میں وہ فرشتوں سے کم بھی نہ تھے۔ وہ عامۃ الناس پر اپنے عیش و آرام کے لیے ظلم ڈھانے کے قائل نہیں تھے۔ چناں چہ مزدوروں اور غلاموں کے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا تھا۔ وہ انھیں انسان سمجھتے اور ان کی محنت کی اچھی اجرت دیتے۔ فتوحات کے نتیجے میں صرف ان زمینوں پر مسلم حکمرانوں اور امراء نے قبضہ کیا جو یا تو سرکاری تھیں یا شکست خوردہ عیسائی امراء کی جاگیریں تھیں جو یا تو جنگ میں کام آگئے تھے یا فرار ہو گئے تھے۔ ان زمینوں پر کام کرنے والے مزدوروں اور غلاموں سے مسلمانوں کا سلوک بڑا ہمدردانہ اور اکثر فراخدلانہ ہوتا۔ نتیجتاً یہ لوگ بڑی تیزی سے اسلام کی طرف بڑھے اور خاص طور سے غلاموں نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا کہ اس طریقے سے انھیں غلامی سے نجات مل جاتی تھی۔ ان مقامی مسلمانوں، کو عربی تاریخوں میں مولدون کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ مقامی مسلمان عرب اور بربر مسلمانوں کے ساتھ بعد کے ادوار میں کام کے بھی ثابت ہوئے اور مسائل بھی پیدا کیے۔ ان میں سے بہتوں نے تعلیم کا راستہ اختیار کیا تاکہ حکومت میں مناصب حاصل کر سکیں۔ بہت سے عالم و فاضل ہو کر دار القضا سے وابستہ ہو گئے۔ مسلم اسپین میں فقہاء کا بڑا اہم رول رہا ہے اور بہت سے فقہاء انھیں مولدون میں سے تھے۔

اسپین کے مسلمانوں میں بربر نسل کے لوگ ہمیشہ بڑی تعداد میں رہے ہیں۔ ان کی اکثریت پڑھنے لکھنے کے بجائے فوج میں کام کرنا پسند کرتی تھی۔ چونکہ عبدالرحمٰن الداخل کو امور سلطنت چلانے کے لیے ان بربر فوجیوں پر ہی انحصار کرنا پڑتا تھا، اس لیے وہ ان کا بڑا خیال رکھتا۔ تنخواہ کے علاوہ اکثر انعامات سے نوازتا۔ مرور ایام کے ساتھ، خاص طور سے حاجب المنصور اور بعض دوسرے اموی خلفاء و امراء کے زمانے میں بربر کافی طاقتور ہو گئے تھے اور محض وفادار فوجی نہ رہ کر امور حکومت میں مداخلت بھی کرنے لگے تھے۔

عرب اگرچہ بڑی تعداد میں نہ تھے لیکن اصل معنی میں حکمراں طبقہ انھیں کا تھا۔ عربوں میں دو بڑے گروپ تھے۔ یمنی عرب اور مصری عرب۔ ان دونوں گروپوں میں اکثر اقتدار کے لیے رسہ کشی جاری رہتی۔ ذہین، بااثر اور طاقتور امیر یا خلیفہ کے دور میں یہ سارے عناصر کنٹرول میں رہتے لیکن جیسے ہی کوئی امیر یا خلیفہ کمزور پڑتا، ان گروپوں کی سیاست خطرناک ہو جاتی۔

سیاست کی اصل وجہ یہ تھی کہ عرب حکمراں ہونے اور کسی حد تک وحی و رسالت کے پہلے مخاطب ہونے کی وجہ سے ذرا خود کو دوسروں سے برتر سمجھتے تھے۔ اگر ایسا وہ زبان سے نہ کہتے تو بھی ان کے رویے سے احساس برتری جھلکتا تھا۔ یہ بات نومسلموں کو، جو اسلام کی تعلیم مساوات وانصاف سے سب سے زیادہ متاثر تھے، بہت کھٹکتی۔ اول اول تو انھوں نے عربوں کے 'نسلی غرور' کو برداشت کیا، لیکن جب پڑھ لکھ کر وہ بھی علماء وفقہاء کی صف میں شامل ہو گئے تو وہ ان کی غیر اسلامی عادتوں پر تنقید کرنے لگے۔ نیز تعلیم یافتہ ہو جانے کے بعد وہ ان بہت سے عہدوں کے طلبگار ہوئے جن پر روایتاً عرب فائز ہوتے تھے۔ اس طرح مفادات کے ٹکراؤ نے سیاسی کشمکش کو جنم دیا۔

مقامی اسپینی مسلمانوں کو بربروں سے بھی شکایت رہتی۔ شکایت کی اصل وجہ ان کا اکھڑپن تھا۔ بربر فوجی ہونے کی وجہ سے اور امیر یا خلیفہ کے سپاہی ہونے کے ناطے مقامی لوگوں کو، خواہ عیسائی ہوں یا مسلمان ذرا کم ہی خاطر میں لاتے تھے۔ انارکی کے زمانے میں بربر لوٹ مار بھی کر لیتے تھے۔ ظاہر ہے مقامی لوگ انھیں کافی ناپسند کرتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ بربروں کو اپنی اہمیت کا اندازہ ہوتا گیا اور وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ سلطنت کی اصل بنیاد ان کی سپاہیانہ صلاحیتوں پر قائم ہے۔ اپنی اس حیثیت کے احساس کے ساتھ وہ امور حکومت میں مداخلت کرنے لگے۔

دیکھا جائے تو عرب، بربر اور مقامی اسپینی مسلمان تین سماجی گروپ تھے۔ تینوں کے اپنے اپنے جائز مفادات تھے جو کبھی کبھی باہم متصادم ہوتے۔ اچھا حکمراں باہم متصادم مفادات کے درمیان توازن قائم کر کے سب کو ایک ساتھ جوڑے رہتا۔ دوسری صورت میں ان گروہوں کے درمیان سیاست کا بازار گرم ہو جاتا۔

شمالی اندلس کے پہاڑوں میں رہنے والے عیسائی گروہ مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ سرگرم رہے۔ ہر اہم خلیفہ یا امیر نے ان کے خلاف کاروائی کی۔ ان عیسائیوں کو پڑوسی عیسائی ریاستوں سے مدد بھی ملتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اور مسلمانوں کی رعایا کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے کرتے انھیں بھی ان کے گروہی اختلافات کا علم ہو گیا تھا۔ یہ لوگ بھی کبھی خفیہ طریقے سے تو کبھی اعلانیہ مسلمانوں کی سیاست کی آگ میں اپنی روٹی سینکنے کی کوشش کرتے۔ اچھے دنوں میں یہ عیسائی سیاست نقصان دہ نہیں ثابت ہوئی، لیکن زوال کے ایام میں اس نے مسلمانوں کا بیڑا ہی غرق کر دیا۔

7.5 سماجی زندگی

اسپین ایک زرخیز ملک تھا۔ پھل اور اناج کی پیداوار اچھی تھی۔ مزدوروں اور غلاموں کے ساتھ اچھے سلوک کی وجہ سے زراعت سے متعلق لوگ خوشحال ہو گئے تھے۔ اس طرح مسلمان حکمرانوں نے صنعت وحرفت کو کافی فروغ دیا اور بے شمار لوگ روزگار سے لگ گئے۔ زراعتی اور صنعتی پیداوار انارکی کے زمانوں میں بھی جاری رہتی جس سے لوگوں کی زندگی خوشحال تھی۔ یہ خوشحالی سب سے زیادہ عبدالرحمٰن الثالث، حکم ثانی اور حاجب المنصور کے دور میں نظر آتی ہے اور یہ دور سو سال سے زیادہ کا تھا۔ لوگوں کے پاس صرف دولت ہی نہیں آئی بلکہ تعلیم اور ثقافت بھی۔ چناں چہ ان کی سماجی زندگی قابل رشک تھی۔ قرطبہ کی خوشحالی اور اس عظیم الشان شہر کے باسیوں کی زندگی بیان کرتے ہوئے پی۔ کے۔ حتی (Hitti) لکھتا ہے:

''اس دور میں اموی دارالحکومت (قرطبہ) یورپ کا سب سے مہذب شہر تھا اور بغداد و قسطنطنیہ کے ساتھ دنیا کے تین بڑے ثقافتی مراکز میں سے ایک تھا۔ اپنے ایک لاکھ 13ہزار مکانوں، 21 suburbs (مضافات) (اصل شہر کے ساتھ بسی ہوئی مضافاتی آبادیاں) 70 کتب خانوں (Libraries)، ان گنت کتابوں کی دکانوں، مساجد اور محلات کے ساتھ قرطبہ کو عالمگیر شہرت حاصل تھی اور سیاحوں کے دلوں کو احترام وجلال کے (جذبات) سے بھر دیتا تھا۔ قرطبہ میں میلوں پختہ سڑکیں تھیں جنہیں گھروں پہ لگائے گئے لیمپ کے ذریعے رات میں روشن رکھا جاتا جبکہ اس کے سات سو سال بعد بھی لندن میں ایک بھی سرکاری لیمپ نہیں تھا۔ اور پیرس کا تو (اور بھی برا حال تھا) جہاں بارش کے دنوں میں آپ گھر سے باہر قدم رکھتے ہی گھٹنوں تک مٹی میں دھنس جاتے تھے۔ اور جب آکسفورڈ یونیورسٹی میں نہانا ایک کافرانہ رسم تھی اس وقت قرطبہ کے سائنس داں کئی نسلوں سے پر تعیش (حماموں) میں غسل کر رہے تھے''۔

اسی شہر قرطبہ کا ذکر امیر علی نے درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

''اپنی تین ہزار آٹھ سو مساجد، اپنے ساٹھ ہزار محلوں اور مینشنوں، اپنے دو لاکھ مکانوں، جن میں عامۃ الناس رہتے تھے، اپنے سات سو حماموں، اپنی 80ہزار دوکانوں جو ہوٹلوں اور سرایوں کے علاوہ تھیں، قرطبہ خوبصورتی اور وسعت میں بغداد سے مقابلہ کرتا تھا۔''

قرطبہ کی آبادی اس کے عروج کے زمانے میں 10 لاکھ تھی۔ شہر کی آبادی بڑھانے کا باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا۔ ایک مدت تک ہر اس شخص کو 400 درہم دیے جاتے جو قرطبہ کے گردونواح میں آباد ہونا چاہتا۔ مقصد غالباً صنعتی ترقی کا حصول تھا۔ قرطبہ میں ہر طرح کی صنعتیں موجود تھیں (Suburbs) جنھیں ترقی دینے کے لیے مزدوروں کی ضرورت تھی۔

اموی حکمرانوں کو بڑے شہر کی ضرورتوں کا پورا خیال تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرطبہ جیسا بڑا شہر انھوں نے ایک بہترین منصوبے کے تحت بسایا تھا۔ شہر دریائے کبیر کے کنارے آباد کیا گیا تھا جو پہاڑیوں کے دامن میں بہتا ہے۔ اہل شہر کو تازہ پانی فراہم کرنے کے لیے پہاڑی چشموں یا نالوں سے نہریں شہر میں لائی گئی تھیں۔ پہلی نہر خود عبدالرحمٰن الداخل نے بنوائی تھی۔ پھر ایک شاندار نہر عبدالرحمٰن الثالث کے زمانے میں تعمیر کی گئی جو سنگ مرمر اور دوسرے پتھروں سے بنی تھی۔ یہ پانی بہترین پتھروں سے بنے حوضوں میں جمع ہوتا اور اس سے پورے شہر اور گردونواح میں بسنے والوں کی ضرورتیں پوری ہوتیں۔ صرف امیر یا خلیفہ کے محل ہی مین خوبصورت حوض نہیں تھے، دوسرے امراء و روٴساء کے محل نما گھروں میں بھی یہ سہولتیں موجود تھیں۔ صحراؤں اور ریگستانوں سے آئے ہوئے مسلمانوں کو اسپین میں خوب پانی ملا اور انھوں نے اس کا بہترین استعمال کیا۔ ہر قابل ذکر گھر میں باغیچے کا ہونا پانی کے اچھے استعمال کی علامت و گواہی ہے۔ عبدالرحمٰن الداخل کا بنوایا ہوا شاہی باغ، جس میں دنیا جہان کے درخت اور پودے لا کر لگائے گئے تھے، اور جو صدیوں بعد مہذب ہونے والے یوروپ کے لیے مثال بنا، وہ اسی پانی کے بہتر استعمال کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔

بادشاہوں اور امراء نے مدینۃ الزہرا اور دوسرے عظیم الشان محلات ہی نہیں بنوائے، انھوں نے عام شہریوں کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مساجد، مدرسے اور جامعات بھی قائم کیں۔ قرطبہ شہر میں روشنی کا بہترین انتظام تھا۔ رات کے وقت 10 میل تک

لوگ اسٹریٹ لائٹ میں چل سکتے تھے۔ امیر علی نے کسی قدیم مصنف کے حوالے سے لکھا ہے کہ قرطبہ دریائے کبیر کے کنارے آباد ایسا شہر تھا جس کی لمبائی ایک طرف 24 اور دوسری طرف 6 میل تھی۔ ہر جگہ مکانات بنے ہوئے تھے۔ گھر تھے، محل تھے، مسجدیں اور باغات۔ یہ تھا شہر کا نقشہ جو دریائے کبیر کے دونوں کنارے پر آباد تھا۔ شہر کی فصیل کے باہر Suburbs یا گردونواح میں بسی ہوئی آبادیاں تھیں جو 27 حصوں میں بٹی ہوئی تھیں جہاں خوشحال لوگ رہتے تھے۔ ہر Suburb (مضافات) میں لوگوں کی مذہبی، معاشی اور سماجی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کافی تعداد میں مساجد، بازار اور حمام تھے، یہاں تک کہ ایک آبادی کے باشندوں کو ضرورتوں کی تکمیل کے لیے دوسری آبادی میں جانے کی ضرورت نہ پڑتی۔

اتنا بڑا شہر جس کی آبادی اس زمانے میں ایک ملین سے زیادہ تھی، اس کی ضرورتوں کی تکمیل کا بھی اموی حکمرانوں نے خوب اہتمام کیا تھا۔ قرطبہ تین ہزار قصبوں اور گاؤں سے جڑا ہوا تھا جہاں سے اس کی ضرورتوں کا سامان مسلسل سپلائی ہوتا تھا۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قصبوں اور گاؤں میں رہنے والے بھی معاشی طور پر خوشحال رہے ہوں گے۔

اس زمانے میں اس طرح کا کوئی تصور نہیں تھا کہ تعلیم ہر شہری کے لیے ضروری ہے۔ لیکن مسلمانوں میں لکھنے پڑھنے پر کافی زور تھا۔ خاص طور سے قرآن مجید تمام ہی مسلمان پڑھتے تھے۔ اس مقصد کی تکمیل مساجد سے ملحق مکاتب اور مدارس سے کی جاتی تھی۔ عرب اپنی علم دوستی اور علمی سرپرستی کے لیے جانے جاتے ہیں۔ امویوں پر الزام ہے کہ عرب نسل پرستی میں یقین رکھتے تھے۔ مگر کم از کم تعلیم کے میدان میں ایسا کوئی امتیاز نظر نہیں آتا۔ مدارس و جامعات کے دروازے عربوں، مقامی اندلسی مسلمانوں یہاں تک کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے یکساں طور پر کھلے ہوئے تھے۔ بعض یہودی اور عیسائی محض اپنے علم کی وجہ سے جامعہ قرطبہ کے ریکٹر بھی بنائے گئے۔ اسی طرح مقامی مسلمانوں نے مذہبی علوم میں بڑی دلچسپی لی اور ان میں سے اکثر دارالقضا میں قاضی یا مدارس و جامعات میں استاد مقرر ہوئے۔ مذہب کا صحیح علم ہونے کی وجہ سے ہی مقامی اندلسی علماء و عوام اکثر عربوں کو آئینہ دکھا دیتے اور کہتے کہ اسلام میں برتری کی بنیاد تقویٰ پر قائم ہے نہ کہ نسلی نسبت پر۔

خوشحالی کی زندگی بسر کرنے والے علم کے ساتھ آرٹ میں بھی دلچسپی لیتے ہیں، فن اور تفریح کا انتظام بھی کرتے ہیں۔ یہ چیزیں مسلم اسپین میں بھی نظر آتی ہیں۔ صاحب ثروت لوگ اہل علم کی قدر کرتے اور علمی مجلسوں کا انعقاد کرتے۔ ایسے اہل دولت بھی تھے جو خود پڑھے لکھے نہ تھے مگر ان کے پاس بہترین کتب خانے تھے جن کی دیکھ ریکھ تنخواہ دار اہل علم کرتے تھے۔ یہ ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے امیر لوگ ادبی محفلیں منعقد کراتے جہاں علمی باتیں بھی ہوتیں اور شعر و شاعری کا اچھا ذوق پایا جاتا تھا۔ رقص، موسیقی اور خوش الحانی میں پوری قوم دلچسپی رکھتی تھی۔

صرف قرطبہ ہی خوشحال شہر نہیں تھا، غرناطہ، طلیطلہ اور دوسرے شہروں میں بھی کافی خوشحالی تھی۔ اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، صرف محلوں میں نہیں بلکہ عام لوگوں کے مکانات میں بھی ضروری سہولتیں موجود تھیں۔ پختہ سڑکیں اور رات کے وقت ان سڑکوں کا روشن ہونا، بازاروں کی رونق، ہوسٹل، ہوٹل اور سرایوں کی کثرت، حماموں کی بہتات، پانی کی فراوانی، چھوٹے بڑے باغات اور اس قسم کی دوسری سہولیات کی فراہمی اس امر پر گواہ ہیں کہ لوگ بڑی مطمئن سماجی و معاشی زندگی بسر کر رہے تھے۔

7.6 معاشی زندگی

مسلم اسپین اپنے عہد کی زبردست معاشی طاقت تھا۔ عربوں نے ایک طرح کا زرعی وصنعتی انقلاب پیدا کر دیا تھا جس سے ریاست کی آمدنی میں بہت اضافہ ہوا۔ اچھے خلفاء نے اس آمدنی کا استعمال عوام کے فائدے کے لیے کیا۔ خلفاء ذاتی کام بھی کراتے تو اس سے روزگار کے مواقع پیدا ہوتے۔ مثلاً خلیفہ عبدالرحمٰن الثالث نے جب الزہرا محل بنوایا تو اس سے دس ہزار لوگوں کو روزگار ملا۔ دراصل شاہی تعمیرات مستقل روزگار کا ذریعہ بن گئی تھیں۔ بادشاہ نے الزہرا محل بنوایا تو امراء، وزراء اور فوجی افسران کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی اپنے مکان اور محل آس پاس بنوائے جس سے قرطبہ سے چند میل دور ایک نیا شہر بس گیا۔ اس شہر (Suburb) کی تعمیر کے دوران لوگوں کو روزگار ملتے رہے۔ محلوں میں استعمال کیے گئے پتھر اور سجاوٹ کی بہت سی چیزیں دوسرے ملکوں سے منگائی گئی تھیں۔ ان اشیا کو فراہم کرنے والے تاجر اچھے پیسے کماتے تھے۔

عبدالرحمٰن الثالث کے عہد میں ریاست کی سالانہ آمدنی حتّی کے ایک اندازے کے مطابق 6245000 دینار تھی جس کا ایک تہائی فوج پر اور ایک تہائی عوامی بہبود کے کاموں پر خرچ ہوتا تھا اور ایک تہائی ایمرجنسی کے لیے یا مستقبل کی ان دیکھی ضرورتوں کے لیے محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ مستقل فوج کی دیکھ ریکھ جس طرح آج کے زمانے میں سیکڑوں نوکریاں پیدا کرتی ہے، اس زمانے میں بھی کرتی تھی۔ اسی طرح عوامی بہبود کے کاموں میں ایک بڑا کام زرعی پیداوار کو بڑھانے کے لیے نہروں کی کھدائی کا تھا اور اس سے بھی لوگوں کو روزگار مل رہا تھا۔

قرطبہ اور دوسرے شہروں میں عربوں نے کئی قسم کی صنعتوں کو فروغ دیا تھا جس میں کپڑے اور چمڑے کی صنعتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ صرف قرطبہ میں کوئی تیرہ ہزار کپڑے بننے والے تھے۔ اسی طرح ہزاروں لوگ چمڑے کی صنعت سے بھی جڑے ہوئے تھے۔ چمڑے سے بنی چیزوں پر نقش کاری مسلم اسپین میں شروع ہوئی۔ یہاں سے یہ ہنر مراکش گیا اور پھر وہاں سے بہت بعد میں مغربی یوروپ۔ لندن اور پیرس میں آج بھی چمڑے کی چیزوں پر بعض نقش کاریوں کو ان کی پرانی اسپینی یا مراکشی نسبت سے جانا جاتا ہے۔ اون کے کپڑے اسپین میں پہلے سے بنتے تھے مگر ریشمی کپڑوں کی پیداوار عربوں نے شروع کی۔ اونی اور ریشمی کپڑوں کی صنعت قرطبہ کے علاوہ مالقہ اور المیر یا جیسے شہروں میں بھی بڑے پیمانے پر موجود تھی۔ مسلمانوں نے جن دوسری صنعتوں کو فروغ دیا ان میں شیشے اور تانبے کے برتن بنانے والی فیکٹریاں بھی تھیں۔ انھوں نے سونے اور چاندی کی کانیں دریافت کیں اور انہیں فروغ دیا۔ لوہے کی صنعت کو ترقی دی اور اس سے بننے والی تلواروں کو پوری دنیا میں رائج کیا۔ طلیطلہ کی تلواریں دمشق کی تلواروں کی طرح مشہور تھیں۔ لوہے سے بنی چیزوں مثلاً تلواروں اور خنجروں پر سونے اور چاندی کی نقش کاری کو بھی عربوں نے بہت فروغ دیا۔ یہ ساری چیزیں نہ صرف اہل اسپین کی ضرورتوں کو پورا کرتیں بلکہ اتنی زیادہ تعداد میں پیدا ہو رہی تھیں کہ اضافی پیداوار کو دوسرے ملکوں میں برآمد کیا جاتا تھا۔ امیر علی نے دو درجن سے زیادہ چیزوں کے نام گنائے ہیں جو اندلس برآمد کرتا تھا۔ ان میں سونا، چاندی (بنے ہوئے زیورات)، تانبا، ریشم، شکر، لوہا، زیتون، اون کی مصنوعات، اگربتی، پاؤڈر، تیل، سلفر، زعفران، سرکہ، مرچ وغیرہ شامل ہیں۔ چیزوں کی درآمد برآمد کے لیے عربوں نے کئی بندرگاہیں یا تو از سر نو بنائیں یا انہیں مزید ترقی دی۔ درآمدات پر ریاست ٹیکس لگاتی تھی جس سے شاہی خزانے کو بھاری آمدنی ہوتی تھی۔

صنعتوں کے ساتھ عربوں نے زراعت کے شعبے کو بھی بڑی ترقی دی۔ وہ اپنے ساتھ زراعت کے بعض وہ طریقے لائے جو مغربی ایشیا میں رائج تھے۔ چناں چہ انھوں نے نہریں اور کنال بنوائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ زمینوں کو کھیتی کے لائق بنایا جاسکے۔ انگور کی پیداوار پر انھوں نے خاص زور دیا، چاول، کاجو، انار، سنگترے، گنا، کاٹن اور زعفران عربوں سے پہلے اسپین میں نہیں پیدا ہوتے تھے۔ یہ سب خالص عربوں کی دین ہیں، اسپین کے جنوب مشرق میں واقع میدانی علاقے زراعت کے لیے خاص طور سے موزوں ہیں۔ عربوں نے نہریں اور کنال بنوا کر یہاں زرعی سرگرمیوں کو عروج پر پہنچا دیا۔ یہاں گیہوں کے ساتھ بعض پھلوں اور زیتون کی پیداوار کو انھوں نے فروغ دیا۔

صنعتی و زراعتی پیداوار اہل اسپین کی اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ تھی۔ اس لیے وہ اپنی چیزوں کو برآمد کرنے لگے۔ ان کی برآمدات زیادہ تر مکہ، دمشق اور بغداد جاتیں۔ بعض چیزیں اسکندریہ اور قسطنطنیہ کے راستے ہندوستان اور وسطی ایشیا کے بازاروں میں بھی پہنچتی تھیں۔

برآمدات کے ساتھ اندرون ملک بھی تجارت خوب ہو رہی تھی۔ ملک کے مختلف علاقے اور شہر مختلف چیزیں بناتے جنھیں تاجر ایک شہر سے دوسرے شہر لے جاکر بیچتے اور اچھے پیسے بناتے۔ اس اندرونی تجارتی سرگرمی سے ہزاروں لوگوں کو روزگار ملے ہوئے تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عربوں کا اسپین نہایت خوشحال تھا۔ اس خوشحالی میں ریاست کی عدل وانصاف کی پالیسی کا بڑا دخل تھا۔ مثلاً عربوں نے زمینداری نظام کو ختم تو نہیں کیا لیکن مزدوروں کو ان کے حقوق دلائے۔ بلکہ انھوں نے 'بٹائی' کا تصور عام کیا۔ خاص طور سے عرب امراء کو جب جاگیریں ملیں یا انھوں نے اپنے پیسوں سے زرعی زمینیں خریدیں تو ظاہر ہے وہ خود کھیتی باڑی نہیں کرسکتے تھے، اس لیے مزدوروں سے 'بٹائی' پر کام کراتے، یعنی پیداوار مالک اور مزدور کے درمیان نصف نصف تقسیم کی جاتی۔ اس اسکیم سے کسانوں کو بہت فائدہ ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ بہتیرے خود زمینوں کے مالک بن گئے۔

7.7 نظام عدالت

جب ایک قوم کا دوسری قوم سے سابقہ پڑتا ہے تو بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں۔ مگر مسلمان جب اندلس میں داخل ہوئے تو انھیں پیش آنے والے مسائل کا نہ صرف اندازہ تھا بلکہ ان کے پاس ان کا حل بھی موجود تھا۔ کیونکہ مسلمان اسپین سے پہلے بھی ایسے ممالک فتح کرچکے تھے جو عیسائیوں کے زیر حکمرانی تھے اور جہاں اہل کتاب بڑی تعداد میں آباد تھے۔ اسلامی ریاست میں اہل کتاب کی حیثیت سے متعلق قرآنی ہدایت کے ساتھ مسلمانوں کے پاس آثار صحابہ بھی تھے۔ اس لیے اندلس پر فتح کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اکثر مسائل کو انھوں نے فوراً حل کرلیا۔

پھر بھی ایسا سماج جہاں دو یا دو سے زیادہ قومیں اور ثقافتیں پائی جاتی ہیں، وہاں نت نئے مسائل کے ساتھ تنازعات پیدا ہوتے رہتے ہیں جنھیں حل کرنے کے لیے عدلیہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ مسلمانوں کو اس صورتحال کا سامنا خاص طور سے حضرت عمرؓ کے دور میں ہوا۔ سماج میں امن قائم کرنے اور لوگوں کو انصاف دلانے کے لیے خلیفہ ثانی نے آزاد عدلیہ قائم کی۔ عدلیہ کا کام مقدمات کے فیصلے کرنا، مظلوم کو انصاف اور حق دار کو اس کا حق دلانا تھا۔ اگرچہ ججوں کا انتخاب حضرت عمرؓ خود کرتے تھے مگر وہ اپنے فریضے کی ادائیگی کے

معاملے میں آزاد تھے۔ ججوں کو انتظامیہ کے زیر اقتدار یا زیر نگرانی نہیں رکھا گیا تھا۔ صوبوں میں گورنر اور دوسرے افسروں کے ساتھ جج بھی مقرر ہوتے اور یہ عدلیہ آزاد تھی، انتظامیہ کے ماتحت نہیں تھی اگر چہ حضرت عمر یا انتظامیہ نے ان کی تنخواہیں مقرر کر دی تھیں۔ بلاشبہ خلفائے راشدین کے دور میں عدلیہ آزاد تھی مگر بنو امیہ کے دور میں صورت حال بدل گئی تھی۔ پھر بھی عدلیہ کا تصور اور وجود پایا جاتا تھا اور کم از کم اہل علم کے درمیان یہ شعور بھی پایا جاتا تھا کہ عدلیہ کو انتظامیہ کے ماتحت نہیں ہونا چاہیے۔ عام حالات میں عدلیہ آزادانہ فیصلے کرتی تھی۔ یہاں تک کہ کئی بار حکمراں خاندان کے افراد بھی عدلیہ کی گرفت سے نہیں بچ پاتے تھے۔

اہل کتاب کا مسئلہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے دور میں ہی حل کر لیا تھا بلکہ ایک طرح سے اس مسئلے کا حل دستور یا میثاق مدینہ میں بھی موجود تھا جو نبی ﷺ نے مدینہ کی شہری ریاست کو چلانے کے لیے یہود مدینہ سے مل کر تیار کیا تھا۔ نبی ﷺ اور صحابہ کرام کی سنت و آثار سے استفادہ کرتے ہوئے اندلس میں عربوں نے غیر مسلموں خصوصاً اہل کتاب کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ انھیں اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی کے ساتھ انھیں اپنے مذہبی معاملات یا مقدمات طے کرنے کی پوری اجازت تھی۔

مسلمانوں کے باہمی تنازعات کو طے کرنے کے لیے اسلامی عدالتیں تھیں۔ ایک چیف جسٹس کے ساتھ جس کے دائرہ کار میں پورا ملک تھا، ہر بڑے شہر میں دار القضا قائم تھے۔ اسلامی عدالتوں میں ظاہر ہے مسلمانوں کے ہی مقدمات آتے۔ لیکن کبھی کبھی غیر مسلموں کے معاملات بھی پیش ہوتے۔ مثلاً اہل کتاب میں سے اگر کوئی کسی مسلمان کو قتل کر دیتا تو اس کا مقدمہ بھی اسلامی عدالت میں پیش ہوتا۔

اسپین میں ایک وقت اہانت رسول ﷺ کے واقعات کثرت سے ہونے لگے تھے۔ ہوا یوں کہ اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر بہت سے اندلسی خصوصاً غلام اور مزدور مسلمان ہو گئے۔ اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو مسلمان نہیں ہوتے تھے لیکن مسلمانوں کی زبان، لباس اور تہذیب و ثقافت کو اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتے۔ مذہبی عیسائیوں کو اس سے بڑی پریشانی تھی۔ چناں چہ وہ اور ان کے بعض ماننے والے سر عام نبی ﷺ کو گالیاں دے دیتے۔ اکثر وہ مسجدوں میں گھس جاتے اور نبی کریمؐ کی شان میں گستاخی کرتے۔ عام مسلمان ردعمل کرتے ہوئے انھیں سزا دینا چاہتے تو قاضی انھیں روک دیتا۔ اس کے بعد قاضی ملزم کو اپنے دفاع کا پورا حق دیتا۔ یہ مذہبی جنونی عدالت میں بھی اسلام اور بالخصوص نبی کریمؐ کو برا بھلا کہتے۔ مجبوراً قاضی انھیں موت کی سزا دے دیتا۔

موت کی سزا پانے والوں کو فوراً پھانسی نہ دی جاتی۔ عبدالرحمٰن الداخل اور دوسرے حکمرانوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان لوگوں کو توبہ کرنے کا ایک اور موقع فراہم کیا جائے۔ چناں چہ قاضی کے فیصلے کے بعد انھیں وزراء و امراء کی کونسل کے سامنے پیش کیا جاتا۔ کونسل شفقت سے انھیں سمجھاتی اور توبہ کرنے پر آمادہ کرتی۔ اگر اس موقع کا بھی وہ فائدہ نہ اٹھاتے اور اپنی گستاخی پر قائم رہتے تو پھر انھیں سزا دے دی جاتی۔

مگر پھانسی کی سزا پانے کے باوجود جنونیوں کی گستاخی رسولؐ والی حرکت جاری رہی۔ اس اندیشے سے کہ یہ سماج میں بھیانک شکل اختیار نہ کر لے، مسلم حکمرانوں نے عیسائی مذہبی رہنماؤں کا تعاون حاصل کیا اور کسی طرح مذہبی جنونیت کی اس وبا کو ختم کیا۔

7.8 اندلس میں علوم کی ترقی

قرآن مجید میں تعلیم و تعلم پر جو زور دیا گیا ہے اس کا راست اثر عالمی اسلامی تہذیب پر نظر آتا ہے۔ جہاں بھی مسلمانوں،

خاص طور سے عربوں کو اقتدار حاصل ہوا، انہوں نے بڑے پیانے پر علم وادب کی سرپرستی کی۔ اندلس فتح کرنے والے عرب مختلف نہیں تھے۔ انھوں نے محض صنعت وحرفت اور زراعت وتجارت کے میدانوں میں اسپین کو آگے نہیں بڑھایا بلکہ یہاں علم کی شمع اس وقت روشن کی جب پورا یوروپ تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ یوں تو سسلی (صقلیہ) اور دوسرے راستوں سے بھی علم کی کرنیں یوروپ پہنچیں مگر یوروپی نشاۃ ثانیہ میں سب سے بڑا حصہ اندلس کا رہا ہے۔

اندلس کے اہل قلم نے خود عربی زبان وادب میں بھی گراں قدر اضافے کیے۔ موشحات جیسی شاعری کی ایک نئی قسم ایجاد کی۔ ابن زیدون جیسے شاعر فطرت نے عربی شاعری کو نئی جہتوں اور مضامین سے روشناس کرایا۔ ابن عبدربّہ جیسے صاحب علم وادب نے العقد الفرید جیسی نابغہ روزگار کتاب دی۔ خاتون شعراء میں خلیفہ المستکفی کی صاحبزادی ولدہ کا بڑا نام ہے۔ ابن حزم جیسا جامع کمالات بھی مسلم اسپین کی دین ہے۔ ابن حزم ایک بہترین منتظم تھا۔ اس نے امویوں کے عہد زوال میں دو خلفاء کی بحیثیت وزیر خدمت کی۔ خلافت کے خاتمے کے بعد اس نے خود کو علم وادب کے لیے وقف کر دیا۔ ابن خلقان نے لکھا ہے کہ ابن حزم نے تاریخ، منطق، دینیات، حدیث، تصورعلم، شاعری اور اس سے متعلق دوسرے موضوعات پر تقریباً چار سو کتابیں لکھیں جن میں اکثر ضائع ہو گئیں۔ میدان ادب میں اس نے طوق الحمامہ جیسی منفرد کتاب لکھی جو عشقیہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا آغاز ابن حزم نے کیا جس کا فی زمانہ بڑا شہرہ ہے۔

اندلس کے اہل قلم نے زبان وادب، دینیات، تاریخ نویسی، جغرافیہ، علم فلکیات اور ایسے دوسرے علوم کے میدانوں میں اپنے گھوڑے دوڑائے ہیں مگر بقول حتّی ان علوم میں وہ شام وعراق کے اہل علم کے مقابلے میں ذرا پیچھے رہ گئے۔ لیکن علم نباتات، طب، فلسفہ اور ریاضی میں ان کی حصہ داری کو کم آنکنا فاش غلطی ہوگی۔

مناسب ہوگا کہ طب وفلسفہ کے اندلسی ماہرین اور عظیم سائنس دانوں کے تذکرے سے پہلے مختصراً بعض دوسرے بڑے ناموں کا تذکرہ ہو جائے جنھوں نے تاریخ وجغرافیہ اور ایسے دوسرے میدانوں میں کافی نام کمایا۔ ابن قوطیہ ایک بڑا مورخ گزرا ہے۔ اس کا پورا نام ابوبکر ابن عمر تھا۔ یہ قرطبہ میں پیدا ہوا، وہیں پلا بڑھا، تعلیم حاصل کی اور وہیں اس کا 1977ء میں انتقال ہوا۔ اس نے اپنے زمانے تک کی اندلس کی تاریخ بڑے اچھے انداز میں لکھی ہے۔ اس کی کتاب تاریخ افتتاح الاندلس سے حتّی نے اپنی کتاب 'تاریخ عرب' کی تصنیف کے دوران استفادے کا اعتراف کیا ہے۔ ابن قوطیہ کی یہ کتاب فتح اندلس سے عبدالرحمٰن الثالث کے ابتدائی دور تک کی تاریخ بیان کرتی ہے۔ ابن قوطیہ بہت بڑا نحوی بھی تھا۔ اس کی کتاب الافعال زمانے کی دست برد سے بچ کر ہم تک پہنچی ہے۔ دوسرا بڑا مورخ، جو اندلس کے ابتدائی زمانے میں تھا، قرطبہ کا ابن مروان حیان بن خلف تھا۔ یہ بھی قرطبہ کا باشندہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے کم وبیش پچاس کتابیں لکھی تھیں جن میں سے ایک 60 جلدوں میں تھی۔ آج بس اس کی کتاب المقتبس فی تاریخ رجال الاندلس موجود ہے۔ عبدالواحد مراکشی ایک دوسرا مورخ گزرا ہے جس نے پورے اندلس کا دورہ کرنے کے بعد اس کی جامع تاریخ لکھی تھی۔ لسان الدین ابن الخطیب اندلس کے عہد زوال کا ایک بڑا مورخ گزرا ہے۔ وہ ایک مشہور عرب خانوادے کا چشم وچراغ تھا جو شام سے ہجرت کر کے اندلس میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ یوسف ابوالحجاج اور اس کے بیٹے محمد پنجم کی حکومتوں میں وہ وزیر تھا۔ اس کے پاس دو وزارتیں تھیں، اس لیے ذوالوزارتین کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ محلاتی سازشوں سے تنگ آکر غرناطہ

نے اپنا آخری اہم مصنف، شاعر اور قدآور لیڈر رکھو دیا۔ ابن خطیب نے کم وبیش 60 کتابیں لکھیں۔ وہ شعر و ادب کے علاوہ کئی علوم میں دسترس رکھتا تھا۔ چناں چہ اس نے تاریخ، جغرافیہ، طب اور فلسفے جیسے موضوعات پر درجنوں کتابیں لکھیں جن میں سے خوش قسمتی سے ایک تہائی ہم تک پہنچی ہیں۔

مورخین اندلس کا ذکر، ظاہر ہے، ابن خلدون کے بغیر ادھورا رہے گا۔ عبدالرحمٰن ابن خلدون 1332ء میں پیدا ہوا اور 1406ء تک زندہ رہا۔ اس کی پیدائش تیونس میں ہوئی تھی۔ ابن خلدون کا خاندان حضرموت، یمن سے ہجرت کر کے آٹھویں صدی میں اندلس میں بس گیا تھا۔ اس خاندان نے اسپین میں کافی ترقی کی۔ عبدالرحمٰن ابن خلدون کافی تعلیم یافتہ اور ماہر منتظم تھا۔ فاس میں وہ کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ چونکہ وہ مسلم اسپین کے عہد زوال میں جی رہا تھا، اس لیے اسے بھی سازشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مجبور ہو کر اسے فاس سے غرناطہ آنا پڑا جہاں اس نے محمد پنجم کے یہاں نوکری کر لی۔ اس کی علمی عظمت اور تجربے کی وجہ سے سلطان محمد نے اسے قشتالہ (Castila) کے بادشاہ کے دربار میں امن مشن کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ ابن خطیب سے ابن خلدون کی بڑی دوستی تھی۔ مگر ابن خلدون پر سلطان محمد کی نوازشیں دیکھ ابن خطیب اس سے حسد کرنے لگا۔ اس کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ابن خلدون المغرب واپس لوٹ آیا۔ یہاں مختلف امراء کے ساتھ اس نے کام کیا اور کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ بالآخر نوکری کو خیرباد کہہ کر وہ علمی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔ وہ ایک نئے انداز سے تاریخ لکھنا چاہتا تھا جس کے لیے اسے سکون اور یکسوئی چاہیے تھی اور اسی لیے اس نے ملازمت سے استعفےٰ دے دیا۔ 1382ء میں ابن خلدون نے حج کا ارادہ کیا لیکن جب قاہرہ پہنچا تو وہیں رک گیا اور جامعہ ازہر میں لکچر دینے لگا۔ مملوک سلطان الظاہر برقوق نے 1384ء میں قاہرہ کا چیف مالکی قاضی مقرر کیا۔ 1401ء میں مملوک سلطان الناصر فراج کے ساتھ تیمور لنگ کے خلاف فوجی مہم میں شریک تھا اور اس کے ساتھ دمشق گیا۔ کہا جاتا ہے کہ تیمور لنگ کو ابن خلدون کی علمی عظمت کا علم تھا۔ چناں چہ اس نے اپنے کیمپ میں اسے کافی عزت و تکریم کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ اس طرح ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ابن خلدون محض مورخ اور مصنف نہیں بلکہ ایک تجربہ کار اور قدآور لیڈر بھی تھا جس نے شمالی افریقہ اور اندلس کی سیاست کا گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا۔ دیکھا جائے تو ایک نئے انداز کی تاریخ لکھنے کے لیے اس کے پاس ضروری تجربات تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ماضی کی تاریخ لکھنے کے لیے اس کے پاس وہی کتابیں استفادہ کے لیے تھیں جن میں وہ کمیاں پاتا تھا۔ چناں چہ اپنے اس فلسفہ تاریخ کے مطابق وہ اپنی کتاب العبر نہیں لکھ پایا جس کی تشریح اس نے اپنے مشہور زمانہ مقدمہ میں کی ہے۔ اس مقدمہ کی وجہ سے ابن خلدون نہ صرف فلسفہ تاریخ کے اہم مصنفین میں گنا جاتا ہے بلکہ علم سماجیات کا بانی بھی گردانا جاتا ہے۔ ناقدین کے بقول اس کی اپنی کتاب العبر خود اس کے اپنے اصول و فلسفہ تاریخ کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی لیکن جیسا کہ حتّی نے لکھا ہے کہ اس میں المغرب کے بربر قبائل اور عربوں کے بارے میں قابل قدر تفصیلی معلومات موجود ہیں۔

حتی نے صحیح لکھا ہے کہ ابن خلدون کی شہرت اس کے مقدمہ کی وجہ سے ہے۔ اس میں اس نے پہلی بار تاریخی ارتقاء کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریے کے مطابق انسانی سماج و کردار پر، انسان کی شخصیت پر جغرافیائی حالات اور ماحول اور اخلاقی و روحانی عوامل کا اثر پڑتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر انسانی تاریخ کی ترقی (Progress) میں مذکورہ عوامل و عناصر اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ابن خلدون نے اسی ضمن میں قوموں کے عروج و زوال کے اصول و ضوابط یا فلسفہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح اسے فلسفہ عروج و زوال اقوام کا موجد کہہ سکتے ہیں۔ اس

تعلق سے ابن خلدون کو خود بھی اپنی اہمیت کا اندازہ تھا۔ بلاشبہ ابن خلدون عالم اسلام کا سب سے بڑا ماہر فلسفہ تاریخ گزرا ہے۔ بجا طور پر اس کا شمار دنیا کے عظیم ترین مصنفین اور ماہرین فلسفہ تاریخ میں ہونا چاہئے۔

جغرافیہ اور ریاضی جیسے اہم علوم میں بھی مسلم اسپین کے اسکالرس نے قابل قدر اضافہ کیا۔ اگر چہ یہاں البیرونی اور الخوارزمی جیسے ماہرین جغرافیہ وریاضی نظر نہیں آتے مگر ان علوم میں دسترس رکھنے والے بے شمار لوگ تھے جن کی کتابوں نے اہل یوروپ پر گہرا اثر ڈالا۔ حتّٰی نے کئی اہل قلم اور ان کی کتابوں کا ذکر کیا ہے جو یوروپی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں۔ عربی کتابوں کو لاطینی اور دوسری یوروپی زبانوں میں ترجمہ کرنے کا بڑا مرکز طلیطلہ تھا۔

سائنس کے میدان میں اندلسی مسلمانوں کا حصہ بہت اہم ہے۔ انھوں نے ہر میدان میں اپنے جوہر دکھائے اور اندلس کے کئی سائنسدانوں نے وہی عالمی شہرت حاصل کی جو مشرق کے مسلمان سائنسدانوں کے حصے میں آئی تھی۔ علم نباتات کے میدان میں خاص طور سے اندلس کے سائنسدانوں نے خاص رول ادا کیا اور اس موضوع پر لکھی ہوئی ان کی کتابیں نہ صرف ان کی معاصر دنیا میں مقبول ہوئیں بلکہ جدید سائنس کے عروج وارتقاء میں بھی ان کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ اندلسی ماہرین نباتات نے پودوں اور درختوں کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا، ان کی قسمیں طے کیں، ان کے فرق کو واضح کیا مثلاً کون سے پودے قلم کر کے اگائے جاتے ہیں، کون بیج سے پیدا ہوتے اور کون خودرو ہیں۔ الغافقی نے اسپین اور افریقہ میں گھوم گھوم کر پودے جمع کئے اور ان کے افریقی لاطینی اور اسپینی ناموں کے قریب تر عربی نام تجویز کیے۔ یہ ایک مشکل کام تھا اور کافی تحقیق ومطالعہ کے بعد ممکن ہو سکا تھا۔ اس سے پہلے بھی عربی میں علم نباتات پر کتابیں موجود تھیں مگر شاید کوئی بھی کام اس کے پائے کا نہ تھا۔ الغافقی کی سب سے اہم کتاب الادویہ المفردہ تھی جس کا اثر ابن بیطار پر بھی پڑا جو زمانہ وسطی کا سب سے بڑا ماہر نباتات گزرا ہے۔

ابن العوام دوسرا اہم اندلسی سائنسداں گزرا ہے جس کا زراعت کے میدان میں بڑا کام تھا۔ اس کی کتاب کا نام الفلاحہ تھا۔ زمانہ وسطی میں زراعت کے موضوع پر اس سے بہتر کوئی اور کتاب نہیں تھی۔ نہ صرف اندلس یا مسلم دنیا بلکہ پورے عالم میں یہ اپنے موضوع پر سب سے عمدہ، ممتاز معلوماتی کتاب تھی۔ ابن العوام نے بعض یونانی وعربی کتابوں سے بھی استفادہ کیا لیکن الفلاحہ کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ صاحب کتاب نے اس میں اندلسی زراعتی تجربات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں 585 پودوں کا ذکر ہے۔ اسی طرح 50 سے زائد پھل دار درختوں کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں قلم لگانے کے نئے تجربات کا ذکر ہے۔ زمین کی زرخیزی کی صلاحیتوں، زراعت میں استعمال ہونے والی کھادوں کے علاوہ اس کتاب میں ان بیماریوں کا بھی بیان ہے جو درختوں، پودوں، کھیتوں، خاص طور سے انگور کی کھیتی کو لاحق ہوتی ہیں۔ کتاب میں ان امراض کے علاج کے طریقوں یا تدبیروں کا بھی ذکر ہے۔ اپنی ان ساری خوبیوں کے باوجود یہ کتاب بہت مشہور نہیں ہوئی۔ ستم تو یہ ہے کہ ابن خلقان اور ابن خلدون جیسے محققین نے ابن عوام کے بجائے اوروں کو اس کتاب کا مصنف قرار دیا ہے۔

لیکن اندلس کا سب سے بڑا ماہر نباتات ودواساز عبداللہ ابن احمد ابن البیطار تھا۔ ابن بیطار مالقہ میں پیدا ہوا اور اپنے وقت کے ماہرین فن وصاحبان علم سے تعلیم حاصل کی۔ یہ طبی اہمیت کے حامل پودوں اور درختوں کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ اس نے پورے اسپین اور شمالی افریقہ میں گھوم گھوم کر ان پودوں اور درختوں کی دریافت کی جن کی طبی نقطہ نظر سے اہمیت تھی۔ طبی اہمیت کے حامل

پودوں کی تلاش میں وہ قاہرہ بھی آیا جہاں اس نے ایوبی سلطان، ملک الکامل کے یہاں نوکری بھی کی۔ مصر کے دوران قیام اس نے شام اور ترکی کا سفر بھی کیا جس کا مقصد پودوں کی تلاش اور مطالعہ تھا۔ اس کا انتقال 1248ء میں دمشق میں ہوا۔ ابن بیطار نے دو مشہور کتابیں تصنیف کیں۔ پہلی کتاب کا نام المغنی فی الادویہ المفردہ تھا۔ دوسری کتاب جو زیادہ مشہور ہوئی اس کا نام الجامع فی الادویہ المفردہ تھا۔ اس کتاب میں ابن بیطار نے جانوروں، سبزیوں اور معدنیات سے بنی ہوئی دواؤں کا ذکر کیا ہے جو مختلف امراض کے علاج کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ اس کتاب میں اس نے سابقہ یونانی وعربی تجربات سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ خود اپنے تجربات اور تحقیقات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ماہرین کے خیال میں یہ اپنی نوعیت کی بڑی ممتاز کتاب ہے۔ اس میں 1400 چیزوں کا ذکر ہے جن میں سے تین سو بشمول دو سو درختوں کے بالکل نئی چیزیں ہیں۔ اس کتاب میں ابن بیطار نے 150 سے زیادہ مصنفین کا حوالہ دیا ہے جن میں سے 20 یونانی تھے۔ اس کتاب کا کئی یوروپی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور لوگ اس سے 18 ویں صدی تک استفادہ کرتے رہے۔

10 ویں اور گیارہویں صدی کے اسپین کے فضلا کی اکثریت ایک سے زیادہ علوم کی ماہر ہوتی تھی۔ عالم وفاضل ہونے کے ساتھ یہ انتظامی امور میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ بعض اپنے علم وفضل کی وجہ سے وزارت کے عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ ابن رشد، ابن میمون (یہودی) ابن باجہ اور ابن طفیل ایسے ہی بڑے نام ہیں جو ایک سے زیادہ علوم کے ماہر ہونے کے ساتھ بہترین منتظم بھی تھے۔ 14 ویں صدی کے وسط میں یوروپ میں 'کالی موت کی آندھی' چلی۔ پلک جھپکتے ہزاروں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ یہودی وعیسائی فضلائے طب نہ صرف خود کو اس بیماری کے خلاف بے بس پاتے بلکہ اسے خدا کا نازل کردہ عذاب تصور کرتے تھے۔ لیکن مسلمان حکماء نے یہ رائے دی کہ ''کالی موت' خدائی عذاب نہیں بلکہ متعدی بیماریوں کی وجہ سے ہو رہی ہے۔

ابوالقاسم الزہراوی عربوں کا سب سے بڑا سرجن گزرا ہے۔ یہ اندلسی حکمراں ہشام ثانی کا درباری طبیب تھا۔ جراحت یا سرجری کے موضوع پر اس کی مشہور کتاب کا نام التصریف تھا۔ اس کتاب میں زہراوی نے علم جراحت سے متعلق وہ ساری معلومات جمع کر دی ہیں جو اس کے دور میں پائی جاتی تھیں۔ زہراوی کی عظیم شہرت اسی کتاب کی مرہون منت ہے۔ اس کتاب میں اپنے تجربات کی بنیاد پر زہراوی نے زخموں پر کاٹن سے مرہم پٹی کرنے کی وکالت کی ہے۔ اسی طرح مثانے میں پتھری کو دواؤں سے توڑنے کا بھی اس نے ذکر کیا ہے۔ وہ مطالعے ومشاہدے کے لیے لاشوں کی چیڑ پھاڑ (Anatomy) کی ضرورت بھی بیان کرتا ہے۔ اس زمانے میں یہ بڑے نئے اور اچھوتے خیالات تھے۔ التصریف کا یورپ کی تمام ہی اہم زبانوں میں ترجمہ ہوا اور 18 ویں صدی تک جراحت کے موضوع پہ یہ سب سے اچھی کتاب مانی جاتی تھی۔ اس طرز تحریر کا وہ بانی ہے جس کی اتباع بعد کے عرب اور یوروپی اہل قلم نے کی ہے۔ بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ یوروپ میں سرجری کی بنیاد التصریف نے ڈالی۔

علم جراحت میں دوسرا بڑا اندلسی ماہر ابن زہر تھا۔ ابن زہر اندلس کے ایک مشہور طبی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ حکماء کے خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے اس کو بہت اچھی تعلیم وتربیت حاصل ہوئی۔ اس کی پیدائش 1091ء سے 1094ء کے درمیان ہوئی اور انتقال 1162ء میں ہوا۔ وہ موحد سلطنت کے بانی عبدالمومن کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس زمانے میں ایک سے زائد مروجہ علوم میں مہارت حاصل کرنا ایک طرح کا فیشن تھا۔ مگر ابن زہر نے خود کو علم طب تک محدود رکھا اور صرف اسی میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ اس نے طب پر کل 6 کتابیں لکھیں جن میں سے تین ہم تک پہنچی ہیں۔ اس کی سب سے مشہور کتاب التیسیر ہے جو اس

نے اپنے معاصر اور دوست ابن رشد کی فرمائش پر لکھی تھی۔ ابن رشد نے اپنی کلیات میں لکھا ہے کہ جالینوس کے بعد ابن زہر سب سے بڑا طبیب ہے۔ حتّیٰ کہتا ہے کہ رازی کے بعد ابن زہر مسلم دنیا کا سب سے بڑا طبیب گزرا ہے۔ ابن زہر پہلا طبیب ہے جس نے سب سے پہلے اس امر سے بحث کی کہ ہڈیوں میں احساس پایا جاتا ہے یا جان ہوتی ہے۔

فلسفے کے میدان میں اندلسی مسلمانوں اور بعض یہودی فلسفیوں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلا نام یہودی فلسفی سلیمان ابن جبریل کا ہے۔ اس نے بڑی چھوٹی عمر پائی۔ 1021ء میں پیدا ہوا اور 1058ء انتقال کر گیا۔ ینبع الحیاۃ یعنی چشمۂ حیات اس کی سب سے اہم کتاب ہے۔ دوسری اہم کتاب اصلاح الاخلاق تھی۔ اس نے نہ صرف اندلس میں فلسفیانہ خیالات بالخصوص Neo-platonism کو فروغ دیا بلکہ اہل یوروپ کو بھی متاثر کیا۔

بارہویں صدی کے اندلس میں بہت سے عظیم فلسفی پیدا ہوئے۔ انھیں میں سے ایک ابن باجہ تھا جسے بعض لوگوں نے دہریہ قرار دے دیا تھا۔ اس کا پورا نام ابوبکر محمد بن یحیٰ ابن باجہ تھا۔ یہ فلسفی، سائنسداں، طبیب، موسیقار ہونے کے ساتھ ارسطو کا بہت بڑا شارح تھا۔ اس کی زندگی کا بڑا حصہ غرناطہ اور سرقسطہ (Saragossa) میں گزرا۔ اس کا انتقال فاس میں 1138ء میں ہوا۔ ابن باجہ نے فلکیات پہ کئی کتابیں لکھیں جن میں اس نے Ptolemy کے افکار پر تنقید کی۔ بعد میں آنے والے ماہرین فلکیات مثلاً ابن طفیل وغیرہ پر ابن باجہ کے گہرے اثرات پڑے۔ اس نے طب پر جو کتابیں لکھیں، ان سے بعد میں آنے والے اطباء خاص طور سے ابن البیطار نے بہت استفادہ کیا۔ ابن رشد بھی ابن باجہ کی طبی خدمات سے متاثر تھا اور اس ان کی عظمت کا قائل بھی۔

ابن باجہ کا اصل کارنامہ فلسفہ کے میدان میں ہے۔ اس موضوع پر لکھی گئی اس کی کتاب تدبیر المتوحد بہت مشہور ہوئی اور اس کی صرف یہی کتاب ہم تک پہنچی ہے۔ ابن باجہ کا فلسفہ یہ تھا کہ انسانی روح کا تدریجی ارتقاء ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ فنافی اللہ ہو جاتا ہے اور یہی فلسفہ کا اصل مقصد ہے۔ بعض مسلمانوں نے اس کے اس فلسفے کی تنقید کی ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اسے دہریہ قرار دے دیا تھا۔

ایک اور اندلسی فلسفی ابن طفیل گزرا ہے۔ ابن طفیل ابن باجہ سے بہت متاثر تھا اور اندلس میں Neo-Platonism کا بہت بڑا علم بردار۔ زمانے کے رواج کے مطابق ابن طفیل بھی کئی علوم کا ماہر تھا۔ وہ غرناطہ میں طبیب تھا اور بعد میں موحد حکمراں ابو یعقوب یوسف کے مشیر اور شاہی طبیب کے عہدے سے استعفے دے دیا اور اپنی جگہ ابن رشد کی تقرری کرادی۔ موحد حکمراں مذہبی معاملات میں تو سخت تھے لیکن فلسفے کی سرپرستی انھوں نے خوب کی۔ ابن طفیل نے کئی کتابیں تصنیف کیں لیکن سب سے زیادہ مشہور حی بن یقظان ہوئی۔ یہ ایک طرح کا فلسفیانہ رومانس ہے۔ اس میں ادبی چاشنی کے ساتھ Neo-Platonism کی تشریح کی گئی ہے۔ یعنی انسان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ کسی خارجی مدد کے بغیر عرفان خدا حاصل کر سکے۔ زمانہ وسطیٰ کی غالباً سب سے زیادہ پر لطف اور Original کہانی حی بن یقظان ہے جس کا تمام ہی یوروپی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ لاطینی زبان میں اس کا ترجمہ 1671ء اور ڈچ میں 1672ء میں ہوا۔ روسی زبان میں اس کا ترجمہ 1920ء اور اسپینی زبان میں 1934ء میں ہوا۔ ابن باجہ کے علاوہ ابن طفیل ابن سینا اور فارابی سے بھی متاثر تھا اور حی بن یقظان کے بعض کرداروں کے نام ان عظیم فلاسفہ کی کتابوں سے مستعار ہیں۔

شاید سب سے بڑا اندلسی مسلم فلسفی ابن رشد تھا۔ یہی وہ فلسفی ہے جس کا مغرب پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہے۔ ابن رشد قرطبہ کے ایک معروف ومشہور تعلیم یافتہ خاندان میں 1126ء میں پیدا ہوا۔ مروجہ علوم میں دسترس حاصل کرنے کے بعد اس نے فلسفے میں خاص دلچسپی دکھائی۔ اگر چہ وہ شارح ارسطو ہونے کے ساتھ بہترین طبیب اور ماہر فلکیات بھی تھا۔ اس کے خاندان میں بڑے بڑے علماء وفضلاء گزرے ہیں جن میں سے کئی قضا کے عہدوں پر فائز ہوئے۔ وہ خود بھی 1169ء اور 1171ء کے دوران اشبیلہ (Siville) کا قاضی رہا۔ دوسال بعد وہ قرطبہ کا قاضی بھی مقرر ہوا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، وہ موحد حکمرانوں کے دربار سے بھی وابستہ رہا۔ اس کا انتقال 1198ء میں ہوا۔

طب کے موضوع پر ابن رشد کی مشہور کتاب الکلیات فی الطب ہے۔ اس کتاب میں اس نے لکھا ہے کہ چیچک کسی کو دوبار نہیں ہوتی۔ طبیب ہونے کے ساتھ وہ ماہر دینیات بھی تھا۔ مگر طب اور دینیات سے کہیں زیادہ اس نے فلسفہ میں نام کمایا۔ اس کی اصل فلسفیانہ کتاب تہافتہ التہافتہ ہے۔ جو امام غزالی کی تہافتہ الفلاسفہ کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے ارسطو کی کتابوں کی تشریح کی۔ مذہبی علماء نے ابن رشد کی تہافت کو پسند نہیں کیا لیکن مغرب یا یوروپ میں یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی۔ اس کے علاوہ ابن رشد نے ارسطو کی کئی کتابوں کی شرح لکھی جن کے یوروپ پر بڑے گہرے اثرات پڑے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ یوروپ میں تعقل پسندی کا رواج ابن رشد کی کتابوں سے عام ہوا۔ یوروپی لٹریچر میں ارسطو اور ابن رشد 'استاذ' اور 'شارح' کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

ابن رشد کی تہافت سے صرف مسلمان ہی ناراض نہیں ہوئے بلکہ یہودی اور عیسائی علماء نے بھی اس کتاب، خاص طور سے اس کی تعقل پسندی کو پسند نہیں کیا۔ لیکن وہ سب ابن رشد کی مذہب اور سائنس اور فلسفہ اور عقیدہ کے درمیان تطابق پیدا کرنے کی کوشش سے بہت متاثر اور مسرور تھے۔ چناں چہ یہودی اور عیسائی علماء نے تہافت کے بعض حصوں کو کتاب سے نکال کر ان فلسفیانہ بحثوں کو یوروپی یونیورسٹیوں میں داخل نصاب کرا دیا جو مذہب وسائنس کے تضاد کو ختم کرتی ہیں۔ ابن رشد کی زیادہ تر فلسفیانہ کتابیں عبرانی یا لاطینی زبان میں محفوظ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب عربی سے عبرانی یا لاطینی زبانوں میں ترجمہ کی گئی تھیں۔ آج اس کی صرف ایک کتاب عربی میں پائی جاتی ہے اور یہ عربی کتاب بھی عبرانی رسم الخط میں لکھی گئی ہے۔

ابن رشد عالم اسلام کا آخری بڑا فلسفی کہا جاتا ہے۔ دراصل غزالی کی تہافتہ الفلاسفہ کے بعد فلسفہ میں لوگوں کی دل چسپی کم ہوتی گئی۔ بعض لوگ غلطی سے کہتے ہیں کہ امام غزالی کے زیر اثر مسلمانوں کے درمیان تعقل پسندی جاتی رہی۔ سچ یہ ہے کہ ہر عروج کو زوال ہے۔ مسلمان علم و ہنر کی بلندیوں پر پہنچ کر جیسے مطمئن سے ہو گئے تھے اور ظاہر ہے اطمینان آگے بڑھنے کی خواہش کو بتدریج کمزور کرتا جاتا ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ماہرین اسلامیات اور علم برداران فلسفہ اپنی اپنی باتیں کہہ چکے تھے اور بحث ومباحثہ کے لیے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دن بھر کام کرنے کے بعد عالم اسلام سونے کی تیاری کر رہا تھا۔

مگر عین اسی وقت مغرب علم و ہنر کو حاصل کرنے کے لیے بیدار ہو رہا تھا۔ یہ علم و ہنر اس وقت مسلمانوں کے پاس تھا، انھیں مسلمانوں کے پاس جن سے وہ صدیوں سے جنگ کر رہے تھے۔ تاریخ کا یہ کرشمہ ہے کہ علم کے میدان میں جنگ نہیں ہوئی، بلکہ مسلمانوں نے اس میدان میں مغرب کی بڑی مدد کی۔ پہلے انھوں نے یونانی علوم کو عربی جیسی زندہ اور عالمی زبان میں منتقل کر کے اور پھر اس کی تنقید وتہذیب کے ساتھ اس میں اضافہ کر کے اسے آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ پھر قدیم علوم کو بنیاد بنا کر نئی ایجادات کے دروازے کھولے اور ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ اور جب مغرب طالب علم کی حیثیت میں ان کے پاس

آیا تو بڑی فراخدلی سے اپنا سب کچھ انھیں دے دیا۔ اسلامی رویہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ علم واحد چیز ہے جو دوسروں کو دینے سے کم نہیں ہوتی۔ ہمارا علمی زوال اس لیے نہیں ہوا کہ ہم نے اسے مغرب کو دے دیا بلکہ اس لیے ہوا کہ ہم سبق کو یاد رکھنے اور نیا سبق لینے کا اولین و بنیادی علمی اصول بھول گئے۔

مغرب نے علمی ترقی کے لیے بالکل وہی راستہ اختیار کیا جس پر ان سے پہلے مسلمان چل چکے تھے۔ یعنی انھوں نے عربی زبان کے عظیم الشان علمی ذخائر کو لاطینی اور دوسری یوروپی زبانوں میں منتقل کیا۔ طلیطلہ ایک طرح سے شہر ترجمہ بن گیا تھا۔ مغرب نے نہ صرف اندلس میں موجود عربی کتابوں کا ترجمہ کیا بلکہ شام وعراق کے علمی خزانوں سے بھی اپنے مطلب کی کتابیں حاصل کر کے انھیں یوروپی زبانوں میں منتقل کیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ 12 ویں اور 13 صدی کے یوروپ میں یونانی زبان جاننے والے نہ ہونے کے برابر تھے۔ چناں چہ افلاطون اور ارسطو کو انھوں نے پہلے عربی کتابوں سے دریافت کیا۔ اس ضمن میں انھوں نے ابن رشد سے سب سے زیادہ استفادہ کیا خاص طور سے اس کی ان شرحوں سے جو اس نے ارسطو کے فلسفے کو سمجھانے کے لیے لکھی تھیں۔ ابن رشد خود بھی یونانی زبان نہیں جانتا تھا، اس لیے اس نے بھی ارسطو کی کتابوں کے عربی ترجمے پڑھے تھے اور پھر اس نے عربی ترجموں کی شرح لکھی تھی۔ یہ شرحیں یوروپ میں بڑی مقبول ہوئیں اور 16 ویں صدی تک ابن رشد مغربی جامعات اور وہاں کے اہل علم کے درمیان سب سے زیادہ پڑھا جانے والا مصنف تھا۔

7.9 خلاصہ

اس اکائی میں فتح اندلس کے ساتھ اس ملک میں اموی شہزادے عبدالرحمٰن الداخل کی آمد اور اس کی امارت کے قیام سے بحث کی گئی ہے۔ اس زمانے کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اہم امراء یا سلاطین اور خلفاء کے کارناموں کے ضروری بیان کے ساتھ حاجب المنصور کی حصولیابیوں کا بھی ذکر ہے۔ اسپین میں مسلمانوں نے جو علمی ترقی کی، اس کا گو قدرے تفصیل سے ذکر ہے، لیکن یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ کئی کوششوں کو نظرانداز کرنا پڑا ہے۔ پھر کوشش کی گئی ہے کہ اہم علوم اور ان میدانوں کے بڑے شہسواروں کا ذکر ضرور ہو جائے آخر میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح مسلم اسپین کا مغرب کی علمی نشاۃ ثانیہ پر اثر پڑا۔ اگرچہ یہ بات اس اکائی میں کھل کر نہیں بیان کی گئی ہے لیکن مسلمانوں کی سماجی و سیاسی زندگی کے مطالعے سے اس زوال کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو بالآخر پندرہویں صدی کے آخری عشرے میں وقوع پذیر ہوا۔

7.10 نمونے کے امتحانی سوالات

1. مسلم اندلس کے سیاسی حالات کا جائزہ لیجیے۔
2. اندلس کے اسلامی عہد میں وہاں کے سماجی حالات کا تجزیہ کیجیے۔
3. اسلامی عہد کے اندلس کی معاشی زندگی پر روشنی ڈالیے۔
4. علوم وفنون کے میدان میں اندلسی مسلمانوں کے کارناموں اور مغرب پر ان کے اثرات کو تفصیلاً بیان کریں۔

7.11 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. تاریخ اندلس (حصہ اول) — ریاست علی ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
2. مسلمان اندلس میں — رشید اختر ندوی
3. تاریخ اسلام — اکبر شاہ خان، نجیب آبادی
4. اندلس کا تاریخ جغرافیہ — محمد عنایت اللہ دہلوی
5. نفح الطیب (اردو ترجمہ) — علامہ المقری
6. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ — ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی
7. عہدت نامہ اندلس — اہن ہارٹ ڈیزی
8. تاریخ ملت عربی — پی کے حتّی
9. Ameer ali, A short History of sarasens
10. Reinhart Dosy, Spainish Islam

اکائی 8 : اندلس کی حکومت کا زوال

اکائی کے اجزاء

8.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد اندلس میں مسلمانوں کے زوال اور اس کے اسباب سے بحث کرنا ہے۔ اسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں بنوامیہ کے عروج و زوال کی مختصر داستان بیان کرتے ہوئے ان کے انحطاط کے اسباب پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ بنوامیہ کے بعد رونما ہونے والی طوائف الملوکی سے بھی ضرورت بھر قاری کو روشناس کرایا گیا ہے۔ اس ضمن میں مختصراً مرابطین و موحدین کی سلطنتوں بالخصوص یوسف بن تاشفین کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس اکائی کے دوسرے جز میں سقوط غرناطہ کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ مسلمانوں سے ہتھیار ڈالنے کے لیے جو عہد نامہ تیار کیا گیا تھا، اس پر کھل کر بحث کی گئی ہے۔ آخر میں اسپین سے مسلمانوں کے مکمل اخراج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

8.2 تمہید

اندلس میں مسلمانوں کی تاریخ طربیہ بھی ہے اور المیہ بھی۔ شاندار فتوحات کے ساتھ اس ملک میں علم وفن کے مینار روشن کرنے کی داستان سنی یا پڑھی جائے تو انسان وجد میں آجاتا ہے۔ اسپین فطری طور پر ایک زرخیز اور خوب صورت ملک مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی تھا۔ مگر یہاں کے باشندوں کے پاس نہ علم تھا اور نہ ذوق، جس سے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے یا انہیں تراش خراش کے مزید خوب صورت بناتے۔ یہ کام یہاں مسلمانوں نے کیا۔ اس ملک کو وہ ترقی دی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ یہاں کے زراعتی نظام کو بہتر بنایا، باغات لگائے، آبپاشی کے لیے نہریں نکالیں، نئے خوبصورت شہر بسائے جہاں راتیں روشنیوں سے جگمگاتیں، یونیورسٹیاں بنائیں، لائبریریاں قائم کیں اور علم وفن کی ایسی بزم سجائی جس سے پورے یوروپ نے استفادہ کیا۔

مگر خود اسپین کے باشندے بڑے بدقسمت نکلے، انہیں بس مذہبی جنون سے لگاؤ تھا۔ صدیوں تک مسلمانوں سے لڑتے رہے، ایسی جنگ جسے نور کے خلاف ظلمت کی لڑائی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بالآخر انہوں نے مسلمانوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ ہزاروں لوگوں کو تہ تیغ کر دیا گیا، لاکھوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ لوگ زبردستی عیسائی بنائے گئے اور زبردستی عیسائی بنائے گئے لوگوں پر بھی ظلم روا رکھا گیا۔ عیسائی حکمرانوں اور مذہبی رہنماؤں نے اس وقت چین کی سانس لی جب انہیں ۱۷ویں صدی میں یقین ہو گیا کہ ملک میں کوئی عرب یا مسلمان باقی نہیں رہا۔

8.3 اندلس میں بنوامیہ کا زوال

جدید دنیا کی آمد سے قبل عظیم سلطنتوں کا سب سے بڑا مسئلہ ترسیل یا Communication کا تھا۔ خاص طور سے دور دراز کے صوبوں کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے یا وہاں بہتر نظم ونسق کی غرض سے ضروری ہدایات بھیجنے کے لیے ایسے تیز رفتار ذرائع نہیں تھے جو ہمیں آج میسر ہیں۔ چنانچہ بڑی سلطنتوں کے حکمرانوں کو چاہے وہ مسلمان ہوں، عیسائی ہوں یا کسی اور مذہب کے ماننے والے، ہمیشہ یہ مسئلہ درپیش رہا کہ مرکز گریز طاقتوں کو کس طرح کنٹرول میں رکھا جائے۔ سب کے پاس بس ایک ہی طریقہ تھا یعنی فوجی طاقت کا رعب دلوں میں بٹھا دینا۔ جو حکمراں کامیاب فوجی مہموں کے ذریعے خود کو طاقتور ثابت کر دیتا، وہ مرکز گریز طاقتوں کو کنٹرول میں رکھنے میں کامیاب رہتا، لیکن جیسے ہی کوئی کمزور حکمراں تخت پر بیٹھتا، مرکز گریز عناصر سر اٹھاتے اور بغاوت کر دیتے۔ یہ عناصر صوبے دار بھی تھے اور فوجی سردار بھی۔ کہیں نہ کہیں ان کے دلوں میں حکمرانی کرنے کا جذبہ ہوتا یا انہیں شکایت ہوتی کہ مرکز ان کی خدمات کا قدرداں نہیں ہے، اس لیے وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ تخت پر بیٹھنے والے ہر نئے حکمراں کو بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایسے حکمراں بھی گزرے ہیں جنہوں نے بغاوتوں کی سرکوبی میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ گھوڑے کی پشت پر گزار دیا یعنی فوجی مہموں میں مصروف رہے۔

موروثی حکومتوں کے سامنے ایک مسئلہ اور بھی رہا ہے۔ یعنی جانشین کون ہو۔ یعنی ایک حکمراں کے انتقال کے بعد اس کا بھائی تخت پر بیٹھے یا بیٹا۔ ایسا کوئی انتظام نہیں تھا کہ خاندان کے سارے لوگ باہمی مشورے سے کسی کو امیر یا خلیفہ منتخب کر لیں تاکہ آپسی خون خرابے کی نوبت نہ آئے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک حکمراں اپنی عمر میں ہی کسی کو اپنا جانشین نامزد کر دیتا۔ لیکن پھر بھی اس کی موت

کے بعد اس کے اپنے ہی خاندان سے حکومت کے دوسرے دعویدار کھڑے ہو جاتے۔ بد قسمتی سے ان مختلف دعویداریوں کا فیصلہ میدان جنگ میں ہوتا۔ اس صورت حال سے عاجز آ کر بعض لوگوں نے ولی عہد کے تصور کو رواج دیا۔ یعنی امیر یا خلیفہ تخت پر بیٹھتے ہی کسی کو ولی عہد بنا دیتا جسے وقت گزرنے کے ساتھ لوگ اپنے مستقبل کے حکمراں کے طور پر دیکھنے لگتے۔ بعض حالات میں یہ تجربہ کامیاب رہا اور بعض صورتوں میں ناکام بھی۔ ناکامی کی وجہ کبھی حکمراں خاندان کے افراد ہوتے جو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ہمہ آن تدبیریں بلکہ سازشیں بھی کرتے رہتے۔ ایک بڑی وجہ حکمرانوں کی ایک سے زائد شادیاں بھی تھی۔ مختلف بیویوں سے کئی اولادیں ہوتیں۔ بادشاہ اگر کسی ایک کے بیٹے کو ولی عہد بناتا تو دوسری رانی اپنے بیٹے کی تخت نشینی کے لیے سازشیں شروع کر دیتی۔ اندلس کے اموی حکمرانوں کو ان ساری مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن خاندان کے اندر سے اٹھنے والے مسئلوں سے کہیں بڑا مسئلہ مرکز گریز طاقتوں کو کنٹرول میں رکھنا تھا۔

ترسیل یا Communication کے میدان میں بڑی تبدیلی اس وقت آئی جب انسان نے بھاپ کی طاقت کو نہ صرف دریافت کیا بلکہ اسے قابل استعمال قوت (انرجی) میں تبدیل کر دیا۔ اس ایجاد سے ترسیل اور پیداوار میں وہ انقلاب آیا جس نے دنیا کا نقشہ ہی بدل دیا۔ اس ایجاد کے بعد انسان لوہے کی پٹریوں پر ریل اور سمندر کی سطح پر جہاز دوڑانے لگا۔ پہلے کے مقابلے میں رسد و حمل کی رفتار کتنی تیز ہوگئی ہے، اس کا ہم تیز رفتار جدید ترسیل کے عادی لوگ بس تصور ہی کر سکتے ہیں۔ ہم SMS، ای میل، فون اور ہوائی جہاز کے سفر (Plane Journey) کے زمانے میں رہ رہے ہیں، اس لئے شاید ہم یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ پیدل، بیل گاڑی، اونٹ، ہاتھی اور گھوڑے کی سواری کے زمانے میں رسد و حمل کا مسئلہ کتنا سنگین رہا ہوگا۔ الغرض اس زمانے میں کسی بھی سلطنت کو، خاص طور سے اگر وہ وسیع ہو، اپنے صوبوں کو مرکز کے کنٹرول میں رکھنا مشکل کام ہوتا تھا۔ تقسیم اختیارات جیسے جمہوری تصورات اس زمانے میں پائے نہیں جاتے تھے۔ اس لیے مشترکہ مفادات کی باہمی تفہیم سے زیادہ قوت بازو پر بھروسہ کیا جاتا تھا۔ طاقت کی حکمت عملی طاقت سے مربوط ہے یعنی آپ کا سکہ اسی وقت تک چلے گا جب تک آپ کے پاس طاقت ہے۔ بصورت دیگر آپ کا زوال وانحطاط یقینی ہے۔

بنوامیہ نے اندلس میں شاندار سلطنت قائم کی تھی۔ عبدالرحمٰن الداخل جن سخت حالات سے گزر کر سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوا تھا، اس کا تقاضہ تھا کہ وہ اپنے آباواجداد کی ان غلطیوں کو نہ دہرائے جو ان کے زوال کا سبب بنی تھیں۔ اس نے بھرپور کوشش کی کہ نہ صرف فوج کے مختلف عناصر کو باندھے رکھے، مختلف مفادات کے درمیان توازن قائم رکھے بلکہ نومسلموں کو بھی عربوں کے برابر درجہ دے، خاص طور سے ان کے باصلاحیت افراد اور نوجوانوں کو نظر انداز نہ کرے بلکہ ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھائے۔ اس کی یہ پالیسی یا حکمت عملی کافی کامیاب رہی۔ مصری و یمنی عرب ہوں، بربر ہوں یا اندلس کے مقامی نومسلم، سبھوں کو اس نے احساس دلایا کہ اس کے یہاں صلاحیت کی قدر ہوتی ہے۔ چنانچہ لوگوں کے درمیان بہ سرعت یہ پیغام گیا کہ نوجوان عرب حکمراں یعنی عبدالرحمٰن الداخل عربی و عجمی کے درمیان فرق نہیں کرتا بلکہ وہ نسلی امتیاز اور غرور سے بالکل پاک ہے۔

بنوامیہ کا فرد ہونے کی وجہ سے عبدالرحمٰن الداخل کا عربی فوقیت کے تصور کو نظر انداز کرنا غیر معمولی بات تھی۔ اس کے اپنے بعض ساتھیوں کو بھی یہ انقلابی بات ہضم نہیں ہوئی اور وہ بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔ عبدالرحمٰن الداخل روایتی فوجی برتری کی پالیسی میں

بھی یقین رکھتا تھا۔اس آزمودہ قدیم حکمت عملی کا وہ ماہر بھی تھا۔اس کے مخالفین بھی اسے صقر قریش کے نام سے یاد کرتے تھے۔اور یہ سچ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں پر شکرے کی طرح جھپٹتا اور بغاوتوں کو سر اٹھاتے ہی کچل دیتا تھا۔اپنی تیز رفتاری سے وہ اکثر اپنے دشمنوں کو حیران کر دیتا اور انہیں اس وقت جالیتا جب وہ جنگ کے لیے پوری طرح تیار نہ ہوتے۔سست رفتار ترسیل کے زمانے میں وہ اپنی نسبتاً تیز چلت پھرت سے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کر لیتا۔بہت کچھ تھا اس نوجوان شہزادے میں، لیکن دشمن پر شکرے کی طرح جھپٹنے کی صلاحیت سب سے ممتاز تھی۔یہی وجہ ہے کہ بنوعباس کے پنجہ خونیں سے بھاگ نکلنے والے اس نوجوان نے تن تنہا اندلس میں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی جس کی مثالیں تاریخ انسانی میں کم ہی ملتی ہیں۔

عبدالرحمٰن الداخل کے بعد اس کے کئی جانشینوں نے اچھے کارنامے انجام دیے کیوں کہ وہ کم وبیش اسی کی پالیسیوں پر کاربند رہے۔لیکن امیر معاویہ نے موروثی حکومت کی جو بنیاد ڈالی تھی اور بعد میں اس تعلق سے بنوامیہ میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں، اس سے عبدالرحمٰن الداخل کے اموی جانشین بھی نہ بچ سکے۔وہی پرانا جھگڑا کہ ولی عہد کون ہو، یا موجودہ امیر یا خلیفہ کے انتقال کے بعد تخت پر کون بیٹھے؟ یہاں بھی شروع ہو گئے۔محلاتی سازشیں الگ تباہی مچا رہی تھیں۔بارہا ایسا ہوا کہ امیر یا خلیفہ کی ایک بیوی دوسری بیوی کے فرزندوں کے مقابلے میں اپنے بیٹوں کو حکومت دلوانے کے لیے سازشیں کرتی اور کامیاب بھی ہو جاتی۔یہ محلاتی سازشیں بھی مسلمانوں کے زوال کا ایک سبب بنیں۔

عبدالرحمٰن الثالث اندلس میں بنوامیہ کا عظیم حکمراں گزرا ہے۔اس کے بعض کارناموں کے سامنے عبدالرحمٰن الداخل بھی ماند پڑ جاتا ہے۔الثالث نے اموی امارت کو خلافت میں بدل دیا اور اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔اس طرح عباسی و فاطمی خلفاء کے ساتھ ایک اموی خلیفہ بھی میدان میں کود پڑا۔عبدالرحمٰن الثالث نے خود کو بہترین حکمراں ثابت کیا۔وہ میدان جنگ کا شہسوار اور جہانِ علم کا بادشاہ تھا۔اس نے عدل وانصاف کا بول بالا قائم کیا۔صنعتوں کو ترقی دی، تجارت وحرفت کو فروغ دیا اور درآمدات و برآمدات کے شعبے پر بھی کافی توجہ دی جس سے ملک میں عمومی خوشحالی کے ساتھ امن بھی قائم ہوا۔

عبدالرحمٰن الثالث کے بعد اس کا بیٹا تخت پر بیٹھا اور الحکم ثانی المستنصر کا لقب اختیار کیا۔حکم ثانی علم دوست ہونے کے ساتھ بذات خود ایک بڑا اسکالر تھا۔اسی کے زمانے میں قرطبہ کی یونیورسٹی دنیا کی عظیم الشان جامعہ بنی۔محض علم دوست ہی نہیں وہ نسبتاً اچھا منتظم بھی تھا۔لیکن ہر انسان کی طرح اس کی اپنی کمزوریاں بھی تھیں۔اس کے انتقال کے وقت اس کے بیٹے کی عمر صرف 12 سال تھی۔اموی خاندان میں دوسرے اہل لوگ موجود تھے جو امور سلطنت کو بخوبی انجام دے سکتے تھے۔مگر انہیں نظر انداز کر کے الحکم نے اپنے بارہ سالہ بیٹے ہشام کو تخت پر بٹھا دیا جو تاریخ میں ہشام ثانی کے نام سے جانا جاتا ہے۔حکم نے اس امر کا بھی انتظام کیا کہ اس کے امراء و عمائدین اس وقت تک اس کے بیٹے کی مدد اور وفاداری کریں گے جب تک وہ خود امور سلطنت سنبھالنے کے لائق نہیں ہو جاتا۔اسے بنو عامر سے تعلق رکھنے والے اپنے حاجب (وزیر) پر زیادہ بھروسہ تھا جو بعد میں المنصور کے نام سے مشہور ہوا۔

بظاہر ہشام ثانی کا دور شاندار کہا جائے گا لیکن اس کی حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہیں تھی۔اس کے والد نے حاجب المنصور کو اس کا مشیر اعظم مقرر کیا تھا، مگر اس نے بڑی ہوشیاری سے دوسرے امراء کو درکنار کر کے اقتدار پر ایک طرح سے قبضہ کر لیا۔ہشام ثانی کو محل میں مہمان قیدی بنا دیا۔افسروں اور وزیروں کو اس سے ملنے نہ دیتا۔خود سارے فیصلے کرتا اور فرامین پر ہشام ثانی کے دستخط

کرالیتا۔ بلاشبہ المنصور ایک نہایت قابل منتظم اور سپہ سالار بھی تھا۔ اس نے ملک سے بغاوتوں کا خاتمہ کر دیا اور شمالی اندلس کے عیسائیوں کا بھی ناطقہ بند کر دیا جو مدت دراز سے دردسر بنے ہوئے تھے۔ لیکن خلیفہ کو بے اثر کر کے اس نے ایک ایسے فتنے کو جنم دیا جو بنوامیہ کے زوال کا سب سے بڑا ظاہری سبب بن گیا۔

المنصور ایک عام آدمی تھا جو ترقی کرتے کرتے وزیر اور پھر حاجب یعنی وزیر اعلیٰ بن گیا تھا۔ اب تک صرف امارت وخلافت کے معاملے میں موروثی نظام قائم تھا لیکن اس نے حاجب کے عہدے کے معاملے میں بھی یہ روایت جاری کرا دی۔ اس نے قیدی خلیفہ سے ایک فرمان پر دستخط کرالیا جس کی رو سے یہ عہدہ موروثی طور پر اس کے خاندان میں رہے گا۔ اہل قرطبہ اور دوسرے امراء و عمائدین کو المنصور کی یہ حرکت پسند نہیں آئی۔ لیکن وہ اتنا طاقتور تھا کہ کوئی اس کا بال بیکا نہ کر سکا۔ لیکن یہ خیال بہتوں کے دلوں میں گھر کر گیا کہ طاقت کے بل پر وہ بھی اقتدار حاصل کر سکتے ہیں اور ایک کٹھ پتلی خلیفہ کے ذریعے پورے اندلس پر حکومت بھی کر سکتے ہیں۔ المنصور کی زندگی میں تو کسی نے بغاوت نہیں کی لیکن اس کے بیٹوں کے زمانے میں ایسی بغاوتوں نے جنم لیا جنہوں نے نہ صرف اس کے خاندانی اقتدار بلکہ بنوامیہ کی خلافت کا ہی خاتمہ کر دیا۔ بربروں اور دوسرے طاقتور گروپوں نے جیسے خلیفہ سازی کا کاروبار شروع کر دیا۔ وہ بنوامیہ کے کسی کمزور شخص کو خلیفہ بناتے، اسے ربر کی مہر کی طرح استعمال کرتے اور لوٹ کھسوٹ میں شامل ہو جاتے۔

دیکھا جائے تو ہشام ثانی سمیت اس کے جانشینوں میں سے کوئی بھی خلیفہ خود مختار نہیں ہوا بلکہ سب کے سب کمزور اور نااہل تھے۔ دراصل یہ خلفاء سازی' کے دور کی پیداوار تھے۔ یعنی حاجب المنصور کے بعد دوسرے طاقتور گروہوں نے بھی' خلیفہ سازی' کا کاروبار شروع کر دیا۔ یہ خلیفہ بنانے والے عرب بھی تھے اور بربر بھی۔ یہ لوگ چوں کہ اصل اقتدار اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے اس لیے بنوامیہ میں سے سب سے نااہل یا اس شخص کو خلیفہ بنا دیتے جو ان کے ہاتھوں میں کھلونا بننے کے لیے تیار ہو جاتا۔ اگر کوئی خلیفہ اپنی بعض ذاتی خوبیوں کی وجہ سے بہتر نظام حکومت کی فکر کرتا تو خلیفہ بنانے والے اسے ایسا کرنے نہ دیتے۔ یہ لوگ محل میں ریشہ دوانیاں کرتے اور ان کے آدمی ہتھیار بند شہر کے امیروں کی دولت لوٹتے پھرتے۔ پورے اندلس میں ایک طرح سے انارکی پھیل گئی اور کئی صوبے داروں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔

اس عام لوٹ کھسوٹ کے خلاف سب سے پہلے غرناطہ کے لوگوں نے بغاوت کی۔ خلیفہ سازی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انارکی کا حل انہیں بنوامیہ کی خلافت کے اختتام میں نظر آیا۔ چنانچہ ایک عام بغاوت ہوئی۔ خلیفہ کا محل گھیر لیا گیا۔ نام نہاد آخری خلیفہ ہشام الثالث المعتز کا انجام بڑا دردناک ہوا۔ اسے اس کے اہل خانہ سمیت مسجد قرطبہ سے ملحق ایک کمرے میں بند کر دیا گیا جہاں نہ روشنی تھی اور نہ کھانے پینے کا انتظام۔ کافی ٹھنڈک تھی۔ خلیفہ ہشام ٹھنڈ سے کانپ رہی اپنی ننھی سی بچی کو کبھی اپنے سینے سے لگاتا تو کبھی اپنے ہاتھ سے اس کے سینے اور پیر کو رگڑتا تاکہ اس کا بدن گرم ہو سکے۔ وہ اپنی بچی اور دوسرے اہل خانہ کے ساتھ ٹھنڈ سے ایک کمرے میں ٹھٹھر رہا تھا اور اہل غرناطہ مسجد قرطبہ کے اندر ایک متبادل نظم حکومت پر غور کر رہے تھے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ خلافت ختم کر دی جائے اور حکومت کی ذمہ داری ایک کونسل کے حوالے کر دی جائے۔ اس کونسل کا پہلا سربراہ ابوالحزم ابن جوہر تھا۔ جب عمائدین شہر اپنے فیصلے سے ہشام کو آگاہ کرنے یا اسے معزول کرنے کے حکم نامے پر اس کا دستخط لینے گئے تو وہ بیچارگی سے بولا کہ جس سے سلطنت سے دستبردار ہونے کا مطالبہ کر رہے ہو، اس پر اتنی عنایت تو کرو کہ ٹھنڈ سے پریشان اور بھوک سے تڑپ رہی اس کی بیٹی کو ایک روٹی دے دو۔

سلطنتوں کے زوال کے اسباب بیان کرتے ہوئے اہل قلم کی توجہ بالعموم حکمراں طبقے کی نااہلیوں پر ہوتی ہے۔ لیکن وہ جو انگریزی زبان کا قول ہے People get the ruler they deserve یعنی عوام کو وہی حکمراں ملتے ہیں جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں، اسے نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ بلاشبہ گیارہویں صدی کا اسپین جہاں بنوامیہ کا زوال ہوا، کوئی جمہوری ملک نہیں تھا۔ لیکن بنوامیہ کے اولین حکمرانوں نے عوام کی فلاح و بہبود کے کام ضرور کیے تھے۔ اندلس کو ایک وحدت، پہچان اور مرکزی حکومت دینے والے کوئی اور نہیں بنوامیہ تھے اور اس ملک کی شاندار ترقی کی بنیاد انہوں نے ہی ڈالی تھی۔ وہ بے جا عربی نسلی غرور کا شکار نہیں تھے۔ انہوں نے امراء وعمائدین کو اقتدار میں شریک کیا تھا اور باصلاحیت افراد کو ترقی کرنے کا موقع دیتے تھے۔ عوام کو تو معاف کیا جاسکتا ہے کہ وہ اقتدار کے کھیل میں شریک نہیں تھے۔ لیکن امراء وعمائدین کو معاف کرنا مشکل ہے کیوں کہ خلفاء کی نااہلیوں کے ساتھ ان کی اپنی کوتاہیوں بلکہ ریشہ دوانیوں نے بھی اموی حکومت کے زوال میں بڑا رول ادا کیا۔ اسی طرح گروہی مفادات کو ترقی وتحفظ دینے والے مسلح گروپ مثلاً بربر وغیرہ بھی زوال حکومت کے لیے برابر کے ذمہ دار تھے۔ دراصل ان کی سرکشی اور لوٹ مار حکومت کی کمزوری کا بڑا سبب تھی۔

اقتدار کی کرسی پر بیٹھے خلیفہ کے فیصلے بلاشبہ خراب وخطرناک ہوسکتے ہیں۔ لیکن اگر امراء وعمائدین اپنا فرض ایمانداری سے نبھائیں تو ایسے خطروں کا مقابلہ کرکے زوال کو روکا جاسکتا ہے۔ اندلس میں بنوامیہ کے آخری ایام میں صرف خلفاء ہی سے نہیں بلکہ امراء وعمائدین سے بھی فرض کی ادائیگی میں کوتاہی ہوئی۔ اس لیے زوال سلطنت کے لیے خلفاء کے ساتھ انہیں بھی موردالزام ٹھہرایا جانا چاہیے۔

8.4 ملوک الطوائف

بنوامیہ کی قائم کردہ خلافت کے آخری ایام میں ہی اندلس کے کئی صوبے خودمختار ہوگئے تھے۔ اس نام نہاد خلافت کے خاتمے کے بعد طوائف الملوکی سکہ رائج الوقت ہوگئی۔ قرطبہ میں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ہشام الثالث کی معزولی کے بعد ابوالحزم ابن جوہر کو شہری کونسل کا سربراہ بنایا گیا تھا۔ موروثی نظام حکومت لوگوں کے دلوں میں اس قدر جاگزیں تھا کہ کسی کو جمہوریت کی نہ سوجھی حالانکہ کونسل کے قیام کے بعد اس قسم کے جمہوری خیالات کو پنپنا چاہیے تھا۔ مگر جب ایسا کوئی خیال اہل قرطبہ کے ذہنوں میں نہیں پیدا ہوا تو ابن جوہر اور اس کی اولاد نے شہر پر 1068ء تک حکومت کی جب ایک دوسرے صوبائی حکومت کے حکمراں خاندان، بنوعباد نے قرطبہ کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ غرناطہ میں ایک بربر خاندان کی حکومت بن گئی۔ بنوحمود نے مالقہ اور آس پاس کے شہروں میں اپنی امارت قائم کرلی۔ تھوڑے وقفے کے لیے قرطبہ بھی ان کے زیراقتدار رہا۔ طلیطلہ پر ایک قدیم بربر خاندان بنی ذوالنون کی حکومت قائم ہوگئی۔ اسی طرح سرقسطہ (Saragossa) میں بنوہود کا اقتدار تھا۔ الغرض بنوامیہ کے زوال کے بعد اس طرح کی کم وبیش بیس (20) چھوٹی بڑی ریاستیں یا امارتیں قائم ہوئیں۔ اور یہ حکومتیں پرامن بقائے باہم کی قائل بالکل نہ تھیں۔ ان کا محبوب مشغلہ ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرنا اور ایک دوسرے کا خون بہانا تھا۔ خانہ جنگیوں اور طوائف الملوکی کی وجہ سے اندلس کا چہرہ خون آلود ہو کررہ گیا تھا۔

ظاہر ہے جب مسلمانوں کی طاقت ایک دوسرے کا سر کاٹنے پر صرف ہو رہی ہو تو ان کے عیسائی دشمن اس کا فائدہ اٹھائیں گے ہی۔ شمالی اندلس کے پہاڑی علاقوں کے عیسائیوں کی سرکوبی کی طرف موسی بن نصیر متوجہ ہوئے ہی تھے کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک نے انہیں دمشق بلا لیا تھا۔ آج صدیوں کے فاصلے سے جب مورخ تاریخ کے اس ایک واقعے پر نظر ڈالتا ہے تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ایک ایسی دانستہ یا غیر دانستہ غلطی تھی جس کی سزا مسلمانوں کو گاہے بگاہے ملتی رہی۔ طارق بن زیاد اور موسی بن نصیر کے بعد کوئی بھی اندلسی حکمراں انہیں ختم نہیں کر پایا۔ اگرچہ کئی بار انہیں مسلمان حکمرانوں کو خراج دینا پڑا۔

جب بنوامیہ کے زوال کے بعد اندلس کی مرکزیت ختم ہوگئی اور ملک چھوٹی بڑی ریاستوں میں تقسیم ہوگیا اور لوگ آپس میں ہی لڑ پڑے تو شمالی اندلس کے عیسائیوں نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا اور بعض ریاستوں کو باجگزار بنا لیا۔ ایسے باجگزاروں میں بنوعباد بھی تھے۔ یہاں بنوعباد کا مختصر اًذکر اس زمانے کے حالات کو سمجھنے میں مدد کرے گا۔

بنوعباد کا تعلق ایک مشہور عرب خاندان سے تھا جو فتح اندلس کے فوراً بعد اسپین آیا تھا۔ ان کے جدامجد فوج میں عہدیدار تھے۔ بنوعباد کا عروج اس وقت شروع ہوا جب اشبیلیہ کے قاضی نے ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مفقود الخبر اموی شہزادہ ہشام الثانی کے ایک ہم شکل کو تخت پر بٹھا دیا۔ ہشام الثانی کا ہم شکل ظاہر ہے ایک کٹھ پتلی تھا اور سارا اقتدار قاضی کے ہاتھ میں تھا۔ یہ واقعہ 1030ء میں پیش آیا۔ 1042ء میں قاضی کے لڑکے نے اپنے باپ کی موت کے بعد چیف وزیر یا حاجب کا عہدہ سنبھالا۔ وہ ہشام الثانی کے ہم شکل کو ہٹا کر تخت پر خود براجمان ہوگیا اور المعتضد کے نام سے خلیفہ بن گیا۔ معتضد تعلیم یافتہ اور شاعری کا دلدادہ تھا۔ ہر وقت شاعروں اور لونڈیوں سے گھرا رہتا اور پوری زندگی عیش وعشرت میں گزاری۔ اس کے بعد 1068ء میں اس کا بیٹا تخت پر بیٹھا اور عیش وعشرت کے معاملے میں اپنے باپ سے کہیں آگے بڑھ گیا۔ تخت پر بیٹھنے کے کچھ ہی دنوں بعد اس نے قرطبہ کو اپنی ریاست میں شامل کرلیا۔ اس طرح وہ ملوک الطوائف کے دور کا غالباً سب سے طاقت ور مسلمان بادشاہ ہوگیا لیکن وہ ایک عیسائی بادشاہ کو خراج دیتا تھا۔ وہ شاعر تھا اور زندگی کو یوں بسر کرتا تھا جیسے عیش کرنے کو دوسری زندگی نہ ملے گی۔ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست اس کا فلسفہ زندگی تھا۔ اس کی عیاشانہ زندگی کے تذکرے کتابوں میں ملتے ہیں لیکن ان کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا معتمد ایک عیسائی حکمراں کا باجگزار تھا۔ یہ عیسائی حکمراں فرڈینڈ اور اس کا بیٹا الفانسو ششم تھے۔ انہوں نے صرف خراج لینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اشبیلیہ پر قبضہ کا پروگرام بنالیا۔ معتمد نے انفانسو ششم کی فوج سے مقابلہ کرنے کے بجائے شمالی افریقہ کے طاقتور حکمراں یوسف بن تاشفین سے مدد مانگی۔ اس درویش صفت حکمراں نے اولاً مسلمانان اندلس کے معاملات میں دخل دینے سے احتراز کیا لیکن جب ان کے برے حالات کا پورا علم ہوا تو ان کی مدد پر آمادہ ہوگیا۔ وہ بیس ہزار کی فوج لے کر اندلس میں داخل ہوا اور 1086ء میں زلاقہ نامی مقام پر انفانسو ششم کی فوج کو زبردست شکست دی۔ انفانسو بہ مشکل تین سو سواروں کے جلو میں فرار ہونے میں کامیاب ہوسکا۔

وعدے کے مطابق یوسف بن تاشفین افریقہ واپس چلا گیا اور اندلس کے حکمراں دوبارہ عیش وعشرت کے ساتھ خانہ جنگیوں میں مصروف ہوگئے۔ اپنے حکمرانوں سے پریشان عوام اور علماء نے یوسف بن تاشفین سے افریقہ واپس نہ جانے کی درخواست کی مگر وہ معتمد سے وعدہ خلافی کا جرم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر جب عوام کے نمائندوں اور علماء نے دوبارہ اس سے درخواست کی تو وہ اندلس میں پھر داخل ہوا۔ اس بار فاتح کی حیثیت سے۔ اس نے بہت جلد مسلم اسپین کو اپنے علم تلے جمع کرکے زبردست مرکزی حکومت قائم کردی۔

یوسف بن تاشفین نے لمبے عرصے تک حکومت کی یعنی 1061ء سے 1106ء تک۔ 1091ء تک وہ شمالی-مغربی افریقہ کے بڑے علاقے پر حکمراں تھا۔ اس کے بعد اندلس بھی اس کی حکومت میں شامل ہوگیا۔ افریقہ میں اس کا دارالسلطنت مراکش نامی شہر میں تھا اور اسپین میں اس کا گورنر اشبیلیہ سے حکومت کرتا تھا۔ یوسف ابن تاشفین کے جانشین لائق حکمراں ثابت نہیں ہوئے اور ان کی حکومت 1147ءمیں ختم ہوگئی۔ واضح رہے کہ یوسف ابن تاشفین کا تعلق ایک مذہبی سلسلے سے تھا جنھیں مرابطون کہا جاتا ہے۔ اسی لیے انگریز مورخ یوسف بن تاشفین کی قائم کردہ حکومت کو Morabit Dynasty بھی کہتے ہیں۔

مرابطون کے بعد ایک دوسرا مذہبی طبقہ، جس کی جڑیں بھی شمالی مغربی افریقہ میں تھیں، اندلس میں حکمراں بنا۔ یہ موحدون کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ موحدون نے مرابطون سے بھی بڑی سلطنت قائم کی۔ بعض مورخین کے مطابق یہ افریقہ کی سب سے بڑی سلطنت گزری ہے۔ اس سلطنت کا حقیقی بانی عبدالمومن ابن علی تھا۔ یہ بہترین فوجی جنرل اور منتظم تھا۔ اس نے پہلے مرابطون کو مراکش میں شکست دی۔ پھر ان کے دوسرے علاقے بھی چھین لیے۔ اس نے مرابطون پر حملہ 1144ء میں شروع کیا اور 1147ء کے آغاز میں ان کے دارالحکومت مراکش پر قبضہ کرلیا۔ موحدون یا عبدالمومن نے بھی مراکش کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ 1145ء میں عبدالمومن نے اپنی ایک فوج اندلس میں اتاردی تھی جہاں سیاسی انتشار عروج پر تھا۔ اس فوج نے تیزی سے پورا اندلس فتح کرلیا۔ عبدالمومن اب اندلس اور مراکش دونوں ملکوں کا حکمراں تھا۔ اس نے 1152ء میں الجزائر، 1158ء میں تیونس اور 1160ء میں طرابلس پر قبضہ کرلیا۔ عبدالمومن کا انتقال 1163ء میں ہوا۔ اس کے اولین جانشین کوئی خاص کارنامہ انجام نہیں دے سکے۔ لیکن اس کے پوتے ابو یوسف یا یعقوب المنصور (99-1184ء) نے بڑا نام کمایا۔ اسی المنصور کے دربار سے صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کے خلاف مدد مانگی تھی۔ ابتدائی تذبذب کے بعد اس نے 180 جہازوں سے ایوبی کی مدد کی۔ اسی کی مدد سے ایوبی نے یروشلم کو صلیبیوں سے واگزار کرایا۔

المنصور نے کئی یادگار آثار چھوڑے ہیں۔ اشبیلیہ کی جامع مسجد کا عظیم الشان مینار اسی نے بنوایا تھا۔ جو آج تک قائم ہے۔ اس عظیم الشان مسجد کی بنیاد 1172ء میں رکھی گئی اور تکمیل منصور کے دور میں 1195ء میں ہوئی۔ اندلس سے مسلمانوں کے انخلاء کے بعد اسے چرچ میں تبدیل کردیا گیا۔ اس نے بڑے شہروں میں اسپتال بھی بنوائے۔ مراکش کا اسپتال اپنے زمانے کا سب سے بڑا اسپتال تصور کیا جاتا تھا۔

1199ء میں المنصور کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا محمد الناصر خلیفہ ہوا۔ 1212ء میں پرتگال اور شمالی اسپین کے حکمرانوں نے مل کر اندلس پر حملہ کیا۔ انہیں فرانس کی بھی حمایت حاصل تھی۔ محمد الناصر نے کھلے میدان میں ان کا مقابلہ کیا۔ بدقسمتی سے اسے شکست ہوئی اور اس کی فوج کا بڑا حصہ موت کے گھاٹ اتاردیا گیا۔ اس نے بھاگ کر مراکش میں پناہ لے لی اور اس کی عظیم سلطنت پر عیسائیوں اور بعض مسلمانوں نے قبضہ کرلیا۔

موحدون کے بعد کوئی بڑی مسلم ریاست اسپین میں قائم نہیں ہوئی۔ قابل ذکر صرف غرناطہ کی ناصری حکومت ہے جو اندلس میں مسلمانوں کی آخری حکومت بھی ثابت ہوئی۔ ناصری حکومت یا بادشاہت کا بانی محمد ابن یوسف بن نصر تھا جس کا تعلق مدینہ منورہ کے مشہور قبیلے خزرج سے تھا۔ ابن نصر ابن احمر کے نام سے مشہور تھا۔ اسی لیے بعض مورخین ناصری سلطنت کو احمری سلطنت بھی کہتے ہیں۔ اسی ابن احمر کے کسی جانشین کے دربار سے مشہور مورخ ابن خلدون کچھ وقفے کے لیے بحیثیت وزیر وابستہ تھا۔

موحدون کے زوال کے بعد عیسائی حکمراں مسلم صوبیداروں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑانے، اور انہیں کمزور کرنے کے بعد ان کے علاقوں پر قبضہ کرنے لگے۔ اس انارکی اور کس مپرسی کے زمانے میں ابن نصر (ابن احمر) نے غرناطہ میں ایک مضبوط حکومت قائم کی۔ اگرچہ وہ خود ایک عیسائی حکمراں کو خراج دیتا تھا، اور اس روایت کو اس کے اکثر جانشینوں نے بھی قائم رکھا، لیکن پھر بھی وہ اور اس کی اولاد تقریباً 250 سال تک عیسائی حملوں کے خلاف جمے رہے اور غرناطہ اسپین میں 1492ء تک مسلمانوں کی پناہ گاہ بنا رہا۔

8.5 سقوط غرناطہ

ابن نصر نے الغالب کا لقب اختیار کیا اور 1232ء سے 1273ء تک حکومت کی۔ اس نے غرناطہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور اسے کافی ترقی دی۔ عیسائی غلبے والے علاقوں کے مسلمان ان کے مظالم سے تنگ آکر غرناطہ اور ناصری سلطنت کے دوسرے شہروں میں آکر آباد ہوگئے۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق غرناطہ کی آبادی 5 لاکھ سے زیادہ ہوگئی تھی۔ یہ شہر صرف یوروپ میں نہیں بلکہ پوری دنیا کے چند گنے چنے ترقی یافتہ شہروں میں سے ایک تھا۔ اسپین کے عرب، خاص طور سے جو شام سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے، اسے اسپین کا دمشق کہتے تھے۔ یہاں ان گنت مشہور عرب خاندان اور بہت سے دولت مند یہودی آباد تھے۔ مسلم اسپین میں یہودیوں کو جو امن نصیب تھا، وہ کہیں اور میسر نہیں تھا۔ وہ تجارت میں بھی کامیاب تھے اور حکومت میں بھی بعض اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

غرناطہ کی شان اس کے قلعے الحمراء سے تھی۔ اس قلعے کے آثار آج بھی اس کی عظمت رفتہ کے گواہ ہیں۔ اس خوبصورت اور مضبوط قلعے کی بنیاد الغالب نے رکھی تھی۔ اسی جگہ پہلے بنو امیہ نے بھی ایک قلعہ بنایا تھا۔ اس مقام کو الحمراء کے لیے منتخب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ شہر کے جنوب-مشرق میں ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ یہ سرخ پتھروں سے بنایا ہوا محض مضبوط قلعہ نہیں تھا بلکہ فن تعمیر کا بھی بہترین نمونہ تھا۔ الغالب کے تین جانشینوں نے الحمراء کو مزید مستحکم اور خوبصورت بنایا۔ چنانچہ یہ نہ صرف اپنے زمانے میں فن تعمیر کا بہترین نمونہ تھا بلکہ آج جدید اسپین میں بھی اسے ایک عظیم آثار قدیمہ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ قلعہ نما محل، اپنی زیبائش کی وجہ سے آج بھی سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جو کوئی بھی اسے دیکھتا ہے، اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہتا۔ اس قلعہ نما محل میں بنونصر، جو نسباً مدینہ کے بنوخزرج سے تعلق رکھتے تھے، نے کچھ عرصے کے لیے بنو امیہ کے عہد زریں کی یاد کو تازہ کر دیا۔ انہوں نے علم وفن کی سرپرستی کی۔ بڑے بڑے علماء ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ افریقہ کے اہل علم بھی الحمراء کی طرف کھینچے چلے آتے۔ شعراء اور دوسرے ماہرین فن کی بھی خوب پذیرائی ہوئی۔ بنونصر نے صرف علم وفن کی سرپرستی نہیں کی بلکہ الحمراء کے ان حکمرانوں نے شہر غرناطہ کو بھی خوب ترقی دی۔ انہوں نے تاجروں کی سرپرستی کی اور ایسی پالیسیاں اختیار کیں جن سے تجارت کی خوب ہمت افزائی ہوئی۔ خاص طور سے اٹلی سے ریشم کی تجارت کو بڑا فروغ ملا۔ تجارت کی ترقی سے شہر غرناطہ کے لوگ بڑے خوشحال ہوگئے بلکہ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ بنونصر کے دور میں غرناطہ یوروپ کا سب سے امیر شہر بن گیا تھا۔ مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ غرناطہ نہ صرف ایک مرکز تجارت و دولت تھا بلکہ بنونصر نے اسے علم وفن کے میدان میں قرطبہ کا جانشین بنا دیا تھا۔ بنونصر محض اپنی علم دوستی اور تجارت کی ہمت افزائی کی وجہ سے نہیں بلکہ انسان دوستی اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے بھی جانے جاتے تھے۔ جس وقت بنونصر غرناطہ میں حکمراں تھے، اسی وقت اسپین دوسرے بڑے شہروں میں بعض دوسرے مسلمان حکمراں تھے۔ پرتگال اور شمالی اسپین کے عیسائی حکمراں انہیں ایک دوسرے

کے خلاف لڑا کر یکے بعد دیگرے انہیں ہضم کرتے جارہے تھے۔ دراصل چودھویں صدی میں غرناطہ اسپین کے مسلمانوں کی آخری پناہ گاہ بن گیا تھا۔ حتّی نے عہد بنونصر کو اسپینی اسلام کے ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں سے تعبیر کیا ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ شمالی اسپین کے عیسائیوں نے اسپین میں مسلمانوں کی موجودگی اور حکومت کو کبھی بھی گوارا نہیں کیا۔ مسلمانوں نے اسپین کو علم وفن کی روشنی دی، اسے تہذیب وتمدن سے روشناس کرایا اور ایسی تجارت و دولت دی جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ شمالی اسپین کے عیسائی اگر چاہتے تو وہ بھی تہذیبی ترقی میں شامل ہوسکتے تھے بلکہ یوروپ کے تمام عیسائیوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتے۔ مگر علم کی روشنی اور تجارت و دولت کے بجائے انہوں نے مسلم دشمنی کی راہ اختیار کی اور اسپین سے انہیں نکال باہر کرنے کی مہم میں جٹے رہے اور بالآخر صدیوں بعد انہیں اپنے مقصد میں کامیابی ملی۔ شاید ہی کوئی قوم ہوگی جس نے تاریکی کے لیے روشنی سے اتنی طویل جنگ کی ہوگی۔

مگر یہ ہمارا مشاہدہ یا تبصرہ ہے۔ مذہبی عیسائی مورخین نے اپنی مسلم مخالف سرگرمیوں کو مذہبی اور قومی نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔ ان کے بقول اسپینی عیسائیوں نے اپنی جدوجہد اور قربانیوں سے یوروپ کو غلبہ اسلام سے بچالیا۔ یعنی اگر انہوں نے ہتھیار بند ہوکر اسلام کی یلغار اور پیش رفت کو روکا نہ ہوتا تو شاید آج کا یوروپ عیسائی یوروپ نہ ہوتا۔ ان کی رائے کے مطابق اسپین میں اسلام کا زوال بنوامیہ کے زوال کے ساتھ شروع ہوگیا تھا۔ اپنی کوششوں کو وہ اسپین کی از سرنو عیسائی فتح سے تعبیر کرتے ہیں۔ 1218ء میں صخرہ بلائی (Covadonga) کے مقام پر عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک زبردست جنگ ہوئی تھی جس میں آسٹریا کی فوجیں بھی شامل تھیں۔ ان کے بقول اس جنگ کے بعد یوروپ میں اسلام کی پیش رفت رک گئی تھی۔ صخرہ بلائی (Covadonga) شمالی اسپین کے پہاڑوں میں واقع ہے۔ اگر اس جنگ میں مسلمان کامیاب ہوجاتے اور عیسائیوں کو اس فیصلہ کن جنگ میں شکست دے دیتے تو شاید آج اسپین کی تاریخ مختلف ہوتی۔

عیسائیوں نے آٹھویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کی پیش قدمی کو روک دیا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انہوں نے فوراً مسلمانوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ انہیں مسلمانوں کو نکال باہر کرنے کا پہلا موقع گیارہویں صدی میں بنوامیہ کے زوال کے بعد ملا۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے غیر متحد مسلمانوں کے کئی شہروں اور ریاستوں پر قبضہ کرلیا۔ مسلمانوں کی درخواست پر یوسف بن تاشفین نے وہاں مداخلت کی اور عیسائیوں کو زبردست شکست دی۔ پہلے مرابطون اور پھر موحدون نے اسپین پر حکومت کی۔ ان کے بعد بلکہ بسا اوقات ان کے کمزور حکمرانوں کے دور میں بھی عیسائیوں نے سر اٹھانا شروع کردیا۔ مگر انہیں اسپین سے مسلمانوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا سنہری موقع تیرہویں صدی میں ملا جب ایک طرف مسلمانوں کی مرکزیت ختم اور ان کی طاقت منتشر ہوگئی تھی اور دوسری طرف عیسائی متحد ہوگئے تھے۔ 1230ء میں لیان (Leon) اور قشتالہ (Castile) کی بادشاہتیں ایک ہوگئیں۔ یہ دونوں بادشاہتیں مذہبی جذبے سے سرشار اور مسلم مخالف تھیں۔ انہوں نے پہلے مسلمانوں کے باہمی انتشار کو ہوا دی اور پھر یکے بعد دیگرے انہیں فتح کرنا شروع کردیا۔ تیرہویں صدی کے نصف تک اسپین کی عیسائی فتح تقریباً عملی طور پر مکمل ہوچکی تھی۔ طلیطلہ پر ان کا قبضہ گیارہویں صدی کے اواخر یعنی 1085ء میں ہوگیا تھا۔ قرطبہ پر انہوں نے 1236ء میں قبضہ کیا اور Seville یا اشبیلیہ پر 1248ء میں غلبہ حاصل کیا۔

مذکورہ شہروں یا شہری ریاستوں پر قبضہ کرنے کے بعد عیسائیوں نے مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیے۔ وہ پورے اسپین میں عیسائیت کا غلبہ چاہتے تھے۔ انہوں نے ان اسپینیوں کو دوبارہ عیسائی بنانا شروع کر دیا جو یا تو مسلمان ہو گئے تھے یا عربیت یعنی عرب تہذیب و ثقافت کو اختیار کر لیا تھا۔ وہ عرب اور اسپینی مسلمانوں سے ان کی زمینیں چھیننے میں بھی مصروف ہو گئے۔ ان کی تجارت میں رکاوٹ ڈالنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے اسپینی مسلمان بس نام کے مسلمان رہ گئے اور عرب تہذیب کے دلدادہ عیسائی اسپینی از سر نو کم تر اسپینی یا یوروپی تہذیب کو بتدریج اختیار کرتے چلے گئے۔ تیرہویں صدی کے اختتام تک عیسائیوں کے زیر اقتدار اسپین میں مسلمان اور اسلامی تہذیب دونوں بڑی تیزی سے زوال پذیر تھے۔ اس صورت حال سے دوچار بہت سے مسلمان خاص طور سے جو عربی النسل یا بربر تھے، غرناطہ میں آ کر پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ جو غریب تھے یا خاص طور سے جو کھیتوں اور باغوں میں کام کرتے تھے، وہ یا تو غلام بنا لیے گئے یا بتدریج انہوں نے دوبارہ عیسائیت قبول کر لی۔

ان ناگفتہ بہ حالات میں غرناطہ کے بنو نصر نے، باوجود اس کے کہ وہ ایک عیسائی حکمراں کے باجگزار تھے، غرناطہ کی ریاست کو نہ صرف بچائے رکھا بلکہ اسے خوب ترقی بھی دی۔ لیکن پندرہویں صدی کے نصف آخر میں ان کا ستارہ بھی گردش میں آ گیا۔ اس وقت عیسائیوں کی دو بڑی بادشاہتیں تھیں۔ ایک قشتالہ (Castile) کی اور دوسری ارغون (Aragon) کی۔ 1469ء میں ارغون کے حکمراں فرڈیننڈ نے دوسری عیسائی بادشاہت قشتالہ کی حکمراں ازابیلا سے شادی کر لی۔ اس طرح دو بڑی عیسائی حکومتیں متحد ہو گئیں جو غرناطہ کے بنو نصر یا ناصری حکمرانوں کے لیے بہت بری خبر تھی۔ ناصری سلاطین نے اس خطرے کو محسوس کر لیا لیکن ان کی مختصر شہری ریاست اس کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں بالکل بھی نہیں تھی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ عیسائی متحد اس وقت ہوئے جب بنو نصر باہم دست و گریباں تھے اور مسلمانوں کی رہی سہی قوت منتشر تھی۔ منافقت زوروں پر تھی اور ضمیر فروشوں کی بن آئی تھی۔ بعض ناصری شہزادے فرڈیننڈ اور ازابیلا سے ہاتھ ملا کر خود اپنوں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔

ایسے ناگفتہ بہ حالات تھے جب 19 ویں ناصری سلطان علی ابوالحسن نے نہ صرف قشتالہ کے بادشاہ کو خراج دینے سے انکار کر دیا بلکہ اس کے بعض علاقوں پر حملہ بھی کیا۔ انتقامی کارروائی کرتے ہوئے فرڈیننڈ نے 1482ء میں جوابی حملہ کیا اور ریاست غرناطہ کے ایک اہم فوجی و تجارتی شہر پر قبضہ کر لیا۔ علی ابوالحسن کے لیے ایک دوسری بری خبر بھی تھی۔ عین اسی وقت جب فرڈیننڈ ریاست غرناطہ کے علاقوں کو تاراج کر رہا تھا، اس کے اپنے ہی ایک بیٹے نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ محمد ابو عبداللہ تھا۔ اس کی ماں فاطمہ اپنے بادشاہ شوہر علی ابوالحسن سے اس بات پر ناراض تھی کہ وہ نہ صرف ایک اسپینی عیسائی کنیز کی طرف مائل تھا بلکہ اس کے بچوں کو بھی آگے بڑھا رہا تھا۔ فاطمہ نے اپنے بیٹے محمد ابو عبداللہ کو جسے اسپینی مورخین بوب ڈل کے نام سے یاد کرتے ہیں، اپنے باپ علی ابوالحسن کے خلاف ورغلایا اور اس نے بغاوت کر کے الحمراء قلعے پر قبضہ کر لیا۔ یہ حادثہ 1482ء میں پیش آیا جب فرڈیننڈ نے غرناطہ ریاست کے ایک شہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس طرح غرناطہ میں ایک ہی وقت میں دو بادشاہ تھے۔ بعض بااثر شہریوں اور امراء نے مداخلت کر کے صورتحال کو درست کرنے کی کوشش کی تو بوب ڈل یا محمد ابو عبداللہ نے ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا نہ صرف ان کی جائدادیں ضبط کر لیں یا ان کی تجارت کو نقصان پہنچایا بلکہ سر عام انہیں بے عزت کیا اور بہتوں کو قتل کرا دیا۔ اپنے والد بزرگوار علی ابوالحسن کے ساتھ اس نے فرڈیننڈ کے خلاف بھی محاذ کھول دیا۔ اس نے ریاست قشتالہ کے شہر Lucena پر 1482ء میں چڑھائی

کی اور شکست کھائی۔ عیسائی فوج نے اسے گرفتار بھی کرلیا۔ اس کی گرفتاری کے بعد اس کے باپ علی ابوالحسن کا غرناطہ پر دوبارہ قبضہ ہوگیا اور اس نے 1485ء تک وہاں حکومت کی۔

علی ابوالحسن کا بھائی الزغل ایک بہادر جنرل تھا۔ وہ مالقہ کا گورنر تھا۔ اس نے چھوٹی سی ریاست غرناطہ کا اچھی طرح نظم چلانا شروع کیا لیکن فرڈینڈ اور ازابیلا نے اپنی جیل میں بند ابوعبداللہ کو فوج اور پیسہ دے کر غرناطہ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کرلیا۔ چنانچہ ابوعبداللہ نے اپنے چچا الزغل کے خلاف اعلان بغاوت کرتے ہوئے دوسری بار شہر غرناطہ کے بعض حصوں پر قبضہ کرلیا اور اس طرح 1486ء میں دوسری بار غرناطہ میں دو بادشاہ تھے اور دونوں باہم برسرپیکار تھے۔ خود کو برباد کرلینے والی اس جنگ کا خمیازہ اسپین کے باقی ماندہ مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑا۔

غرناطہ اور اس کے گردونواح میں چچا بھتیجے یعنی الزغل اور ابوعبداللہ کے بیچ جنگ کا براہ راست فائدہ فرڈینڈ اور ازابیلا کو پہنچا۔ انہوں نے چچا بھتیجے کو باہم دست و گریباں دیکھ کر غرناطہ کی طرف بتدریج بڑھنا شروع کردیا۔ 1486ء میں ہی انہوں نے غرناطہ کے کئی شہروں اور قصبوں پر قبضہ کرلیا۔ دوسرے سال مالقہ پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا۔ عیسائی فوج نے نہ صرف شہر کو تباہ کیا بلکہ بے شمار لوگوں کو غلام بنا کر بیچ دیا۔ مالقہ کے بعد انہوں نے غرناطہ کے محاصرے کا پروگرام بنایا۔ الزغل نے فرڈینڈ کی بڑھتی ہوئی فوج کو کئی بار جراٴت مندی سے روکنے کی کوشش کی مگر ہر بار ابوعبداللہ عیسائیوں کے اتحادی کے طور پر اس کے سامنے آجاتا۔ مایوس ہوکر اس نے آخری بار افریقہ کے مسلم بادشاہوں سے مدد کی اپیل کی جو خود ہی باہم برسرپیکار تھے۔ ہر طرف سے مایوس ہوکر اور بالخصوص اپنے بھتیجے کی غداری سے عاجز آکر اس نے ہار مان لی۔ اس کے آخری ایام کس مپرسی اور غربت میں گزرے۔

الزغل کے بعد ابوعبداللہ غرناطہ کا بادشاہ بنا۔ اب اس کے پاس صرف شہر غرناطہ بچا تھا۔ اور پورے اسپین پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ابوعبداللہ سے اس کے عیسائی سرپرست فرڈینڈ نے 1490ء میں مطالبہ کیا کہ وہ شہر اس کے حوالے کردے۔ لیکن شہر کے نوجوانوں اور ایک بہادر جنرل موسیٰ بن ابی غسان کے زیر اثر اس نے ہتھیار ڈالنے اور شہر عیسائیوں کے حوالے کرنے سے انکار کردیا۔ موسیٰ بن ابی غسان ایک بہادر اور ذہین جنرل تھا۔ اس نے شہر کے دفاع کا بہت اچھا انتظام کیا۔ اس نے شہر پر قبضہ کرنے کی کوشش کو ناکام بنادیا۔ جب سردیاں تیز ہوگئیں تو فرڈینڈ نے محاصرہ اٹھالیا۔ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر غرناطہ کی فوج نے اپنے بعض علاقوں کو واگزار بھی کرالیا۔ لیکن دوسرے سال (1491ء) موسم بہار میں فرڈینڈ نے دوبارہ غرناطہ کا محاصرہ کرلیا۔ اس کی فوج میں 40 ہزار پیادہ فوجی اور 10 ہزار گھوڑ سوار تھے۔ زمانے کے رواج کے مطابق دونوں طرف سے انفرادی جنگ شروع ہوئی یعنی دونوں طرف کے ایک ایک بہادر آمنے سامنے ہوتے۔ ایسے معرکوں میں بالعموم مسلمان بہادروں کو فتح ہوئی۔ عیسائی فوج کے کئی نامور جانباز مارے گئے۔ فرڈینڈ یہ سب کچھ اپنے خیمے سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے محاصرے کو گھیرابندی میں تبدیل کرنے کا حکم دیا۔ گھیرابندی یعنی Blockade کا مقصد شہر کے باشندوں کو بھوکوں مارنا تھا تاکہ عاجز آکر وہ شہر اس کے حوالے کردیں۔ یہ گھیرابندی یا Blockade روز بروز شدید ہوتا گیا۔ شہر میں کسی طرف سے بھی کوئی شے داخل نہیں ہوسکتی تھی۔ عام شہری ہمت ہارنے لگے۔ لیکن سب سے زیادہ پریشان اخلاقی جراٴت اور مردانہ شجاعت سے عاری امراء اور بادشاہ کے درباری تھے۔ فرڈینڈ کے جاسوسوں نے انہیں لوگوں کو نشانہ بنایا اور جھوٹے وعدوں کے ذریعے انہیں ورغلایا کہ اگر شہر فرڈینڈ کے حوالے کردیا گیا

تو ان کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا جائے گا۔ بتدریج دربار میں ضمیر فروش درباریوں اور امراء کی تعداد بڑھتی گئی اور موسی بن ابی غسان جیسے دور اندیش اور بہادر جنرل کو کنارے لگا دیا گیا۔

8.6 ہتھیار ڈالنے کی شرائط

موسم بہار میں شروع ہوا Blockade (گھیرابندی) دسمبر 1491ء تک جاری رہا۔ تنگ آکر بوب ڈول یا ابوعبداللہ نے فرڈیننڈ کے پاس سفارت بھیجی تاکہ شہر کی سپردگی کا عہد نامہ تیار کیا جا سکے۔ کئی کانفرنسوں اور بحث و گفتگو کے بعد جو دستاویز تیار ہوئی اس کے اہم نکات یہاں ہم حتّی اور سید امیر علی کے حوالے سے پیش کرتے ہیں:

''یہ کہ اگر دو مہینے کے اندر زمینی یا بحری راستے سے کوئی مدد نہیں آتی تو غرناطہ کو عیسائیوں کے حوالے کر دیا جائے گا''۔

یہ کہ بادشاہ، اس کے جنرل، وزیر اور شیوخ اپنی تمام رعایا کے ساتھ قشتالہ کے بادشاہ کی اطاعت گزاری کا حلف لیں گے۔

یہ کہ بوب ڈول یا ابوعبداللہ کو البشارہ ایک جاگیر ملے گی۔

یہ کہ مسلمانوں، خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے، ہر ایک کو شخصی پناہ حاصل ہوگی۔

یہ کہ مسلمانوں کو پوری آزادی حاصل ہوگی اور وہ اپنی جائداد و دولت، ہتھیار اور گھوڑے پر مالکانہ حقوق رکھیں گے۔

یہ کہ انہیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی اور اس ضمن میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔

یہ کہ ان کی مساجد اور مذہبی آثار و اوقاف محفوظ رہیں گے۔

یہ کہ موذن پر اذان دینے کی کوئی پابندی نہیں ہوگی۔

یہ کہ انہیں اپنے عادات واطوار، رسم و رواج، زبان اور لباس پہننے اور اسے قائم و دائم رکھنے کی اجازت ہوگی۔

یہ کہ مسلمانوں پر ان کے اپنے قوانین اپنے قاضیوں کے ذریعے نافذ کرنے کی اجازت ہوگی۔

یہ کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان متنازعہ امور کا تصفیہ ایک ایسے ٹریبونل کے ذریعے ہوگا جس میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل ہوں۔

یہ کہ مسلمانوں پر کوئی نیا ٹیکس نہیں لگے گا اور وہی ٹیکس دیتے رہیں گے جو اپنے بادشاہ کو دیتے رہے ہیں۔

یہ کہ کوئی عیسائی کسی مسلمان کے گھر میں زبردستی داخل نہیں ہوگا۔

یہ کہ تمام مسلم قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے گا۔

یہ کہ وہ تمام مسلمان جو افریقہ ہجرت کرنا چاہتے ہیں، انہیں ایک خاص متعینہ مدت کے اندر ایسا کرنے کی جازت ہوگی اور قشتالہ کے بحری جہازوں کے ذریعے ان کو ان کی منزل پر پہنچا دیا جائے گا۔

یہ کہ متعینہ مدت گزر جانے کے بعد بھی کسی مسلمان کو ہجرت کرنے سے روکا نہیں جائے گا۔

بشرطیکہ وہ سفرخرچ برداشت کرنے کے علاوہ اپنی دولت و جائداد کا دسواں حصہ عیسائی ریاست کو دے گا۔

یہ کہ کسی بھی مسلمان کو دوسرے کے گناہ کے بدلے سزا نہیں دی جائے گی۔

یہ کہ اگر کسی عیسائی نے اسلام قبول کر لیا تو اسے اپنے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی کسی دوسرے مذہب کو اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

یہ کہ اگر کوئی مسلمان عیسائی مذہب اختیار کرنا چاہتا ہے تو اسے موقع دیا جائے گا کہ اپنے ارادے پر از سرِ نو غور کرے۔ اس کے بعد اس سے عیسائی اور مسلمان جج تفتیش کریں گے کہ عیسائی کیوں ہونا چاہتا ہے۔ اگر وہ اب بھی عیسائیت اختیار کرنے کے ارادے پر قائم رہتا ہے تو اسے ایسا کرنے دیا جائے گا۔

یہ کہ کسی مسلمان کو مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ عیسائیوں کو اپنے ساتھ سپاہی کے طور پر رکھے۔

یہ کہ کسی مسلمان کو اس کی مرضی کے برعکس اس کے گھر سے نکالا یا ملک بدر نہیں کیا جائے گا۔

یہ کہ اگر کوئی مسلمان عیسائیوں کے درمیان رہنا چاہتا ہے یا ان کے شہروں سے ہو کر سفر کرنا چاہتا ہے تو اس کے جان اور مال کی حفاظت کی جائے گی۔

یہ کہ مسلمانوں کے اوپر ان کی پہچان یا علاحدہ شناخت کے لیے کوئی بیج وغیرہ نہیں لگایا جائے گا جیسا کہ یہودیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

جب مذکورہ عہد نامہ ابوعبداللہ کے دربار میں پڑھ کر سنایا گیا تو جیسے موت کا سناٹا چھا گیا۔ بلا شبہ بعض لوگوں کو غلط فہمی تھی کہ بظاہر مذہبی فرڈیننڈ اور ازابیلا اپنے عہد کا پاس رکھیں گے لیکن جن کی نظر حالات پر تھی، وہ بخوبی جانتے تھے کہ موت اور ذلت ان کا مقدر بن چکی ہے۔ غرناطہ کی فوج میں وہ طاقت نہیں تھی یا شاید ان میں ہمت نہیں تھی کہ سر پر کفن باندھ کر دشمن پر ٹوٹ پڑتے اور شہر کا محاصرہ ختم کر دیتے۔ عوام بھی اس عزم اور حوصلے سے خالی تھے جو مصیبت کے وقت قوموں میں زندگی کی روح پھونک دیتے ہیں۔ بلا شبہ فاقے کی نوبت آن پہنچی تھی مگر عزت کی زندگی کے لیے قربانیاں نہ دینا گویا اپنے اوپر ذلت کی زندگی کو مسلط کرنا ہے۔

دربار میں کئی امراء نے معاہدے کو قبول کرنے اور شہر فرڈیننڈ کے حوالے کر دینے کی بات کہی۔ پتہ نہیں انہیں کس وجہ سے فرڈیننڈ کی زبان یا اس کی دی ہوئی تحریر پر یقین تھا۔ وہ گزشتہ چند سالوں کے دوران دیکھ چکے تھے کہ ریاست غرناطہ کے دوسرے شہروں کا عیسائی فوجوں نے کیا حال کیا تھا۔ انہوں نے صرف ان شہروں اور قصبوں کو تاراج نہیں کیا جن کا دفاع الزغل نے بہادری سے کرنے کی کوشش کی تھی بلکہ ان آبادیوں پر بھی عذاب کی طرح نازل ہوئے تھے جنہوں نے لڑے بغیر اور صلح نامے پر دستخط کر کے اپنے شہر ان کے حوالے کر دیے تھے۔ فرڈیننڈ کا یہ معمول ہو چکا تھا کہ وہ لوگوں کو قتل کرتا یا غلام بناتا یا انہیں شہر بدر کر دیتا اور ان کی دولت، جائداد اور باغات ضبط کر لیتا۔ ایسے بے شمار لوگ شہر غرناطہ میں موجود تھے اور ان کی کہانیوں سے لوگ واقف تھے۔ مگر صرف

چند لوگ ان کے مصائب کی کہانی سن کر جہاد کے لیے تیار ہوئے۔ اکثر تو جیسے مایوس ہو گئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غرناطہ کے لوگوں کی اکثریت خود فریبی کا شکار تھی۔

8.7 موسیٰ کی تقریر

دربار میں فرڈیننڈ کے پیش کردہ عہدنامے کے خلاف واحد آواز موسیٰ بن ابی غسان کی تھی۔ اس نے پر جوش تقریروں سے امراء اور بادشاہ سے اپیل کی کہ کھلے میدان میں نکل کر اور قلعہ بند ہو کر بھی شہر کا دفاع جاری رکھا جائے۔ اس کی دلیل تھی کہ شہر اس وقت جس تکلیف سے گزر رہا ہے وہ اس سے کہیں کم ہے جو اس معاہدے کو قبول کرنے کے بعد ہوگی۔ مگر بزدل اور مصلحت پسند درباریوں نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ موسیٰ بن ابی غسان کی آخری تقریر دلوں کو پھاڑ دینے والی تھی۔ مگر ابوعبداللہ اور اس کے درباریوں کے دل تو مردہ ہو ہی چکے تھے۔ عیسائیوں کی دغابازیوں اور وعدہ خلافیوں کی یاد دلاتے ہوئے موسیٰ نے محاصرے کو ختم کرنے کے لیے ایک آخری جنگ کی اپیل کی۔ اس کی آخری تقریر کا آزاد ترجمہ پیش ہے۔

> موت غلامی کی شرم اور درد سے کہیں زیادہ شیریں ہے۔ تمہیں واقعی یقین ہے کہ عیسائی ایمانداری سے اپنے وعدوں پر عمل کریں گے؟ تم فریب خوردہ ہو۔ (خود کو دھوکہ دے رہے ہو) دشمن تمہارے خون کا پیاسا ہے۔ اس کے پاس ہمارے لیے بس موت ہے۔ یعنی زخم، ذلت، حقارت اور عصمتوں کو تار تار کرنا، وہ ہمارے گھروں کو لوٹیں گے۔ ہماری بیویوں پر اور بیٹیوں کی عزت سے کھلواڑ کریں گے۔ ہماری مساجد کی بے حرمتی کریں گے، مختصراً وہ ہم پر ظلم و ناانصافی مسلط کریں گے۔ ہمیں کسی بھی شکل میں برداشت نہ کرنا ان کی پالیسی ہوگی۔ آگ کے الاؤ پہلے ہی تیار ہیں تاکہ ہمیں جلا کر راکھ میں تبدیل کر دیا جائے۔

یہ دہکتے ہوئے الفاظ بھی سرد اور مردہ دلوں کو گرمانے میں ناکام رہے۔ دربار میں چھائے سناٹے سے موسیٰ کو اپنا جواب مل گیا۔ اس نے بادشاہ اور دربار میں موجود امراء پر ذلت اور حقارت کی ایک نگاہ ڈالی اور باہر نکل گیا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اکیلے عیسائی فوجوں کی طرف بڑھا۔ چند عیسائی بہادروں (knights) نے اس کا راستہ روکا، موسیٰ نے ان میں سے کئی کو تہ تیغ کر دیا۔ لیکن دشمنوں نے اس کے گھوڑے کو زخمی کر کے گرا دیا۔ بھاری زرہ پہنے ہونے کے باوجود وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر کچھ دیر تک ان کا مقابلہ کرتا رہا۔ وہ زخموں سے چور ہو گیا تو دشمنوں نے اس کی جانبازی کی داد دیتے ہوئے اس پر رحم کرنے کی پیش کش کی جسے اس نے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ جب وہ زخموں سے چور ہو کر لڑنے کے قابل نہ رہا تو اس نے خود کو دریائے شنیل (Xenil) کے حوالے کر دیا۔ جس نے غرناطہ کے آخری جانباز سپاہی کو ہمیشہ کے لیے اپنی گہرائی میں چھپا لیا۔

اہل غرناطہ کو دو مہینے کی مہلت ملی تھی۔ ابوعبداللہ اور عمائدین شہر نے مصر اور ترکی کے سلاطین کے پاس مدد کی درخواست بھیجی مگر کہیں سے کوئی مدد نہیں آئی۔ بالآخر 3/جنوری 1492ء کو شہر میں فرڈیننڈ کی فوجیں داخل ہو گئیں، شہر کے میناروں پر ہلالی پرچموں کی جگہ صلیبی جھنڈوں نے لے لی۔ ابوعبداللہ نے البشارہ میں اپنی جاگیر کی طرف جاتے ہوئے شہر کے باہر واقع ایک پہاڑی پر کھڑے

ہو کر آخری بار غرناطہ پر ایک نظر ڈالی اور آہ بھر کر رہ گیا۔ آج بھی اسپین میں یہ مقام موجود ہے اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے جہاں یہ الفاظ کندہ ہیں: ''مسلمانوں کی آخری آہ''۔ جب ابوعبداللہ کا درد آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا تو اس کی ماں، جس کے احمقانہ مشوروں نے ایک طرح سے غرناطہ پر یہ مصیبت نازل کی تھی، بول پڑی: ''تمہیں اس سلطنت کے کھونے پر ایک عورت کی طرح رونا ہی چاہیے جس کی حفاظت اور دفاع تم ایک مرد کی طرح نہیں کر سکے۔''

شہر پر عیسائیوں کے قبضے کے فوراً بعد موسیٰ بن ابی غسان کے ایک ایک بول صحیح ثابت ہوئے۔ ذلت اور مسکنت اہل شہر کا مقدر بن گئی۔ لوگ غلام بنائے جانے لگے۔ کچھ خود ہجرت کر گئے۔ بعض ملک بدر کر دیے گئے۔ ملک بدر کیے جانے والوں میں ابوعبداللہ بھی تھا جسے البشارہ میں جاگیر دی گئی تھی۔ لاکھوں مسلمانوں کو ملک بدر کرنا یا انہیں غلام بنانا عملاً ممکن نہیں تھا۔ اس لیے انہیں زبردستی عیسائی بنانے کا سلسلہ دراز شروع کیا گیا۔ اس کام کی تکمیل میں برسہا برس لگے۔ بالآخر اسپین میں اسلام کا چراغ گل ہو گیا اور اندلس تاریخ اسلام کا ایک دکھتا ہوا باب بن کر رہ گیا۔

8.8 سقوط غرناطہ کے بعد: عیسائیوں کی بدعہدی اور مسلمانوں کی حالت زار

غرناطہ کی سپردگی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ بظاہر مذہبی اور عبادت گزار فرڈیننڈ اور ازابیلا نے اپنا اصلی رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ موسیٰ بن ابی غسان کی آخری تقریر کا ایک ایک لفظ سچ ثابت ہوا۔ فرڈیننڈ اور ازابیلا بدعہدی پر اتر آئے اور مسلمانوں کے ساتھ کم و بیش وہی سلوک کیا جانے لگا جو پہلے یہودیوں کے ساتھ ہو چکا تھا۔ مسلم اسپین میں یہودیوں نے کافی ترقی کی تھی اور ان کی خوشحالی عیسائیوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ 1492ء میں فرڈیننڈ نے ایک فرمان جاری کر کے یہودیوں سے مطالبہ کیا کہ یا تو وہ اپنا مذہب ترک کر دیں یا اسپین چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ یہودیوں نے اگر ذرا بھی مزاحمت کی تو ان پر تشدد کے پہاڑ توڑے گئے۔ انہیں جلایا گیا اور وطن چھوڑنے پر بھی مجبور کیا گیا۔

یہودیوں کے ساتھ جو ہو رہا تھا اس سے مسلمانوں کو بھی اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا ہوگا۔ عین اسی وقت جب یہودیوں پر عیسائیوں کا قہر نازل ہو رہا تھا، مسلمانوں کے ساتھ بھی بدعہدی شروع ہو گئی۔ سپردگی کے عہدنامے کی بتدریج خلاف ورزی شروع ہو گئی۔ بعض مذہبی رسوم پر پابندی لگا دی گئی اور مختلف بہانوں سے مسلمانوں کو ذلیل و رسوا کیا جانے لگا۔ اور بعضوں کو تو باقاعدہ زبردستی عیسائی بنا لیا گیا۔ مسلمانوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا جس کی ناکامی کے بعد مسلح جدوجہد بھی شروع کی مگر فرڈیننڈ کی فوجوں نے نہ صرف اسے کچل دیا بلکہ مسلمانوں پر کھل کر ظلم کرنا شروع کر دیا۔ 1498ء میں بالکل اسی طرح کا قانون نافذ کیا گیا جو یہودیوں کے لیے 1492ء میں بنایا گیا تھا۔ عیسائی مذہبی جنونیوں نے حکم دیا کہ ایک محدود عرصے کے اندر مسلمان یا تو عیسائیت قبول کر لیں یا پھر اسپین چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ چند لوگوں نے عیسائیت قبول کر لی لیکن بھاری اکثریت اپنے مذہب پر قائم رہی اور یہ لوگ البشارہ کے پہاڑوں کی طرف چلے گئے یہاں ستم زدہ مسلمانوں پر زبردست حملہ کیا گیا۔ مسلمان مردوں کو تہ تیغ کر دیا گیا اور اس مسجد کو جلا دیا گیا جہاں مسلمان بچوں اور عورتوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ بہت سے مسلمانوں نے ہتھیار اٹھا لیا اور بعض مقامات پر بڑی بہادری سے اپنا دفاع کیا۔ خاص طور سے 1501ء میں جبل بلنسا کے مقام پر انہوں نے عیسائیوں کو شکست دے دی جس

کے نتیجے میں انہیں اس امر کی اجازت ملی کہ وہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ مراکش، ترکی یا مصر چلے جائیں۔ ہجرت کرنے والوں کی جائدادیں اور اسباب و اموال بحق سرکار ضبط کر لیے گئے تھے۔ اب بھی بہت سے مسلمان وہاں موجود تھے۔ یا وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ ہجرت کر سکتے یا وہ ترک وطن پر آمادہ نہیں تھے۔ ان بچے کھچے لوگوں کو تلوار کی نوک پر عیسائی بنا لیا گیا۔ تقریباً یہ تمام ہی لوگ نام کے عیسائی تھے۔ یہ لوگ دلوں میں ایمان چھپائے ہوئے تھے کیوں کہ موقع ملتے ہی یا موقع نکال کر وہ چھپ کر عبادت کرتے، وضو کرتے اور نماز پڑھتے، بچوں کے بپتسمہ کے بعد وہ انہیں اسلامی طریقے سے غسل دیتے اور چھپ کر اسلامی طریقے پر ان کی پرورش کرتے۔ وہ چرچ میں عیسائی طریقے سے شادی کرنے کے بعد گھر کی تنہائی میں نکاح کرتے۔ مگر جلد ہی مذہبی جنونیوں کو پتہ چل گیا کہ مسلمان دل سے عیسائی نہیں ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کی نگرانی اور جاسوسی کی جانے لگی۔ اگر کسی پر ذرا بھی شبہ ہوتا کہ وہ اندر سے مسلمان ہے تو اسے مع اہل خاندان کے جن میں بچے اور عورتیں بھی ہوتے، آگ کے حوالے کر دیا جاتا۔ آگ کے یہ الاؤ غرناطہ، قرطبہ اور اشبیلیہ میں جلتے رہتے جہاں بظاہر عیسائی لیکن اندر سے مسلمان لوگوں کو لایا جاتا اور بے رحمی سے جلا دیا جاتا۔ اس اندیشے سے کہ بچے کھچے مسلمان کہیں بغاوت نہ کر دیں، ان سے ان کے اسلحے لے لیے گئے۔ یہاں تک کہ سبزیاں اور پھل کاٹنے والے چاقو بھی چھین لئے گئے۔ الغرض بظاہر عیسائیت قبول کر لینے کے بعد بھی ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کی گئی۔

ظلم و ستم کا یہ سلسلہ نصف صدی سے زائد عرصے تک چلتا رہا۔ جس کسی بظاہر عیسائی مسلمان پر اندر سے مسلمان ہونے کا شبہ ہوتا ہے، اسے سزائے موت دے دی جاتی۔ لیکن ابھی تک ان عربوں اور بربروں کو عربی لباس پہننے اور بعض مورخوں کے بقول صاف ستھرا رہنے کی اجازت تھی۔ 1568ء میں فلپ دوم اسپین کا بادشاہ ہوا جو ایک انتہا پسند عیسائی تھا۔ اسی کی طرح غرناطہ کا بشپ بھی مذہبی جنونی تھا۔ اس نے بادشاہ سے یہ حکم نامہ جاری کرایا کہ بظاہر عیسائی ہو چکے عرب و بربر لوگ عربی لباس نہ پہنیں بلکہ عیسائیوں کا لباس زیب تن کریں اور ہیٹ لگائیں۔ حمام بند کر دیے گئے اور بظاہر عیسائی ہو چکے مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ غسل نہ کریں اور عام اسپینیوں کی طرح گندے بنے رہیں۔ ان سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ وہ عربی نہ بولیں، اپنی مخصوص رسوم، تقریبات اور ثقافتی علامتوں کو چھوڑ دیں۔ عرب اور بربر نام نہ رکھیں، لازمی طور پر اسپینی زبان بولیں، اسپینی نام اختیار کریں اور اسپینیوں کی طرح بن جائیں یعنی ان کے مذہب، ثقافت اور تہذیب کو اختیار کر لیں۔ شاید یہ مطالبے ان کی برداشت سے باہر تھے۔ وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ تین سال تک خوں ریزی جاری رہی اور بدنام زمانہ ڈان جُوآن (Don Juan of Austria) نے بے رحمی سے بغاوت کو کچل دیا۔ بظاہر عیسائی ہو چکے عرب و بربر مرد، بچے اور عورتیں اس کے سامنے ہر روز ذبح کئے جاتے اور البشارت، مسلمانوں یا عربوں کی آخری پناہ گاہ کو خاک و خاکستر میں تبدیل کر دیا گیا۔

بلنسیہ (Valencia) اور مرسیہ (Murcia) جیسے مقامات پر اب بھی بہت سے عرب موجود تھے۔ ان کی عیسائیت بھی مشکوک تھی۔ یہ لوگ پانچ لاکھ سے زائد تعداد میں تھے۔ 1610ء میں فلپ سوم تخت پر بیٹھا۔ یہ اپنے باپ ہی کی طرح مذہبی جنونی تھا۔ چنانچہ اس نے بھی اسپین کو عربوں سے خالی کرانے کی پالیسی جاری رکھی۔ اس نے مذکورہ پانچ لاکھ سے زائد مسلمانوں کو زبردستی جہازوں میں ٹھونس کر، غذا اور پانی دیے بغیر سمندر کے حوالے کر دیا تاکہ وہ افریقہ چلے جائیں۔ دو لاکھ سے زائد عرب اسپین کے اندرونی علاقوں، گاؤں اور دیہاتوں میں رہتے تھے، انہیں فرانس کی طرف کھدیڑ دیا گیا۔ ان میں سے جو راستے کی صعوبتیں

برداشت کر کے کسی طرح فرانس پہنچنے میں کامیاب ہوئے کسی طرح اپنے خرچ پر جہازوں کے ذریعے مختلف مسلم ممالک کی طرف ہجرت کر گئے۔ کہا جاتا ہے کہ سقوط غرناطہ سے فلپ سوم کے دور تک، جو ایک صدی سے زائد عرصے پر محیط ہے، تین ملین (تیس لاکھ) سے زائد مسلمانوں کو اسپین سے جلاوطن کیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں تہذیب وثقافت کا جنازہ نکل گیا۔

8.9 خلاصہ

خلاصہ بحث یہ کہ جب عرب مسلمان اپنے سامنے عظیم مقصد رکھتے تھے تو ان کی صفوں میں اتحاد تھا اور وہ کامیابی پر کامیابی حاصل کرتے گئے۔ انہوں نے قدرتی مناظر سے مالا مال مگر جہالت کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے ایک ملک کو ترقی کے بام عروج تک پہنچا دیا۔ وہاں علم وفن اور تہذیب وثقافت کے چراغ جلائے۔ لیکن جب ان کی نظروں سے عظیم الشان مقاصد اوجھل ہو گئے تو وہ باہم دست وگریباں ہو گئے جس کا فائدہ اٹھا کر عیسائی حکمرانوں نے انہیں جلاوطن کر دیا۔ ہزاروں لاکھوں لوگ یا تو مارے گئے یا غلام بنا لیے گئے۔ ایسا زوال یا عذاب آیا کہ اندلس سے عربوں اور مسلمانوں کا نام ونشان تک مٹا دیا گیا۔ مساجد مسمار کر دی گئیں یا گرجوں میں تبدیل کر دی گئیں۔ اگر کہیں کسی مسجد کے آثار باقی رہے تو وہاں سے اذان کی صدائیں بلند ہونا بند ہو گئیں۔ اندلس سے مسلمانوں کا انخلاء اسلامی تاریخ کا ایک دکھتا رستا ہوا ناسور ہے۔

8.10 نمونہ کے امتحانی سوالات

1. اندلس میں بنوامیہ کے زوال پر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔
2. سقوط غرناطہ پر تفصیلی مضمون لکھیں۔
3. غرناطہ کو عیسائیوں کے حوالے کرنے کے لیے طے کردہ شرائط اور ان پر موسیٰ بن ابی غسان کے تبصرے پر روشنی ڈالیں۔
4. سقوط غرناطہ کے بعد مسلمانوں پر ڈھائے گئے مظالم کو تفصیل سے بیان کریں۔

8.11 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. مسلمان اندلس میں — رشید اختر ندوی
2. اندلس کا تاریخی جغرافیہ — محمد عنایت اللہ دہلوی
3. نفح الطیب (اردو ترجمہ) — علامہ المقری
4. عبرت نامہ اندلس — این ہارٹ ڈوزی
5. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ — ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی
6. Ameer Ali, A Short History of Sarasens

اکائی 9 : صقلیہ کی حکومت

اکائی اجزاء

9.1 مقصد

اس اکائی میں سب سے پہلے آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ سسلی یا صقلیہ کو فتح کرنے کا خیال مسلمانوں کے دلوں میں کیوں آیا۔ مختصراً آپ کو یہ بھی بتایا جائے گا کہ صقلیہ پر مسلمانوں کے ابتدائی حملے کب اور کیسے شروع ہوئے۔ پورا جزیرہ یا اس کا بڑا حصہ مسلمانوں کے

قبضے میں دوراغالبہ میں آیا اوراسی دور میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ مختصراً مسلمانوں کے نظام حکومت کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی جائیں گی۔ اس کے بعد مسلمانوں کی تہذیبی وتمدنی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے مختلف علمی میدانوں میں مسلمانوں کے کارناموں یا حصول یابیوں کا ذکر ہوگا۔ سب سے آخر میں صقلیہ میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی جائے گی۔

9.2 تمہید

سسلی یا صقلیہ بحرروم میں ایک جزیرہ ہے جو اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے ہمیشہ، خاص طور سے زمانہ وسطی میں، بڑی فوجی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ جب حضرت عمرؓ کے دور میں مسلمانوں نے اس وقت کی بازنطینی سلطنت جسے عرب مورخین رومن امپائر کے نام سے یاد کرتے ہیں، کے دو اہم صوبوں، شام اور مصر پر قبضہ کرلیا تو بہت سے عیسائی امراء نے جزیرہ صقلیہ میں جاکر پناہ لی اور وہاں سے ریشہ دوانیاں شروع کردیں۔ بعض دوسرے علاقوں اور جزیروں مثلاً قبرص وغیرہ سے بھی وہ مسلمانوں کو تنگ کرنے لگے۔ مسلمانوں کو شدت سے احساس ہوا کہ رومیوں کی ریشہ دوانیوں اور حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے بحری بیڑے کا ہونا ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں اس کی اجازت نہیں دی لیکن امیر معاویہؓ کے مشورے کو حضرت عثمانؓ نے مان لیا۔ جزیرہ صقلیہ پر اس کے بعد مسلمانوں کے حملے شروع ہوگئے۔ اور بالآخر اغالبہ کے دور میں اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا اور وہاں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی گئی جو کوئی سو سال تک قائم رہی۔ مسلم صقلیہ نے علوم وفنون اور صنعت وتجارت میں اسی طرح ترقی کی جس طرح اس کی بڑی بہن اندلس اس دور میں ترقی کررہی تھی۔ اندلس کی طرح مسلم صقلیہ کے بھی یوروپ پر بڑے گہرے اثرات پڑے۔

9.3 فتح صقلیہ کی ضرورت

مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان کشمکش رسول اللہ ﷺ کے دور میں ہی شروع ہوگئی تھی۔ آخری پیغمبر ہونے کا لازمی تقاضہ تھا کہ نبیؐ عربوں کے علاوہ دوسری قوموں کو بھی اسلام کی دعوت دیتے۔ دعوتِ اسلامی کی عالمگیریت بھی اس کی متقاضی تھی۔ چناں چہ نبیؐ اس مقصد کے لیے قبائل اور حکومتوں کے پاس اپنے سفیر بھیجتے جو نبیؐ کا خط لے جاتے جس میں مختصراً اسلام کی تعلیمات درج ہوتیں اور بہ طریق احسن سرداروں اور حکمرانوں کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کیا جاتا۔ ایسے ہی دو قاصد روم کی طرف بھی روانہ کیے گئے تھے جنھیں غسانی عربوں نے اپنے ماتحت علاقے میں قتل کردیا تھا۔ غسانی عرب عیسائی اور سلطنت روم کا حصہ تھے۔

زمانے کے رواج اور قانون کے مطابق مدینہ کی اسلامی ریاست کو اپنے مقتول سفراء کا انتقام لینے کا حق تھا۔ سفیر کا قتل محض ایک شخص کا قتل نہ تھا بلکہ اس ریاست پر حملہ تصور کیا جاتا تھا جس کی وہ نمائندگی کررہا ہوتا تھا۔ چناں چہ مدینہ کی اسلامی ریاست نے محسوس کیا کہ غسانیوں نے محض ایک سفیر شخص کو قتل نہیں کیا ہے بلکہ صحرائے عرب کی نئی حکومت کے لیے خطرے کی گھنٹی بجائی ہے۔ یہ احساس بھی تھا کہ شاید یہ مقامی غسانی لیڈر کی حرکت ہو اور سلطنت روم کا باقاعدہ سرکاری فیصلہ نہ ہو۔ چناں چہ نبیؐ نے سرزنش کے لیے ایک چھوٹی سی فوج روانہ کی اور اس طرح جنگ موتہ پیش آئی۔ اس جنگ میں عیسائیوں نے جس بڑے پیمانے پر شرکت کی، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ صحرائے عرب میں ابھررہی اسلامی طاقت انھیں کھٹک رہی ہے۔ ادھر ادھر سے آنے والے اکثر ایسی خبریں لاتے کہ رومی لشکر مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے والا ہے۔

ضروری ہو گیا تھا کہ پڑوس کی بڑی طاقت پر یہ واضح کر دیا جائے کہ مدینہ کی اسلامی ریاست لقمۂ تر نہیں ہے۔ چناں چہ رومیوں کے حملے کے اندیشوں میں گھر کر رہنے اور انتظار کرنے کے بجائے نبیؐ نے اقدامی جنگ کا فیصلہ کیا اور غزوۂ تبوک پیش آیا۔ نبیؐ نے اپنے اس اقدام سے محض رومیوں کو باخبر نہیں کیا کہ اسلامی ریاست اپنے حقوق کی حفاظت کرے گی بلکہ مسلمانوں کے دلوں میں بھی یہ بات بٹھادی کہ ان پر اپنی سرحدوں اور سفراء کی حفاظت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

روم وعرب کی کشمکش یا مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان باقاعدہ جنگ اس وقت شروع ہوئی جب مفرور عرب باغیوں کے تعاقب میں اسلامی فوجیں شام میں داخل ہوگئیں۔ یہ بعض باغیوں کا تعاقب نہیں تھا بلکہ عرب نسل کے لوگوں کو رومیوں کے پنجے سے نجات دلانا بھی تھا تا کہ وہ کھلی فضا اور ماحول میں اسلام کی دعوت کو سنیں اور بغیر زور زبردستی کے اس پر ایمان لائیں۔ فوجی حکمت عملی کے اعتبار سے شام، عراق اور مصر پر یا تو مسلمانوں کی حکمرانی ضروری تھی یا ان صوبوں رعلاقوں کو مسلمانوں کا باجگزار ہونا تھا تا کہ روم وایران کی عظیم مگر اسلام مخالف سلطنتیں اسلامی حکومت کے لیے مستقل خطرہ نہ بنی رہیں۔ اسی سوچ کے تحت حضرت عمرؓ نے شام عراق اور مصر کی فتح کا حکم دیا۔ ان تینوں ممالک کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ کی خواہش ہمیشہ یہی رہی کہ مزید جنگیں نہ ہوں۔

لیکن دشمن چپ بیٹھنے والے تو نہ تھے۔ وہ کئی جنگوں میں شکست کھانے کے باوجود اس امر کے لیے مسلسل کوشاں تھے کہ اسلام کے چراغ کو بجھا دیں۔ رومیوں کو شام اور عراق جیسے زرخیز صوبوں کے چھن جانے کا خاص طور سے بڑا قلق تھا۔ خشکی کی جنگ میں بری طرح شکست کھا جانے کے بعد انھوں نے سمندر کے راستے سے مسلمانوں کو تنگ کرنا شروع کیا۔ امیر معاویہؓ نے اس خطرے کو خاص طور سے بھانپ لیا کیوں کہ وہ شام کے گورنر تھے جس کی بندرگاہوں پر رومی بیڑے حملے کرتے رہتے تھے۔ مگر حضرت عمرؓ رومیوں سے مزید جنگ نہیں چاہتے تھے اور یہ خواہش رکھتے تھے کہ وہ اپنے ملکوں میں خوش رہیں اور ہمیں اپنی سرحدوں میں چین کی سانس لینے دیں۔ چناں چہ انھوں نے امیر معاویہؓ کی بحری بیڑہ تیار کرنے کی درخواست مسترد کر دی۔

رومی بحری بیڑہ یا اس کے بعض جہاز ساحلی شہروں میں لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ یہ دیکھ کر ان کا حوصلہ بڑھتا گیا کہ مسلمان بحری جنگ کی طرف سے غافل ہیں۔ اس کا فائدہ اٹھا کر انھوں نے بحری راستے سے حملہ کر کے مصر پر دوبارہ اپنی حکومت قائم کرنے کا پلان بنایا۔ بعض مصریوں کو پہلے انھوں نے بغاوت پر آمادہ کیا اور جب بغاوت پھوٹ پڑی تو اپنے بحری بیڑے کو اسکندریہ پر قبضہ کرنے کا حکم دے دیا۔ مسلمانوں نے بھی جوابی پیش قدمی کی۔ حضرت عمرؓ کے انتقال کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو انھوں نے فتوحات کے سلسلے کو از سر نو دوبارہ شروع کرنے کا حکم دیا۔ چناں چہ امیر معاویہؓ نے رومی سلطنت کے ایشیائی صوبوں پر حملہ کیا اور عبد بن سعد بن ابی سرح نے مصر سے آگے افریقہ پر حملہ کر دیا۔

امیر معاویہؓ نے ان جنگوں کے درمیان سمندر کی طرف سے خطرے کے بارے میں حضرت عثمانؓ کو قائل کر لیا اور انھوں نے بحری فوج کی ترتیب و تنظیم کی انھیں اجازت دے دی۔ امیر معاویہؓ نے سرعت سے اس پروجیکٹ پر عمل کیا اور مسلمانوں کا پہلا بحری بیڑا تیار کر کے 28 ہجری میں جزیرہ قبرص کو اسلامی سلطنت کا باجگزار بنا لیا۔ یہ دیکھ کر کہ مسلمان بھی بحری جنگ کے میدان میں کود پڑے ہیں، رومیوں نے بڑے پیمانے پر جنگی تیاری شروع کر دی۔ وہ بحری جنگ کا فن ایک زمانے سے جانتے تھے۔ مسلمانوں سے کئی بحری جنگوں میں شکست کھانے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ بحری راستے سے اسلامی ریاست کو ڈرانے یا مصر و شام پر دوبارہ قبضہ کرنے کا

زمانہ لد گیا بلکہ الٹا انھیں یہ اندیشہ ہونے لگا کہ مسلمان بحری بیڑہ کہیں اتنا طاقتور نہ ہو جائے کہ خود سلطنت روم کے لیے خطرہ بن جائے۔ اس احساس نے انھیں یہ فیصلہ لینے پر مجبور کیا کہ بحر روم میں ایک بڑا بحری فوجی اڈہ قائم کریں۔اس کے لیے ان کی نظر انتخاب صقلیہ پر پڑی۔ چناں چہ اسے نہ صرف انھوں نے بحر روم میں اپنا فوجی اڈہ بنایا بلکہ افریقہ میں مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں کا مرکز بھی۔ آئے دن ان کی بحری فوجی ٹکڑیاں مسلم افریقہ کے ساحلوں پر حملے کرتیں اور غارت گری کا بازار گرم کرتیں۔ان حرکتوں سے مسلمانوں کو جزیرہ صقلیہ کی فوجی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوگیا اور انھوں نے اسے فتح کرنے کا منصوبہ بنانا شروع کردیا۔

9.3.1 ابتدائی حملے

چناں چہ امیر معاویہؓ نے تین سو جہازوں پر مشتمل ایک بحری بیڑا صقلیہ کی طرف روانہ کیا۔ یہ بیڑا صقلیہ کے کسی ساحل پر بغیر کسی مزاحمت کے لنگر انداز ہوگیا۔ صقلیہ کے رومی گورنر نے آگے بڑھ کر مسلمانوں کی پیش قدمی روکنی چاہی۔کئی جنگیں ہوئیں جن میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ گورنر کو ابتداء مرکزی رومی حکومت سے کوئی مدد نہیں ملی۔لیکن کچھ دنوں بعد 6 سو جہازوں پر مشتمل بحری بیڑا صقلیہ کی طرف بڑھا۔مسلمانوں کو خبر ہوئی تو انھوں نے اپنے حالات کا جائزہ لیا۔اس رائے پر اتفاق ہوا کہ ان کی چھوٹی سی فوج دوطرفہ حملے کے لیے کافی نہیں ہے۔ چناں چہ وہ مال غنیمت لے کر شام واپس لوٹ گئے جہاں امیر معاویہؓ نے گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا اور ان کی فوجی بصیرت اور دوراندیشی کی داد دی۔

اس کے بعد فاتح اندلس موسی بن نصیر سمیت افریقہ کے کئی والیوں نے جزیرہ صقلیہ پر چڑھائی کی لیکن اس پر اسلامی علم پوری طرح اغالبہ کے دور حکومت میں لہرایا۔

9.3.2 اغالبہ کا دور

دولت اغالبہ کا قیام عباسی خلیفہ ہارون رشید کے دور میں ہوا۔ابراہیم بن اغلب کو ہارون رشید نے افریقہ کا والی بنایا تو اس نے درخواست کی کہ افریقہ کو صوبہ مصر کے تحت نہ رکھا جائے اور خاص طور سے مصر کے خزانے سے جو ایک لاکھ دینار اسے ملتا ہے، وہ بند کر دیا جائے اور اس کی جگہ اسے ایک مستقل صوبہ بنا دیا جائے جو خلافت بغداد کو سالانہ چالیس ہزار دینار دے گا۔ ہارون رشید نے یہ تجویز مان لی۔اس کے بعد ابراہیم اغلبی نے افریقہ کا بہت اچھا انتظام کیا۔اس کی کارکردگی سے خوش ہوکر ہارون رشید نے افریقہ کی ولایت کو موروثی قرار دے دیا یعنی افریقہ کا والی ہمیشہ خاندان اغلب سے ہوگا۔

اغالبہ کی حکومت سو سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی۔ اغلبی والیوں میں زیادۃ اللہ بن ابراہیم بڑا بیدار مغز حکمراں گزرا ہے۔اس کی خوبی یہ تھی کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے تمام مضمرات پر خود بھی غور کرتا اور امراء، اعیان حکومت، علماء اور فقہاء سے بھی رائیں لیتا۔ جب اس نے صقلیہ پر رومیوں کی بدعہدی کی وجہ سے حملے کا ارادہ کیا تو مسئلہ کو مجلس شوری میں پیش کیا۔ بعض لوگوں نے رائے دی کہ صقلیہ کو باجگزار بنایا جائے لیکن اکثریت کی رائے اسے دارالاسلام بنانے کے حق میں تھی۔ کیوں کہ صقلیہ کی رومی حکومت نے نہ صرف بدعہدی کی تھی بلکہ مدت دراز سے یہ جزیرہ ان کی افریقہ مخالف سرگرمیوں اور ریشہ دوانیوں کا مرکز تھا۔ قاضی القضاۃ ابوعبداللہ اسد بن فرات بن سنان صقلیہ کو دارالاسلام بنانے کے سب سے بڑے حامی تھے۔ چناں چہ زیادۃ اللہ نے فتح صقلیہ کے لیے فوج کا سپہ سالار انھیں کو بنا دیا۔

قاضی اسد بن فرات نے دس ہزار پیادہ فوج اور سات سو سواروں کے ساتھ صقلیہ کی سرزمین پر قدم رکھا۔ ایک بڑا شہر فتح کرنے کے بعد وہاں انھوں نے صقلیہ کی اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد رومیوں کے دارالحکومت کا محاصرہ کرلیا۔ اس محاصرے کے دوران ہی ان کی وفات ہوگئی۔ ان کے جانشین نے بوجوہ رومی دارالحکومت کا محاصرہ ختم کر کے افریقہ جانے کا ارادہ کرلیا۔ لیکن جیسے ہی اسلامی لشکر افریقہ کی طرف بڑھا، رومیوں کے ایک بہت بڑے بحری بیڑے نے ان کا راستہ روک لیا۔ اسلامی لشکر کی غیرت جاگ اٹھی۔ انھوں نے صقلیہ ہی میں رہنے، جینے اور مرنے کا عہد کیا اور جہازوں میں آگ لگا دی۔ اس کے بعد انھوں نے کئی شہروں کو فتح کیا۔ ایک ایک شہر کے لیے زبردست جنگیں ہوئیں اور صقلیہ کی فتح میں سالوں لگ گئے اور اس دوران کئی والی اور سپہ سالار یا تو فطری موت مرے یا میدان جنگ میں شہید ہوئے یا پھر بدل دیے گئے۔ بہر حال قاضی اسد بن فرات نے صقلیہ میں جس اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی وہ کئی سو سال قائم رہی، کبھی مضبوط تو کبھی کمزور۔

قاضی اسد بن فرات اور ان کے جانشین جنھوں نے صقلیہ میں اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی، وہ ہمیشہ عباسیوں کے نامزد والی افریقہ کے ماتحت رہے۔ اغالبہ عملاً خود مختار تھے مگر انھوں نے کبھی خود کو سلطان نہ سمجھا نہ ایسا کوئی اعلان کیا۔ اس کے برعکس وہ ہمیشہ عباسی خلفاء کے والی ہونے کا دم بھرتے رہے۔ صقلیہ میں جمعہ کے خطبوں میں عباسی خلفاء کا نام پہلے اور اغالبہ کا بعد میں لیا جاتا۔ صقلیہ اس روحانی تعلق سے عباسی خلافت کا حصہ ضرور تھا، مگر عملاً اپنے امور والی افریقہ کی نگرانی میں انجام دیتا۔ یہ صورتحال فاطمیوں کے دور میں بھی قائم رہی جو اغالبہ کے زوال کے بعد افریقہ پر قابض ہو گئے تھے۔ چوں کہ فاطمی خلفاء عباسی خلفاء کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اس لیے ان کے حکم سے جمعہ کے خطبوں میں عباسی خلیفہ کا نام لیا جانا بند ہوگیا۔ صقلیہ کے مسلمانوں نے افریقہ کے نئے حاکموں یعنی فاطمی خلفاء کا نام جمعہ کے خطبوں میں پڑھنا شروع کر دیا۔

اغالبہ اور فاطمیوں کے علاوہ بعض دوسرے افراد اور خاندانوں نے بھی صقلیہ پر حکومت کی۔ یہ حکومتیں کمزور ثابت ہوئیں۔ جب فاطمی حکومت نے مصر پر قبضہ کے بعد دارالحکومت کو قاہرہ منتقل کر دیا تو جزیرہ صقلیہ پر ان کی گرفت کمزور پڑگئی۔ یہ تاریخ کی بدقسمتی ہے کہ قاہرہ کی فاطمی حکومت نے صقلیہ میں مسلمانوں کی آزاد حکومت برداشت نہ کی اور عیسائی حکمراں نارمن کو دعوت دی کہ وہ جزیرۂ صقلیہ پر قبضہ کرلے۔ اور نارمنوں نے اپنی مسلم دشمن پالیسیوں سے دھیرے دھیرے انھیں صقلیہ سے باہر نکال دیا۔ یہ سانحہ گیارہویں صدی کے آغاز میں پیش آیا۔

9.4 نظام حکومت

صقلیہ میں پہلی اسلامی حکومت قاضی اسد بن فرات کی سربراہی میں قائم ہوئی۔ یہ والی بھی تھے اور امیر لشکر بھی۔ ان کے بعد یہ دونوں عہدے بالعموم دو افراد کے پاس رہے۔ امیر لشکر عام طور سے والی صقلیہ کا نائب ہوتا اور اکثر مسلمانان صقلیہ والی کے انتقال کے بعد امیر لشکر کو والی بنا لیتے۔ ابتداءً اغلبی حکمرانوں نے اس روایت کو جاری رکھا لیکن بعد میں وہ اپنے خاندان کے افراد یا شہزادوں کو صقلیہ کا والی بنانے لگے۔ جب خود اغلبی خاندان کے شہزادے اور دوسرے اہل خاندان یہاں کافی تعداد میں آباد ہو گئے تو لوگ باہم مشورہ کر کے اپنے میں سے کسی کو والی بنا لیتے۔ والی افریقہ یا وہاں کا اغلبی حکمراں اکثر اس قسم کی تقرریوں کو بحال رکھتا لیکن کبھی کبھی کسی اور کو افریقہ سے نامزد کر کے بھیج دیتا جسے لوگ بسر و چشم قبول کر لیتے۔

اغالبہ کے بعد فاطمیوں نے بھی ابتداء انھیں کی روایت کو قائم رکھا یعنی مسلمانان صقلیہ کے فیصلوں کی تصدیق کر دیتے۔ لیکن بعد میں وہ اپنے والی بھیجنے لگے۔ چوں کہ مقامی مسلمانوں سے ان کا رابطہ گہرا نہ ہوتا، اس لیے فاطمی والیوں کے خلاف بغاوتیں سر اٹھانے لگیں۔ بعض فاطمی والیوں نے سختی سے کام لیا اور باغیوں کو سختی سے کچل دیا۔ لیکن فاطمیوں کے قیروان سے دارالحکومت قاہرہ منتقل کرنے کے بعد صقلیہ پر ان کی گرفت کمزور پڑتی گئی۔

اس صورتحال کا فائدہ اٹھا کر حسن کلبی جو 326ھ میں صقلیہ میں والی بن کر آیا تھا، نے اپنی حکمت عملی سے صقلیہ میں خود مختار موروثی حکومت کی نبیاد ڈال دی جس کا قاہرہ کی فاطمی حکومت سے تعلق برائے نام تھا۔ ایک معمولی رقم سالانہ ان کی خدمت میں پیش کر دی جاتی اور جمعہ کے خطبوں میں ان کا نام لے لیا جاتا۔ ہر نئے کلبی والی کا تصدیق نامہ قاہرہ سے ضرور آتا مگر یہ بات بس ایک رسم بن کر رہ گئی تھی۔

صقلیہ کو عربوں نے تین بڑے صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہر صوبے کا ایک گورنر ہوتا۔ ہر صوبے کو ضلعوں میں بانٹ دیا گیا تھا جن کے امیر ہوتے، جو والی صوبہ کو جوابدہ ہوتے۔ ایک تھوڑے عرصے کے لیے اٹلی کے بعض حصوں اور دوسرے جزائر پر مشتمل ایک اور صوبہ بھی قائم رہا اور اس کا والی صقلیہ کے والی کے علاوہ ہوتا۔ ایسا اغلبی حکمرانوں کے دور میں ہوا تھا۔ مگر یہ سلسلہ دیر تک جاری نہیں رہا اور والی صقلیہ ہی ان اطالوی مقبوضات کا بھی والی ہوتا۔

صقلیہ کی اسلامی حکومت کے بعض مستقل شعبے تھے جنھیں بالعموم دیوان کہا جاتا تھا، مثلاً دیوان الکتاب (سکریٹریٹ یا دفتر وزارت)، دیوان الخراج (شعبہ مالیات)، اور دیوان الجیوش وغیرہ۔ عدل وقضا اور شرطہ یعنی پولس کے بھی مستقل شعبے تھے۔ [illegible]طمی دور بلکہ عہد کلبیہ میں دارالحکومت بلرم کے پہلو میں ایک علاحدہ سکریٹریٹ بنایا گیا تھا جن میں مختلف وزارتوں کے صدور کا دفتر، عما[illegible] اور افسران کی رہائش گاہیں تھیں۔ یہ صقلیہ کے نظام حکومت کو مرکزیت فراہم کرنے کا ایک طریقہ تھا۔

دیوان الکتاب حکومت کا اہم ترین شعبہ تھا۔ اسے آج کی زبان میں دفتر وزارت عظمیٰ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کتاب یا وزراء کا تقرر والی صقلیہ یا وہاں کا فرمانروا کرتا۔ حکومت کے تمام شعبے انھیں کی نگرانی میں کام کرتے۔ یہ وزراء نہایت قابل، اہل علم اور بہترین منتظم ہوتے اور اکثر ان کا انتخاب ان کی صلاحیت کی وجہ سے ہوتا تھا۔

دیوان الخراج یعنی وزارت مالیات حکومت کا دوسرا اہم شعبہ تھا۔ دیوان الخراج کے افسر اعلی کو صاحب الخمس کہتے تھے۔ حکومت کے ذرائع آمدنی کئی تھے جیسے شہروں سے ٹیکس جن میں یکسانیت نہیں تھی۔ مثلاً بزور طاقت فتح کئے گئے شہروں سے زیادہ ٹیکس لیا جاتا جبکہ صلح کے ذریعہ اسلامی ریاست میں شامل کئے گئے شہروں سے لیا جانے والا ٹیکس بالعموم کم ہوتا کیوں کہ اس کی تعیین میں اہالیان شہر کی رائے بھی شامل ہوتی۔ زمینوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ان پر اسی طرح ٹیکس لگایا جاتا۔ صنعتی مصنوعات صقلیہ میں آتیں یا یہاں سے باہر جاتیں تو ان پر ٹیکس لگایا جاتا۔ صقلیہ کی عیسائی رعایا سے جزیہ وصول کیا جاتا جو خود عیسائی مورخین کے بقول سلطنت روم کے ٹیکسوں کے مقابلے میں بہت کم تھا۔

صقلیہ میں قضا کا اچھا نظام قائم تھا۔ عجب اتفاق ہے کہ جزیرے میں اسلامی حکومت قائم کرنے والا شخص خود قاضی تھا۔ اسلامی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی دارالقضا بھی قائم ہوا۔ جب عہد کلبیہ میں مرکزی سکریٹریٹ کا شعبہ بنایا گیا تو اس میں دارالقضا کی عمارت بھی بنائی گئی جس میں قضاۃ رہتے بھی تھے اور وہیں عدالتیں بھی لگاتے۔

مرکزی عدالت کے ساتھ اہم شہروں اور صوبوں میں بھی ذیلی عدالتیں قائم تھیں۔ دارالحکومت بلرم کا قاضی بالعموم قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس ہوتا۔ مقدمات کے فیصلے بالعموم حنفی فقہ کے مطابق ہوتے۔ اگرچہ عبادات کے معاملے میں لوگ زیادہ تر مالکی مسلک کے قائل تھے۔ فاطمیوں نے بزورشیعیت نافذ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے خودمختار موروثی والیوں یعنی عہد کلبیہ میں سنی علماء بھی قضا کے عہدوں پر فائز ہونے لگے تھے اور مقدمات کا فیصلہ بالعموم حنفی فقہ کے مطابق ہوتا۔

عیسائیوں کے لیے ان کی اپنی الگ عدالتیں قائم تھیں اور عیسائی مذہبی رہنما ان کے مذہبی معاملات میں فیصلے سناتے۔ یہ عیسائیوں کے باہمی تنازعات کے فیصلے بھی کرتے۔ ہاں اگر کسی تنازعہ میں ایک فریق مسلمان ہوتا مثلاً مقتول یا قاتل مسلمان ہوتا تو مقدمے کا فیصلہ اسلامی قانون کے مطابق ہوتا تھا۔

حکومت کا ایک اہم شعبہ دیوان المظالم بھی تھا۔ اگرچہ یہ شعبہ دارالقضا کے تحت نہیں تھا لیکن یہ بھی ایک طرح کی عدالت یا ٹریبونل تھا جہاں عوام وخواص حکومت کے عہدیداروں کے خلاف شکایات درج کراتے۔ یعنی اگر حکام غلطی کرتے یا کسی کے ساتھ زیادتی کرتے یا کسی کو غلط مقدمات میں پھنسا دیتے تو اس ٹریبونل میں اس کے خلاف اپیل کی جاتی۔ یہ براہ راست اس شعبے کا اثر ہے کہ جدید یوروپ میں اس طرح کے ٹریبونل قائم کیے گئے۔

شرطہ یا پولس کا نظام بھی کافی معقول تھا۔ پولس محض امن وامان قائم نہ کرتی بلکہ بعض امور میں یہ عدالت کا فریضہ بھی انجام دیتی۔ یہ جرم روکنے، جرائم کی تفتیش کرنے، عدالتی فیصلوں کی تنفیذ وغیرہ جیسے فرائض کو انجام دیتی۔ انسداد جرائم کے ساتھ شرعی حدود کو نافذ کرنے کی ذمہ داری بھی پولس کی تھی۔

دیوان الجیوش یا فوجی دفتر ایک نہایت اہم حکومتی شعبہ تھا۔ اس شعبہ بلکہ وزارت کا کام تقریباً وہی کچھ تھا جو آج کے عہد میں وزارت دفاع کا ہوتا ہے۔ ملک کی سلامتی کا انتظام کرنا، فوج کو بہتر حالت میں رکھنا، اس کی ہر قسم کی ضرورت پوری کرنا اور فوج سے متعلق سارے ریکارڈ رکھنا وغیرہ اس وزارت کے کام تھے۔ چوں کہ مسلم صقلیہ میں مدت دراز تک عیسائیوں سے لڑائیاں جاری رہیں، اس لیے دیوان الجیوش کو کافی اہمیت حاصل تھی۔

9.5 تہذیبی وتمدنی زندگی

مسلمانوں کی آمد کے وقت سسلی (صقلیہ) بنیادی طور پر رومیوں کا ایک بحری اڈہ تھا۔ غیر متمدن تو نہیں کہہ سکتے لیکن یہاں اعلی تمدن کی علامتیں بہت کم تھیں۔ پورا جزیرہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے بھرا پڑا ہے۔ مگر ان پہاڑوں سے پھوٹنے والے چشموں نے دریاؤں کی شکل اختیار کرکے وادیوں کو زرخیز وشاداب بنا دیا ہے۔ چناں چہ یہاں غلہ اور پھل کی اچھی پیداوار ہوتی ہے اور ہوتی تھی۔ رومیوں کو صقلیہ اپنی فوجی اہمیت کے ساتھ اپنے کھیتوں کی وجہ سے بھی عزیز تھا۔ مگر وہ کھیتوں پر کام کرنے والوں کو غلام سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے بلکہ اکثر غلام ہی کھیتوں پر کام کرتے جنھیں انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ پریشان ہوکر ان غلاموں نے کئی بار بغاوت کی جسے رومیوں نے بزور شمشیر کچل دیا۔

مسلمان جزیرے پر رحمت بن کر نازل ہوئے۔ انھوں نے اندلس کی طرح صقلیہ کے تمدن کو بھی بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ نہ صرف زراعت کو کافی ترقی دی بلکہ اضافی زرعی پیداوار کی برآمد کا بہترین انتظام کیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ کھیتوں پر کام کرنے والوں کے تئیں نرم رویہ اختیار کیا۔ انھیں وہ حقوق دیے جن سے وہ خود کو انسان سمجھنے لگے اور ان کی معاشی زندگی بھی سدھر گئی۔ انھوں نے ایک بہتر نظام حکومت فراہم کیا، بہترین عدالتی نظام قائم کیا۔ معیشت کو صرف زراعتی شعبے پر منحصر نہیں رہنے دیا بلکہ یہاں صنعت و حرفت، تعمیر اور تجارت کا وہ بازار گرم کیا کہ صقلیہ اندلس کی چھوٹی بہن بن گیا۔ صقلیہ محض ایک فوجی اڈہ نہ رہا بلکہ مسلمانوں کے زیرِ حکومت ایک عالمی تجارتی منڈی بن گیا۔

مسلمانوں نے محض صقلیہ کی معیشت کو ترقی نہیں دی بلکہ اس جزیرے کو جہالت کے غار سے نکالا اور اسے علوم وفنون کا گہوارہ بنا دیا۔ اندلس کے بعد صقلیہ دوسرا ملک ہے جس سے گنوار یوروپ نے علم کی روشنی حاصل کی۔ جب فاطمیوں کی احمقانہ دعوت پر نارمنوں نے صقلیہ پر قبضہ کرلیا تو اول اول یہ کوشش کی کہ مسلمانوں سے زراعت، صنعت، حرفت اور تجارت چھین لیں۔ انھوں نے یہ ساری چیزیں عیسائیوں کو دے دیں مگر ان کے اناڑی پن سے ملک تنزلی کے راستے پر گامزن ہوگیا۔ جزیرے کی خوش قسمتی کہ نارمن حکمرانوں کو بہت جلد احساس ہوگیا کہ محض فوجی برتری سے معاشی خوشحالی کا اعلیٰ معیار نہ حاصل کیا جاسکتا ہے اور نہ اسے قائم رکھا جاسکتا ہے۔ چناں چہ جزیرے پر قبضے کے فوراً بعد مسلم دشمنی کی جو پالیسی انھوں نے اختیار کی تھی، اسے بدلنے پر مجبور ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان بارہویں صدی کے وسط تک یہاں موجود رہے اور جزیرے کے اس تمدن کی آب وتاب کو قائم رکھا جس کی بنیاد انھوں نے اپنے دورِ حکومت میں ڈالی تھی۔

9.6 صقلیہ کی علمی ترقی

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں صقلیہ نے علم کے میدان میں بھی وہ ترقی حاصل کی جو اس سے پہلے نصیب نہیں ہوئی تھی۔ کبھی یہاں یونانیوں نے حکومت کی تھی اور علم کو ترقی دی تھی۔ ان کے بعض بڑے فلسفی اور شاعر یہیں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن فلسفیوں اور شاعروں کے اثرات اس وقت صقلیہ سے زائل ہو چکے تھے جب مسلمانوں نے اس پر قبضہ کیا اور اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ مسلمانوں نے جزیرے کو معاشی ترقی دینے کے ساتھ اسے علم کا گہوارہ بھی بنا دیا۔ انھوں نے محض اسلامی علوم کو ترقی نہیں دی بلکہ طبعی و سماجی علوم پر بھی بھرپور توجہ کی۔ یہاں پھوٹنے والے علم کے سوتوں سے یوروپ نے بھی اپنی پیاس بجھائی اور بالآخر وہاں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔

9.6.1 اسلامی علوم

فتح صقلیہ کے لئے بھیجی گئی فوج کے سربراہ اسد بن فرات زبردست عالم دین تھے جن کی شہرت پورے افریقہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کی محبت میں بہت سے علماء اور فضلاء ان کے ساتھ ہوگئے۔ اس طرح صقلیہ بڑا خوش نصیب تھا کہ اسے اول دن ہی سے علماء کی جماعت مل گئی جو ایامِ جنگ میں بھی تعلیم اور تصنیف وتالیف کے کام میں مصروف رہتی۔ واضح رہے کہ کبار علماء کو فوجی خدمت سے، جو دشمن کے حملے کے وقت سب کے لئے لازمی تھی، مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔

تیسری سے پانچویں صدی ہجری تک علوم قرآن میں خاص طور سے فن قرأت اور تفسیر شامل تھے۔ ان دونوں ہی موضوعات پر صقلیہ کے اہل علم نے ماہرانہ عبور حاصل کرلیا تھا۔ ہر مسجد مدرسہ کا کام بھی کرتی جہاں تشنگان علم کی پیاس بجھائی جاتی۔ علماء طلباء کو قرآن پڑھنے کا طریقہ سکھاتے اور جو علمی ترقی کی منازل طے کرنا چاہتے، انھیں تفسیر قرآن بھی پڑھائی جاتی۔ تاریخ کی کتابوں میں بہت سے کبار علماء کے نام محفوظ ہیں جنہوں نے علوم قرآن جیسے اہم موضوع پر خامہ فرسائی کی۔

فطری طور پر پہلے علماء کی توجہ صحیح احادیث کو جمع کرنے پر ہوئی۔ حدیث کی اہمیت کا اندازہ سب سے زیادہ صحابۂ کرام کو تھا۔ چناں چہ انھوں نے نہ صرف اسے اپنے سینوں میں محفوظ کیا بلکہ بعض نے اسے تحریری شکل میں بھی جمع کرنے کا اہتمام شروع کر دیا تھا۔ صقلیہ میں بھی اول دن سے علم حدیث پر زور دیا گیا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ کی فوج کے علاوہ بعض دوسرے ابتدائی حملوں میں صحابہ کرامؓ بھی موجود تھے۔ ایسے بعض حملے صقلیہ پر بھی ہوئے تھے جن میں چند صحابہ کرام کی شرکت تاریخی طور پر ثابت ہے۔ افریقہ اور صقلیہ میں دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد لوگ فطری طور پر صحابہؓ و تابعینؒ کی طرف رخ کرتے تاکہ ان کی تعلیم و تربیت سے اچھے مسلمان اور عالم بن سکیں۔ اول دن ہی سے افریقہ اور اس کے زیر اثر صقلیہ میں علم حدیث پر بہت زور دیا گیا۔ اسد بن فرات کے ساتھ آنے والے علماء میں، بہت سے ماہرین حدیث بھی تھے۔ اسی طرح جیسے جیسے صقلیہ فتح ہوتا گیا، مسلمان وہاں آکر آباد ہوتے گئے۔ آباد ہونے والوں میں علماء بھی شامل تھے جو حدیث کے ماہر اساتذہ تھے۔ حدیث کے ان اساتذہ و علماء اور ان کی تصنیفات کا تفصیلی ذکر کتب تاریخ میں ملتا ہے۔ مسلمان تیسری صدی ہجری سے ساتویں صدی ہجری تک صقلیہ میں رہے۔ ابتدائی دو صدیوں میں یعنی تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں حدیث کے موضوع پر علماء نے بہت سی معرکۃ الاراء کتابیں لکھیں۔ چوتھی صدی کا نصف آخر اور پانچویں صدی ہجری میں صقلیہ میں اسلامی علوم اپنے عروج کو پہنچ گیا تھا۔ اس عہد میں بعض بڑے پائے کا کام کیے گئے۔ اگرچہ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں مسلمانوں کے ہاتھ سے اقتدار جاتا رہا تھا اور بہت سے علماء یہاں سے ہجرت کر گئے تھے، پھر بھی یہاں حدیث اور دوسرے علوم کی تعلیم جاری رہی۔ اس دور میں بعض اہم کتابیں بھی لکھی گئیں۔

افریقہ اور اس کے زیر اثر صقلیہ میں فقہ کی تعلیم پر بڑا زور تھا۔ یہ محض اس لیے نہیں تھا کہ فتح صقلیہ کے لیے جانے والی فوج کا سپہ سالار ایک فقیہ تھا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ علم فقہ زمانے کی ضرورت تھا۔ نئی جگہیں تھیں، جہاں اسلام نیا نیا وارد ہوا تھا، اس لیے نت نئے مسائل آئے دن پیدا ہوتے رہتے تھے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں ان مسائل کا حل دریافت کرنا فقہاء کی ذمہ داری تھی۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ فقہ صرف پرسنل لا نہیں تھی بلکہ ریاست کا قانون بھی تھی اور اسی لیے اس کی تعلیم پر خاصا زور تھا۔ اچھے ماہرین قانون پیدا نہ کیے جاتے تو ریاست کا انتظام و انصرام مشکل ہو جاتا۔

اسد بن فرات جنہوں نے فتح صقلیہ کی بنیاد رکھی، وہ کوئی معمولی عالم دین نہیں تھے۔ وہ ایران میں پیدا ہوئے۔ والد فوج میں تھے۔ ایک اسلامی فوج کے ساتھ افریقہ آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اسد پانچ سال کی عمر تک قیروان میں رہے۔ اس کے بعد والد ماجد کے ساتھ تیونس چلے آئے۔ یہیں انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے مدینہ منورہ گئے اور امام مالک کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔

مدینہ کے بعد اسد عراق تشریف لے گئے جہاں انھوں نے امام ابو حنیفہ کے ارشد تلامذہ، امام ابو یوسف، امام محمد اور دوسرے علماء سے درس لیا۔ یہیں انھیں یہ اعزاز بھی ملا کہ ان کے اپنے ہی جید اساتذہ یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد نے ان سے موطا امام مالک کا درس لیا۔

عراق کے بعد اسد مصر تشریف لے گئے اور وہاں امام مالک کے مشاہیر تلامذہ سے درس لیا۔ انھوں نے خاص طور سے عبدالرحمٰن بن قاسم سے کسب فیض کیا۔ یہیں الاسدیہ، جو فقہ مالکی کی اولین کتاب ہے، کی تالیف ہوئی۔ ہوا یوں کہ اسد بن فرات عبدالرحمٰن بن قاسم سے سوال کرتے جن کے جوابات وہ فقہ مالکی کی روشنی میں لکھا دیتے۔ اور اس طرح الاسدیہ، جیسی معرکتہ الاراء تصنیف معرض وجود میں آئی۔

تو یہ تھے اسد بن فرات، صقلیہ کو دارالاسلام بنانے کے لیے فتوحات کا آغاز کرنے والی فوج کے سپہ سالار۔ ظاہر ہے ان کے تلامذہ اور دوسرے فقہاء جو ان سے عقیدت رکھتے تھے، وہ بھی ان کے ساتھ صقلیہ آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے فقہ و حدیث کی تعلیم اور تالیف و تصنیف کا جو سلسلہ شروع کیا وہ صدیوں تک قائم رہا۔

اسلامی علوم کے برعکس صقلیہ میں عقلی علوم خصوصاً فلسفہ کو فروغ حاصل نہیں ہوا۔ علم ہیئت اور ریاضی میں بعض لوگوں نے نام پیدا کیا۔ اسی طرح بعض لوگوں نے کیمیا پر بھی کتابیں لکھیں۔ لیکن چوں کہ یہ کام عراق اور اندلس میں ہونے والے کاموں سے کہیں کم تر تھے، اس لیے انھیں شہرت دوام نہیں ملی۔ صقلیہ کے مسلمانوں نے طب اور جغرافیہ کے میدان میں بہر حال قابل ذکر کام کیے جن کا تذکرہ کرنا نہایت ضروری ہے۔

9.6.2 علم طب

قرآن مجید میں تحصیل و تدریس علم کی جو اہمیت بیان کی گئی ہے، اس کا لازمی تقاضہ تھا کہ ایک بے مثال علمی تحریک جنم لیتی۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ جیسے ہی صدر اول کے مسلمان اقتدار میں آئے، انھوں نے علم کی سرپرستی اور فروغ کو اپنا فریضہ بنا لیا۔ سب سے پہلے انھوں نے جمع و تدوین قرآن کا عظیم کارنامہ انجام دیا تا کہ اللہ تعالیٰ کے بیان کے مطابق وہ قیامت تک کے لیے محفوظ ہو جائے۔ قرآن کریم کی جمع و تدوین کے ساتھ انھوں نے علم حدیث پر توجہ دی اور ایک ایسا فن دنیا کے سامنے پیش کر دیا جس کی نظیر ملنا ناممکن ہے۔ اسلامی تہذیب کا یہ وہ امتیاز ہے جو دنیا کی کسی بھی تہذیب کے دامن میں موجود نہیں ہے۔ حدیث کے بعد فقہ پر مسلمانوں کا کام لازوال ہے۔ فقہ دراصل قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی انسانی تعبیر و تشریح ہے۔

اسلامی علوم کے بعد مسلمانوں نے عقلی علوم پر توجہ کی یا ان علوم کو حاصل کرنا شروع کیا جو انسانوں نے اپنی عقل و فراست سے حاصل یا ایجاد کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے مسلمانوں نے دوسری زبانوں میں موجود علمی سرمائے کو حاصل کر کے اسے عربی زبان میں منتقل کیا۔ اندیشہ تھا کہ بہت سی کتابیں اور علوم غیر معروف زبانوں میں ہونے کی وجہ سے دنیا سے مٹ جاتے مگر عربی جیسی زندہ بین الاقوامی زبان میں ترجمہ کر کے مسلمانوں نے انھیں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جس سے انسانیت آج تک استفادہ کر رہی ہے۔

اسلامی علوم کے بعد صقلیہ کے مسلمانوں نے سب سے زیادہ علم طب پر توجہ کی۔ صقلیہ میں ابن سینا اور زہراوی جیسے ماہرین طب تو نہیں تھے لیکن عرب و یہودی اطباء نے ملک کو اچھا نظام صحت دیا۔ مسلمانوں کی حکومت ختم کرنے والے نارمنوں نے بھی ان اطباء کی سرپرستی کی جس سے صقلیہ میں اس فن کو ترقی ملتی رہی۔ مسلمان والیوں یا بادشاہوں نے بہت سے شفا خانے کھولے تھے جن سے عامۃ الناس استفادہ کرتے۔ عبدالرحمٰن الناصر (300 تا 350ھ) کے عہد میں ایک ایسا ادارہ قائم کیا گیا تھا جسے آج کی اصطلاح میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کہہ سکتے ہیں۔ اس ادارے نے ابن جلجل، ابوداؤد، اور سلیمان جیسے ماہر اطباء کی نگرانی میں طبی تحقیق کے میدان میں نمایاں کام انجام دیا۔ اس ادارے نے خاص طور سے مقامی دواؤں کا باقاعدہ مطالعہ کر کے ان کے عربی نام یا اصطلاحات ایجاد کیں۔ یونانی اور لاطینی زبانوں میں پائے جانے والے بعض نادر طبی نسخوں کی ترتیب وتہذیب کے ساتھ ان کا عربی ترجمہ بھی اسی ادارے نے کیا۔

مذکورہ ادارے کے علاوہ انفرادی طور پر بھی اطباء نے کتابیں تصنیف کیں۔ ایسا ہی ایک مصنف طبیب ابوسعید بن ابراہیم صقلی تھا۔ ریاست علی ندوی نے اپنی کتاب، تاریخ صقلیہ (جلد دوم) میں اس کی کتاب المنہج فی التداوی من صنوف الامراض و الشکاوی کا ذکر کیا ہے۔ مصنف کے اپنے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کافی قدیم کتاب ہے اگر چہ اس کا سنِ تصنیف نامعلوم ہے۔

امام مازری اور شیخ ابوبکر صقلی دوسرے اطباء ہیں جن کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ سسلی کے بعض حکماء اور اطباء کو افریقہ میں بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ دراصل صقلیہ بالعموم افریقی مسلم حکمرانوں کے زیر اثر رہا اس لیے علماء، حکماء اور اطباء صقلیہ اور افریقہ کے درمیان سفر کرتے رہتے تھے۔ ایسے بہت سے اطباء گزرے ہیں جو پیدا سسلی میں ہوئے، تعلیم وتربیت بھی یہیں پائی، لیکن خدمات افریقہ میں انجام دیں۔ اسی طرح اس کے بالکل برعکس بعض افریقی اطباء نے صقلیہ میں آکر بود و باش اختیار کی اور اپنی طبی خدمات کے ذریعے نام کمایا۔

9.6.3 علم جغرافیہ

اس میدان میں صقلیہ کے مسلمانوں کا کارنامہ قابل ستائش ہے۔ دراصل سسلی کو ہمیشہ ایک فوجی اور تجارتی بندرگاہ کا درجہ حاصل رہا۔ اس لیے سیاح یہاں کثرت سے آتے۔ ابن حوقل اور ابن جبیر جیسے عظیم سیاح بھی یہاں آئے تھے۔ یہ سیاح تفریح طبع کے لیے سیاحت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا مقصد علم کی خدمت تھا۔ یہ ملکوں ملکوں گھومتے، لوگوں کے بارے میں معلومات جمع کرتے، ان کے علوم وفنون کا پتہ لگاتے اور ان کی تہذیبی وتمدنی زندگی کا گہرائی سے مشاہدہ کرتے اور یہ سب اپنی تصنیفات میں درج کرتے۔ ان سیاحوں کے سفرنامے ایک طرح سے سماج کا آئینہ کہے جاسکتے ہیں۔

محض سیاح ہی نہیں بلکہ بعض علماء اور دانشور بھی سفر کرتے کہ اس زمانے میں بعض حقائق کی تصدیق کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ اگر کسی ملک کے حالات کے بارے لکھنا ہوتا تو اس تعلق سے کتابی علم نہ ہونے کے برابر ہوتا۔ اس لیے علماء اس ملک کا سفر کرتے، ہر چیز کا مشاہدہ کرتے اور پھر اپنی کتاب کی تصنیف کرتے۔ ہندوستان کے بارے میں اپنے شاہکار، کتاب الہند کی تصنیف کے لیے

البیرونی کو اس ملک کے بڑے حصے کا سفر کرنا پڑا۔ بیرونی ہی جیسا ایک عظیم اسکالر صقلیہ میں بھی پیدا ہوا یعنی شریف ادریسی۔ ادریسی کی علمی سرپرستی نارمن بادشاہ راجر دوم نے کی۔ وہ افریقہ کے مشہور شاہی خاندان ادریسی کا چشم و چراغ تھا۔ وہ حسنی سید تھا اور اسے سیاست سے زیادہ علم سے دلچسپی تھی۔

ادریسی 493ھ میں سبتہ میں پیدا ہوا۔ اعلیٰ تعلیم قرطبہ میں حاصل کی۔ اس نے خاص طور سے علم جغرافیہ میں مہارت حاصل کی۔ اس فن کی بعض قدیم کتابوں میں اسے تشنگی محسوس ہوئی، اس لیے اس نے سفر کر کے بچشم خود حالات و اشیاء کے مشاہدے کی ٹھانی۔ سیاحت پر اسے اس امر نے بھی ابھارا کہ وہ ادریسی شہزادوں کی باہمی سیاسی رسہ کشی سے دور رہنا چاہتا تھا۔ اس نے سیاست و حکومت کے بجائے میدان علم کی شہسواری پسند کیا اور خوب نام کمایا۔ اس کی شہرت صقلیہ کے نارمن بادشاہ راجر دوم کے دربار تک پہنچی۔ راجر جوہر شناس، علم دوست اور علماء کا قدرداں تھا۔ اس نے ادریسی کو صقلیہ آنے کی دعوت دی تا کہ اس کے علم و فضل سے فیضیاب ہو سکے۔

راجر دوم نے سب سے پہلے ادریسی سے گزارش کی کہ اس کے لیے ایک ایسا کرہ بنائے جس سے زمین کی ہیئت اور صورت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔ اس مقصد کے لیے ادریسی کو منوں چاندی فراہم کی گئی۔ ادریسی نے بعض دوسرے ماہرین کی مدد سے چاندی کو پگھلا کر آسمان کی شکل کو دکھانے کے لیے چند دائرے بنائے۔ کرہ کی شکل کے یہ دائرے طبق افلاک کی نمائندگی کر رہے تھے اور ان میں ستارے اور سیارے بھی دکھائے گئے تھے۔ دائرہ نما طبق افلاک کے ساتھ اس نے زمین کے لیے ایک دوسرا مدوّر کرہ بنایا جس میں دنیا کے بڑے شہروں، پہاڑوں، سمندروں، دریاؤں، میدانوں اور وادیوں وغیرہ کی تصاویر بنائی گئی تھیں۔ نزہتہ المشتاق کے مطابق اس کرے کا قطر 6 فٹ اور وزن ساڑھے پانچ من کے قریب تھا۔

جب راجر دوم نے یہ کرہ دیکھا تو خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے ادریسی کو انعام و اکرام سے نوازا۔ اپنی محنت کا انعام پا کر ادریسی بھی خوش تھا۔ مگر اسے اپنے وطن کی یاد آئی اور اس نے راجر سے افریقہ جانے کی اجازت مانگی۔ راجر کو اندیشہ تھا کہ ادریسی کہیں دوبارہ واپس نہ آئے لیکن وہ ایک اسکالر کو زبردستی روک بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ذہین تھا اور اس نے ایک ایسے بہانے سے ادریسی کو روک لیا جس سے اس کی دل شکنی بھی نہیں ہوئی اور راجر کا مقصد بھی پورا ہو گیا یعنی یہ کہ ادریسی صقلیہ میں ہی بود و باش اختیار کر لے۔ اس نے ادریسی کو سمجھایا کہ افریقہ کے حالات اچھے نہیں ہیں، خاص طور سے اس کے خاندان کے شہزادے باہم دست و گریباں ہیں۔ کہیں وہ خود آگ میں جھلس نہ جائے۔ بات معقول تھی اور ادریسی کے دماغ میں اتر گئی۔ اس نے صقلیہ میں اپنے مستقل رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ راجر اس کے اس فیصلے سے بے انتہا خوش ہوا اور ایسے انتظامات کر دیے کہ وہ شاہانہ زندگی بسر کر سکے۔

نقرئی کرہ بن جانے کے بعد راجر نے ادریسی سے ایک ایسی کتاب لکھنے کی گزارش کی جس کے سارے مشمولات مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہوں۔ ادریسی نے اس بڑے چیلنج کو قبول کیا۔ بعض ماہر جغرافیہ دانوں اور مصوروں کو ساتھ لیا اور مشارق و مغارب کی خاک چھان ماری۔ 15 سال تک وہ معلوم دنیا کے بیشتر حصوں کا سفر کرتا رہا۔ اس نے اشیاء و افراد کا گہرائی سے مشاہدہ کیا۔ ان سے متعلق معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ان کی تصاویر بھی بنوائیں۔ پھر ان جمع کی ہوئی معلومات اور تصاویر کی بنیاد پر ادریسی نے نزہتہ المشتاق فی اختراق الآفاق جیسی شہرہ آفاق کتاب تصنیف کی۔ یہ دنیا کی ان چند تصانیف میں سے ہے جس سے مشرق و مغرب کے تمام

ہی علماء وفضلا نے استفادہ کیا۔ صرف بعد کے عرب جغرافیہ دانوں ہی نے نہیں بلکہ یوروپ کے ماہرین نے بھی اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ بعض اہل قلم نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یوروپ کو علم جغرافیہ ادریسی نے سکھایا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب مدت دراز تک یوروپ میں پڑھی پڑھائی جاتی رہی۔ اسی لیے تمام ہی اہم یوروپی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

9.7 مسلم صقلیہ کے اثرات یوروپ پر

بعض لوگ اس رائے میں یقین رکھتے ہیں کہ یوروپ پر اسلام کے تمدنی وتہذیبی اثرات صلیبی جنگوں کے بعد پڑنا شروع ہوئے۔ اس اجمال کی تفصیل یوں بیان کی جاتی ہے کہ جب صلیبیوں نے کافی خون خرابے اور وحشت ودہشت کا ننگا ناچ ناچنے کے بعد یروشلم اور بعض دوسرے اہم شہروں وعلاقوں پر قبضہ کرلیا تو بعض تو فوراً مال غنیمت کے ساتھ یوروپ لوٹ گئے مگر اکثر یہیں رک گئے۔ یہ جو رک گئے وہ تقریباً دوسو سالوں تک مغربی ایشیاء میں رہے جس سے مسلمانوں سے ان کا میل جول بڑھا۔ اس میل جول کے نتیجے میں ان پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ ان کے مذہبی رہنماؤں کے بیانات بلکہ پروپیگنڈے کے برعکس مسلمان نہایت مہذب اور متمدن قوم ہیں۔ چناں چہ فاتح ہونے کے باوجود انھوں نے مسلمانوں سے اثر قبول کرنا شروع کردیا۔

دوسو سالوں پر محیط صلیبی جنگوں میں بالآخر عیسائیوں کو شکست ہوئی اور وہ دنیائے اسلام سے نکال باہر کیے گئے۔ مسلمانوں نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ عثمانی ترکوں کی قیادت میں یوروپ پر بھرپور وار کیا اور اس کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا۔ ایک بار تو ایسا لگا جیسے مغربی یوروپ پر بھی عثمانی ترکوں کا قبضہ ہوجائے گا۔

اس صورتحال نے عیسائی دانشوروں اور مذہبی رہنماؤں کو سوچنے پر مجبور کیا۔ سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ صلیبیوں اور منگولوں نے دنیائے اسلام کے بڑے حصے کو تاراج کردیا تھا، ایک طرح سے اسلام چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس کر رہ گیا تھا۔ مگر پھر اس کے بعد اس نے انگڑائی لی اور تقریباً آدھے یوروپ پر قبضہ کرلیا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ اس فکری کاوش سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ مسلمان علم کے میدان میں ساری دنیا سے آگے ہیں اور علم اور اقتدار سکّے کے دو پہلو ہیں یعنی جس کے پاس علم ہوتا ہے، اقتدار بھی بالآخر اسی کے پاس آتا ہے۔ چناں چہ انھوں نے علم حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ علم اس وقت مسلمانوں کے پاس تھا۔ پس وہ دوسری بار مسلم دنیا میں لوٹے مگر اس بار فوجی جارحیت کے بجائے طالبعلمانہ آئے اور مسلمانوں کی علمی ترقی سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

اس میں شک نہیں کہ صلیبی جنگوں میں بالآخر شکست کھانے کے بعد یوروپ نے بڑے پیمانے پر علم حاصل کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اس علمی روشنی سے فیضیاب ہوا جسے نشاۃ ثانیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نشاۃ ثانیہ میں بلاشبہ قاہرہ، دمشق، بغداد اور ان سے بھی کہیں زیادہ اندلس کی یونیورسٹیوں کا حصہ رہا ہے۔

لیکن یوروپی نشاۃ ثانیہ میں مسلم صقلیہ یا صقلیہ کے مسلمانوں کا بھی رول رہا ہے جسے نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اندلس اور بغداد وقاہرہ کے علمی خزانوں سے بہت پہلے نارمن عیسائی حکمرانوں نے صقلیہ کے مسلمانوں سے علم کی روشنی حاصل کرنا شروع کردیا تھا اور اس کے یوروپ پر گہرے اثرات پڑے۔ اندلس میں عیسائی بارہویں اور تیرہویں صدی میں مسلمانوں کے علمی خزانے سے متعارف

ہوئے یا اسے لائق اعتناء سمجھا جبکہ صقلیہ میں وہ دسویں اور گیارہویں صدی میں ہی اس طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ صقلیہ میں مسلم حکومت نارمنوں کی فتح کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اول اول نارمنوں نے جزیرے سے مسلمانوں کے سارے اثرات مٹانے کی کوشش کی۔ وہ اس غلط سوچ کے شکار تھے کہ صنعت وحرفت اور زراعت وتجارت سے مسلمانوں کو بے دخل کر کے ان کی جگہ عیسائی بٹھا دیے جائیں تو وہ ساری ترقیاں انھیں مل جائیں گی جو مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ لیکن انھیں بہت جلد اپنی غلطی کا اندازہ ہوگیا کہ محض صنعتوں پر مالکانہ حقوق سے ترقی نہیں ملتی بلکہ اس کے لیے صنعت وحرفت اور زراعت وتجارت کے میدانوں میں فنی مہارت حاصل کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ فنی مہارت مسلمانوں کے پاس تھی جو محض صنعتوں کے مالکانہ حقوق حاصل کر لینے سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ اس کے لیے تعلیم اور تجربہ درکار ہوتا ہے۔ پس مجبوراً نارمنوں نے مسلم دشمنی کے بجائے مسلم دوستی کی پالیسی اختیار کی اور یہ پالیسی اس وقت تک جاری رہی جب تک انھوں نے ہر میدان میں مسلمانوں جیسی فنی مہارت حاصل نہیں کر لی۔ اس کے بعد انھوں نے مسلمانوں کو جزیرہ بدر کر دیا یا انھیں غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔

صقلیہ کی مسلم تہذیب اور تمدن کا اثر صرف یوروپ کی صنعت وحرفت اور تجارت وزراعت پر ہی نہیں پڑا بلکہ ان کی فکر پر بھی پڑا۔ قانون کی برتری اور عدالت کی غیر جانبداری کا پہلا سبق انھوں نے یہیں پڑھا۔ اس وقت تک عورتوں کے بارے میں یوروپی عیسائیوں کی سوچ یہ تھی کہ وہ سرچشمہ گناہ ہیں۔ پہلی بار انھوں نے مسلمانوں سے سیکھا کہ وہ نصف انسانیت ہے اور علم وتقوی کے میدان میں وہ بھی مردوں کی طرح شہسواری کر سکتی ہے۔ الغرض یوروپ کی زندگی کے اکثر شعبوں پر مسلم صقلیہ نے اثرات مرتب کیے جن کا اعتراف غیر متعصب اہل قلم اب کھل کر کر رہے ہیں۔

9.8 زوال صقلیہ

یوں تو صقلیہ میں مسلمانوں کی موجودگی کئی صدیوں پر محیط ہے لیکن اس جزیرے پر حکومت انھوں نے تقریباً پونے تین سو سال کی۔ 212ھ میں اسد بن فرات نے بعض شہروں کو فتح کر کے پہلی اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی اور 484ھ میں جزیرے پر نارمنوں کا مکمل قبضہ ہوگیا۔

اندلس میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں جہاں مسلمانوں کی خانہ جنگیوں اور طوائف الملوک کو اولیت حاصل ہے، وہیں بعض دوسرے اسباب بھی بڑے اہم تھے۔ مثلاً اندلس کے اکثر بڑے شہر صنعتی شہر بن گئے تھے اور اس کے نتیجے میں سماج میں پیدا ہونے والے مختلف گروہوں کے مفادات کو حکمرانوں کے ذریعہ نہ سمجھ پانا اور ان کا تحفظ نہ کرنا بھی ایک بڑا سبب تھا مگر صقلیہ میں ذرا صورتحال مختلف تھی۔ یہاں بھی صنعتی ترقی ہوئی جس سے خوشحالی آئی۔ مگر اس طرح کے سماجی گروپ یہاں ابھی نہیں پیدا ہوئے تھے جو قرطبہ اور غرناطہ جیسے بڑے شہروں میں چودھویں اور پندرہویں صدی میں پیدا ہوگئے تھے۔ اس لیے طبقاتی کشمکش جیسا کوئی عامل یہاں کارفرما نہیں تھا۔

اندلس صرف چند سالوں تک والیان افریقہ کے زیر نگرانی رہا اور خاص طور سے اموی حکومت کے قیام کے بعد وہ ایک آزاد و خود مختار مملکت بن گیا تھا۔ صقلیہ اس کے برعکس ہمیشہ اغلبی و فاطمی حکمرانوں کے زیر نگرانی رہا، کچھ عرصہ کے لیے یہاں بھی اندلس جیسی

عملاً خودمختار حکومت قائم ہوئی مگر مذہبی اور فکری سطح پر وہ بھی فاطمی خلفاء کی طرف رجوع کرتی تھی۔ اس کی وجہ سے ہمیشہ صقلیہ کے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات رہی کہ انھیں افریقہ کی حمایت ہمیشہ حاصل رہے گی۔ اس سوچ نے متاخرین صقلی فرمانرواؤں میں تن آسانی اور بے فکری پیدا کردی تھی جو ظاہر ہے کسی بھی سلطنت کے لیے موت کا پیغام ہے۔

صقلیہ میں مسلمانوں کا زوال بلاشبہ طوائف الملوکی کی وجہ سے ہوا۔ پانچویں صدی ہجری میں مسلم افریقی حکومتیں کمزور ہوگئی تھیں جس کا اثر صقلیہ پر بھی پڑا۔ یہاں بھی طالع آزماؤں نے حکومت کی مرکزیت کو کمزور والیوں یا حکمرانوں کی وجہ سے چیلنج کیا اور صوبوں کی خودمختاری کا اعلان کردیا۔ اتنے ہی پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ صوبوں کے بعض بڑے شہر بھی خودمختار ہوگئے۔ ان ''خودمختاریوں'' کے پیچھے اولوالعزمی جیسے جذبے کارفرما نہیں تھے بلکہ یہ صورتحال عیش پرستی کا سامان فراواں فراہم کرنے کے لیے پیدا کی گئی تھی۔

نارمن پہلے ہی جنوبی اٹلی میں قائم چھوٹی موٹی شہری ریاستوں پر قابض ہوگئے تھے۔ وہ جزیرہ صقلیہ کے ساحلی شہروں میں بھی لوٹ مار کرتے تھے۔ مگر پورے جزیرے پر قبضہ کرنے سے ڈرتے تھے۔ کیوں کہ مسلمانوں کی فتوحات اور جرأت وشجاعت کے انھوں نے قصے سن رکھے تھے۔ مگر بتدریج انھیں پتہ چلا کہ صقلیہ میں مسلمانوں کی مرکزی حکومت کمزور پڑگئی ہے اور تقریباً ہر شہر خودمختار ہے۔ انھیں اندازہ ہوا کہ اب مسلمان پہلے کی طرح مضبوط و مستحکم نہیں رہے۔ آزمانے کی خاطر پہلے انھوں نے قریبی شہروں پر حملے کئے اور کامیاب رہے۔ ان حملوں کے دوران انھیں طالع آزما اور زرخرید منافق بھی ملنے لگے جس سے ان کے حوصلے بلند ہوگئے اور وہ پورے جزیرے پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھنے لگے۔ پھر بھی انہیں اپنے خواب کو پورا کرنے میں تقریباً نصف صدی کا عرصہ لگ گیا۔ ان کی پوری فاتحانہ مہم پر سرسری نظر ڈالی جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہوجاتی ہے کہ نارمنوں کی اپنی جرأت و بہادری سے کہیں زیادہ مسلمانوں کی خانہ جنگیوں، باہمی سازشوں، امراء کی نااہلیوں اور منافقتوں سے انھیں مدد لی۔

صقلیہ پر نارمنوں کے قبضہ سے محض ایک مسلم حکومت کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ اس کی وجہ سے عیسائی حکمرانوں کے دلوں سے مسلمانوں کا خوف جاتا رہا۔ اور وہ یروشلم اور اندلس کو فتح کرنے کا خواب دیکھنے لگے۔

9.9 خلاصہ

اس اکائی میں فتح صقلیہ کے قدرے تفصیلی ذکر کے بعد مسلمانوں کے ذریعے قائم کردہ نظام حکومت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ مسلمانوں نے صقلیہ میں اپنی موجودگی یا وہاں اسلامی حکومت قائم کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا کہ مسلمانوں نے جزیرے پر اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد اسے اپنا ملک سمجھا اور اسے اس تہذیبی وتمدنی ترقی سے ہم کنار کیا جو اندلس کے علاوہ کسی دوسرے یوروپی ملک میں نظر نہیں آتی۔ صقلیہ کی علمی ترقی پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ نقلی وعقلی دونوں علوم پر یکساں توجہ دی گئی ہے۔ اخیر میں یوروپ پر مسلم صقلیہ کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے جزیرے میں ان کے زوال کے اسباب کو اجاگر کیا گیا ہے۔

9.10 نمونے کے امتحانی سوالات

1. فتح صقلیہ کی تفصیل بیان کریں۔
2. صقلیہ میں مسلمانوں کے قائم کردہ نظام حکومت پر روشنی ڈالیں۔
3. صقلیہ میں اسلامی علوم کی ترقی پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔
4. نزہتہ المشتاق کے حوالے سے ادریسی کی قدر و منزلت پر روشنی ڈالیں۔

9.11 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. تاریخ صقلیہ سید ریاست علی ندوی

Hitti, History of the Arabs .2

بلاک:3 خاندانی حکومتیں-1

فہرست

اکائی 10 : اغالبہ،طولونیہ،اِخشید یہ

اکائی کے اجزاء

10.1 مقصد

اس اکائی میں آپ اغالبہ، طولونیہ اور اخشید یہ یعنی تین حکومتوں کے بارے میں پڑھیں گے، اس کے پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ بنو اغالبہ کی خود مختار سلطنت کیسے قائم ہوئی، افریقہ میں شورشوں اور بغاوتوں پر انہوں نے کیسے قابو پایا، جزیرۂ صقلیہ کو انھوں نے کیسے مسخر کیا، ان کے عہد میں فن تعمیر نے کتنی ترقی کی۔ اسی طرح اس اکائی کو پڑھ کر آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ طولونیوں نے اپنی حکومت کیسے قائم کی، ان کے کارنامے کیا ہیں، مالیات اور فوج کے شعبہ میں انھوں نے کیا اصلاحات کیں، اس اکائی میں آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اخشید یوں نے اپنی سلطنت کا دائرہ کہاں تک وسیع کیا، محمد اخشید اور کافور کی شخصیتیں کتنی مؤثر تھیں۔

10.2 تمہید

اس اکائی میں مختلف محاذوں پر ابراہیم بن اغلب کی خدمات اور مرکز خلافت عباسیہ سے دور افریقہ میں سلطنت اغلبیہ کے قیام کے لئے اس کی کوششوں پر گفتگو کی جائیگی۔ افریقہ کے بربر قبائل سے اغلبی حکمراں کس طرح نبرد آزما ہوئے، اور مذہبی علماء وصلحاء

سے دینی امور پر کس قسم کا رویہ اپنایا، مساجد اور دیگر عمارتوں کی تعمیر پر کتنی توجہ مبذول کی اور پھر اس سلطنت کا خاتمہ کیسے ہوا، یہ سب مسائل اس اکائی میں زیر بحث آئیں گے۔ اس کے بعد بتایا جائیگا کہ طولونیوں نے 38 سال تک مصر و شام پر اپنی حکمرانی کے دوران کیا کارہائے نمایاں انجام دئے، مصر میں شعبۂ خراج کے مالک احمد بن مدبر کی آہنی شخصیت اور خوارج اور علویوں کی شورشوں پر کس طرح قابو پایا، مختلف الانواع افواج کی کس ڈھنگ سے تربیت کی، نیز خمارویہ نے عباسیوں اور بیزنطینیوں کے ساتھ کئی معرکہ آرائیوں کے بعد وسیع حکومت کیسے قائم کی۔ اس اکائی کی آخری کڑی میں ماوراء النہر کے علاقہ فرغانہ سے تعلق رکھنے والے ترک نژاد غلام محمد اخشید کی کشور کشائی اور دوربینی پر روشنی ڈالی جائیگی۔ اس میں بتایا جائیگا کہ اخشیدیوں نے شمالی افریقہ کے عبیدی یا فاطمی حکومت کا مصر پر چڑھائی کے دوران کس طرح مقابلہ کیا، اور یہ کہ محمد اخشید نے احمد بن طولون کی پالیسی سازی اور جہانداری میں کس طرح پیروی کی، کافور اخشیدی نے حکمرانی کے فرائض انجام دینے میں کس قدر اپنا کردار ادا کیا۔

10.3 اَغالبہ

10.3.1 سلطنتِ بنو اَغالبہ کا قیام

عباسی خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں شمالی افریقہ کا علاقہ (جو موجودہ طرابلس، تیونس اور الجزائر پر مشتمل ہے اور جو اموی زمانے ہی سے ایک الگ تھلگ صوبہ چلا آ رہا تھا) نیم خود مختار ہوگیا، کیوں کہ مرکزِ خلافت سے دور ہونے کی وجہ سے اس علاقہ کا انتظام مشکل ہو رہا تھا۔ نیز 171ھ تا 172ھ/ 788ء تا 789ء میں مراکش نے ادریسوں کے ماتحت علیحدگی اختیار کر لی تھی اور ڈر تھا کہ کہیں اس کے دوسرے حصے بھی الگ ہوتے نہ چلے جائیں، تاہم باعتبارِ نظم و نسق بھی اس امر کی ضرورت تھی کہ یہاں کوئی مستحکم حکومت قائم ہو، عباسیوں کو مشرق سے تو کوئی خطرہ نہیں تھا، خراسان ان کی دعوت کا مرکز تھا، لیکن دولتِ امویہ کے خاتمے اور مغرب پر تسلط کے باوجود انہیں مصر اور افریقہ سے کوئی خاص تائید حاصل نہیں تھی، اس لئے ہارون رشید نے یہاں کی حکومت مستقل طور پر تیونس کے ایک بربر سردار اور حاکم، دولتِ اغالبہ کے بانی ابراہیم بن اغلب اور اس کی اولاد کو 184ھ/ 800ء میں موروثی طور پر سپرد کر دی۔ اس طرح افریقہ میں ایک نئی حکومت کی بنیاد پڑی جو اغالبہ یا خاندانِ اغلب کی حکومت کہلاتی ہے۔ اغلبی سُنّی خاندان کی یہ حکومت 184ھ/ 800ء سے 296ھ/ 908ء تک یعنی ایک سو سال سے زیادہ عرصے تک قائم رہی۔

اغلبی حکومت میں 11 حکمراں رہے ہیں جن کے نام یہ ہیں: ابراہیم بن اغلب، ابو العباس عبد اللہ، ابو محمد زیادۃ اللہ بن ابراہیم، ابو عقال الأغلب بن ابراہیم، ابو العباس محمد، ابو ابراہیم احمد بن محمد بن اغلب، زیادۃ اللہ دوم، ابو الغرانیق محمد بن احمد، ابو اسحاق ابراہیم بن احمد، ابو العباس عبد اللہ دوم اور زیادۃ اللہ سوم۔

10.3.2 اَغالبہ کی خودمختاری

اَغالبہ کی حکومت کے قیام کے بعد سے افریقہ کی ایک جدید تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اغلبی حکومت تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی میں تقریباً سو برس سے زائد تک اپنے داخلی و خارجی نظام سیاست میں عملاً خودمختار (Autonomus) اور آزاد حکومت تھی، صرف تخت نشینی کے بعد عباسی خلیفہ سے ضابطہ کی منظوری حاصل کی جاتی۔ تاہم اغلبی حکومت، عباسی خلافت کو تسلیم کرتی اور

ہر سال چالیس ہزار دینار کی رقم باقاعدگی سے دیا کرتی تھی، جو اس بات کا ثبوت تھا کہ حکومت عباسی خلافت کا حصہ ہے۔ اندرونی طور پر خودمختار صوبوں کے قیام کا یہ پہلا تجربہ تھا جو دولت عباسیہ نے کیا اور کامیاب رہا۔

10.3.3 اَغالبہ سے خلافتِ عباسیہ کو مالی فائدہ

اغلبی حکومت کے قیام کے پیشتر تک عباسی خلفاء کو افریقہ کی اسلامی حکومت سے کسی قسم کا کوئی مالی نفع حاصل نہ تھا، بلکہ خود اس صوبہ کو جس پر صرف مصر کی سرحد کی حفاظت کے لئے اقتدار رکھنا ضروری سمجھا جاتا تھا، خزانہ مصر سے سالانہ ایک لاکھ دینار ادا کئے جاتے تھے جن سے یہاں امن وامان قائم رکھا جاتا تھا۔ ابراہیم بن اغلب نے افریقہ کو ایک آزاد صوبہ بنانے کے لئے خلیفہ ہارون رشید سے درخواست کی اور ساتھ ہی خزانہ مصر سے افریقہ کو دی جانے والی امداد بند کرا دینے اور خود حکومتِ افریقہ سے یعنی اَغالبہ سے سالانہ چالیس ہزار دینار قبول کرنے کی درخواست کی جسے ہارون رشید نے بہ خوشی قبول کر لیا۔

10.3.4 افریقہ کی داخلی شورشیں

اغالبہ نے ہمت اور سیاسی سمجھ بوجھ کے ذریعہ افریقہ کی داخلی شورشوں اور باغیانہ حالات پر قابو پایا۔ اغلبی حکومت کی سرحدوں، افریقہ کے جنوب اور قریب قریب تمام مغربِ وسطی پر خارجیت کا تسلط تھا، اُدھر قبائل خُرد (Lesser Kabylia) کے کتامہ کی شیعیت سے وابستگی آگے چل کر اس خاندان کے زوال کا باعث بننے کو تھی، تونس اور خود قیروان بھی مخالفت کے مراکز تھے اور سب سے زیادہ شورش انگیز الجُند کے عرب تھے، جو مقامی باشندوں سے نفرت وحقارت کا برتاؤ کرتے اور ملک کے حکمرانوں کے ساتھ جھگڑتے اور معاملات میں لالچ کا مظاہرہ کرتے تھے، ابراہیم بن اغلب اول نے جہاں بربر بغاوت کے آخری فتنہ کو فرو کیا وہیں اس نے حمدیس بن عبدالرحمٰن الکندی (186ھ مطابق 802ء) اور عمران بن مخلّد (194ھ مطابق 809ء) کی بغاوتوں کو جن میں قیروانیوں کا ہاتھ تھا فرو کیا۔ اسی خطرے کے پیشِ نظر اس نے قیروان سے دو میل جنوب کی طرف القصر القدیم یا العباسیہ شہر آباد کرایا اور الجُند کے قابل اعتماد سپاہیوں اور اپنے زرخرید سیاہ فام محافظ دستوں کے ساتھ وہیں مقیم ہو گیا تھا۔

تیسرے اغلبی حکمران ابو محمد زیادۃ اللہ (201ھ مطابق 817ء تا 223ھ مطابق 838ء) کے عہد حکومت میں قیروانیوں کے تعاون سے منصور بن نصر التّنبذی کی تحریک پر ایک اور بھی زیادہ سنگین عرب بغاوت رونما ہوئی۔ باغیوں نے ماسوا قابس اور اس کے گرد وپیش کے علاقوں کے تقریباً پورے افریقہ پر قبضہ کر لیا، لیکن الجرید کے بربروں کی مدد سے زیادۃ اللہ نے اپنا اقتدار دوبارہ حاصل کر لیا۔ التّنبذی کو ہتھیار ڈالنے کے بعد قتل کر دیا گیا۔

بعض موقعوں پر علماء اور صلحاء بھی اغلبی حکومت کے لئے کچھ مشکلات پیدا کر دیتے تھے۔ علماء چاہتے تھے کہ ہر امر میں شریعت کا لحاظ رکھا جائے اور طاقت کا بے جا استعمال نہ ہو، دوسری طرف حکّام وقت کے لئے ناممکن تھا کہ امورِ حکومت میں اپنی بنائی ہوئی روش کو بنیادی طور پر بدل دیں، یوں رعایا اور حکّام کے تعلقات میں اکثر کشیدگی پیدا ہو جاتی تھی، چنانچہ پچھلی مسلم حکومتوں کے طریقہ کے برخلاف دوسرے اغلبی امیر ابو العباس عبداللہ بن ابراہیم (197ھ مطابق 812ء تا 201ھ مطابق 817ء) نے ایک مالی اصلاح نافذ کی اور وہ یہ تھی: فصلوں پر عُشر کی شکل میں خراج بالجنس کی جگہ ایک معیّنہ نقد رقم کی صورت میں لگان۔ اس اقدام کے خلاف شدید احتجاج رونما ہوا اور اس کی موت کو عذابِ الٰہی تصور کیا گیا۔

10.3.5 جزیرۂ صقلیہ کی تسخیر

اغلبی حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ جزیرۂ صقلیہ (Sicily) کی تسخیر اور بحری قوت کی ترقی ہے۔ اس دور میں نہ صرف یہ کہ جزیرۂ صقلیہ فتح کیا گیا، بلکہ جنوبی اٹلی پر مسلمانوں کا تسلط قائم ہوا اور اس پر یلغار کا راستہ بھی کھل گیا، اغلبی حکومت کا بحری بیڑہ اتنا طاقتور ہو گیا تھا کہ مغربی بحیرۂ روم (Mediterranean Sea) میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ابراہیم بن اغلب کے بعد اس کے بیٹے عبداللہ بن ابراہیم نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی، 50 سال کے مسلسل حملوں کے بعد بحیرۂ روم کا جزیرۂ صقلیہ اس کے جانشین تیسرے اغلبی حاکم زیادۃ اللہ اول کے دور میں فتح ہوا۔ اس جزیرہ پر فوج کشی کی ابتداء معاویہ بن حدیج ہی کے عہد یعنی 31ھ/ 652ء سے ہو چکی تھی۔ صقلیہ پر باضابطہ فوج کشی نویں صدی عیسوی میں اغلبیوں نے شروع کی۔ دراصل بحیرۂ روم کی سیادت کے لئے عربوں اور بازنطینیوں میں برابر کشمکش جاری تھی، جب بازنطینی سلطنت (Byzantine Empire) نے زیادۃ اللہ کے دور میں رونما ہوئی بغاوت کے دوران ساحلِ افریقہ پر تاخت و تاراج شروع کی اور سرقسطہ (Saragossa) کے ایک باغی نے بازنطینی گورنر کے خلاف سرکشی کر کے 211ھ/827ء میں اغلبیوں سے مدد مانگی تو زیادۃ اللہ اول نے 211ھ/ 827ء میں مشہور فقیہ و قاضی اور وزیر اسد بن فرات کو اس دینی اور قومی مہم پر روانہ کیا، ان کے ساتھ دس ہزار فوجیوں پر مشتمل ستّر یا سو سمندری جہاز تھے۔ اسد بن الفرات نے کئی معرکوں کے بعد یہ عظیم فتح حاصل کی، بعد ازاں وہ جزیرۂ صقلیہ کے دوسرے شہروں پر قبضہ جماتے گئے اور بازنطینی بحری طاقت کے اس عظیم مستقر کو سلطنتِ اغالبہ کا حصہ بنا لیا۔

10.3.6 فاتحِ صقلیہ قاضی اَسد بن فُرات

متعدد اسباب کی وجہ سے اغلبی حکمراں زیادۃ اللہ (223ھ-201ھ/ 838ء-817ء) نے قاضی قیروان اسد بن فرات نیشاپوری کو صقلیہ (سِسلی) کی فتح کا سالارِ اعلیٰ مقرر کیا۔ وہ امام ابوحنیفہ کے قابل شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی کے شاگرد ہونے کے علاوہ امام مالک بن انس کے بھی شاگرد تھے۔ وہ بڑے عالم اور محدّث بھی تھے، نیز وہ فقہِ مالکی کی معروف کتاب ''الأسدیۃ'' کے مصنف ہیں، غالبًا اغلبی حکمراں ان کے ذریعہ لشکر میں روحِ جہاد پھونکنا چاہتے تھے۔ ان کی فوج میں متعدد مسلم طبقات کے لوگ تھے، جیسے عرب، بربر، اقریطش (کریٹ) کے اندلسی اور کچھ ایرانی بھی۔ ان کے ساتھ سوسہ کے متعدد علماء، فقہاء اور مجاہدینِ اسلام بھی گئے تھے۔

10.3.7 قیروان اَغالبہ کا دارالحکومت

اغالبہ کا دارالحکومت شہر قیروان (قریب قدیم کارتھج / قرطاجنہ) تھا جس کی بنیاد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں مشہور اسلامی جرنیل عقبہ بن نافع الفہری نے رکھی تھی۔ قیروان کا نام دخیل ہے اس سے مراد لشکر کے پڑاؤ کی جگہ یا جنگ میں لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے۔ بہت کم مدت میں قیروان ایک مضبوط قلعہ بن گیا جہاں سے فاتحین اسلام کے لشکروں نے شمالی افریقہ کی طرف کوچ کیا۔ قیروان کی عمارتوں میں بھی اسلامی فنِ تعمیر کے بڑے دلکش تعمیری مظاہر موجود ہیں۔ اغلبی خاندان کے دورِ حکومت میں قیروان شمالی افریقہ میں علوم و فنون کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ اغلبی عہد میں قیروان کو بڑی ترقی ملی، متعدد عمارتیں بنوائی

کئیں اور دوسرے تہذیبی کارنامے انجام دئے گئے۔ اغالبہ میں زیادۃ اللہ اول اور ابراہیم نے خلیفہ ہشام اموی کے تالابوں کے برابر مزید تالاب اور حوض بنوائے، ان میں سے سب سے بڑا تالاب اغلبی کے نام سے مشہور ہے۔

10.3.8 صنعت وحرفت کی ترقی

اغالبہ کے قبضہ میں تونس، قیروان، طرابلس اور مصر جیسے جو افریقی ممالک تھے، وہاں انہوں نے مسلم تہذیب وتمدن کو خوب فروغ دیا۔ انہوں نے علوم وفنون، صنعت وحرفت اور تجارت وزراعت کی ترقی میں بڑی کوشش کی، جگہ جگہ تجارت کی منڈیاں قائم کیں، جن سے صحرائی قوموں اور سواحل کے باشندوں کے درمیان آمد ورفت کی سہولتیں فراہم ہوگئیں۔ انہوں نے نئی نئی سڑکیں نکالیں، ان میں امن وامان کا بڑا بندوبست کیا، ڈاک کے راستوں اور مقامات کی نگرانی عمائدینِ شہر کو سپرد کی، نیز ان مقامات میں خاص نگراں مقرر کئے، ان میں پیدل ہرکارے اور سوار قاصد ڈاک لے جایا کرتے تھے اور یہ ڈاک حدودِ مغرب کی ابتداء سے مملکتِ مصر کے حدود تک برابر آتی جاتی تھی، علاوہ بریں اغالبہ نے بڑی کشتیوں کا بیڑہ بھی تیار کیا جس کے ذریعہ سے بحرِ متوسط (Mediterranean Sea) پر حکومت کرتے تھے۔

10.3.9 فنِ تعمیر کو فروغ

اغالبہ فنِ تعمیر کے بڑے شائق تھے۔ انہوں نے افریقی ملکوں کو مہذب بنایا۔ جو اسلامی تمدّن شام اور عراق میں جاری تھا، وہی تمدّن انہوں نے یہاں بھی جاری کیا۔ انہوں نے قصر قدیم (عبّاسیہ) اور رقادہ دو نئے شہر آباد کئے، وہ کبھی تونس، کبھی قیروان اور کبھی طرابلس میں رہتے تھے جس سے یہ سب شہر ایسی عمارتوں سے معمور ہوگئے جن میں مادّۂ قوسین بنائی جاتی تھیں اور بڑے بڑے آراستہ وپیراستہ ستون قائم کئے جاتے تھے اور رومانی طرزِ تعمیر پر ہوتے تھے اور ایسی ندیوں پر جہاں بارش کی وجہ سے تیز رو سیلاب جاری ہوجاتے تھے، انہوں نے پُل بنوائے (اور بند بندھوائے)۔ شاہی محلات میں قصر القدیم، الرصافہ اور الرقادہ وغیرہ ہیں، اسی طرح ان کے تعمیری کارناموں میں حمام اور کارواں سرائیں جیسی دوسری عمارتیں ہیں۔

(الف) جامع القیروان

قیروان کی مشہور عالی شان بڑی مسجد جامع القیروان کی بنیاد تقریباً 59ھ/ 670ء میں عقبہ بن نافع نے ڈالی تھی اور جس میں آٹھویں صدی کے دوران دو دفعہ ترمیم وتجدید ہوئی، دراصل بنو اغلب ہی نے بنوائی تھی۔ 206ھ/ 821ء میں اس کی دوبارہ تعمیر زیادۃ اللہ دوم سے منسوب ہے، زیادۃ اللہ کے علاوہ دو اور امراء ابوابراہیم اور ابراہیم دوم نے اس میں مزید تعمیرات کیں اور اس کے ایوان کو وسیع کیا۔ اس مسجد کی تیاری میں قدیم کارتھج کے کھنڈرات سے سنگ مرمر کے ستون اور دیگر سامان حاصل کئے گئے۔ مسجد کے مینار اموی اور شامی طرز کے مربع تراش عمودی اور پتھر کے تھے۔ شمالی افریقہ میں تعمیر کا یہی طریقہ جاری رہا، مصر کے بعد کے میناروں کی طرح ان کی تراش دائری نہ تھی اور نہ وہ اینٹ سے بنائے جاتے تھے۔ اس مسجد میں محاصل (Taxes) کے اعلان کا مرکز بھی تھا، وہاں فوجی ٹریننگ بھی ہوتی تھی، درس وتدریس کے حلقے بھی ہوتے تھے، نیز سیاست کے داؤ پیچ پر بھی مباحثے ہوتے تھے۔ مسجدِ قیروان میں جہاں بڑی دلکش تعمیری مہارت کا حسن موجود تھا، وہیں یہاں سے معاشرے کی بہت سی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ اس مسجد کی وجہ سے قیروان، مکہ مدینہ اور یروشلم کے بعد اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ مقدس شہر تصور ہونے لگا۔

(ب) ابوفتیانہ مسجد

زیادۃ اللہ اغلبی (223ھ-201ھ/ 838ء-817ء) کے جانشیں ابوعقال اغلب کے عہد میں سوسہ کی ابوفتیانہ مسجد تعمیر ہوئی اور اس میں تقریباً اسی زمانہ میں مزید تعمیرات عمل میں آئیں، ابوالعباس محمد نے بڑی مسجد کے ساتھ اس کے لئے وقف قائم کیا جو اب تک موجود ہے، احاطے کی دیواریں بھی اب تک محفوظ ہیں اور یہ ابوابراہیم احمد کے زمانے میں (یعنی 249ھ-242ھ/ 863ء-856ء میں) تعمیر کی گئی تھیں۔ابوابراہیم کو افریقہ کی تعمیراتی تاریخ میں اپنے پورے خاندان میں ممتاز ترین حیثیت حاصل ہے۔اسی حکمراں نے تیونس کی جامع مسجد بھی تعمیر کرائی تھی۔

(ج) جامع زیتونہ

جامع زیتونہ تیونس کی عظیم ترین مسجد ہے، 114ھ/ 732ء میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔226ھ/ 840ء میں اغالبہ کے عہد میں اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا، پھر اس مسجد سے نظام تعلیم بھی جوڑ دیا گیا، اس طرح یہ مسجد مصر کی جامع ازہر کی طرح ایک جامع زیتونہ بن گئی۔ یہاں تاریخ وفلسفہ اور ادبی موضوعات کی تعلیم ہونے لگی۔مسجد سے ملحق بڑی لائبریری قائم کی گئی، اس لائبریری میں 40 ہزار مخطوطے تھے۔1957ء میں تیونس جب ایک اسلامی جمہوریہ بنا تو اس کے پہلے صدر حبیب بورقیبہ (صدارت 1987ء-1957ء) نے جامع زیتونہ کو ایک عصری تعلیم کے کالج میں تبدیل کردیا۔تیونس کے دوسرے صدر زین العابدین بن علی (صدارت 2011ء-1987ء) نے حبیب بورقیبہ کے خلاف بغاوت کرکے جب زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے جامع زیتونہ کو اپنی مدت صدارت میں دوبارہ اس کی سابقہ حالت پر لوٹا کر اسے اسلامی یونیورسٹی بنایا۔تاریخ میں اس یونیورسٹی کی پیدا کردہ بے شمار علمی شخصیات اور بڑے علماء کا تذکرہ ملتا ہے۔

(د) جامع کبیر اور دیگر مساجد

تونس کی جامع کبیر کی تعمیر ابوابراہیم احمد اغلبی کی طرف منسوب ہے جو قیروان کی مسجد کی طرح ایک قدیم تر مسجد کی جگہ بنائی گئی تھی، جسے اب ناکافی سمجھا جانے لگا تھا۔اغلبی دور کی دوسری مساجد میں تین دروازوں والی مسجد، مسجد سیدی صاحب اور مسجد الأنصار وغیرہ ہیں۔

(ر) اغلبی دور میں قلعوں کی تعمیر

ابوابراہیم احمد نے افریقہ میں تقریباً دس ہزار قلعے تعمیر کیے جو پتھر اور گچ سے بنائے گئے تھے اور جن میں لوہے کے دروازے نصب تھے۔ اس نے ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ نیز مغربی سرحد پر بہت سے قلعے بنوائے، جن میں سے کئی شاید بازنطینی Limes کے مستحکم مقامات تھے، جنہیں اس نے ازسرنو تعمیر کیا، سوسہ میں فصیل جو ایک کتبے کی رو سے 245ھ/ 859ء سے چلی آرہی ہے بظاہر ھدرومیتم Hadrumetum کی قدیم دیوار پر بنائی گئی تھی۔اسی طرح مہرس Mahres کے جنوب میں تونس کے ساحل پر برج ینگہ بھی جو اغلبی عہد کا ہے ایک بازنطینی قلعہ تھا جس کی بنیادوں پر مسلم معماروں نے نئی عمارت کھڑی کردی۔

(ز) اغلبی فنِ تعمیر میں عیسائی اور اسلامی فنون کی آمیزش

عمارتوں کی ساخت اور آرائش پر اگرچہ عیسائی افریقہ کی موروثی روایات کا خاصا اثر ہوا، تاہم اغلبی فن تعمیر نے شام اور عراق جیسے مشرقی مآخذ سے بھی استفادہ کیا ہے جس سے ایک نیا اور مخصوص اسلامی فن تعمیر ظہور میں آیا اور اس کا نمونہ القیروان کی جامع کبیر ہے۔

10.3.10 علمی اور مذہبی زندگی

اغالبہ کے دور میں قیروان اسلامی مذہبی زندگی اور علم وادب کا ایک بڑا مرکز تھا، وہاں حنفی اور مالکی مسالک کی نمائندگی یکساں طور پر بخوبی کی جاتی تھی، لیکن امام شافعی کی فقہ رائج نہیں ہوئی مخصوص طور پر اغالبہ کے ماتحت قیروان مالکی دبستان (School) کا مضبوط ترین مرکز بن گیا۔ اس زمانے کی بعض ممتاز ترین فقہی شخصیتیں جن کی تصانیف کم وبیش باقی رہ گئی ہیں حسب ذیل ہیں: الأسدیۃ کے مصنف قاضی اسد بن الفرات (م 213ھ/ 828ء)، المدوّنۃ (فقہ مالکی کی ضخیم تلخیص) کے مصنف سحنون (م 240ھ/ 854ء)، یوسف بن یحییٰ (م 288ھ/ 901ء)، ابوزکریا یحیی بن عمر الکنانی (م 289ھ/ 902ء)، عیسی بن مسکین (م 295ھ/ 908ء) اور ابوعثمان سعید بن محمد ابن الحدّاد (م 302ھ/ 915ء)۔

اغلبی دورِ حکومت میں صقلیہ میں بعض اہم فقہی تصانیف ترتیب دی گئیں، ان میں سے ایک اہم کتاب امام یحییٰ بن عمر الکنانی کی تھی جو صقلیہ اور شمالی افریقہ دونوں جگہ مقبول تھی۔ امام سحنون کے ایک اہم شاگرد دعانہ بن محمد (وفات 298ھ/ 910ء) اغلبی دور میں صقلیہ کے قاضی القضاۃ رہے تھے۔

علمِ کلام کے میدان میں بھی اغالبہ کے عہد میں قیروان متعدد آراء وخیالات کا مرکزِ اجتماع تھا، راسخ العقیدۃ لوگوں، جبریہ، مرجئہ، معتزلہ اور آخر میں اِباضیہ کے درمیان زوردار اور بعض وقت پُرتشدد بحث ومباحثے ہوا کرتے تھے۔ اسد بن فرات کے برخلاف سلیمان بن القرّاء مؤمنوں کی رؤیت باری تعالی کا منکر تھا، اسی طرح قاضی سحنون کے بالمقابل ان کے پیشرو عبداللہ بن ابی الجواد کی رائے تھی کہ قرآن مخلوق ہے، اس آخری عقیدے کے بارے میں اغالبہ کی مذہبی روش خلفاء بغداد کی روش کے تابع تھی۔

10.3.11 رفاہی خدمات

افریقہ کے ان عرب حکمرانوں کو تدبیر اور جہاں بانی سے خاصا بہرہ ملا تھا۔ انہوں نے رفاہ عامہ کو ترقی دی، تہذیب وتمدن کے نشو ونما میں حصہ لیا۔ ریاست کی آمدنی کو اس قدر قابلیت اور توازن سے خرچ کیا کہ ان کے زیر اقتدار شمالی افریقہ میں علوم وفنون کو تحریک ملی، ملک میں خوش حالی اور فارغ البالی کی لہر دوڑ گئی اور اس طرح وہاں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ چنانچہ اس نشأۃِ ثانیہ کے آثار آج بھی جگہ جگہ موجود ہیں اور اغالبہ کی شان وشوکت اور بلند نظری کی چغلی کھا رہے ہیں۔ اس خاندان نے عرب اور بربر کے اخلاق اور دین کو متحد کر کے نکاح کے ذریعہ دونوں کے خون کو باہم مخلوط کر دیا اور غیرت کی وجہ سے ان میں جو بغض وحسد اور نفرت تھی، وہ سب جاتی رہی، شام اور عراق کے اسلامی تمدن کو افریقی علاقوں میں بھی جاری کیا۔

10.3.12 افریقہ میں عربی زبان کا فروغ

اغلبیوں کے زمانے میں افریقہ کی زبان بجائے لاطینی کے عربی قرار پائی اور اس کے باشندوں کا مذہب بجائے عیسائیت، اسلام بن گیا۔ سنٹ آگسٹائن (St. Augustine) اور دوسرے لاطینی تہذیب وتمدّن کے شمالی افریقی بانیوں کی تمام کوششیں یک لخت بیکار ہوگئیں۔

10.3.13 سلطنتِ اَغالبہ کا زوال

اگر چہ اغلبی حکومت میں اضمحلال اس کے نویں فرماں روا ابراہیم بن احمد کے آخری دورِ حکومت سے شروع ہو چکا تھا، وہ اس طور پر کہ اس نے 28 سال فرماں روائی کی، وہ اپنی تخت نشینی کے ابتدائی عرصہ میں ایک بہترین فرماں روا ثابت ہوا۔ اس کے عہد حکومت کے چھ سات سال گذرے تھے کہ وہ ذہنی خلل اور دماغی عدمِ توازن کا شکار ہوگیا، اس مرض سے اس کے تمام اوصاف حمیدہ عادات رذیلہ میں تبدیل ہوگئے، عمّال کو بار بار عزل ونصب کرنے لگا، ذرا ذرا سی بات پر قتل کے واردات سرزد ہونے لگے، اس کے طویل دورِ مظالم کے نتائج وعواقب کے طور پر سرزمین افریقہ میں دعوت اسماعیلی پورے طور پر بارآور ہوگئی۔ بہرحال ابراہیم کی ذات جہاں صقلیہ (Sicily) میں فتوحات اسلامی کی تکمیل کا باعث بنی، وہیں صرف اسی کی شخصیت دولتِ اغالبہ کے زوال کا موجب بنی۔

تاہم دسویں فرماں روا ابوالعباس عبداللہ دوم (291ھ-290ھ/903ء-902ء) نے اپنی چند روزہ حکومت میں حالات بہت کچھ درست کر لئے تھے اور یہ توقع پیدا ہوئی تھی کہ حکومت اغلبیہ کی متزلزل بنیاد کچھ دنوں کے لئے سنبھل جائے اور شاید وہ دعوتِ اسماعیلی کے استیصال میں کامیاب ہوجائے کہ اچانک خاندانِ اغالبہ کے گیارہویں اور آخری حکمراں اس کے ناخلف لڑکے ابومضر زیادۃ اللہ سوم (207ھ-291ھ/909ء-903ء) نے اپنے باپ ابوالعباس کو قتل کرواکے دولت اغلبیہ کے زوال میں آخری کیل ٹھونک دی اور اس نے برسرِ اقتدار آتے ہی کشت وخون کا بازار گرم کردیا۔ اس نے اپنی شخصی حکومت کے استحکام اور اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے پہلے خود اپنے عزیز واقارب کو پھر حکومت کے دوسرے عہدیداروں کو تہہ تیغ کیا، جس سے دولتِ اغالبہ کے خلاف ملک میں بددلی پیدا ہوگئی۔ افریقہ کے اعیان وعلماء ابراہیم بن احمد کے وقت ہی سے نظام حکومت سے رفتہ رفتہ علیحدہ ہوگئے تھے۔

10.3.14 سلطنتِ اَغالبہ کا خاتمہ

دوسری طرف افریقہ میں دعوتِ اسماعیلی کی بنیادیں قدرۃً مضبوط ہوگئیں۔ دعوتِ اسماعیلی کے سرخیل اور داعی ابوعبداللہ الشیعی نے اپنی کامیابی کے توقعات دیکھ کر فرقۂ اسماعیلی شیعی کے امام فاطمی خلیفہ ابوعبیداللہ المہدی کو افریقہ بلا بھیجا، اکثر مقامات کتامہ بربروں کی مدد سے جنہیں اس نے شیعہ مذہب کا حلقہ بگوش بنالیا تھا، بلا مزاحمت اسماعیلیوں کے قبضے میں آگئے، اغالبہ کا لشکر ابراہیم بن ابی الأغلب کی سرکردگی میں مقابلہ کر رہا تھا۔ 24 جمادی الأخری 296ھ/ 908ء کو ایک معرکۃ الآراء جنگ میں ابراہیم کو شکست ہوئی اور یہی اغالبہ کی حکمرانی کا سب سے آخری میدان ثابت ہوا۔ ابومضر زیادۃ اللہ ثالث اس شکست سے حواس باختہ ہوگیا، اس نے حکومت کی فوج کے چیدہ قائدین اور بہی خواہوں کے لاکھ روکنے کے باوجود تخت وتاج چھوڑ کر فرار ہوجانے کا قصد کرلیا۔ چنانچہ 26 جمادی الأخری 296ھ/ 908ء کو اغالبہ کا یہ آخری تاجدار قصر شاہی سے جس قدر دولت وثروت کا انبار ساتھ لے جا سکتا

تھا، اونٹوں پر لاد کر اور اپنے تمام اہل وعیال اور عزیز واقارب کو دشمنوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر رقّادہ سے براہِ طرابلس، مصر فرار ہوا، آخر اثنائے سفر میں رملہ (فلسطین) پہنچ کر فوت ہوگیا۔

اسی کے ساتھ دولتِ اغالبہ کا آفتابِ اقبال 26 جمادی الآخری 296ھ/ 908ء کو ایک سو گیارہ سال اور تین مہینے (یا ایک سو نو سال) کے بعد سرزمین افریقہ سے ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

10.3.15 صقلیہ سے اَغالبہ کا خاتمہ

افریقہ میں ابوعبداللہ کی زیرِ قیادت اغلبی حکومت کے خاتمہ اور دولتِ فاطمی کے قیام کے بعد صقلیہ کا آخری اغلبی والی (گورنر) احمد بن حسین بن رباح پندرہ دن تک اپنی جگہ پر برقرار رہا، اس کے بعد صقلیہ میں از خود دولتِ فاطمیہ کا استقبال کیا گیا اور 11 رجب 296ھ/ 908ء سے صقلیہ میں بھی نئی فاطمی حکومت قائم ہوگئی۔

معلومات کی جانچ

1. اغلبی حکومت میں کتنے حکمراں رہے ہیں اور ان کے نام کیا ہیں؟
2. جامع القیروان کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

10.4 طولونیہ

طولونیہ یا بنوطولون، یہ نام مصر کے خودمختار والیوں اور حکمرانوں کے سب سے پہلے خاندان کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس خاندان نے 254ھ/ 868ء سے 292ھ/ 905ء تک یعنی صرف 38 سال مصر میں حکومت کی۔ بنی طولون اگرچہ خودمختار تھے اور مصر کا صوبہ گویا 254ھ/ 868ء میں خلافتِ عباسیہ سے جدا ہو چکا تھا، مگر مصر میں خطبہ خلیفۂ بغداد کے نام کا پڑھا جاتا تھا۔ بنی طولون نے ملک شام کو بھی اپنی حکومت میں شامل کرلیا تھا۔ اس طرح شام ومصر میں ایک ایسی سلطنت قائم ہوگئی تھی جو اگرچہ اپنے آپ کو خلیفۂ بغداد کی فرماں بردار بتاتی تھی، مگر دربار بغداد کو شام ومصر کی حکومت سے بے تعلق کردیا تھا۔ اس کا رقبۂ حکومت بدستور دولتِ عباسیہ کا ماتحت علاقہ ہوگیا، اس میں کل پانچ فرماں روا ہوئے: احمد بن طولون، خمارویہ بن احمد بن طولون، جیش (یا جیش) بن خمارویہ، ہارون بن خمارویہ اور شیبان بن احمد بن طولون۔ ان کی حکومت عباسی سالار محمد بن سلیمان کے ہاتھوں ختم ہوئی۔

10.4.1 احمد بن طولون: بانی سلطنتِ طولونیہ

سلطنتِ طولونیہ کا بانی احمد بن طولون ایک ترکی غلام زادہ تھا۔ 200ھ/ 815ء میں ماوراء النہر کے علاقہ فرغانہ (بخارا) کے ایک ترک عامل نوح بن اسد سامانی نے احمد کے والد طولون کو مامون کی خدمت میں بطور تحفہ بھیجا تھا، 220ھ/ 835ء میں سامرّا میں اس کو احمد نامی ایک لڑکا پیدا ہوا۔ احمد کی تعلیم وتربیت بغداد میں نہایت اعلیٰ پیمانہ پر شاہی گھرانے میں ہوئی، وہ فطرتاً صالح تھا، اس کو بارگاہِ خلافت میں اتنا اعتماد ورسوخ حاصل تھا کہ پوشیدہ امور بھی اس سے نہ چھپائے جاتے تھے۔ وہ علم وادب اور فنونِ لطیفہ (Fine Arts) کا بڑا قدرداں اور مربی تھا۔

احمد مستعین کے قتل کے بعد معتز کے عہد میں ترکی سپہ سالار اور جاگیر دارِ مصر باکباک / بابکیاں کے نائب کی حیثیت سے 23 رمضان 254ھ/ 15 ستمبر 868ء کو فوج کے ساتھ مصر کے پایۂ تخت فسطاط میں داخل ہوا۔ اس وقت اسکندریہ (مصر) میں اسحاق بن دینار اور برقہ (لیبیا) میں احمد بن عیسی صعیدی بہ حیثیت والی (گورنر) متمکن تھے، جب کہ بکار بن قتیبہ منصب قضاء پر فائز تھا، شقیر خادم محکمۂ ڈاک اور احمد بن مدبر شعبۂ خراج کے مالک تھے۔ اس لئے ابن طولون کو اس وقت پورے مصر کی ولایت (Viceroyalty) حاصل نہیں تھی بلکہ بابکیال کے نائب ہونے کی وجہ سے اس کی سلطنت محدود تھی، لیکن اس کے منصوبے بلند اور دوررس تھے۔

مصر میں قدم قدم پر اس کے سامنے رکاوٹیں تھیں، ایک طرف احمد بن مدبر مصر اور دارالخلافہ بغداد میں مستقل چیلنج تھا تو دوسری طرف مصر میں خوارج اور علویوں نے شورش برپا کر رکھی تھی جس کی وجہ سے مصر کی معیشت اور امن داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ اسی عرصہ میں باکباک کا قتل ہوگیا، مصر کی تولیت بارجوخ کو سونپی گئی، اس نے ابن طولون کو رشتۂ مصاہرت کی وجہ سے پورے مصر کا والی (گورنر) بنادیا، خلیفہ مہتدی کے زمانے میں اسکندریہ (مصر) اور برقہ (لیبیا) بھی ابن طولون کے زیرنگیں ہوگیا، اضلاع کے حکام نے اس کی اطاعت قبول کرلی، ٹیکس میں اضافہ اور اس کی وصولی میں جبر و تشدد کی وجہ سے ابن مدبر مصری عوام کے درمیان ناپسندیدہ شخص بن چکا تھا۔ اس نے معتمد کے حکم سے 257ھ/ 871ء میں مصر کے بجائے دمشق، فلسطین اور اردن میں شعبۂ خراج کی ذمہ داری قبول کی اور مصر کے شعبۂ خراج کو خلیفہ معتمد نے ابن طولون کے حوالہ کردیا۔ رفتہ رفتہ ابن طولون نے محکمۂ ڈاک کو بھی اپنے تابع کرلیا، تاکہ ضرورت بھر ہی دارالخلافہ بغداد تک مصر کی خبروں کی ترسیل عمل میں آئے۔

10.4.2 احمد ابن طولون کو شام کی تولیت سپُرد

ایک طرف شام کے ساحل پر رومی حملے کرتے رہتے تھے، عباسی خلیفہ معتمد میں مدافعت کی قوت نہ تھی اور دوسری طرف مصر، اسکندریہ اور برقہ کی ولایت (Viceroyalty) کے بعد ابن طولون نے حکومت کے ہر شعبہ کو بڑی ترقی دی، یہ دیکھ کر معتمد نے 264ھ/ 877ء میں عیسی بن شیخ والئ شام کی بغاوت فرو ہونے کے بعد شام اور اس کی سرحدوں کی حفاظت و ولایت ابن طولون کے متعلق کردی۔ اس طرح احمد بن طولون دس سال کے اندر اندر مصر اسکندریہ اور برقہ اور شام کی وسیع ولایت (Viceroyalty) کا خود مختار حاکم ہوگیا اور عملاً خلیفہ کی اطاعت ترک کردی۔ ابن طولون اسلامی عہد کا پہلا حکمراں تھا جس نے مصر میں بابانگ دہل ایک خود مختار حکومت کی بنا ڈالی اور اپنے بعد آنے والوں کے لئے نمونہ چھوڑا۔ اس نے القطائع شہر آباد کیا اور جامع مسجد بنائی، نیز اس نے اندرونی شورشوں پر قابو پایا اور امن بحال کیا۔

احمد ابن طولون نے احمد بن محمد واسطی کو اپنا کاتبِ خاص یعنی پرائیوٹ سکریٹری بنایا۔ وہ احمد واسطی سے حکومت کے نظم وضبط میں مشورہ لیا کرتا تھا، نیز واسطی وزیرِ اعظم کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ احمد واسطی نے ابن طولون کے مشورہ سے سامرّہ میں جعفر بن عبدالغفار کو کاتب یعنی فارن سکریٹری کے عہدہ پر سرفراز کیا۔

10.4.3 موفق اور ابنِ طولون کی محاذ آرائی

ابنِ طولون نے تعمیری ترقیوں کے ساتھ حکومت کے ہر شعبہ کو ترقی دے کر دولتِ طولونیہ کو اس عہد کی مہذب ترین حکومتوں کے پہلو بہ پہلو کھڑا کر دیا۔ ابن طولون کا یہ عروج دولتِ عباسیہ کے مختار کل خلیفہ معتمد کے بھائی ابو احمد موفق کی نظروں میں بھی کھٹکتا تھا، اس لئے اس نے اسے موسی بن بغا کے ذریعہ گرانے کی تدبیریں شروع کر دیں اور 263ھ/ 877ء میں اس کے ذریعہ ابن طولون کو مصر سے ہٹا کر اس کی جگہ والی دمشق اناجور کو بھیجنے کا حکم دیا، لیکن اناجور کو ابن طولون کے مقابلہ میں جانے کی ہمت نہ ہوئی، موسی بن بغا مصر کی طرف بڑھا، رقہ میں اپنی فوج کے ساتھ ایک ماہ مقیم رہا، لیکن اسے مقابلہ کی ہمت نہ ہوئی، اسی شش و پنج میں وہ انتقال کر گیا اور فوج واپس ہوگئی۔

اسی زمانے میں والئ دمشق اناجور کی 264ھ/ 878ء میں موت کے بعد ابن طولون نے اس کے لڑکے علی کو دمشق میں اپنی میزبانی کے لئے تیار کیا، 264ھ/ 878ء میں دمشق میں اناجور کے نائب محمد بن ابو رافع اور لڑکے علی بن اناجور دونوں نے اس کی بڑی مدارات کی اور خود رملہ (فلسطین) اور دمشق اس کے حوالہ کر دیا۔ ابن طولون نے رملہ میں محمد بن رافع کو قائم رکھا اور دمشق میں احمد دوغیاش کو اپنا قائم مقام بنا کر حمص کی طرف روانہ ہوگیا، یہاں کے عامل نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی، البتہ انطاکیہ (شام کا سرحدی علاقہ) کے حاکم سیما طویل نے اس کی سیادت سے انکار کیا، ابن طولون نے 265ھ/ 879ء میں اس کو قتل کر کے اس کا کل مال ضبط کر لیا اور پھر طرطوس والوں نے بھی مقابلہ کیا، ابن طولون یہاں طخشش بن بلبیر کو اپنا قائم مقام بنا دیا اور احمد بن محمد واسطی کے بتوسط اپنے لڑکے عباس کی مصر میں بغاوت کی خبر سن کر فسطاط لوٹ گیا۔

10.4.4 خلیفہ معتمد کا ابن طولون کے دامن میں پناہ طلبی

خلیفہ معتمد 23 سال تک تختِ حکومت پر رہا، لیکن چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی وہ دخل دینے کا مجاز نہ تھا، اس کا بھائی موفق دولتِ عباسیہ کا مختارِ کل تھا۔ یعقوب بن لیث صفار سے معتمد کو نفرت اور ابن طولون سے الفت تھی۔ لیکن موفق کو اس کے برعکس صفار سے قربت اور ابن طولون سے عداوت تھی۔ ابن طولون دولتِ عباسیہ کا مرکز، مصر کو بنانے کا آرزومند تھا، جب خلیفہ معتمد نے موفق کے خلاف ابن طولون کے دامن میں بذاتِ خود پناہ لینے کی بذریعہ خط خواہش ظاہر کی تو اس نے حامی بھر لی اور طرطوس جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ معتمد شکار کے بہانہ سے مصر روانہ ہوا تو اسحاق بن کنداج نے موفق کی درخواست پر معتمد کو سمجھا بجھا کر حدیثیہ سے سامراء (بغداد) واپس کر دیا اور اسے ابن طولون سے نہ ملنے دیا۔ اس واقعہ کے بعد ابن طولون نے موفق کے خلاف یہ کہہ کر اعلان جہاد کر دیا کہ ''موفق نے معتمد کی بیعت توڑ دی ہے''۔ یہ سن کر اہلِ مصر موفق کے خلاف ہوگئے، دمشق کے سرحدی علاقے میں ابن طولون نے سب سے اعلانِ جہاد پر دستخط لئے، طرطوس میں مازیار خادم نے ابنِ طولون کی حسب سابق مخالفت کی۔ ابن طولون نے اس کے مقابلے کے لئے طرطوس کا رخ کیا، مازیار نے اس کو روکنے کے لئے نہر بردان کا باندھ کھول دیا جس سے ابن طولون کی پوری فوج پانی میں پھنس گئی۔

10.4.5 احمد ابن طولون کی موت

طرطوس کی اس مہم کے بعد ابن طولون کو مصیصہ (شام کا سرحدی علاقہ) لوٹ آنا پڑا، یہاں وہ آ کر بیمار پڑ گیا اور چند دن کے بعد یعنی 20 ذیقعدہ 270ھ/ 883ء کو انتقال کر گیا۔ ابن طولون کی موت کے بعد موفق اور خمارویہ بن احمد بن طولون میں مزاحمت جاری رہی، لیکن 273ھ/ 886ء میں فوجی افسروں نے خمارویہ اور موفق میں صلح کرا دی۔ موفق نے 30 سال کے لئے خمارویہ اور اس کی اولاد کے نام مصر و شام کی حکومت کا قبالہ لکھ دیا اور خمارویہ نے اس کے نام کا خطبہ جاری کر دیا۔

10.4.6 طولونیوں کے کارنامے

احمد ابن طولون نے حکومت کے ہر شعبہ کو بڑی ترقی دی، اس کثرت سے غلام، عام سپاہی اور آلات و اسلحہ جمع کئے کہ دارالامارہ کی وسعت ان کے لئے ناکافی ثابت ہوئی۔

(الف) شہر القطائع

احمد ابن طولون نے مصر کے شہر فسطاط اور العسکر (فوجی چھاؤنی) کی تنگ دامنی کے پیشِ نظر سامرّہ جہاں اس کی پرورش و پرداخت ہوئی تھی، کے فاخرانہ طرز پر نیا خوبصورت شہر القطائع بسایا جس کا ایک سرا فسطاط سے ملتا تھا۔ اس میں ہر قوم، ہر مذہب، ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے محلے الگ الگ اور عطّار، بزّار، بقّال اور جملہ پیشہ وروں کے بازار جدا جدا تھے۔ شہر میں متعدد وسیع صاف ستھری سڑکیں اور گلیاں تھیں، جا بجا خوبصورت مساجد اور حمام تھے۔ قدیم القطائع شہر، قاہرہ کی موجودہ بستیوں سیدہ زینب، القلعہ، الدرب الأحمر اور الحلمیۃ میں سمایا ہوا ہے۔ العسکر شہر صالح بن علی عباسی نے 133ھ/ 751ء میں بسایا تھا۔ القطائع کے بسنے والے ابن طولون کے پیروکار، فوجی اور حاشیہ بردار تھے۔ ابن طولون نے اپنے لئے ایک کشادہ محل تعمیر کیا اور اس کے سامنے وسیع و عریض میدان بھی چھوڑا، پھر اس محل کے اردگرد اس کے امراء، قائدین، غلام اور اس کے دیگر پیروکاروں نے اپنے اپنے گھر بنائے، ان میں ہر ایک نے اپنے لئے ایک قطعہ اراضی مختص کر لیا، اسی لئے شہر کا نام القطائع رکھ دیا گیا۔ اس شہر میں احمد بن طولون نے ایک تیسری جامع مسجد بھی تعمیر کی۔

ابن طولون نے فوجی حکمت عملی اور القطائع کے جدید شہر کی ضروریات کے تحت سررشتۂ تعمیرات کو بھی ترقی دی، چنانچہ ساٹھ ہزار دینار کے صرفہ سے ایک عمدہ شفاخانہ تعمیر کیا گیا۔ خلافت کے خلاف غیر شیعہ مصریوں اور شامیوں کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے 270ھ/ 884ء میں حضرت امیر معاویہؓ کے مقبرے کی مرمت اور اس کے اوقاف کی بحالی کا کام بھی طولونیوں نے کیا۔ قاہرہ کے محلّہ القلعہ کے موجودہ میدان میں ابن طولون کا چالیس دروازوں پر مشتمل محل نہایت وسیع اور خوبصورت تھا جس کا وجود اب باقی نہ رہا۔ شہر سے متعلق ایک وسیع تفریح گاہ تھی۔ زراعت کو فروغ دینے کی خاطر آبپاشی کی طرف خاص توجہ کی۔

(ب) جامع ابن طولون

جامع عمرو بن العاص میں وسیع فوجی چھاؤنی کے سپاہیوں کا جم غفیر نہیں سما سکتا تھا اس لئے ابن طولون نے بارہ ہزار دینار کے صرفہ سے سامرا کی مساجد کے طرز پر ایک عظیم الشان جامع مسجد بنوائی۔ آج بھی جامع احمد بن طولون کو قاہرہ کی تمام مساجد کے درمیان فوقیت حاصل ہے، مملوکی عہد میں بعض اضافوں کے باوجود یہ قدیم ترین مسجد مکمل طور پر اپنی اصلی حالت میں قابل دید ہے۔ جب کہ جامع عمرو بن العاص میں متواتر توسیعی وتجدیدی عمل کی وجہ سے اس کے اصلی نقوش مکمل طور پر مٹ چکے ہیں۔ احمد بن طولون نے یہ مسجد 265ھ-263ھ/ 879ء-877ء تک عرصے میں ایک قبطی انجینئر سعید بن کاتب فرغانی کے بدست بنوائی تھی۔ ابن طولون نے اس سے کہا تھا کہ ''میں ایک ایسی مسجد بنانا چاہتا ہوں کہ مصر اگر نذرِ آتش یا غرقِ آب بھی ہوجائے تو بھی اس پر کوئی آنچ نہ آنے پائے''۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، موسیٰ ہارون کے آخری عہد میں دولتِ عباسیہ نے مصر پر چڑھائی کی تو القطائع کو زمیں بوس کردیا اور مسجد ہذا کے علاوہ کچھ بھی باقی نہ رکھا۔

(ج) بحری بیڑوں کا قیام

ابن طولون نے ایک لشکر تیار کرنے کے علاوہ بحری بیڑے کو بھی مضبوط کرنے کی طرف توجہ دی۔ جگہ جگہ بحری اڈے اور استحکامات بنائے تاکہ شام پر بھی اس کا تسلط قائم رہ سکے۔ اس نے عکّہ میں بھی ایک بحری مرکز قائم کیا۔ اس کے جانشینوں نے بھی بحری بیڑے کو قائم رکھا، لیکن طرطوس کی بحری افواج (Navy) نے اسے تنّیس کے مقام پر تباہ کردیا جو دُمیانہ کے زیر قیادت محمد بن سلمان کی مہم کے ساتھ آئی تھیں۔

(د) محکمہ عدل کا قیام

عباسی خلیفہ کے دربار کے طرز پر ابن طولون کے یہاں بھی محکمۂ عدل وانصاف قائم کیا گیا، چنانچہ طولونی حکمراں خود بنفس نفیس مظالم کی شکایات کھلی عدالت میں سنا کرتا تھا، عیسائیوں اور یہودیوں سے کسی قسم کا کوئی تعرض نہیں ہوتا تھا اور ابن طولون کے میلانِ طبع کے بموجب مقامی مصری عہدے دار نظام مملکت میں زیادہ بھرتی کئے جاتے تھے۔

10.4.7 طولونی سلطنت کی مالی اصلاحات

احمد بن طولون نے مصر کی مالیات میں اصلاحات کیں۔ خراج کی کل آمدنی جو اس کے پیش روؤں کے زمانے میں آٹھ لاکھ دینار سالانہ تھی، احمد کے عہد آخر میں تینتالیس لاکھ دینار تک بڑھ گئی، زراعت صنعت اور تجارت جیسے پیداواری میدانوں میں آمدنی دوگنی ہوگئی اور مرتے وقت جو جمع کردہ دولت اس نے چھوڑی اس کی مجموعی مقدار ایک کروڑ دینار تھی۔ خراج کی آمدنی کے علاوہ (جس میں وہ زرِ لگان بھی شامل تھا جو امراء اپنی جاگیروں کے عوض ادا کیا کرتے تھے) خزانے میں وہ سالانہ زرِ لگان بھی داخل ہوا کرتا تھا جو شاہی اَملاک کے عوض وصول ہوکر مصر کے جاگیردار کے نام پر جمع اور خرچ ہوتا تھا، اس وقت کا جاگیردار جعفر المفوّض، خلیفہ معتمد کا بیٹا اور ولی عہد (Crown Prince) تھا، الغرض ابن طولون کے عہد میں ملک پر کوئی زائد بوجھ ڈالے بغیر ہی آمدنی کی

ترقی کے ساتھ ساتھ تمام خرابیوں کی اصلاح ہوئی۔ ناجائز محصولات منسوخ کردیے گئے اور امراء وافسرانِ مال پر کڑی نگرانی قائم ہوئی، پہلے جو رقم بغداد چلا جاتا تھا اب اسی ملک میں خرچ ہونے لگا۔

خمارویہ کے زمانے میں اس کے بے پناہ اخراجات کی وجہ سے غالباً مالی انتظام میں انحطاط شروع ہوگیا۔ وہ اپنے امراء سے بھی نرمی اور مصالحت سے پیش آتا تھا جس سے انہیں اپنی اپنی جاگیروں (اِقطاعات) کے انتظام میں کھلی چھوٹ مل گئی تھی۔ احمد بن محمد الواسطی جو احمد کا مالی معاملات میں دستِ راست تھا، کی موت اور مرکزی حکومت کی درحقیقت امیروں کے ہاتھ میں منتقلی نے بھی شاید مالی نظام پر بُرا اثر ڈالا ہو، خمارویہ کی وفات کے وقت خزانہ بالکل خالی تھا۔ نیا حکمراں ہارون (وفات بعمر 22 برس) محض بچہ تھا، اس لئے حکومت کی باگ ڈور ابوجعفر بن اَبالی کے ہاتھ میں تھی جس کے ماتحت دولتِ طولونیہ کی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔

10.4.8 طولونی سلطنت کی فوج

طولونیوں کی طاقت اور خودمختاری کا انحصار زیادہ تر ان کی جمع کردہ فوج پر ہی تھا۔ ان کی فوج میں 24 ہزار ترکی غلام، 40 ہزار سوڈانی غلام اور 7 ہزار پیشہ ور یونانی سپاہی بھی شامل تھے۔ اس طرح ان کے ماتحت باضابطہ فوج کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ مقامی فوجیوں کو شامل کرتے ہوئے اس فوج کی کل تعداد کوئی ایک لاکھ کے قریب تھی، باقاعدہ افواج میں نظم وضبط بے حد سخت تھا۔ فوجی کوتوال قائم رکھتے تھے۔ غالباً ہر پلٹن پر ایک فوجی کوتوال مقرر تھا، 258ھ/ 872ء میں ہر ایک سپاہی سے ذاتی طور پر احمد کے حق میں حلف اطاعت لیا گیا۔

اگرچہ 264ھ/ 878ء میں شام کی فتح کی وجہ سے اس کی فوج میں نہ صرف جدید رضا کار فوج کی زیادتی ہوئی، بلکہ سابق ترک والیوں (گورنروں) کی نجی فوجیں بھی اس میں شامل ہوگئیں، لیکن اب اسے مختلف نوعیتوں پر مشتمل افواج پر پورا قابو رکھنے کے لئے بڑی مشکلات کا سامنا ہونے لگا، کیوں کہ افواج کے ساتھ اس کا رشتہ بہت ہی کمزور تھا۔ اس کے اپنے بیٹے العباس (268ھ-265ھ/ 882ء-879ء) کی سرکشی اور اس کے بعد اس کے اپنے غلام لؤلؤ کی غداری کی وجہ سے اس کی حیثیت اور وقار کو بڑا خطرہ لاحق ہوگیا جس سے وہ اپنی موت سے کچھ پہلے بمشکل تمام کسی حد تک عہدہ برآ ہوسکا تھا۔

خمارویہ نے اپنے والد ابن طولون کی موت کے بعد اپنی ذاتی ہمت ومردانگی کو بروئے کار لاکر وقتی طور پر انتشار کا خطرہ دور کرنے میں کامیابی حاصل کرلی، نیز وسط ایشیا (Central Asia) سے نئے غلاموں کو خرید کر اس نے اپنی مستقل فوج میں کافی اضافہ کیا، تاہم خمارویہ طرح طرح کی فضول خرچیوں کے بل پر اور احمد کے وقت کے فولادی نظم وضبط میں ڈھیل دے کر ہی اپنی فوج کو متحد رکھنے میں کامیاب ہوسکا، اس کے زمانے میں صرف فوجی اخراجات پر سالانہ تقریباً 9 لاکھ دینار صرف ہوتے تھے۔ اس کے اپنے اسراف کی وجہ سے خزانہ خالی ہوگیا اور جیش بن خمارویہ (282ھ/ 886ء) کی تخت نشینی کے موقع ہی پر فوج کے ایک حصے نے اس کے دیوالیہ پن کی وجہ سے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ جیش بن خمارویہ کی انتہائی نااہلی کی وجہ سے بڑے بڑے ترکی سپہ سالار الگ ہوکر بغداد فرار ہوگئے جہاں خلیفہ المعتضد نے ان سب کو شاہانہ اعزاز واکرام سے نوازا۔

10.4.9 طولونیوں کی رفاہی خدمات

روشن دماغ خود مختار بادشاہوں کی طرح احمد بن طولون اور اس کے بیٹے خمارویہ ہمیشہ لوگوں کو خوش کرنے کی خاطر نہ صرف مفت خوراک کی تقسیم، بڑے میلے تماشے اور وسیع پیمانے پر داد و دہش کیا کرتے تھے بلکہ تکالیف کو دور کرنے اور لوگوں کی اقتصادی حالت کی اصلاح کے لئے عملی تدابیر اختیار کرنے سے بھی غافل نہ تھے، تاکہ ان کے مفادات کی تکمیل کے ذریعہ اپنے خاندان کے اقتدار کو قائم رکھا جائے اور ان کے معاشرتی معیار کو بلند کر کے ان میں زیادہ مالیہ ادا کرنے کی اہلیت پیدا کی جائے، اس لئے غیر ملکی غلبے اور ان کی حکومت کی فوجی طرز کے باوجود طولونیوں کا دور حکومت مصریوں کے لئے ٹھوس خوش حالی اور ترقی کا ایک ممتاز زمانہ تھا جو آگے چل کر سنہری دور کہلایا۔

10.4.10 طولونی عہد میں مدارس اور درسِ حدیث

احمد ابن طولون نے مصر میں تعلیم و تعلّم کے کاموں کی حوصلہ افزائی کی، خمارویہ کو علمِ موسیقی، نقاشی اور سنگ تراشی سے دلچسپی تھی۔ اس زمانے کی عام تعیّش پسندی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ مقامی حرفت وصنعت کو اسی وجہ سے فروغ حاصل ہوا ہو۔ ابن طولون نے تعلیم پر اس قدر توجہ دی کہ اس نے جگہ جگہ مکاتب اور مدارس کھلوائے۔ اس نے پسماندہ اقوام کو بھی تعلیم سے بہرہ ور کیا۔ جامع القیروان میں علامہ محمد بن ربیع مقرر کئے گئے، انہوں نے وہاں درسِ حدیث کا آغاز کیا، ان کے درس میں خود ابنِ طولون اور اس کا بیٹا طالبِ علم کی طرح حاضر ہوتے تھے۔ طولونیوں کے زمانے میں قاضی بکار بن قتیبہ عہدۂ قضا پر متمکن تھے، مصر میں ان کی شخصیت بہت ممتاز تھی، فقہِ اسلامی میں انہیں غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ وہ فیصلہ کرنے میں کسی کی کوئی رعایت نہیں کیا کرتے تھے۔ ابنِ طولون کے شدید اصرار اور انتہائی دباؤ کے باوجود انہوں نے دولتِ عباسیہ کے مختارِ کُل ابو احمد موفق پر لعنت نہیں بھیجی۔

10.4.11 طولونی سلطنت کا رقبہ

ابو الجیش خمارویہ نے عباسیوں اور بازنطینیوں کے ساتھ کئی معرکہ آرائیوں کے بعد وسیع حکومت قائم کی جس کا پایہ تخت مصر تھا۔ یہ سلطنت مغرب میں برقہ (لیبیا) سے مشرق میں فرات (عراق) تک اور شمال میں وسطی ایشیا (ترکی) سے جنوب میں بلاد النوبۃ (مصر) تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی حکومت کو قانونی چوکھٹے پر پورا اتارنے کی غرض سے عباسی خلیفہ اور اس کے بھائی ولی عہد موفق کے ساتھ اور خود عباسی خلیفہ اور موفق نے اس کے ساتھ مصالحت کی روش اپنائی۔ خلافتِ عباسیہ نے خمارویہ اور اس کے بعد اس کی اولاد کے حق میں 30 سال کی حکمرانی تسلیم کی۔ خلیفہ المعتضد کی تخت نشینی کے وقت جو عہد نامہ تیار ہوا تھا اس کی شرائط کے بموجب مصر، شام، کیلیکیا (Cilicia) اور عراق (ماسوا موصل) کا قبضہ خمارویہ اور اس کے ورثاء کو 30 سال کے لئے دے دیا گیا تھا (اس کے بدلے انہوں نے تین لاکھ دینار کا سالانہ دینا منظور کیا تھا۔ اس سے پہلے احمد بن طولون یہی رقم خلیفہ معتمد کو صرف مصر کے لئے ادا کیا کرتا تھا)۔ اس عہدنامے سے اس خاندان کے اقتدار کے اوجِ کمال کا پتہ چلتا ہے۔ بعد میں ان کی طاقت کمزور ہوگئی تو 286ھ/899ء میں اس عہدنامے پر نظرِ ثانی ہوئی، جس کی رو سے مملکتِ محروسہ صرف مصر اور شام تک محدود کر دی گئی اور سالانہ رقم بڑھا کر چار لاکھ پچاس ہزار دینار کر دیا گیا۔

10.4.12 باغات اور چڑیا خانہ کی تنصیب

خمارویہ کو عمارتوں کی تعمیر کا بڑا شوق تھا، اِس کے ساتھ اُسے تفریح گاہوں (Garden) سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ سرکاری تفریح گاہ میں اس نے دور دور سے درخت منگوا کر لگوائے اور قسم قسم کے پھول دار درخت اور میوے کے درخت اس باغ میں نصب کرائے، پھولوں کی چمن بندی کرائی۔ طرح طرح کے خوشنما اور خوش رنگ پرندے منگوا کر اس باغ میں رکھے۔ اس نے ایسے کئی باغ اپنی قلمرو میں تیار کرائے۔ خمارویہ نے ایک بڑے احاطہ میں چڑیا خانہ (Zoo Park) بھی بنوایا، جہاں جنگلی جانوروں کے رکھنے کا معقول انتظام تھا۔ شیر اور چیتے ایسے سدھائے گئے تھے کہ دربار میں اس کے ساتھ آکر اردگرد کھلے بندوں بیٹھے رہتے اور باغ میں خمارویہ چہل قدمی کو جاتا تو پیچھے پیچھے وہ ساتھ رہتے۔

10.4.13 خمارویہ کا محل

خمارویہ نے اپنے محل میں سونے سے ملمع کاری کی ہوئی دیواروں کا ایک دالان تیار کروایا، جن میں اسلامی تعلیمات کے برخلاف اس کی عورتوں کی تصویریں قد آدم بنوائی گئیں۔ خوش نما باغ میں پھول کے پودوں کو کیاریوں میں عربی الفاظ کی شکل میں ترتیب دیا گیا۔ پارہ سے لبریز ایک حوض بنوایا گیا جس پر ہوا سے بھرے ہوئے چمڑے کے تکیے تیرتے تھے، چاندی کے ستونوں کو ریشم کی رسیاں باندھ کر یہ تکیے حوض کی سطح پر ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچائے جاتے تھے، خمارویہ ان پر لیٹا ہوا آرام کرتا یا نیند کے انتظار میں پڑا رہتا تھا۔

10.4.14 خمارویہ کا قتل اور طولونیہ کا زوال

خمارویہ نے 12 سال تک شان وشوکت سے حکومت کی اور 17 ذوالحجہ 282ھ/ 6 فروری 896ء کو دمشق (شام) میں قتل ہوا، تاہم اس کی تدفین المقطم (مصر) میں عمل میں آئی۔ خمارویہ کی موت کے فوراً بعد ہی امور سلطنت میں فوج کی مداخلت، طولونی امراء کے آپسی جھگڑوں اور شورشوں کے سبب سلطنت طولونیہ کی چولیں ہلنے لگیں، طولونیوں کی طاقت جاتی رہی، وہ فوج کے ہاتھوں کا کھلونا اور قتل وغارت کے شکار بن گئے۔ ادھر شام کے نظم ونسق میں 290ھ/ 903ء میں قرامطہ کی شورشوں کے باعث ابتری پیدا ہوئی، طولونی لشکر نے ان سے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی، خلافت عباسیہ نے اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا، خلافت کی شاہی افواج نے دمشق پر چڑھائی کر دی، وہاں سے فتح مند سپہ سالار محمد بن سلیمان نے طرطوس کے بحری بیڑے کی مدد سے مصر کے خلاف مشترکہ بحری اور برّی مہم ترتیب دی اور معمولی سی مزاحمت کے بعد فسطاط پر قبضہ کر لیا۔

لبنانی عرب عیسائی مصنف فِلپ کے حتّی نے اپنی کتاب ''تاریخ عرب'' میں احمد ابن طولون اور ان جیسے دیگر خود مختار حکمرانوں پر مختصر سی روشنی ڈالی ہے اور ان کے اسبابِ زوال پر گفتگو کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ چوں کہ ''..... ابن طولون اور ایسے دوسرے کئی خاندانوں کو جن جن ملکوں پر حکومت کرنے کا موقع ملا ہے، وہاں ان خاندانوں کی کوئی قومیت ہی نہ تھی، اس لئے ان کو بساطِ سیاست سے بہت جلد ہٹ جانا پڑا۔ ان خاندانوں کی عام کمزوری یہ تھی کہ ان کی ریاستوں میں ان کے اپنے قبیلوں کی کوئی ایسی تنظیم اور طاقت ور جماعتیں موجود نہ تھیں جو آڑے وقتوں میں ان کے آگے سینہ سپر ہو جائیں۔ خود والیانِ ریاست کی حیثیت ناخواندہ

مسلمانوں کی سی ہوتی تھی اور یہ لوگ اپنے محافظ دستوں کے سپاہیوں کو بہت سی غیر قوموں سے بھرتی کرنے پر مجبور تھے اور ان ہی دستوں سے فوج کا کام بھی لیا جاتا تھا''۔

10.4.15 طولونی سلطنت کا خاتمہ

فوج کے سپہ سالاروں نے خمارویہ کے قتل کے بعد اس کے دونوں کمسن بیٹوں کو یکے بعد دیگرے تخت سلطنت پر بٹھایا۔ بڑا بیٹا جیش صرف ایک سال کی حکمرانی کے بعد 10 جمادی الآخرہ 283ھ/ 26 جولائی 896ء کو اپنے بھائی ابوموسی ہارون کے حق میں معزول کر دیا گیا۔ خمارویہ کے دوسرے بیٹے ابوموسیٰ ہارون نے 283ھ/ 896ء سے 292ھ/ 905ء تک حکومت کی۔ ہارون بڑا نااہل تھا، اس کی نااہلی کی وجہ سے نہ صرف عباسی حکومت سے اس کے تعلقات خراب ہوگئے، بلکہ خود اس کے امراء اور رشتہ دار تک اس کے خلاف ہوگئے۔ 19 صفر 292ھ/ یکم جنوری 905ء کو ہارون کے قتل کے بعد اس خاندان کا خود بخود خاتمہ ہوگیا۔ تاہم مزید 12 دن تک اس کا چچا شیبان بن احمد بن طولون مقامی طور پر مصر کی حکومت پر قابض رہا۔ 2 ربیع الأول 292ھ/ 12 جنوری 905ء کو خلیفہ مکتفی کے عہد میں محمد بن سلیمان عباسی نے فسطاط پر قبضہ کر لیا، شہر میں خوب لوٹ مار کی گئی، مضافات میں القطائع کی فوجی چھاؤنی کو زمین کے برابر کر دیا گیا، یہاں مکتفی کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا، فسطاط پر قبضہ کے بعد محمد بن سلیمان نے طولونی خاندان کے تمام ارکان اور ان کے وابستگانِ سلطنت کو یہاں سے ہٹا کر نیا نظام قائم کیا اور مصر و شام سے طولونی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

معلومات کی جانچ

1. دولتِ طولونیہ کے فرمانرواؤں کے نام بتائیے؟
2. جامع احمد بن طولون کے سلسلہ میں اپنی معلومات فراہم کیجئے؟

10.5 اِخشیدیہ

اِخشیدیہ مصر کے ایک حکمراں خاندان کا نام ہے۔ یہ نام فارسی کے پرانے شاہی لقب اِخشید سے لیا گیا ہے۔ اخشید کے معنی ''شاہِ شاہان'' بیان کئے گئے ہیں۔ بعض لوگ اس کے معنی ''عبد'' بتاتے ہیں۔ مصر وشام سے جب بنی طولون کی حکومت جاتی رہی تو چند سالوں کے لئے مصر وشام، دونوں صوبوں کے حاکم دربارِ خلافت بغداد سے مقرر ہوکر آنے لگے اور بہ ظاہر یہ دونوں صوبے پھر خلافتِ عباسیہ میں شامل ہوگئے۔ پھر یہاں اخشیدیوں نے اپنی حکومت قائم کی۔ عباسی خلیفہ الراضی کے عہد میں ایک ترک سالار محمد بن طُغج نے مصر کی گورنری اور اِخشید کا لقب حاصل کیا اور پھر خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ اخشیدی سلطنت میں کل پانچ حکمراں ہوئے، ان کے نام بالترتیب یہ ہیں: محمد اخشید بن طُغج بن جُف، ابوالقاسم اُنوجور بن محمد اخشید، ابوالحسن علی بن محمد اخشید، ابوالمسک کافور (محمد اخشید کا زرخرید غلام جس نے اپنے نام سے بھی حکومت کی) اور ابوالفوارس احمد بن علی۔ اِخشیدیوں کی سلطنت فاطمی سپہ سالار جوہر الصقلی کے ہاتھوں ختم ہوئی۔

10.5.1 محمد اِخشید بن طُغج (بانی سلطنتِ اِخشیدیہ)

محمد اِخشید بن طُغج بن جُف ماوراء النہر کے علاقہ فرغانہ کے قدیم حکمراں خاندان سے تعلق رکھتا تھا، یعنی اس کے بزرگ فرغانہ کے امیر تھے، اس زمانہ میں فرغانہ کے امراء اور حکمرانوں کو اخشید کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ 326ھ/ 937ء میں خلیفہ راضی نے قدیم ایرانی شہزادوں کے اس لقب سے دولتِ اخشیدیہ کے بانی محمد بن طغج کو اس کے کارہائے نمایاں کے سبب سرفراز کیا تھا۔

محمد اِخشید ترکی نژاد شخص ہے۔ اس کا دادا جُف، معتصم کے عہد میں دار الخلافۃ آیا تھا۔ جف کا خاندان دیگر ترکوں کے ساتھ دار الخلافۃ بغداد میں برسرِ خدمت تھا۔ محمد الاخشید کا باپ اور دادا پہلے ہی سے خلیفہ کے ملازم تھے، لیکن خود اس نے آہستہ آہستہ نیچے سے اوپر کی جانب ترقی کی۔ 316ھ/ 928ء میں مقتدر باللہ خلیفہ بغداد نے محمد اخشید کو رملہ کا حاکم مقرر کیا، 318ھ/ 930ء میں اس کو دمشق کی حکومت سپرد کی گئی اور 323ھ/ 935ء میں اس کو مصر کی حکومت دی گئی۔ اس نے مصر کی حکومت پر فائز ہو کر 327ھ / 938ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا، 330ھ/ 942ء میں شام پر بھی قبضہ کر لیا اور 331ھ/ 943ء میں ملکِ حجاز کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر کے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لی۔ خاندانِ اخشیدیہ نے 356ھ/ 967ء تک ان ملکوں پر حکومت کی، اس کے بعد عبیدیوں نے پہلے مصر کو پھر چند روز کے بعد شام کو بھی فتح کر لیا۔

10.5.2 اِخشید کی تولیتِ مصر

دراصل مصر میں فاطمی خطرہ کو روکنے کے لئے کی جانے والی تیاروں کی راست نگرانی کرنے کے مقصد سے اخشید مصر آیا تھا۔ مؤنس نے محمد بن طغج سے خوش ہو کر 316ھ/ 928ء مین پہلے اسے رملہ (فلسطین) کی ولایت (Viceroyalty) سپرد کی۔ ابن طغج کی نگاہیں مصر کی ولایت پر ٹکی ہوئی تھیں۔ خلیفہ راضی نے جب خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تو مصر کے حالات انتہائی دگر گوں تھے، مصر کے قائدین اور شعبۂ خراج کے مالک محمد بن علی ماذرائی کی وجہ سے حالات انتہائی پیچیدہ ہو گئے تھے، وزیرِ مال محمد بن علی ماذرائی اور اس کے اہلِ خاندان نے تقریباً پچاس سال سے مصر کے خزانہ کو خوب لوٹا، مصری خراج کو اپنی جاگیر بنا لی اور ایسا لگ رہا تھا کہ مصری سلطنت کے اندر ان کی اپنی ایک الگ سلطنت ہے۔ چوں کہ ابن طغج نے ایک طرف بغداد کے صاحبِ اثر شخص ابوالفتح فضل بن جعفر جو عباسی خلافت کی جانب سے مصر و شام کے خراج کا والی (گورنر) تھا، سے رشتۂ مصاہرت جوڑ کر دار الخلافۃ میں اپنی حیثیت بڑھا لی تھی اور دوسری طرف خلافت کو ایک فولادی عزم کے حامل شخص کی شدید ضرورت تھی جو مصر میں امن بحال کرتا اور فاطمیوں کے حملوں کا جواب دینے کے لئے اسے طاقتور مرکز کے طور پر اپناتا۔ چنانچہ خلیفہ راضی نے محمد بن طغج کو 328ھ/ 939ء میں مصر کا والی یعنی گورنر بنا دیا۔

ابن طغج نے مصر میں اپنی پوزیشن سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے شعبۂ خراج کے عامل محمد بن علی ماذرائی کے پیر اکھاڑ دئے اور اسے وہاں سے راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور پھر 321ھ سے 324ھ/ 936ء تک فاطمیوں کے مسلسل حملوں پر روک لگانے مین کامیابی حاصل کی، اس طرح اس کی کوششوں سے ملک کی حالت پھر سنبھل گئی۔ خلیفہ راضی نے محمد بن طغج کے انہی کارہائے نمایاں کو دیکھ کر اسے اخشید کے لقب سے سرفراز کیا، مصر و شام کے منبروں پر رمضان 327ھ/ 938ء سے اسی لقب سے اسے یاد کیا جانے لگا۔

10.5.3 محمد اِخشید کا فوجی نظام

محمد اِخشید بن طغج ایک سپاہی منش شخص تھا۔ اس نے ترکی اور رومی سپاہیوں پر مشتمل چار لاکھ کی فوج مرتب کی تھی، اس میں اِخشید کی خاص باڈی گارڈ فوج شامل نہ تھی۔ اس فوج کے سپاہیوں کو باقاعدہ تنخواہ دی جاتی تھی۔ اِخشید ہر سپاہی کا خود خیال رکھتا تھا، وہ بہادر ہونے کے ساتھ نہایت نرم طبیعت بھی تھا۔ اُس نے نہ صرف طولونی سلطنت کے بانی احمد بن طولون کے طرز پر اپنی فوج تیار کی تھی، بلکہ سیاست کی بساط بھی اسی انداز میں بچھائی تھی۔ اس طرزِ حکمرانی سے اس نے جہاں اہلِ مصر کا دل جیتا وہیں بااثر ذمیوں کے ساتھ رشتۂ مودت بھی استوار کیا۔ اس کے عہد میں مصر فوجی قوت اور مال و دولت کی زیادتی کی وجہ سے ممتاز تھا۔

10.5.4 خلیفہ راضی کی اِخشید کے دامن میں پناہ طلبی

ترکوں نے جس خلیفہ راضی کے ساتھ کھلواڑ کیا اور امیرالأ مراء کی زیادتی اور جارحیت نے جسے خوفزدہ کیا، اسی خلیفہ راضی نے محمد اخشید کے دامن میں پناہ لینے کی دہائی دی۔ چنانچہ اخشید نے اسے مصر آنے کی دعوت دے دی جس طرح ابن طولون نے خلیفہ معتمد کی خود اپنے دامن میں پناہ دینے کی درخواست منظور کی تھی، تاکہ مصر کو عباسی خلافت کا پایہ تخت بنایا جاسکے، گرچہ اخشید کو اس میں کامیابی نہ مل سکی جیسا کہ ابن طولون کو اپنے عہد میں اس مقصد میں کامیابی نہیں ملی تھی، تاہم اخشید کو اپنی اولاد کے حق میں اور ابن طولون کو اپنے لڑکے خمارویہ اور اس کی اولاد کے حق میں یہ معاہدہ طے کرانے میں کامیابی ملی تھی کہ مصر و شام پر موروثی حقِ ولایت انہیں حاصل ہوگا۔ چنانچہ خلیفہ راضی نے اخشید کی اولاد کے حق میں موروثی طور پر مصر و شام کی ولایت قبول کرلی، مزید برآں ملک حجاز یعنی مکہ اور مدینہ بھی ان کے کنٹرول میں آ گیا۔ محمد اخشید نے اپنے عمال اور قائدین کو اپنے لڑکے انوجور کی ولایت تسلیم کرنے کا حکم دیا، خلیفہ سے اس بیعت پر رضا مندی حاصل کی۔ اس طرح مصر و شام کے منبروں پر خلیفہ راضی، محمد اخشید اور اس کے بیٹے انوجور کا نام لیا جانے لگا۔

10.5.5 اِخشید کی حمدانیوں سے صلح کی پالیسی

امیر الامرا محمد بن رائق کی وفات کے بعد اخشید کو ایک نئے دشمن یعنی حمدانی خاندان کا سامنا کرنا تھا، ان کے زمانے میں مصر کے شمال کی جانب حمدانیوں کا شیعی خاندان حکمراں تھا۔ حمدانی، قبیلۂ بنوتغلب کے حمدان بن حمدون کی نسل سے تھے، شمالی عراق میں انہوں نے موصل کو 381ھ-317ھ/ 991ء-929ء تک اپنا مرکزِ حکومت بنا رکھا تھا۔ ادھر 332ھ/ 944ء میں شمالی شام میں وہ گھس پڑے۔ حلب میں ان کی طاقت نہ صرف ابھرنے لگی، بلکہ ان کے مشہور حکمراں سیف الدولہ حمدانی نے حلب اور حمص اِخشیدیوں سے چھین لیے اور دمشق پر قبضہ جمانے کے لئے پیش قدمی کرنے لگا۔ ان حالات میں محمد اخشید نے سیف الدولہ حمدانی کے خلاف اپنی فتح کے باوجود حمدانیوں کے ساتھ حلب اور شمال میں اس سے ملے ہوئے شامی علاقوں کو چھوڑنے اور دمشق کے تحفظ کے عوض انہیں سالانہ جزیہ دینے پر مصالحت کرلی، کیوں کہ اس زمانے میں حمدانی اہلِ روم کے ساتھ برسرِ پیکار تھے اور رومی، مسلم حکومتوں پر حملے کرنے کے فراق میں سرگرداں تھے۔ محمد اخشید چاہتا تھا کہ حمدانی رومی حملوں کے سامنے سدِّ سکندری بنے رہیں، اس طرح بحیثیتِ والی شام عالم اسلام کے تحفظ کے حوالہ سے خود اس کی یعنی اخشید کی جو ذمہ داری بنتی تھی وہ ذمہ داری حمدانی بذاتِ خود اور بدرجۂ اتم نبھا رہے تھے۔

10.5.6 محمد اخشید کی تعمیری سیاست

محمد اخشید کے عہد میں مصر کی عظمتِ رفتہ بحال ہوئی۔ امن وامان کا قیام عمل میں آیا۔ اصلاحی اور تعمیری سیاست کے نتیجے میں خوش حالی عام ہوئی۔ یہاں تک کہ مؤرخین نے اخشید کی چھوڑی ہوئی دولتِ بے بہا کے متعلق کافی کچھ لکھا ہے۔ اس کی حکومت کا دائرہ، مصر، یمن، حمص، دمشق، اردن، فلسطین، مکہ اور مدینہ تک پھیلا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اخشیدی، خلافت کے دو خاندانوں (عباسیہ اور فاطمیہ) میں سے دل سے تو فاطمیوں کو اپنا سردار ماننے کی طرف مائل تھے، لیکن عباسیوں کے وفادار بھی رہنا چاہتے تھے، کیوں کہ ابھی تک انہیں کی دھاک زیادہ بیٹھی ہوئی تھی۔

10.5.7 اِخشیدیوں کے عہد میں خراج اور زراعت کی ترقی

کافور نے زراعت کی ترقی میں آخری درجہ دلچسپی لی اور بے تکان محنت کی، جس کی وجہ سے مصر کے خراج کی آمدنی تقریباً چالیس لاکھ دینار ہوگئی۔ مگر مصر میں قحط پڑنے کی وجہ سے آخر میں خراج کی آمدنی اتنی کم ہوگئی کہ فوج کی تنخواہیں ادا نہ کی جاسکیں۔ محمد اِخشید کے زمانے میں مصر کے خراج سے آنے والی آمدنی کی رقم بیس لاکھ دینار تھی۔

10.5.8 محمد اِخشید کی وفات

334ھ کے اواخر/ جولائی 946ء میں دمشق میں محمد اخشید بن طغج کی وفات ہوئی۔ اُسے قدس شریف میں دفن کیا گیا۔ اس نے کُل گیارہ سال تین ماہ حکومت کی۔

10.5.9 اِخشیدی سلطنت کے دیگر حکمراں

اِخشید کی وفات کے بعد اس کے بڑے بیٹے ابوالقاسم انوجور نے 349ھ-334ھ/ 960ء-946ء تک، پھر اس کے بعد چھوٹے بیٹے ابوالحسن علی نے 356ھ-349ھ/ 966ء-960ء تک برائے نام حکومت کی۔ محمد اخشید کے یہ دونوں جانشیں اپنی کم سنی کی وجہ سے محض نام کے بادشاہ تھے۔ اصلی اقتدار اخشید کے ایک زرخرید حبشی غلام ابوالمسک کافور کے ہاتھ میں تھا، ملک کا تمام انتظام 334ھ/ 946ء سے 355ھ/ 966ء تک وہی انجام دیتا رہا۔

اخشید کے دوسرے لڑکے ابوالحسن علی کے فوت ہوجانے کے بعد خلیفہ کی جانب سے ابوالمسک کافور کو ہی مصر کا باقاعدہ بادشاہ بنادیا گیا۔ بعدازاں اسی نے مصر اور شام کو 355ھ/ 966ء سے 358ھ/ 968ء تک اس کے شمالی ہمسایہ حمدانی حکمراں خاندان کے حملوں سے کامیابی کے ساتھ بچائے رکھا۔ کافور نے سلطنت کا نظم ونسق بہتر انداز میں سنبھالا۔ چنانچہ حجاز اور شام میں اس کے نام کا خطبوں میں ذکر آنے لگا۔

10.5.10 اِخشید اور کافور کی شخصیتیں

دولتِ اخشیدیہ میں محمد اخشید بن طغج اور ابوالمسک کافور کی شخصیتیں حقیقت میں بڑی اہم تھیں۔ اخشید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جسمانی لحاظ سے تو وہ بڑا طاقتور تھا مگر حریص تھا۔ اس کی حکومت میں کسی کی ذاتی ملکیت محفوظ نہ تھی، تاہم ان بعض سلبی پہلوؤں سے

قطع نظر کئی خوش آئند انسانی خصائل بھی اس کی طرف منسوب ہیں۔ گو کافور کی شکل و صورت نفرت انگیز تھی، لیکن وہ بھی کچھ کم قابلِ وقعت نہ تھا، اس عہد کے مشہور عربی شاعر ابوالطیب متنبّی (354ھ-303ھ/ 965ء-915ء) نے پہلے تو کافور کی بہت مدح سرائی کی، بعد میں بُری طرح اس کی ہجو لکھی اور سیف الدولہ حمدانی کی خدمت اختیار کی۔ کافور اپنی ذہنی صلاحیتوں کی بدولت ایک سیاہ فام غلام سے ایک خاندانی بادشاہت کے اقتدار کا مالک ہوگیا۔ ان دونوں حکمرانوں نے اپنے اپنے زمانے میں ادبی ذوق کی پرورش کی۔

10.5.11 اِخشیدی سلطنت کا خاتمہ

ابوالمسک کافور کی وفات کے بعد محمد اخشید کا پوتا یعنی ابوالحسن علی کا بیٹا ابوالفوارس احمد جو صرف دس سال کا تھا 357ھ/ 967ء میں تخت نشیں ہوا، لیکن چوں کہ پورے ملک میں اس خاندان کا بھرم جاتا رہا تھا، اس لئے ایک ہی سال بعد المعزلدین اللہ فاطمی کا سپہ سالار جوہر الصقلی جو شمالی افریقہ کی جانب سے بڑھتا چلا آرہا تھا، نے 358ھ/ 968ء میں شام اور مصر سمیت سارا ملک اس سے چھین لیا اور اِخشیدی سلطنت کا خاتمہ کردیا۔ اخشیدیوں نے 327ھ/ 938ء میں تولیتِ مصر کے بعد سے 358ھ/ 968ء تک یعنی تیس سال حکمرانی کی۔

معلومات کی جانچ

1. اخشیدی سلطنت کے حکمرانوں کے نام لکھیں؟

2. اخشید کا مطلب اور اس کے استعمال کا پس منظر بتائیے؟

10.6 خلاصہ

اغالبہ صرف ایک سو گیارہ سال اور چند مہینے افریقہ کے حکمراں رہے اور اس مدت میں گیارہ فرماں رواؤں نے حکومت کی۔ اس قلیل عرصہ میں مشکل سے 75 برس ایسے نکلیں گے جن میں امن و امان قائم رہا۔ اسی قلیل ترین عہد حکومت میں اغالبہ نے محض اپنی قوت بازو سے تقریباً تمام شمالی افریقہ کو زیرِ نگیں کیا اور ان کے حدودِ حکومت سواحل بحیرۂ روم کا احاطہ کرتے ہوئے حدودِ مصر تک جا پہنچے۔ شمالی افریقہ کا تمام علاقہ جو اغالبہ کے ماتحت تھا چوں کہ بحرِ روم (Mediterranean Sea) کے سواحل پر آباد تھا، اس لئے انہوں نے بحری طاقت میں نمایاں امتیاز حاصل کرلیا تھا، چنانچہ ابن خلدون کے بہ قول افریقہ اور اندلس کی اسلامی حکومتوں کی بحری طاقتیں اس زمانہ میں دنیا کی سب سے بڑی بحری طاقتیں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ بحرِ روم کے تمام جزائر انہی دونوں اسلامی حکومتوں کے زیر اقتدار آگئے تھے۔ اغالبہ جزیرۂ صقلیہ (سِسلی) کے علاوہ بحرِ روم کے اور بہت سے دوسرے جزیروں پر بھی قابض ہوئے۔ پھر وہ سواحل اٹلی پہنچے، اس سے آگے بڑھ کر اندرونِ اٹلی میں داخل ہوئے اور پھر ساحلِ فرانس سے جاکر ڈانڈے ملادئے۔ جزائر مالٹا اور سر دانیہ پر اغالبہ کا قبضہ ہوگیا، یہاں تک کہ شہر روما پر بھی فوج کشی کی گئی، اسی زمانہ میں اغلبی مسلمان جزیرہ کریٹ (اقریطش) سے نکل کر بحیرۂ یونان (Aegian Sea) کے جزائر پر بھی حملے کرنے لگے اور دسویں صدی عیسوی کے وسط تک یونان کے سواحل کو بھی پامال کرنا شروع کردیا۔

طولونیوں نے 254ھ/ 868ء سے 292ھ/ 905ء تک یعنی صرف 38 سال مصر میں حکومت کی۔ بنی طولون اگرچہ خودمختار تھے اور مصر کا صوبہ گویا 254ھ/ 868ء میں خلافت عباسیہ سے جدا ہو چکا تھا، مگر مصر میں خطبہ خلیفۂ بغداد کے نام کا پڑھا جاتا تھا۔ بنی طولون نے ملک شام کو بھی اپنی حکومت میں شامل کرلیا تھا۔ اس طرح شام ومصر میں ایک ایسی سلطنت قائم ہوگئی تھی جو اگرچہ اپنے آپ کو خلیفۂ بغداد کی فرماں بردار بتاتی تھی، مگر دربار بغداد کو شام ومصر کی حکومت سے بے تعلق کردیا تھا۔ اس کا رقبۂ حکومت بدستور دولت عباسیہ کا ماتحت علاقہ ہوگیا۔ احمد بن طولون دس سال کے اندر اندر مصر اسکندریہ اور برقہ اور شام کی وسیع ولایت کا خود مختار حاکم ہوگیا اور عملاً خلیفہ کی اطاعت ترک کردی۔ ابن طولون اسلامی عہد کا پہلا حکمراں تھا جس نے مصر میں بانگ دہل ایک خود مختار حکومت کی بنا ڈالی اور اپنے بعد آنے والوں کے لئے نمونہ چھوڑا۔ اس نے القطائع شہر آباد کیا اور جامع مسجد بنائی۔ اس نے اندرونی شورشوں پر قابو پایا اور امن بحال کیا۔

اِخشید یہ مصر کے ایک حکمراں خاندان کا نام ہے۔ یہ نام فارسی کے پرانے شاہی لقب اِخشید سے لیا گیا ہے، جس کے معنی ''شاہِ شاہان'' یا ''عبد'' بیان کئے گئے ہیں۔ 326ھ مطابق 937ء میں خلیفہ راضی نے قدیم ایرانی شہزادوں کے اس لقب سے دولتِ اخشید یہ کے بانی محمد بن طغج کو اس کے کارہائے نمایاں کے سبب سرفراز کیا تھا۔ اخشیدیوں نے 327ھ/ 938ء میں تولیتِ مصر کے بعد سے 358ھ/ 968ء تک یعنی تیس سال مصروشام پر حکمرانی کی۔ محمد اخشید بن طغج نے نہ صرف احمد بن طولون کے طرز پر اپنی فوج تیار کی، بلکہ سیاست کی بساط بھی اسی انداز میں بچھائی۔ اس طرزِ حکمرانی سے اس نے جہاں اہلِ مصر کا دل جیتا وہیں بااثر ذمیوں کے ساتھ رشتۂ مودت بھی استوار کیا۔ محمد اخشید کے عہد میں مصر کی عظمتِ رفتہ بحال ہوئی۔ امن وامان کا قیام عمل میں آیا۔ اصلاحی اور تعمیری سیاست کے نتیجے میں خوشحالی عام ہوئی۔ یہاں تک کہ مؤرخین نے اخشید کی چھوڑی ہوئی دولتِ بے بہا کے متعلق کافی کچھ لکھا ہے۔ اس کی حکومت کا دائرہ۔ مصر، یمن، حمص، دمشق، اُردُن، فلسطین، مکہ اور مدینہ تک پھیلا ہوا تھا۔ دولتِ اخشید یہ میں محمد اخشید بن طغج اور ابوالمسک کافور کی شخصیتیں حقیقت میں بڑی اہم تھیں۔ کافور اپنی ذہنی صلاحیتوں کی بدولت ایک سیاہ فام غلام سے ایک خاندانی بادشاہت کے اقتدار کا مالک ہوگیا۔ ان دونوں حکمرانوں نے اپنے اپنے زمانے میں ادبی ذوق کی پرورش کی۔

10.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھئے۔

1. سلطنتِ بنواغالبہ کا قیام کب اور کیسے عمل میں آیا؟
2. خمارویہ کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کریں؟
3. محمد اخشید کا تعارف کرایئے؟
4. ابوالمسک کافور کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

درج ذیل سوالوں کے جوابات تین سطروں میں لکھیے۔

1. اغالبہ کے دور کے فنِ تعمیر و ترقی پر روشنی ڈالئے؟
2. طولونیوں کی فوج پر جامع تبصرہ کریں؟
3. احمد بن طولون کا تعارف کرائیے؟
4. محمد اخشید کی شخصیت اور اس کی خدمات پر جامع تبصرہ کیجئے؟

10.8 فرہنگ

کشور کشائی	:	بادشاہی، ملک گیری
عزل ونصب	:	موقوفی اور بحالی، ترقی و تنزلی
نشاۃِ ثانیہ	:	کسی قوم یا ملک کا ازسرِ نو ترقی کرنا
اضمحلال	:	پژمردگی، سستی، افسردگی
عواقب	:	(عاقبت کی جمع)، انجام
محروسہ	:	ماتحت کیا گیا، نگہبانی کیا گیا
انحطاط	:	پستی، زوال
تسخیر	:	تابع کرنا، قابو میں لانا
ہجو	:	مذمت، برائی
مدح سرائی	:	تعریف کرنا، ستائش کرنا
سواحل	:	ساحل کی جمع، سمندر یا دریا کا کنارہ
صقلیہ (سسلی)	:	یہ جزائرِ بحرِ متوسط (Mediterranean Sea) کا ایک جزیرہ ہے، یہ بہت سرسبز وشاداب جزیرہ تھا، جس میں کئی شہر اور بہت سے قصبے اور دیہات آباد تھے

10.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. العالم الاسلامی فی العصر العباسی — ڈاکٹر حسن احمد محمود اور احمد ابراہیم شریف
2. موسوعۃ الأیان (المیسرۃ) — متعدد مصنفین، دار النفائس، کویت
3. حضارۃ مصر فی العصر الطّولونی — حسن احمد محمود، قاہرہ
4. تاریخِ صقلیہ (جلد اول) — سید ریاست علی ندوی، دار المصنفین
5. دائرہ معارف اسلامیہ (ج 2 ، 12) — متعدد مصنفین، پاکستان

6. تاریخ اسلام، ج3 (خلافتِ عباسیہ، جلد اول و دوم)
7. تاریخِ ملت، جلد ہفتم (تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ)
8. تاریخ تہذیبِ اسلامی (حصہ سوم و چہارم)
9. تاریخ الثقافۃ الإسلامیۃ

اردو ترجمہ بہ عنوان: مختصر تاریخ ثقافتِ اسلامی

شاہ معین الدین احمد ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، یوپی

مفتی حکیم انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی، ندوۃ المصنفین، اعظم گڑھ، یوپی

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنوء۔

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی (علیگ)، علامہ ابوالحسن ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر فاؤنڈیشن، علی گڈھ۔

اکائی 11 : فاطمینِ مصر

اکائی کے اجزاء

11.1 مقصد

11.2 تمہید

11.3 فاطمینِ مصر

11.3.1 شمالی افریقہ میں سلطنتِ فاطمیہ کی تاسیس

11.3.2 فاطمی خلافت کا افریقی دور

11.3.3 بنو فاطمہ مصر میں

11.3.4 نظامِ حکومت

11.3.4.1 خلافت

11.3.4.2 وزارت

11.3.4.3 عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ رواداری

11.3.4.4 سلطنت کی تنظیم

11.3.4.5 فاطمیوں کا فوجی نظام

11.3.4.6 معاشی سرگرمیاں

11.3.4.7 ثقافتی سرگرمیاں

11.4 خلاصہ

11.5 نمونے کے امتحانی سوالات

11.6 فرہنگ

11.7 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

11.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپکو معلوم ہوگا کہ فاطمیوں نے افریقہ اور جزیرہ صقلیہ میں اغلبی حکومت کی بیخ کنی کر کے اپنی خلافت کس طرح قائم کی۔ اسی طرح آپکو اس بات کا بھی علم ہوگا کہ فاطمیوں نے مصر میں اخشیدی سلطنت کو روبہ زوال کر کے اپنی خلافت کی داغ بیل کس طرح ڈالی اور یہ کہ فاطمی حکومت کے زمانے میں کیا کارنامے انجام دئے گئے، حکومت کو چلانے کے لئے فاطمیوں کی داخلی حکمت عملی کیا تھی۔

11.2 تمہید

اس اکائی میں فاطمی خاندان اور شمالی افریقہ میں دولت فاطمیہ کی تاسیس کا تعارف کرایا جائیگا۔ فاطمی تحریک کے فروغ میں ابو عبداللہ اور عبیداللہ مہدی کی خدمات پر بحث کی جائیگی۔ اس بات پر روشنی ڈالی جائیگی کہ عبیداللہ مہدی، المعز، الحاکم اور المستنصر جیسے بیدار مغز خلفائے بنی فاطمہ نے شمالی افریقہ، مصر، صقلیہ، یمن، شام، بحرین، عمان، یمامہ اور مکہ و مدینہ تک اپنی خلافت کے دائرہ کو کیسے وسعت دے دی، مختلف قسم کی شورشوں اور بغاوتوں پر کیسے قابو پایا گیا، معاشی، ثقافتی، تعمیری، علمی اور فنی سرگرمیوں کا کیا حال رہا۔

11.3 فاطمینِ مصر

فاطمینِ مصر دراصل ایک حکمراں خاندان کا نام ہے جس نے شمالی افریقہ اور مصر میں 297ھ سے 567ھ (908ء سے 1171ء) یعنی ڈھائی سو سال سے زیادہ مدت تک حکومت کی۔ فاطمیوں کی حکومت اپنی وسعت اور شان وشوکت میں شمالی افریقہ کی ادریسی حکومت اور اسپین کے حمودی حکمراں خاندان سے بہت زیادہ تھی۔ وہ ایک عرصہ تک بنی عباس کے ہم پلّہ شمار کئے جاتے رہے۔ اس خاندان میں کل چودہ حکمراں مسندنشین ہوئے، ان کے نام یہ ہیں: عبیداللہ المہدی، القائم بأمراللہ، المنصور باللہ، المعز لدین اللہ، العزیز باللہ، الحاکم بأمراللہ، الظاہر لإعزاز دین اللہ، المستنصر باللہ، المستعلی باللہ، الآمر بأحکام اللہ، الحافظ لدین اللہ، الظافر لأعداء اللہ، الفائز باللہ اور العاضد لدین اللہ۔

بنو فاطمہ اپنا سلسلۂ نسب اسماعیل بن جعفر صادق سے ملاتے ہیں، فاطمی نسب نامے کے مطابق عبیداللہ، حسین بن احمد بن عبد اللہ بن محمد بن اسماعیل بن جعفر الصادق کا بیٹا تھا۔ مؤرخین اس خاندان کو عبیدیہ یا عبیدی خاندان بھی کہتے ہیں۔

11.3.1 شمالی افریقہ میں سلطنتِ فاطمیہ کی تاسیس

ابوعبداللہ نے دعوت وتبلیغ کے مختلف مراحل عبور کئے، بعدازاں اس نے بنو کتامہ کو منظم کر کے بربریوں کا ایک لشکر جرار حکومت اغلبیہ کے خلاف میدان جنگ میں لے آیا، افریقہ کے اغلبی حکمراں ابراہیم کے عہد سے کھلّم کھلّا مقابلہ ہونے لگا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر عبیداللہ (یا سعید بن حسین) بنوعباس کی طرف سے ہونے والی تحقیقات سے، یا اس مخفی سازش سے بچنے کے

لئے جو خود اسماعیلی تحریک کے اندر اس کے خلاف ہو رہی تھی، اپنے تبلیغی صدر مقام شام کے شہر سلمیہ سے تاجر کے بھیس میں نکل کر پہلے رملہ (فلسطین)، پھر براہ مصر اپنے بیٹے ابوالقاسم کی ہمرکابی میں شمالی افریقہ پہنچ گیا۔ عبیداللہ نے سجلماسہ (جنوب کوہِ اطلس) کے حاکم یسع کے یہاں پناہ لی، اگرچہ اغلبی حکمران زیادۃ اللہ نے اسے اور اس کے بیٹے ابوالقاسم کو سجلماسہ کے محبس (قید خانے) میں کچھ مدت قید رکھا، لیکن اس کے پیشرو ابوعبداللہ حسین نے اسے قید سے چھڑا لیا اور بالآخر جب 26/ جمادی الآخری 296ھ/ 908ء کو آخری اغلبی فرماں روا ابومضر زیادۃ اللہ افریقہ سے فرار ہوا، تو ابوعبداللہ نے فوراً ہی تمام افریقہ میں دولتِ عبیدیہ کے قیام کا اعلان عام کر دیا اور اغالبہ کے دارالحکومت شہر رقادہ پر قبضہ کر کے عبیداللہ کو اپنے ساتھ لے کر فاتحانہ شان وشوکت کے ساتھ رقادہ میں داخل ہوا۔ چنانچہ اسی دن افریقہ سے خلافتِ عباسیہ کا قطعی صفایا ہو گیا۔

11.3.2 فاطمی خلافت کا افریقی دور

ابتدائی چار فاطمی خلفاء عبیداللہ المہدی، القائم، المنصور اور المعز شمالی افریقہ میں مقیم رہے، جب فاطمی سپہ سالار جوہر الصقلی نے مصر فتح کر لیا تو ان میں سے مؤخر الذکر خلیفہ المعز نے 363ھ/ 973ء میں مصر کا رخ کیا۔

خلیفہ عبیداللہ مہدی نے جب دارالحکومت قیروان کے ایک بیرونی حصہ رقادہ میں کامل اقتدار حاصل کر لیا، اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد اس کا اپنے پرانے معاون اور محسن داعی ابوعبداللہ کے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا۔ چنانچہ ابوعبداللہ نے اپنے بھائی ابوالعباس کے ساتھ مل کر خلیفہ عبیداللہ مہدی کے خلاف سازش رچی، تاکہ اسے عہدۂ خلافت سے بے دخل کیا جائے، خلیفہ عبیداللہ نے 299ھ/ 911ء میں دولتِ فاطمیہ کے اصل بانی ابوعبداللہ اور اس کے بھائی ابوالعباس کو عروبہ بن یوسف اور اس کے بھائی حباسہ بن یوسف کے ذریعہ قتل کروا دیا۔ یہ دیکھ کر کُتامہ قبیلہ نے بغاوت کر دی اور ایک نوعمر لڑکے کو مہدی کا لقب دے کر اپنا امیر بنا لیا۔ یہ بغاوت بڑی خون ریزی کے بعد فرو ہوئی، اسی موقعہ پر عبیداللہ مہدی نے اپنے بیٹے ابوالقاسم کی ولی عہدی کا باضابطہ اعلان کیا۔ المنصور اور المعز کے دوران حکومت میں خود فاطمی خاندان کے اندر کئی اختلافات رونما ہوئے۔

مشرق کی طرف پیش قدمی کے لئے ایک راستہ کھلا رکھنے کی غرض سے خلیفہ اول عبیداللہ المہدی نے افریقہ کے مشرقی ساحل پر المہدیہ شہر بسایا اور 308ھ/ 920ء سے اسے اپنا دارالخلافۃ بنایا۔

مصر فوجی اور سیاسی دونوں لحاظ سے نہایت اہم مقام تھا۔ مصر کے اخشیدی فرمانروا کا دائرۂ حکومت شام اور حجاز تک وسیع تھا۔ اس لئے مصر پر تسلط قائم کرنے کا مطلب شام وحجاز پر قبضہ تھا۔ عبیداللہ مہدی نے اپنی خلافت کے چند سال کے دوران خانہ جنگیوں کے خاتمہ کے بعد مصر میں پاؤں جمانے کی کوشش کی، لیکن اس کے بیٹے ابوالقاسم کی سرکردگی میں اس کی دونوں مہمیں (پہلی مہم 301ھ/ 913ء تا 302ھ/ 915ء، اور دوسری مہم 307ھ/ 919ء تا 309ھ/ 921ء) ناکام رہیں۔ القائم نے اپنی جانشینی کے بعد تیسری مرتبہ 323ھ/ 925ء میں مصر فتح کرنے کی کوشش کی، لیکن اس دفعہ بھی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، منصور نے اپنے عہد میں تسخیر مصر کی طرف توجہ کی، اس نے مصر فتح کرنے کے لئے فوجی مہم بھی بھیجی، مگر اسے بھی ناکامی ہوئی۔

جنگی اور فوجی نقطۂ نگاہ سے فاطمیوں کو مصر میں گرچہ کامیابی نہیں ملی، لیکن بیعتِ علوی کی دعوت مصر کے گوشہ گوشہ میں اسماعیلی داعیوں نے خفیہ طور پر پہنچادی، اس لئے فتح کا مرحلہ اور آسان ہوگیا، دوسری طرف دولتِ عباسیہ یکسر مضمحل ہوچکی تھی، نیز مصر وبا اور قحط کا بُری طرح شکار ہورہا تھا۔ مصری، ترکوں کی فوجی حکومت کے ظلم وجور سے حد درجہ نالاں تھے، چنانچہ انہوں نے خود معزلدین اللہ فاطمی کو لکھا کہ فوج لے کر آیئے، ہم اطاعت کے لئے حاضر ہیں۔

خلیفہ المُعز فاطمی حکومت کا سب سے قابل حکمراں تھا۔ اس کے عہد میں برقہ سے مراقش، مالٹا، سارڈینیا، صقلیہ، نیز بحرِ متوسط کے بیشتر جزیروں پر قبضہ ہوچکا تھا، شمالی افریقہ میں جب وہ کامیابی سے ہم کنار ہوگیا تو اس نے مصر کو مسخر کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے جوہرالصقلی کو، جو بانیٔ دولتِ فاطمیہ ابوعبداللہ حسین کے ساتھ بھی رہ کر فاس (Fez) اور سجلماسہ وغیرہ فتوحات سے بڑی عظمت حاصل کرچکا تھا، خلعتِ شاہانہ سے سرفراز کیا، المعز نے اسے ایک لاکھ سوار اور بے شمار مال ومتاع اور ساز وسامان دے کر 353ھ / 964ء میں مصر روانہ کیا۔ 356ھ/ 967ء میں مصر میں اخشیدی فرماں روا کافور نے انتقال کیا۔ اس کے انتقال کے بعد 12 شعبان 358ھ/ یکم جولائی 969ء کو جوہرالصقلی، اندرونی خلفشار اور قحط کے شکار ملک کو بڑی آسانی سے مسخر کرتے ہوئے فُسطاط میں داخل ہوگیا۔ امیروں، وزیروں، عالموں اور قاضیوں نے فُسطاط کے دروازے پر جوہر صقلی کا استقبال کیا۔ جوہر نے عباسی خلیفہ کا نام خطبہ سے خارج کردیا اور جمعہ کے دن جامع عمرو بن عاص میں فاطمی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا، عباسی سیاہ شعار کے بجائے فاطمی سفید شعار مقرر کئے اور اذان میں حیّ علیٰ خیرالعمل پکارنے کا حکم دیا۔ اس نے سب سے پہلے اپنی ساری توجہ قحط کے سدّ باب اور امن کی بحالی کے بارے میں اقدامات پر مرکوز کی اور اس سلسلہ میں خاصی فیاضی سے کام لیا۔ اپنی فوجوں کے قیام کے لئے اس نے ایک نیا شہر قاہرہ بسایا اور 24 رجمادی الأولی 359ھ/ 4 اپریل 970ء کو جامع ازہر کا سنگِ بنیاد رکھا۔

11.3.3 بنوفاطمہ مصر میں

(الف) مکہ مدینہ

مصری سرحدوں کے علاوہ جو ممالک اِخشیدی اِمارت کے ماتحت تھے جوہرالصقلی نے وہاں فاطمی تسلط کو وسعت دینے کی زبردست کوشش کی، المُعز نے مکہ اور مدینہ میں خوب مال وزر صرف کئے، چنانچہ ان دونوں مقدس شہروں کے باشندوں نے بلاتاخیر 359ھ/ 970ء-971ء میں فاطمیوں کی اطاعت قبول کرلی اور المستنصر کے عہدِ حکومت تک فاطمیوں کی زیرِ سیادت رہے۔

(ب) فتح صقلیہ

اغالبہ کے جانشین ہونے کی حیثیت سے فاطمیوں کی نئی حکومت صقلیہ (سِسلی) سے بے توجُّہی نہیں برت سکتی تھی۔ عبیداللہ مہدی نے شمالی افریقہ میں اپنے استحکام اور امن وامان کے قیام کے بعد صقلیہ کے لئے نئے فاطمی عامل علی بن محمد بن ابی الفوارس کو باشندگانِ صقلیہ کی مرضی اور مطالبہ کے مطابق نامزد کیا۔ اس نے ابوالعباس اغلبی سابق فرمانروائے افریقہ کے عہد میں بھی ولایتِ صقلیہ کی خدمات انجام دی تھی۔ ابن ابی الفوارس نے صقلیہ کا اقتدار حاصل ہونے کے بعد حکومتِ اغالبہ کے زوال کے ٹھیک پندرہویں دن یعنی 11 رجب 296ھ/ 908ء کو صقلیہ کے آخری اغلبی والی (گورنر) احمد بن ابی الحسین بن رباح کو جسے سب

سے آخری اغلبی تاجدار ابومضر زیادۃ اللہ نے مقرر کیا تھا، گرفتار کر کے پابہ زنجیر عبیداللہ مہدی کی خدمت میں پیغام تہنیت کے ساتھ افریقہ بھیج دیا، اس طرح علی بن محمد بن ابی الفوارس کے ہاتھوں صقلیہ میں دولت اغلبیہ کا خاتمہ ہوا، لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ عبیداللہ مہدی نے موقعہ ہاتھ لگنے پر علی بن ابی الفوارس کو افریقہ میں اس کی آمد کے بعد دارالحکومت رقّادہ کے جیل میں ڈال دیا اور اس کی بجائے اپنے معتمد خاص حسن بن احمد بن ابی الخنز یر کو صقلیہ کی ولایت پر مامور کیا، ابن ابی الخنز یر دولتِ فاطمی کا وہ پہلا گورنر تھا جو افریقہ سے نامزد ہو کر آیا اور صقلیہ کی حکومت کا دولتِ فاطمی کے نقطۂ نظر سے جدید نظم و نسق قائم کیا۔ اس نے حکومتِ صقلیہ کو مختلف صوبوں بلرُم (Palermo)، جرجنت ،قصریانہ (Castrogiovanni) اور مسینا (Mesina) وغیرہ میں تقسیم کیا۔ ہر صوبہ پر الگ الگ والی (گورنر) مقرر کیئے۔ صقلیہ کی حکومت کا سرکاری مذہب شمالی افریقہ کی طرح شیعی قرار دیا۔ اسی لئے جس طرح مذہب کے بدلنے سے افریقہ کے مذہبی و نیم مذہبی عہدوں میں تبدیلی عمل میں آئی، اسی طرح صقلیہ کے عہدوں میں بھی ردّ و بدل ہوا، چنانچہ اسی سلسلہ میں سابق قاضیِ صقلیہ کو معزول کر کے اسحٰق بن منہال کو قاضی بنایا گیا۔

دوسری طرف صقلیہ کے، تمام تر رومی باشندوں پر مشتمل مشرقی حصہ نے جسے ابراہیم بن احمد اغلبی نے اپنے آخری حملے میں زیر کیا تھا، اسلامی حکومت سے بغاوت کر کے اٹلی کی عیسائی حکومتوں سے مدد طلب کی اور اس کی وجہ سے صقلیہ اور اٹلی میں اسلام اور عیسائیت کی جنگ کا بھی دوبارہ آغاز ہوگیا۔ صقلیہ میں فاطمی تسلط کے بعد سب سے پہلی بغاوت 298ھ/ 910ء میں مشرقی صقلیہ میں اہلِ دلش کی جانب سے برپا ہوئی تھی، ابن ابی الخنز یر نے فوراً یہ بغاوت فرو کی۔

عبیداللہ مہدی نے ابن ابی الخنز یر کے بجائے علی بن عمر البلوی فاطمی (299ھ/ 911ء) کو والیٔ صقلیہ مقرر کیا۔ باشندگان صقلیہ نے علی بن عمر کی آمد کے ساتھ ہی دولت فاطمی کے خلاف علانیہ علمِ بغاوت بلند کر دیا، چنانچہ صقلیہ کے باغیوں نے وہاں کے گورنر علی بن عمر البلوی کو معزول کر کے 304ھ میں ترغیب و ترہیب کے ذریعہ اور اپنی وفاداری پر اطمینان دلا کر، احمد بن زیادۃ اللہ بن قُرہُب عباسی کو خود اپنا عامل و امیر منتخب کر لیا۔

ابن قرہُب نے عبیداللہ مہدی سے منحرف ہو کر عباسی خلیفہ کی حمایت کا اعلان کر دیا اور اس کی طرف سے باضابطہ سندِ ولایت بھی حاصل کر لی اور افریقی حکومت کے خلاف دوبار اپنا بحری بیڑا بھیجا۔ پہلی مہم میں عبیداللہ مہدی کے بحری سردار حسن بن احمد بن ابی الخنز یر کو شکست ہوئی اور وہ ابن قُرہُب کے بیٹے محمد کے ہاتھوں مارا گیا۔ لیکن دوسری مہم کے دوران ابن قُرہُب کے بیڑے کو زبردست شکست ہوئی اور بالآخر اہلِ صقلیہ نے اپنی وفاداری کا رخ بدلتے ہوئے اور مہدی کی طاقت سے خوف کھا کر احمد بن قُرہُب کو پابہ زنجیر عبیداللہ مہدی کے حوالہ کر دیا، جس نے اسے ابن ابی الخنز یر کی قبر پر 304ھ/ 916ء میں موت کے گھاٹ اتروادیا۔

336ھ/ 948ء میں منصور نے خلیل بن اسحٰق والیٔ صقلیہ کو معزول کر کے الحسن بن علی بن ابوالحسن الکلبی کو عامل و والی بنا کر صقلیہ روانہ کیا۔ اس نے استقلال کے ساتھ اپنی حکومت کی صقلیہ میں داغ بیل ڈالی اور اس کے بعد سے صقلیہ کے عامل اسی خاندان سے مقرر ہوتے رہے اور ان کا میلان روز بروز خود مختار (Autonomous) حکومت کی طرف بڑھتا رہا۔

(ج) شام میں توسیعِ حکومت

المعز کے لئے شام میں پاؤں جمانا زیادہ مشکل تھا، کیوں کہ بغداد کے بوبہی فرمانروا کے حمایت یافتہ اخشیدی عامل نے بحرین کے قرامطہ سے ایک عہدنامہ پر دستخط کر رکھا تھا، جوہر کے نائب جعفر الفلاح نے دمشق فتح کرلیا، لیکن وہ اواخر 360ھ/ اگست 971ء میں قرمطی قائد الحسن الأعصم کے خلاف ایک لڑائی میں لڑتا ہوا مارا گیا، ادھر الحسن الأعصم کو مصر کی طرف پیش قدمی کے دوران جوہر کے کامیاب دفاع کا سامنا کرنا پڑا، بالآخر اس نے اواخر 361ھ/ دسمبر 971ء میں راہِ فرار اختیار کی، جوہر فلسطین کے صرف ایک حصہ پر دوبارہ قبضہ کرسکا، 363ھ/ اوائل 974ء میں الحسن الاعصم بدویوں (Bedouins) پر مشتمل امدادی فوج کے ساتھ قاہرہ پر دوبارہ حملہ کرنے کے لئے واپس آیا، لیکن اس کی فوج مال و زر کی تحریص کا شکار ہوکر اس کا ساتھ چھوڑ گئی اور الحسن الأعصم کو شکستِ فاش کا منہ دیکھنا پڑا، بعد ازاں فاطمی فوج پھر دمشق پر قابض ہوگئی، لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد دمشق ایک ترک جانباز اُلپتکین کے تصرُّف میں چلا گیا۔

21/شوال 361ھ/ 5/اگست 972ء کو المعز نے، المغرب کی حکومت، صنہاجی بربروں کے شیخ بُلکّین کو سونپ دی اور 7/رمضان 362ھ/ 11/جون 973ء کو قاہرہ پہنچ گیا المعز نے قاہرہ پہنچ کر الپتکین کے خلاف 365ھ/ 975ء میں پیش قدمی کا ارادہ کیا تھا کہ اس کی یعنی المعز کی موت ہوگئی۔

368ھ/ 978ء میں خلیفہ العزیز نے دمشق واپس لینے میں کامیابی حاصل کرلی، لیکن اسے الپتکین کے حامی قرامطہ کو ہٹانے کے لئے خراج دینا پڑا۔ منصوبہ کی توسیع کی خاطر العزیز کے لئے فلسطین اور شام پر قبضہ اور حلب کو زیر تصرُّف لانا ضروری تھا، فلسطین اور شام میں شورش کی آگ مسلسل بھڑکتی رہتی تھی، جسے کبھی تو باغی (فلسطین کے خاندانِ طیٔ کے افراد اور بنو جراح) ہوا دیتے تھے اور کبھی غیر مطمئن عامل اور سپہ سالار۔ اس سلسلہ میں العزیز نے 373ھ/ 983ء اور 382ھ/ 992ء اور اسی طرح 385ھ-384ھ/ 994ء-995ء میں جو کوششیں کیں وہ ناکام رہیں اور اس کا دائرہ اقتدار مشکل سے طرابلس تک وسیع ہوسکا۔ تاہم اسی زمانہ میں فاطمیوں کی حکومت بحرِ اوقیانوس (Atlantic Ocean) سے بحیرۂ قلزم (Red Sea) تک (یعنی حجاز، یمن اور شام میں بلکہ ابوالذّ وّاد بن مُسیب عُقیلی کے زمانے میں کچھ عرصے کے لئے موصل میں بھی) تسلیم کرلی گئی۔

شام میں شورشیں برابر جاری رہیں، اس لئے یہ ملک کسی زمانے میں بھی مستحکم طور پر فاطمیوں کے قبضے میں نہ رہ سکا۔ حاکم کے عہد میں امارتِ حلب فاطمیوں کے تحت آگئی۔ فلسطین میں مُفرّج بن دَغفل جراحی نے حاکم کے خلاف فتنہ کھڑا کردیا۔ الظاہر کے زمانے میں بنو جراح، مرکزی شام کے بنو کلب اور شمالی شام کے بنو کلاب کے اتحاد کی وجہ سے شام میں فاطمی تسلط خطرے میں پڑ گیا۔ 415ھ/ 1025ء میں حلب پر صالح بن مرداس الکلابی نے قبضہ کرلیا۔ فاطمی سپہ سالار اُنوشتگین دُزبَری نے 429ھ/ 1038ء میں المستنصر کے عہد میں دمشق اور حلب پر دوبارہ قبضہ کیا، اس کی بدولت فاطمیوں کی حدودِ مملکت حرّان، سروج اور رقہ تک پھیل گئی۔ بہر حال حلب ناصر الدولۃ کے عہد میں مختلف نشیب و فراز سے گذرنے کے بعد 452ھ/ 1060ء میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فاطمیوں کے تصرُّف سے نکل کر بنو مرداس کے قبضے میں چلا گیا اور وہاں ایک سلجوقی عامل کا تقرر عمل میں آیا۔

اسی طرح پانچویں صدی ہجری مطابق گیارہویں صدی عیسوی میں بھی شام اور فلسطین زیادہ عرصے تک فاطمیوں کے زیرِ تسلط نہ رہ سکے۔ وہاں مسلسل بدامنی کا دور دورہ رہا ارمن سپہ سالار بدر الجمالی کی شام اور دمشق کی بازیابی اور وہاں فاطمی سیادت کی برقراری کی کوئی کوشش بارآور نہ ہوئی۔

11.3.4 نظام حکومت

11.3.4.1 خلافت

اسمٰعیلی نظام میں امام کا انتخاب اپنے پیشرو کی ذاتی نامزدگی سے بذریعہ نص ہوتا ہے، جسے رضائے الٰہی کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ یہ نامزدگی لوگوں سے صیغۂ راز میں رکھی جاسکتی تھی اور اس کا علم صرف چند معتبر اشخاص کو ہوتا تھا اور حسبِ خواہش مناسب وقت پر ظاہر کی جاتی تھی۔ فاطمی سلطنت میں خلیفہ الحاکم سے پہلے ہر چیز باقاعدہ رہی۔ الحاکم کے غائب ہونے کے بعد نامزد وارث (خلیفہ کے بھتیجے عبدالرحمٰن بن الیاس) کو ملکہ سِت الملک کے حکم سے گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا گیا اور اسی کے حکم کے مطابق الحاکم کے چھوٹے بیٹے علی الملقب بہ الظاہر کی امامت کا 16 برس کی عمر میں اعلان کردیا گیا، چوں کہ امامت کے لئے عمر کی کوئی قید نہ تھی، اس لئے الحاکم کی تخت نشینی کے وقت اس کی عمر 11 برس تھی، جب کہ المستنصر کی عمر 7 سال، المستعلی کی 8 سال، الآمر کی 5 سال، الظافر کی 17 سال، الفائز کی 5 سال اور العاضد کی 9 سال تھی۔ چنانچہ اصل اقتدار ایک نائب کے ہاتھوں میں چلا جاتا تھا اور کئی موقعوں پر اصل اختیار سپہ سالاروں اور وزراء کے ہاتھ میں رہتا تھا، حتیٰ کہ وہ نئے خلیفہ کے سنّ بلوغ کو پہنچ جانے پر بھی اختیارات پر قابض رہتے تھے، اسی لئے خلفاء اکثر اپنے وزراء اور سپہ سالاروں کے سامنے بالکل بے بس ہوتے تھے۔

المستنصر کے بڑے بیٹے نزار کی باقاعدہ نامزدگی کے باوجود وزیر الافضل نے اس کے چھوٹے بیٹے المستعلی کی خلافت کی حمایت کی، اس کے نتیجے میں نزار کی قیادت میں ایک بغاوت برپا ہوئی جو اس کی موت اور بعد ازاں اسماعیلی جماعت میں نئے تفرقہ پر منتج ہوئی۔ الآمر کی موت کے بعد، جو 524ھ/ 1130ء میں نزاریوں کی ایک سازش کا شکار ہوگیا تھا، جانشینی کے سلسلہ میں کوئی قاعدہ اور ضابطہ باقی نہ رہا، بلکہ اس کے بعد ہولناک بحران کا آغاز ہوا اور بغاوتوں کے کئی خونریز واقعات رونما ہوئے۔

المستنصر کے عہد سے ہی خلفاء کے اقتدار میں کمزوری کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ المستعلی کے زمانے میں حقیقی اربابِ اقتدار صاحبُ السیف (فوجی یا شمشیر بردار) وزراء تھے، بنو فاطمہ کے ضعف کی وجہ سے وہ خلافت کے لئے عوام کے نزدیک زیادہ قابل قبول نہ رہے، اسکندریہ اور قاہرہ جیسے مرکزی شہروں میں عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ فاطمی خلافت جہاں داخلی ابتری سے دوچار ہورہی تھی، وہیں وہ صلیبی جنگوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔ الغرض مختلف مصیبتوں میں گھر جانے کے بعد فاطمی خلافت روز بروز زوال کا شکار ہوتی چلی گئی۔

11.3.4.2 وزارت

ابتدائے اسلام میں وزیر کا لفظ کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ منصب عباسیوں نے اہل فارس سے لیا ہے۔ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے جو شخص وزیر کے لقب سے یاد کیا گیا وہ ابوسلمہ حفص بن سلیمان الخلال، سفاح کا وزیر تھا، ورنہ اس سے پہلے لفظ کاتب

(سکریٹری) ہی ان معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ فاطمی حکومت میں منصب وزارت کی اہمیت میں بتدریج اضافہ ہوا، شمالی افریقہ کے عہد حکومت میں ایسے عمال کا وجود نہیں ملتا جنہیں وزیر کا لقب حاصل ہوا ہو، خلفاء اور ان کے عمال و رعایا کے مابین رابطے کا کام انجام دینے والا شخص واسطہ کہلاتا تھا، تاہم خلفاء کبھی کبھی ایک ایسا نائب مقرر کر لیتے تھے جو درحقیقت وزیر کے لقب کا حامل ہوتا تھا۔ مصر میں خلیفہ العزیز باللہ نے یہ لقب سب سے پہلے نومسلم یہودی ابوالفرج یعقوب بن کِلّس کو 368ھ/ 978ء میں عطا کیا۔ ابتداء میں وزیر بحیثیت 'وزیر التنفیذ' حاکمِ وقت کی خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا فرض سرانجام دیتا رہا۔ لیکن المستنصر کے دوسرے دور میں شام کے سپہ سالار بدر الجمالی نے اس سے کلی اختیار حاصل کر لئے اور وہ 'وزیر التفویض' (ایک ایسا وزیر جسے حکومت کے تمام اختیارات سپرد کر دئے گئے ہوں) ہو گیا، چوں کہ وہ بنیادی طور پر ایک فوجی عہدہ پر فائز تھا، لہٰذا اسے 'وزیر القلم والسیف' یا محض 'وزیر السیف' کہا جانے لگا۔ اس کے بعد جتنے بھی وزیر برسر اقتدار آئے، کلی اختیارات کے مالک رہے اور 'وزراء السیف' کہلائے۔ وزیر السیف صرف فوجوں کا سردار (امیر الجیوش) ہی نہیں بلکہ انتظامیہ اور عدلیہ کے علاوہ امور شریعت کا بھی سربراہ ہوتا تھا اور اس کے القاب میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) اور رئیس المبلّغین بھی شامل تھے۔

العزیز کے 20 سالہ دور حکومت میں 8 وزراء، الحاکم کے 19 سالہ عرصے میں 5 وزراء اور ایک روایت کے مطابق المستنصر کے عہد میں کل 24 وزراء مقرر ہوئے۔

11.3.4.3 عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ رواداری

فاطمی وزارت میں کئی وزیر بشمول العزیز اور الحاکم کے عہد میں عیسیٰ بن نسطورس، زُرعۃ بن عیسیٰ بن نسطورس، فہد بن ابراہیم نصرانی، منصور بن عَبدون اور الحافظ کے عہد میں بہرام، یانس اور ایک دوسرا ارمن وزیر جو وزیر السیف اور سیف الاسلام کے لقب سے ملقب تھا، عیسائی تھے۔ اس کے برعکس اگرچہ یہودی اکثر اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے، لیکن ایسے کسی یہودی کا پتہ نہیں چلتا جو حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے بغیر وزارت کے منصبِ اعلیٰ پر فائز ہو سکا ہو۔

الحاکم کے دور کو نظر انداز کر دیا جائے تو عیسائیوں اور یہودیوں سے رواداری کا سلوک فاطمیوں کے خاندان کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ ارمنی ابو صالح اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ فاطمی خلفاء کی طرف سے گرجا گھروں کی تعمیر اور مسیحی اداروں کو مالی امداد دینا ان کی رواداری کا کھلا ثبوت تھے۔

ابوالفرج یعقوب بن کِلّس، حسن بن ابراہیم بن سہل التُستَری اور ابن الفلاحی نومسلم وزراء تھے۔ سنی حضرات بھی فاطمی حکومت میں بڑے عہدوں پر فائز ہوئے، رضوان بن والخش خلیفہ الحافظ کا وزیر بنا، اسی طرح احمد بن افضل جمالی اور ابن سلار کردی شافعی کو خلیفہ ظافر (543ھ مطابق 1148ء) کے عہد میں وزارت کا منصب سونپا گیا۔

11.3.4.4 سلطنت کی تنظیم

فاطمیوں کی حکومت کا طریقہ اور ملک کا نظم و نسق عام طور پر بنی عباس یا ان کے پیشرو ایرانی فرمارواؤں کے اصول پر مبنی تھا۔ شمالی افریقہ میں رسوم و آداب کا ماحول پیدا کر لینے کے باوجود فاطمی سلطنت نے ابھی اپنی تنظیم میں کوئی خاص ہیئت ترکیبی پیدا نہ کی

تھی، جبکہ مصری دور کے ابتداء ہی سے خلیفہ المعز اور العزیز نے فاطمی خاندان کا اقتدار بڑی ٹھوس بنیادوں پر قائم کیا۔ جوہر الصقلی نے یعقوب ابن کِلّس (وفات 381ھ/ 991ء) اور اُسلوُج کے ساتھ مل کر نظم ونسق اور شعبہء مالیات میں بہترین تنظیم ترتیب دی جسے دونوں خلفاء نے عملی جامہ پہنایا، یہی تنظیم فاطمی اداروں کے پیچیدہ نظام کی بنیاد بنی۔ یعقوب بن کلّس بغداد کا رہنے والا تھا۔ اس کی رہنمائی میں فاطمیینِ مصر کا ابتدائی دور بہت درخشاں ثابت ہوا۔ اس نے علم وہنر کی بھی خدمت کی، مصر میں ایک اکیڈمی قائم کی جس میں چند بلند پایہ عالم برسرکار رہتے۔

فاطمیوں کا نظم ونسق ایک مضبوط مرکزی نظام پر قائم تھا جس کا حاکمِ اعلیٰ خلیفہ یا اس کا وزیر ہوتا تھا۔ ہر شعبہ مرکزی انتظامیہ کے ماتحت ہوتا تھا۔ صوبائی حکومتوں کو صحیح معنوں میں حقوقِ خوداختیاری حاصل نہ تھے۔ ملکی انتظام دیوانوں (دفاتر معتمدی یا وزارتوں) کے ذریعے چلایا جاتا تھا جن کے اجلاس کبھی تو صدارتی محل میں ہوتے تھے اور کبھی قصرِ خلافت میں۔ خلیفہ کے دو محل تھے: ایک ''قصرِ کبیر شرقی'' اور دوسرا ''قصرِ صغیر غربی''، اگر ایک ساتھ نام لینا ہوتا تو ''قصورِ زاہرہ'' کے نام سے موسوم کیا کرتے تھے۔

صدارتی محل کے منصب داروں میں حاملُ المظلة (چتر بردار) حاملُ سیفِ الخلیفة (شمشیر بردار)، صاحبُ المجلس یا اَمینُ الدولة، صاحبُ الرسالة یا الأمیر الثقة، متولّی زمام القصر، متولّی زمام الأقارب، طبیبِ خاص، قرّاءِ خاص اور شعرائے دربار تھے۔ شعرائے دربار میں سے محمد بن ہانیٔ اندلسی، تمیم بن المعز اور عمارة بن ابی الحسن اور علی بن زیدان الیمنی مشہور تھے۔

فوجی اور غیر فوجی اہلکار (اَربابُ الأقلام واَربابُ السیوف) دونوں خلیفہ وقت کی ذاتی ملازمت سے منسلک تصور کئے جاتے تھے۔ عام سرکاری محکموں (حربیہ، انتظامیہ، مالیہ، عدلیہ، شرعیہ) کے ملازمین کی نہایت باضابطہ تنظیم ایک سلسلہ مدارج کے تحت کی گئی تھی۔ بعض فوجی اہلکار (اربابُ السیوف) سرکاری ملازمت عامہ سے تعلق رکھتے تھے، بعض ملازمین خواجہ سرا، مختلف خواجہ سرا خاص شاہی ملازمت سے متعلق تھے۔

اَربابُ القلم میں وزیرُ القلم، عملۂ وزارت اور مختلف دیوانوں کے سربراہ، ناظم خزانۂ عامرہ، محکمۂ شریعت کے بعض اہلکار مثلاً قاضیُ القضاة، رئیس المبلغین، محتسب، قرّاء قرآن اور دوسرے اراکینِ دربار مثلاً شاہی اَطباء (ڈاکٹرس) اور شعراء شامل تھے۔

عہدِ فاطمی کے اہم ترین دفاتر میں دیوانُ الِانشاء والمکاتب، برید (برّی ڈاک، بحری ڈاک، فضائی ڈاک بہ ذریعہ تربیت یافتہ کبوتر) اور پولیس ہوتے تھے۔

11.3.4.5 فاطمیوں کا فوجی نظام

فاطمیوں نے اپنے عہدِ حکومت میں جو نظامِ جنگ قائم کیا تھا وہ حد درجہ مضبوط و مستحکم تھا، انھوں نے جو فوجی نظام استوار کیا تھا وہ ایک ترقی یافتہ اولوالعزم حکومت کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ فاطمیوں کی برّی فوج (Army) جس طرح کافی منظّم اور مستحکم تھی اسی طرح ان کے اپنے بحری بیڑے (Navy) بھی منظّم اور مستحکم تھے۔

وزارت دیوان الجیش (وزارتِ دفاع) میں دو محکمے دیوان الجیش اور دیوان الرواتب ہوتے تھے، یہ پوری وزارت دیوان الجیش والرواتب کے نام سے مشہور تھی۔ یہاں سپاہیوں اور فوجیوں کے احوال کا مکمل خاکہ ہر وقت تیار رہتا تھا۔ فوج پانچ حصوں میں منقسم ہوتی تھی:

مقدمہ (سب سے آگے/Vanguard)، قلب (درمیانی حصہ/ Centre)، میمنہ (فوج کا دایاں حصہ/ Right Wing)، میسرہ (فوج کا بایاں حصہ/ Left Wing) اور مؤخرہ یا ساقۃ الجیش (فوج کا پچھلا حصہ/ Rear Guard)۔

دیوان الجہاد (وزارتِ بحریہ/ Navy): اسے دیوان العمائر بھی کہتے تھے۔ تجارتی جنگی اور سفری جہازوں کی تیاری، نظم، تربیت اور سفر واجراء کا کام اس کے ذمہ تھا، ملاحوں اور سمندری افسروں کی تربیت اور کارگزاری کی ذمہ داری بھی اس وزارت پر عائد ہوتی تھی، اس محکمہ کا اپنا خاص بجٹ ہوتا تھا۔

دیوان الاِقطاع (محکمۂ جاگیر): محکمۂ فوج سے ملحقہ محکموں میں ایک دیوان الاقطاع (محکمۂ جاگیر) بھی تھا۔ یہ فوجیوں کو حسبِ ضرورت زمین اور جائیداد عطا کیا کرتا تھا، دوسرے لوگ بھی اس سے بہرہ ور ہو سکتے تھے۔ یہ جاگیریں حقِ ملکیت کے بغیر حینِ حیات ہوتی تھیں۔ یہ زمینیں ان لوگوں سے حاصل کی جاتی تھیں جن کے پاس فاضل ہوتی تھیں یا کسی اور سبب سے ضبط کر لی جاتی تھیں۔ اس طرح اسماعیلیوں نے اِبطالِ ملکیتِ زمین (زمین کے مالکانہ حقوق چھیننے) کی بنیاد اشتراکیوں (کمیونسٹوں) کے مانند ڈال دی تھی، جسے وہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے، ان زمینوں سے استفادہ کا حق دیا جاتا تھا، ملکیت کا نہیں، وفات کے بعد یہ زمینیں پھر خلیفہ کی ہو جاتی تھیں۔ یہ جاگیریں اور زمینیں نہ مستقل ہو سکتی تھیں اور نہ ہی ان میں وراثت چلتی تھی۔

11.3.4.6 معاشی سرگرمیاں

شمالی افریقہ میں شہری زندگی خوشحال اور آسودہ تھی۔ اس خوشحالی کے باعث ابتدائی فاطمی خلفاء کو یہ موقع ملا کہ وہ اپنے قیمتی وسائل کو بروئے کار لا کر ایک مضبوط بحری بیڑا اور فوج تیار کریں۔ مصر نے فاطمیوں کے عہدِ عروج میں قدیم فراعنہ اور بعد کے بطلیموسی فرماں رواؤں کے درخشاں زمانوں کی یاد تازہ کر دی تھی، اپنے انتظامی اور مالی نظام کے استحکام، بیش قرار محاصل اور واجب الأداء رقم، حکومت کی مملوکہ کانوں سے آمدنی، تجارت اور محصول، درآمد کی یافت اور جنوبی سوڈان/نوبیہ (Nubia) کی کانوں سے بڑی مقدار میں سونے کی برآمد کی بدولت عہدِ فاطمی شورشوں اور بغاوتوں کے باوجود بڑی خوشحالی سے بہرہ ور رہا۔

دریائے نیل میں ہر سال آنے والی طغیانی مصر کی زمین کو زرخیز بنا دیتی تھی اور اس کی زراعت کو متعدد فصلیں پیدا کرنے کے قابل بنا دیتی تھی۔ دولتِ فاطمیہ کے ذرائع آمدنی میں خراج (زمین پر بطور ٹیکس وصول کیا جانے والا لگان)، الجوالی وجزیہ (اہلِ ذِمّہ یعنی یہود ونصاریٰ سے وصول کیا جانے والا ٹیکس)، زکوۃ اور المستغلات (وہ معادن یعنی کانیں جن کے محصولات سے کافی آمدنی ہوتی تھی) انتہائی اہم تھے۔ دیوانُ الخراج اور دیوان الجوالی ٹیکس اور جزیہ کے اجراء، نفاذ اور سقوط سے متعلق کام کرتے تھے۔

دولتِ فاطمیہ اپنی دولت وثروت اور شان وعظمت کے اعتبار سے مسلم سلطنتوں میں سب سے بڑی حکومت تھی۔ قصرِ شاہی میں بہت سے محکمے اور توشہ خانے تھے، ان میں سے چند یہ ہیں: خزانۃ الکِسوۃ، درزی خانہ، خزانۃ الکسوۃ الباطنۃ، خزائنِ جواہر، خزائنُ السلاح، خزائن فرش وأمتعہ، خزانۃ السراج، خزانۃ الشراب، خزانۃ الطعام، خزانۃ الخیم، خزائن البنود، حواصلِ المواشی اور دار الضیافۃ وغیرہ۔

فاطمیوں میں مستنصر سب سے زیادہ دولت مند تھا اور عیش وعشرت پر بہت روپیہ خرچ کرتا تھا۔ فاطمی دور فنِ تعمیر اور صنعت وحرفت کی ترقی کے لئے بھی دنیا بھر میں مشہور ہوا۔ صنعت وحرفت کے میدان میں اولیت پارچہ بافی (یعنی کپڑا بُننے کے پیشہ) کو حاصل تھی، اس کا فروغ سن کی کاشت کا مرہون منت تھا اور یہ صنعت تنّیس (Tynes)، دمیاط اور دبیق کے علاقوں میں جاری تھی۔ قاہرہ میں مختلف قسم کے کپڑے تیار کئے جاتے تھے، الفسطاط اور اسکندریہ میں لکڑی کی صنعت، شیشہ سازی اور بلورسازی، تنّیس میں چاقو اور قینچیوں کی صنعت جاری تھی، نیز سفال سازی (ٹھیکرا)، کوزہ گری، پچی کاری، دھاتوں کا کام، ہاتھی دانت کا کام، کاغذ سازی، چینی اور تیل کی تیاری سلطنت فاطمی کے عہد کی خصوصیات ہیں۔ فاطمیوں نے اپنے دورِحکومت میں متعدد مقامات پر ٹکسال (دارالضرب) قائم کررکھے تھے جہاں سکّے ڈھالے جاتے تھے۔ یہ ٹکسال صرف ایک ہی شہر میں نہیں تھے بلکہ اسکندریہ، قوص، صور، عسقلان وغیرہ جیسے متعدد مقامات میں قائم کئے گئے تھے، اس دفتر کا سربراہ قاضی القضاۃ ہوتا تھا جس کے ساتھ پورا ایک عملہ ہوتا تھا۔ خلفاءِ فاطمیین کے سکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ملکی اور سیاسی امامت سے زیادہ دلچسپی دینی امامت میں تھی، خاص طور پر اس بارے میں خلیفہ المعز زیادہ سرگرم تھا۔

تحائف، ملبوسات، فیاضانہ عطیوں اور الیازوری اور الأ فضل جیسے وزراء کی شاہ خرچیوں سے صنعت وحرفت اور تجارت کو بڑا فائدہ پہنچا۔ مصر کے تجارتی تعلقات حبشہ، نوبہ، قسطنطنیہ، اٹلی، املفی (Amalfi)، پیزا، وینس، صقلیہ، شمالی افریقہ، ہسپانیہ اور یورپ بالخصوص براہِ صقلیہ جیسے بہت سے ممالک سے قائم ہوگئے، ہندوستان سے تجارت بحیرہٴ قلزم پر واقع قُوص اور عَیذاب کی بندرگاہوں سے ہوتی تھی اور یہیں سے تجارتی بحری جہاز روانہ ہوتے تھے۔

11.3.4.7 ثقافتی سرگرمیاں

عہدِ فاطمی میں ذہنی، ادبی اور فنی سرگرمیوں کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ شمالی افریقہ میں درباری شعراء نے بڑی قدر ومنزلت پائی، ان میں سے ابن ہانیٔ اندلسی تھا۔ قاضی النعمان نے تاریخِ فقہ اور علمِ باطن پر کتابیں لکھیں اور جعفر ابن منصور الیمنی نے بھی کتابیں تحریر کیں۔

مصر میں ثقافتی سرگرمیاں شمالی افریقہ سے بھی زیادہ زوروں پر تھیں۔ اٹھارہویں صدی کے یورپ کی طرح عہدِ فاطمی کی بھی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اس میں ذہنی جستجو کا غیر معمولی اظہار ہوا، ایسی کتابوں کی جوش وخروش سے حوصلہ افزائی کی جاتی تھی جن کا تعلق مذہب، اسمٰعیلی عقائد کی تشریح، قرآن کی تمثیلی اور مجازی رنگ میں تفسیر اور فلسفے سے تھا یا جو علومِ طبیعی (سائنس) کو مقبولِ عام بنانے کے لئے تصنیف کی جاتی تھیں۔ فاطمیوں کا زمانہ اربابِ علم وفضل کی وجہ سے بھی خاص طور پر ممتاز تھا، ریاضی داں علی الحسن بن الہیثم البصری، ہیئت داں علی بن یونس الصدَفی نمایاں نام ہیں۔ اس عہد میں مصنفین کی ایک کثیر تعداد موجود تھی جنھوں نے مختلف موضوعات پر تصنیفات پیش کیں، حاکم کے عہد میں عمار بن علی الموصلی نے (المنتخب فی علاج العین) تصنیف کی، اس کے ہم عصر علی بن حسین نے بھی اسی فن کی ایک دوسری کتاب تذکرۃ الکحالین تیار کی۔ یہ کتابیں علاجِ چشم کی 32 بلند پایہ عربی تصانیف میں اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہیں۔ مؤرخین میں سے ابن زولاق، المُسبِّحی، القُضاعی، کتاب الدیارات کے مصنف الشُّابشتی نے العزیز کے لئے جغرافیہ پر کتاب لکھی۔

معلومات کی جانچ

1. عبید اللہ مہدی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2. احمد بن زیادۃ اللہ قُرہُب کون ہے؟

11.4 خلاصہ

فاطمیوں کی سیاسی تاریخ دو مختلف ادوار میں بٹی ہوئی ہے، پہلا دور جس کا آغاز 297ھ/ 908ء یعنی قیروان میں ابوعبداللہ حسین کی کوششوں سے مہدی کی تخت نشینی کی تاریخ اور المہدیہ کی تاسیس سے ہوتا ہے اور یہ دور 362ھ/ 973ء میں اس وقت تمام ہو جاتا ہے جب خلیفہ المعز لدین اللہ شمالی افریقہ سے رخصت ہو کر قاہرہ کو اپنا دارالخلافت بناتا ہے۔ یہاں سے اب مصری دور شروع ہوتا ہے۔ یہ دور 362ھ/ 973ء سے 567ھ/ 1171ء میں صلاح الدین ایوبی کے ذریعے زوال خلافت تک جاری رہتا ہے۔ الغرض 297ھ سے 567ھ (908ء سے 1171ء) تک فاطمی حکومت قائم رہی، یعنی قمری تقویم کے حساب سے 270 سال تک اور شمسی کیلینڈر کے لحاظ سے 262 سال تک۔ ڈھائی سو سال سے زیادہ اور پونے تین سو سال سے کم مدت کچھ بہت زیادہ نہیں ہے۔ لیکن مختلف اعتبارات سے تاریخ میں یہ غیر معمولی اہمیت اور امتیاز کی حامل ہے۔ اس حکومت کو عیسائیوں، مسلمانوں اور خود اپنی جماعت کے ایک فرقہ سے جنگ کرنی پڑی، پھر بھی علمی، ادبی، تمدنی، انتظامی، معاشرتی، حربی، اصلاحی، تعمیری اور ثقافتی اعتبار سے اس نے جو آثار ونقوش چھوڑے ہیں وہ ثبات و دوام کا فخر حاصل کر چکے ہیں۔

اسلامی مصر کی تاریخ میں عہدِ فاطمیین سے بڑھ کر کسی دور میں مسلم سلطنت کے تئیں جوش و ولولہ، شان و شوکت اور کشور کشائی کا اظہار نہیں ہوا۔ اس نے شمالی افریقہ میں بزورِ شمشیر اپنے قدم جمائے اور بالآخر مصر میں ایک طاقتور سلطنت قائم کر لی۔

عہدِ بنو فاطمہ میں عروج وعظمت کے کئی ادوار آئے۔ یہ عظمت اس خاندان کو اپنی اداری و مالیاتی تنظیم، اس کی معاشرتی ترقی، اعلیٰ درجہ کی فکری وفنی سرگرمی، دربار وقصرِ خلافت کی شان وشوکت اور اس کی پورے آداب ورسوم کے ساتھ منعقد ہونے والی پرتکلف ضیافتوں کی بدولت نصیب ہوئی، جنھیں دیکھ کر دربارِ قسطنطنیہ سے مقابلہ کا خیال پیدا ہوتا تھا۔

مصر اس زمانہ میں گہوارۂ تہذیب وتمدن اور علم وفن تھا۔ فاطمیوں کا کتب خانہ قرطبہ اور بغداد وغیرہ کے کتب خانوں کی نظیر تھا۔ مسلسل ڈھائی سو سال سے زیادہ تک اس خاندان کی تاریخ خطۂ بحیرۂ روم میں واقع مشرق قریب کے ممالک کی تاریخ پر سایہ فگن رہی، اس کا دائرۂ عمل مغرب میں بحرِ اخضر، مشرق میں دریائے فرات، شمال میں ایشیائے کوچک (روم) اور جنوب (سوڈان) میں نوبیہ (Nubia) تک وسیع تھا، دوسری طرف صقلیہ اور حجاز بھی اس کی قلمرو میں داخل تھے، یمن، موصل اور ماوراء النہر کے ملکوں میں فاطمی خلفاء کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔

11.5 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھئے۔

1. ابوعبداللہ حسین کون ہے اور وہ شمالی افریقہ کیسے پہونچا؟
2. عبیداللہ مہدی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
3. جوہر الصقلی کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجئے؟
4. فاطمی دور میں عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ رواداری پر تبصرہ کیجئے؟

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھئے۔

1. فاطمی حکومت کی اجمالی تاریخ بیان کیجئے۔
2. فاطمی خلافت کے افریقی دور پر ایک نوٹ لکھئے۔
3. فاطمیوں کے فوجی انتظام پر گفتگو کیجئے۔

11.6 فرہنگ

محاصرہ	:	گھیرا ڈالنا، ناکہ بندی،
بلاد	:	(بَلد کی جمع)، ممالک، ملک
بلادِ شرقیہ	:	مشرقی ممالک

11.7 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. تاریخ الدولۃ الفاطمیۃ — حسن ابراہیم حسن، قاہرہ، 1958ء.
2. عبقریۃ الفاطمیین — محمد حسن اعظمی، قاہرہ، 1960ء
3. نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین — ڈاکٹر عطیہ مصطفی مشرفۃ، قاہرہ، 1958ء.
4. مصر الاقتصادیۃ فی عہد الفاطمیین — رشید احمد البرّ اوی، قاہرہ، 1948ء.
5. تاریخِ صقلیہ، — سید ریاست علی ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ.
6. اردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد 15) — متعدد مصنفین، پاکستان،

7. تاریخِ دولت فاطمیہ، سید رئیس احمد جعفری ندوی، 2007ء، اریب پبلیکیشنز، نئی دہلی۔
8. تاریخِ ملت، (جلد 7 ، 9) مفتی حکیم انتظام اللہ شہابی، ندوۃ المصنفین
9. تاریخِ اسلام، جلد 3 (خلافت عباسیہ جلد 2) شاہ معین الدین احمد ندوی، دار المصنفین
10. تاریخ تہذیبِ اسلامی (جلد سوم و چہارم) پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی۔

اکائی 12 : آلِ بویہ، سلاجِقہ

اکائی کے اجزاء

12.1 مقصد

اس اکائی میں آپ دو سلطنتوں، سلطنت آل بویہ اور سلطنت سلاجقہ کے بارے میں پڑھیں گے۔ اسے پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ خاندان بنی بویہ کی تاریخ کیا ہے، بنی بویہ کی حکومت کس طرح کی تھی، بنی بویہ کے عہد میں معاشی، علمی، فنی اور تہذیبی سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں، اسی طرح اس اکائی کو پڑھ کر آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ سلاجقہ کون تھے، طغرل بیگ، الپ ارسلان، ملک شاہ اور نظام الملک طوسی کے علاوہ دیگر حکمرانوں نے سلجوقی حکومت کو کس طرح پروان چڑھایا، نیز یہ کہ سلاجقۂ عراق، کرمان (جنوبی فارس)، شام اور روم میں کیسے پہنچے اور پھر وہ وہاں کیوں کر زوال آشنا ہوئے۔

12.2 تمہید

اس اکائی میں دیلم اور بویہ کی اصلیت، بانیانِ سلطنتِ بویہ اور ان کی حکومت کی تفصیلات زیر بحث آئیں گی۔ آلِ بویہ، دیالمۂ فارس، دیالمۂ رے اور دیالمۂ عراق کیوں کر کہلائے، نیز اس میں بویہیوں کے اقتدار کے عملی پہلو کا بھی جائزہ لیا جائیگا، اس میں بتایا جائیگا کہ آلِ بویہ بالخصوص عضد الدولہ اور اس کے بیٹے شرف الدولہ کے عہد میں علمی، فنی اور تہذیبی سرگرمیوں نے کس طرح فروغ پایا۔ اسی طرح اس اکائی میں سلطنتِ سلجوقیہ پر بھی روشنی ڈالی جائیگی، اس میں یہ بھی جائزہ لیا جائیگا کہ سلجوقیوں کی تاریخ کیا ہے، سلجوقی نومسلموں نے سیاسی اسلام کے تحفظ کے لئے کس طرح صحرا نوردی اور آبلہ پائی کی، سلجوقیانِ اعظم کے بعد یہ سلطنت سلجوقی خاندان میں کس طرح تقسیم ہوگئی، پھر تقسیم کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔

12.3 آلِ بُوَیہ

12.3.1 دیلم اور خاندانِ بویہ

سلاطینِ دیالمہ کو امام الانساب اور مؤرخ ابن ماکولا شاہ بہرام گور کی نسل سے بتاتے ہیں، اور ابن مسکویہ لکھتے ہیں کہ یہ لوگ فارس کے آخری تاجدار کی نسل سے تھے۔ اس خاندان کا تعلق طبرستان میں ماژندران کے علاقہ دیلم سے تھا۔ اس لئے بنی بویہ کو دیالمہ بھی کہتے ہیں۔ دیالمہ جمع ہے دیلم کی، دیلم مقام کا نام ہے، اس کو جیلان بھی کہتے ہیں، روز بار شہر اس کا قصبہ تھا جو بحرِ خزر (Caspian Sea) کے جنوبی غربی ساحل پر واقع تھا۔

دیلم ایک زمانہ میں ریوان کا صوبہ بنا۔ پہلے یہاں بت پرست تھے، محمد بن زید علوی کے مقتول ہونے کے بعد اُطرُوش یعنی حسن بن علی بن حسین بن علی زین العابدین (وفات 304ھ/ 915ء) کی تیرہ برس تک برابر تبلیغ کی وجہ سے بلادِ دیلم وطبرستان میں اسلام پھیلا۔ بنو بویہ دَیلمیوں کی آبادی میں شامل تھے جنھوں نے نیا نیا اسلام قبول کیا تھا اور ان دنوں بڑی تعداد میں مشرقی مسلمان افواج میں، جن میں خلیفہ کی فوج بھی شامل تھی، بھرتی کیے جا رہے تھے۔

اس خاندان کا نام بُوَیہ یا بُوَیہ سے لیا گیا ہے۔ اس کا بانی اور مورثِ اعلیٰ ابوشجاع بویہ بن فنا خسرو، اگرچہ سلاطینِ ایران کی اولاد سے تھا، لیکن اس میں حکومت وسلطنت کا مدتوں سے خاتمہ ہو چکا تھا، اور اس کے افراد زیادہ تر غربت وافلاس میں مبتلا تھے، بویہ ماہی گیری (Tunny Fishing) کے ذریعہ گزر بسر کرتا تھا، لیکن اس کے تینوں لڑکے علی، حسن اور احمد بیدار مغز تھے۔ انھوں نے اپنی کوششوں سے ایران اور عراق میں علیحدہ علیحدہ حکومتیں حاصل کرلیں۔ دیلمی حکومت کے بانی یہی تینوں بھائی ہیں، بعد میں یہ لوگ بالترتیب عماد الدولۃ، رکن الدولۃ اور معز الدولۃ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ انہوں نے سامانی سلطنت وغیرہ کے اقتدار پر اپنی سلطنت قائم کی اور دھیرے دھیرے پورے مشرق پر چھا گئے۔ بالآخر مستکفی باللہ (334ھ-333ھ/ 945ء-944ء) کے عہد میں اس خاندان کا سب سے اہم حکمران معز الدولہ جمادی الاولیٰ 334ھ/ 945ء میں بغداد پر قابض ہو گیا اور یہ خاندان خلیفہ قائم کے اواخر تک بغداد پر مسلط رہا۔ اس کے زمانہ تسلط کے دوران پانچ عباسی خلفاء (مستکفی، مطیع، طائع، قادر اور قائم) تختِ بغداد پر بٹھائے گئے۔ بویہی سلاطین کا کوئی مستقل پایۂ تخت نہ تھا، مختلف مقامات پر وہ رہتے تھے اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی وقت میں اس خاندان کے دو تین اشخاص کی جدا جدا خود مختار حکومتیں قائم رہیں۔ اس خاندان کے بادشاہوں کے نام حسب ذیل ہیں:

ایران میں عماد الدولۃ ابوالحسن علی، عضد الدولۃ ابوشجاع خسرو، شرف الدولۃ ابوالفوارس شیرزیل، صمصام الدولۃ ابوکالیجار مرزبان، بہاء الدولۃ (عراق)، سلطان الدولۃ ابوشجاع، عماد الدین ابوکالیجار مرزبان اور ابو النصر خسرو فیروز الرحیم حکمران رہے۔ عراق، اہواز اور کرمان میں معز الدولۃ ابوالحسین احمد، عز الدولۃ بختیار، عضد الدولۃ، شرف الدولۃ، بہاء الدولۃ ابو النصر فیروز اور سلطان الدولۃ نے حکومت کی۔ عراق کے مختلف صوبوں میں مشرف الدولۃ، جلال الدولۃ، عماد الدین اور ابونصر خسرو فیروز نے حکمرانی کی۔ کرمان میں قوام الدولۃ ابوالفوارس، عماد الدین، ابومنصور فولا دستون، رکن الدولۃ ابوعلی حسن، مؤید الدولۃ ابو منصور، فخر الدولۃ ابوالحسن، مجد الدولۃ ابوطالب، شمس الدولۃ اور سماء الدولۃ ابوالحسن حاکم رہے۔

12.3.2 بنی بویہ کی حکومت

خلافتِ عباسیہ کے عروج کے زمانے (274ھ/ 887ء) تک اندلس اور مراکش کے چھوٹے ملکوں کو چھوڑ کر باقی ساری اسلامی دنیا کی صورتِ حال یہ تھی کہ وہ موجودہ پاکستان اور فرغانہ سے لیکر قیروان (مراکش) تک عباسی خلافت کے ماتحت تھی، لیکن عباسی خلافت کے زوال آشنا ہونے کے بعد اس اتحاد اور وحدت کا خاتمہ ہوگیا اور کئی خودمختار حکومتیں قائم ہوگئیں، ان تین بڑی اور قابل ذکر حکومتوں میں بنی بویہ کی حکومت بھی شامل تھی، ایران میں بنی بویہ یا دیلمی حکومت کا قیام عباسی خلیفہ محمد بن معتضد الملقب بہ قاہر باللہ (322ھ-321ھ/ 934ء-933ء) کے عہد میں عمل میں آیا جو آگے چل کر خلافتِ بغداد کی متولی بنی۔

آلِ بویہ عقیدہ کے لحاظ سے شیعہ تھے اور محرم کے مہینہ میں تعزیہ نکالنے اور علم کے رسوم ادا کرنے کا آغاز انھیں کے حکمراں معزالدولۃ کے زمانے سے ہوا۔ ان کا زمانہ گرچہ 135,136 سال سے زیادہ نہیں ہے، لیکن ان کے کارناموں اور عظمت وشان کے لحاظ سے تاریخِ اسلام میں اس خاندان کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس حکومت کا بانی اور مرکزی سربراہ عمادالدولۃ تھا۔ اس کے بعد یہی حیثیت رکن الدولۃ کو حاصل ہوئی اور اس کے بعد عضدالدولۃ اور اس کی اولاد کو۔

بغداد پر اسی خاندان کے حکمراں معزالدولۃ نے 334ھ/ 945ء میں قبضہ کیا تھا۔ عراق کا پورا ملک اور خراسان چھوڑ کر باقی ایران بنو بویہ کے قبضہ میں تھا۔ بغداد، اصفہان اور شیراز بویہی سلطنت کے بڑے شہر تھے۔ دولت سامانیہ کے زوال کے بعد رے پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا۔

عمادالدولۃ کے سلسلہ میں عضدالدولۃ، صمصام الدولۃ، شرف الدولۃ، بہاؤالدولۃ، سلطان الدولۃ، جلال الدولۃ اور ملک الرحیم فرمانروا ہوئے، یہ دیالمہ فارس کہلائے۔ ملک الرحیم کے دورِ حکومت میں سلجوقیوں نے فارس پر قبضہ کرلیا۔ رکن الدولۃ کے سلسلہ میں فخرالدولۃ، مجدالدولۃ، علاءالدولۃ اور ظہیرالدولۃ فرمانروا ہوئے، یہ دیالمہ رے کہلائے۔ 420ھ/ 1028ء میں غزنی کے حکمراں محمود غزنوی نے حملہ کر کے اس حکومت کا خاتمہ کیا اور معزالدولۃ کے سلسلہ میں صرف عزالدولۃ ہوا، یہ دیالمہ عراق کہلائے۔ 447ھ/ 1055ء میں سلجوقیوں نے بغداد پر قبضہ کر کے بنی بویہ کی سلطنت کا ہر جگہ سے خاتمہ کردیا۔

12.3.3 بانیانِ سلطنتِ بویہ

بویہی شروع میں سامانیوں کے ملازم اپنے ایک ہم وطن ماکان بن کاکی کے پیرو رہے اور پھر ان کے گیلانی حلیف مرداویج کے ساتھ مل گئے، تاکہ دونوں مل کر اپنے مشترک دشمن، طبرستان کی زیدی ریاست (جو کبھی رے تک پھیلی ہوئی تھی) سے مقابلہ کریں۔ یہ لوگ اس وقت بھی اسی گیلانی مَرْداوِیج کے تابع تھے جب اس نے وسطِ ایران میں اپنی ایک وسیع خودمختار ریاست قائم کی، لیکن کچھ عرصے بعد انھوں نے اس کے ساتھ کسی قدر سرکشانہ رویہ اختیار کیا، جب عمادالدولۃ (علی) کچھ دن کے لئے اصفہان کا مالک ہوا اور پھر مستقل طور پر فارس کا حکمراں ہوگیا تو اس نے مرداویج کے پنجہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے عباسی خلیفہ کی منظوری حاصل کرلی، عمادالدولہ علی اس وقت بھی اس صوبے پر قابض تھا جب 334ھ/ 945ء میں مرداویج کا قتل ہوا۔

عمادالدولۃ (علی) نے سامانیوں کے حلیفوں یا خلیفہ پر اثرانداز مختلف قبائل سے لڑ کر صوبۂ فارس پر اپنا قبضہ قائم رکھا، اس کے بھائی رکن الدولۃ (حسن) نے سارے بلادالجبل پر اپنا قبضہ جمالیا اور سب سے چھوٹے معزالدولۃ (احمد) نے ایک طرف تو کرمان

پر اور دوسری طرف خوزستان پر قبضہ کر لیا، اب بویہی دوسری جماعتوں کے ساتھ حصولِ اقتدار کی اس کشمکش میں شریک ہو گئے جو عراق اور دیگر ممالک خلافت میں چل رہی تھی۔ معز الدولۃ (احمد) 334ھ/ 945ء میں بغداد میں داخل ہو گیا اور جو نظام حکومت اس نے وہاں قائم کیا وہ 447ھ/ 1055ء تک چلتا رہا۔

کچھ عرصے بعد عماد الدولۃ (علی) انتقال کر گیا، چوں کہ اس کی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے فارس کا فرمانروا اس کا بھتیجہ عضدُ الدولۃ ہوا جو رکن الدولۃ (حسن) کا بیٹا تھا، جب معز الدولۃ (احمد) کی وفات کے بعد رکن الدولۃ (حسن) کا بھی انتقال ہو گیا تو عضد الدولۃ سارے خاندان بویہ کا سردار قرار پایا، اس نے اپنے بھتیجے عز الدولۃ بختیار کو عراق کی حکومت سے برطرف کر کے اپنے بھائی مؤید الدولۃ کو بویہیوں کے زیرِ اقتدار ایران کے باقی ماندہ حصے پر حکومت کرنے کی اجازت دی، عضد الدولۃ نے خاندانِ بویہ میں مکمل اتفاق اور اتحاد قائم کیا۔

12.3.4 جاگیردارانہ نظام

بویہی دور میں سلطنت اور دیوان الخراج (محکمۂ خراج) پر پورا عسکری تسلط قائم ہو گیا تھا، تبدیل شدہ صورت حال میں سب سے زیادہ خطرناک نتائج جاگیر (اقطاع) کے نظام میں پیدا ہوئے۔ بویہی نظام نے اعلیٰ فوجی افسروں کو انعام کے طور پر سرکاری زمینوں کا ایک حصہ عارضی طور پر دینے، زرعی اراضی سے محصول وصول کرنے اور اس رعایت کے بدلے میں انہیں حکومت کے خزانے میں اسلامی عُشر جمع کرنے کے عمل میں زیادہ وسعت پیدا کی اور اس رواج کو سختی سے جاری کیا، بہت سے اضلاع اسی نوعیت کے ''اِقطاعات'' (جاگیر) کی صورت میں باقاعدہ تقسیم کئے جانے لگے اور اب عُشر ادا کرنے کی شرط بھی اٹھا دی گئی، کسانوں کی محنت یکسر نظر انداز کر دی گئی۔

لیکن یہ اِقطاعات بطور جاگیر نہیں بلکہ بطور تنخواہ دیے جاتے تھے اور جاگیر کی ملکیت چوں کہ عارضی ہوتی تھی اس لئے صاحبِ جاگیر کو اس کی ترقی سے نہ کوئی دلچسپی ہوتی تھی اور نہ کوئی مستقل تعلق۔ وہ اس عارضی ملکیت کو اپنے لئے محض مستقل جائیداد بنانے کا ذریعہ سمجھتا تھا۔

12.3.5 معاشی سرگرمیاں

ابتدائی بویہی حکمرانوں کے عہد میں سکّے کی حالت مستحکم تھی۔ سلطنت کی مالی آمدنی خلافت کی آمدنی سے کسی قدر زیادہ تھی۔ بویہی عہد میں زراعت (کاشتکاری) کے لئے آبپاشی کا نظام درست کیا گیا، نئے نہر بنائے گئے، تجارتی مقاصد کے لئے سڑک اور پل درست کرائے گئے۔ بغداد، شیراز اور اصفہان کو زیادہ فروغ حاصل ہوا، ان شہروں میں شاندار محل بنوائے گئے۔ عراق اور فارس کے قریبی ربط و تعلق کا نتیجہ یہ ہوا کہ عراقی طریقوں کو فارس میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی، مگر ان دونوں میں کبھی انتظامی اتحاد نہیں ہو سکا۔

12.3.6 علمی ترقی اور علماء کی قدردانی

ابتداء میں بویہی، تعلیم سے بے بہرہ اور ناتراشیدہ تھے، لیکن ان کے اَخلاف (بعد میں آنے والوں) نے ایرانیوں کے تہذیبی اثرات قبول کئے۔ سامانیوں کے قدیم ایران کے مقابلہ میں بویہیوں کے زیرِ اقتدار ایران (جس میں ابن العمید اور صاحب

ابن عباد وزراء تھے) ظاہراًعرب اثرات کا نمونہ معلوم ہوتا تھا، ان کے دربار میں عرب شعراء کی ایک بڑی تعداد تھی ۔ بویہی دور کے ابو الفَرَج الِاصفہانی نے کتاب الأغانی اور ابن الندیم نے الفہرست تصنیف کی جو عربی ادب کے دوبیش بہا خزانے ہیں۔ عضدالدولۃ کے وقت میں ابو اسحاق الصابی، آخری بویہیوں کے عہد میں اس کے پوتے مؤرخ ہلال الصابی اور خزانہ دار فلسفی ومؤرخ ابوعلی مِسکَوَیہ (وفات 456ھ/ 1064ء) کی سرپرستی انہی نے کی۔

عضدالدولۃ کے عہد میں علم وادب کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس نے مدرسہ بغداد قائم کیا۔ عضدالدولہ کا بیٹا شرف الدولۃ اپنے باپ کے قدم بقدم چل کر علمی کاموں کو فروغ دیتا رہا۔ اس نے مدرسہ بغداد کو اپنے والد سے زیادہ ترقی دی۔ اس کے لڑکے بہاءُ الدولۃ نے خلیفہ الطائع کے عہد میں بغداد میں دس ہزار کتابوں کا ایک کتب خانہ قائم کیا۔ کتاب التاج آل بویہ کی یادگار ہے، مختلف بویہی حکمرانوں نے شیراز، رے اور اصفہان میں جو کتب خانے تعمیر کئے ان کی تعریف ساری دنیا نے کی ہے۔ سلاطینِ بویہ ہی کے زمانہ میں اِخوان الصفا کی جماعت قائم ہوئی جس نے علمی رسائل مرتب کئے۔

اِخوانُ الصفا عباسی دور کے مسلم فلسفیوں کی قائم کردہ جماعت کا نام ہے۔ اس میں باقاعدہ اجلاس اور مباحثے اور مذاکرے ہوتے تھے۔ بعدازاں وہ مباحثے اور مذاکرے کتابی شکل میں مدوّن کرلئے جاتے تھے، اس طرح سے اکیاون رسالے جمع ہوگئے۔ چوں کہ ان رسائل کے مصنفین کے نام معلوم نہیں ہیں، اس لئے یہ رسائل، رسائلِ اِخوانُ الصفا کے نام سے معروف ہیں۔ یہ رسائل فلسفہ کی مختلف قسموں پر مشتمل ہیں۔ ان میں دنیا بھر کے علوم جمع کردئے گئے ہیں، چنانچہ ان کے سترہ رسائل میں مادّہ، مدّ وجزر (یعنی جوار بھاٹا)، عناصر کی تشکیل، زلزلہ، سورج اور چاند گرہن اور صوتی لہروں کے اسباب جیسے طبعیات (Physics) کے مختلف موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں۔ تاریخ تہذیبِ اسلامی کے مصنف پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے قفطی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کے مؤلفین میں ابوسلیمان محمد بن معشر مقدسی، ابوالحسن علی بن ہارون الزنجانی، ابواحمد المہر جانی اور رعوفی کے علاوہ بھی کئی لوگ شامل تھے۔

12.3.7 علماء، دربارِ سلاطینِ بویہ میں

خاندانِ دیالمہ علمی ذوق وشوق میں کسی دوسرے خاندان سے کم نہ تھا۔ بویہیوں نے بالعموم علماء کی اور بالخصوص ان علماء کی جن کا علم عملی فوائد کا حامل تھا، قدردانی کی، اس قسم کے علماء میں علومِ دینیہ کو چھوڑ کر جغرافیہ داں الِاصطَخری، ریاضی داں ابوالوفاء البوزجانی، ''اعداد'' کو رواج دینے والے ابوالحسن علی احمد النَّسَوی وغیرہ جیسے علماء کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ بلند مرتبہ بویہی ابن البوّاب نسخی خوش نویسی کے موجدوں میں سے ایک تھا۔

ابواسحاق ابراہیم بن ہلال بن ابراہیم بن زرون الصابی (384ھ-313ھ/994ء-925ء) علم وادب میں ماہر، نظم ونثر میں بالغ نظر، ریاضی میں دستگاہ کامل، علمِ ہیئت(Astronomy) اور ہندسہ(Engineering / Geometry) میں یدِطولیٰ حاصل تھا۔

فخرالدولۃ دیلمی کے دربار میں ابومحمود حامد بن الخضر الخُجندی علمُ الأفلاک(Astronomy) کا ماہر تھا، اس نے آلہ رسد (Sextant) موسوم بہ سدس الفخری ایجاد کیا، اس آلہ کی مدد سے میل اور عرض البلد کی مسافت ناپی جاتی تھی۔

شرف الدولہ کے دربار کا رکن ابو سہل ونجن رستم الکوہی علمِ ہیئت یعنی علم نجوم وافلاک (Astronomy) کا ماہر تھا، اس نے ایک رصدگاہ (Planetarium) قائم کی تھی۔ ابوالحسن کوشیار ابن لبان الجیلی (وفات 420ھ/ 1029ء) نے ایک نہایت عمدہ رصد خانہ (Planetarium) تیار کیا تھا، 459ھ/ 1067ء میں کثیر فلکی مشاہدات کیے، زیج الجامع والسامع اس کی مشہور کتاب ہے۔

ابوالوفاء محمد بن محمد البوزجانی الصفاتی (وفات 388ھ/ 998ء) علمائے ہیئت میں مشہور تھا، علم مثلث (Trigonometry) اور ہیئت میں مفید اضافے کیے، کتاب مایحتاج الیہ الکتاب والعمال من الحساب اس کی مشہور کتاب ہے، شریف بن الاعلم (متوفی 375ھ/ 985ء)، عبدالرحمٰن صوفی کا معاصر تھا، فن ہیئت میں اس کا جدول (Table) مشہور ہے۔

ابوالحسین عبدالرحمٰن الصوفی الرازی (متوفی 411ھ/ 1020ء) ماہر ہیئت تھا، بغداد میں ایک رصدگاہ (Observatory) قائم کی، کتاب الکواکب الثابتہ، رسالۃ فی الاصطرلاب اس کی تصنیف ہیں۔

12.3.8 فنی اور تہذیبی سرگرمیاں

المجوسی جیسے اطباء کے لئے عضدالدولہ نے بغداد کے قدیم قصر الخلد میں ایک مشہور اسپتال قائم کیا، شہر مرجان اور شیراز میں اسی طرح کے عظیم الشان اسپتال بنوائے۔ ایرانی فنون کی تاریخ میں بویہی عہد کا مقام بھی لائق اعتناء ہے۔ بویہی دور میں عبادت گاہوں کی تعداد، محلّوں، قلعوں اور اسپتالوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ بویہیوں نے فنون، صنعت وحرفت اور دستکاری پر بھی توجہ دی۔

12.3.9 فارسی ادب

بویہیوں اور ان کے وزراء نے جدید قسم کے فارسی ادب سے بھی پوری دلچسپی لی۔ پہلی دیلمی نسل کے اخلاف (یعنی بعد میں آنے والے) صحیح معنوں میں دیلمی ہونے کی بہ نسبت پوری طرح ایرانی تھے، اسی سبب انہوں نے اپنے لئے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔ اگرچہ ادبی میدان میں ان کے کارناموں کا مقابلہ سامانیوں کے کارناموں سے نہیں کیا جاسکتا، پھر بھی ان کے دربار میں ان کے اپنے فارسی شعراء تھے اور فارسی کے مشہور شاعر ابوالقاسم فردوسی کی بہاؤالدولہ کے دربار میں بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔

12.4 سلاجقہ

سلاجقہ، نسلاً اوغوز ترکوں کے ایک شاہی مسلم سنّی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے گیارہویں صدی عیسوی سے لے کر تیرہویں صدی عیسوی تک ایشیائے وسطیٰ اور ایشیائے کوچک (روم) کے وسیع خطوں پر حکومت کی۔ غزنوی سلطنت کے انتشار کی بنیاد پر سلجوقی ترکوں نے اپنی سلطنت قائم کی، خراسان میں اپنی سلطنت مستحکم کرنے کے بعد انہوں نے دھیرے دھیرے مغرب کی طرف بڑھنا شروع کیا اور ایران وعراقِ عجم وعرب پر قبضہ کرکے اپنی فرمانروائی قائم کردی۔ ان کے دورِ اقتدار میں یوں تو چھ عباسی خلفاء ہوئے، لیکن ان میں دو خلیفہ اول وآخر پہلے اور آخری دور میں مشترک ہیں، ان خلفاء کے نام یہ ہیں: قائم، مقتدی، مستظہر، مسترشد، راشد اور مقتفی۔

سلجوقی سلطنت دولتِ عباسیہ کے خاتمے کے بعد عالم اسلام کوایک مرکز پر جمع کرنے والی آخری حکومت تھی۔ اس کی سرحدیں ایک جانب چین سے لے کر بحرِ متوسط (Mediterranean Sea) اور دوسری جانب عدن سے لیکر خوارزم و بخارا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کا عہد تاریخِ اسلام کا آخری عہدِ زریں کہلا سکتا ہے، اسی لئے سلاجقہ کو اسلامی تاریخ میں خاص درجہ ومقام حاصل ہے۔ زوالِ سلاجقہ کے ساتھ امت مسلمہ سیاسی انتشار سے دوچار ہوئی۔ اہالیانِ یورپ نے مسلمانوں پر صلیبی جنگیں مسلط کیں اور بیت المقدس پر قبضہ کرلیا۔ سلاجقہ کے مندرجہ ذیل خاندان خاص طور پر ممتاز ہیں: (1) سلجوقیانِ اعظم (2) سلجوقیانِ عراق (3) سلجوقیانِ کرمان (4) سلجوقیانِ شام (5) سلجوقیانِ ایشیائے کوچک (روم)۔

12.4.1 سلجوقی خاندان کی ابتدائی تاریخ

سلجوقیوں کی نئی طاقت کا ظہور عباسی خلیفہ قادر باللہ ہی کے زمانہ میں ہو چکا تھا، لیکن اس وقت ان کی حیثیت خانہ بدوش قبائل سے زیادہ نہیں تھی۔ البتہ عباسی خلیفہ قائم بامراللہ کے زمانہ میں انہوں نے ایک منظم طاقت کی حیثیت حاصل کرلی۔ سلجوق نسلاً ترک تھے۔ ان کا آبائی وطن، ترکستان اور چین کا درمیانی علاقہ تھا۔ سلجوقی قبائل کی تعداد ہزاروں نفوس پر مشتمل تھی۔ ترکستان کی غیر مسلم حکومت میں ان کے سردار دُقاق یا تُقاق کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی، بیغو فرمانروائے ترک اسے بہت مانتا تھا۔ دُقاق کو بڑا ہونہار سلجوق نامی لڑکا پیدا ہوا۔ بیغو نے سلجوق کی صلاحیتوں اور کارناموں کے سبب اسے سپہ سالار بنایا، سارے ترک، اس کے مطیع ہوگئے۔ اس کے اثر ورسوخ کو دیکھ کر بیغو کی ملکہ نے اپنے شوہر کو اس کے قتل پر آمادہ کیا، ملکہ کی مخالفت کو دیکھ کر 362ھ/ 972ء میں سلجوق اپنے زیر اثر ترکمان قبائل کو لے کر ترکستان سے ترک وطن کر کے ماوراء النہر کے علاقہ بخارا کے قریب اسلامی قلمرو جند میں قیام پذیر ہوا، وہاں ان لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ قبولِ اسلام کے بعد سلجوقی ایک منظم قوت بن گئے اور ماوراء النہر کے ان سرحدی مقامات پر جو بیغو کے قبضہ میں تھے اور جہاں کے مسلمانوں سے وہ خراج وصول کیا کرتا تھا، قبضہ کرلیا۔

12.4.2 اولادِ سلجوق

سلجوق (وفات بعمر 107 برس) کے چار لڑکے ارسلان (یا اسرائیل)، میکائیل، یونس اور موسی تھے۔ ان سب سے نسل چلی، یونس اور موسی کی اولاد نے تاریخ میں اپنی کوئی یادگار نہیں چھوڑی۔ البتہ میکائیل اور ارسلان کی اولاد نے بڑی عظمت و ناموری حاصل کی۔ ایران اور عراق کے سلجوقی فرمانروا میکائیل کی نسل سے تھے۔ ارسلان کی اولاد نے ایشیائے کوچک (روم) میں اپنی حکومت قائم کی، ترکان عثمانی ان ہی کی یادگار رہے۔

سلجوق کی موت کے بعد اس کے چاروں لڑکے ماوراء النہر کے نور بخارا، سغد اور سمرقند کے مرغزاروں جیسے مختلف حصوں میں پھیل گئے، ارسلان اپنے قبیلہ کے ساتھ بخارا کے قریب مقیم ہوا اور ایلک خانی اور غزنوی حکومت کی سرحدوں پر تاخت شروع کردی۔ ایلک کے بھڑکانے سے محمود غزنوی نے ارسلان کو عہد بھائی چارہ کے بہانہ سے بلا کر قید کرلیا اور اسے ملتان کے قریب، ہندوستان کے کالنجر کے قلعہ میں نظر بند کر دیا، اس کے قبیلہ کو قتل وقید کر کے مختلف سمتوں میں منتشر کر دیا۔ ارسلان سات برس تک محمود کی قید میں رہ کر یا تو قید ہی میں مرگیا یا دو ترکمانی کی مدد سے بھاگنے کے بعد مرا۔ ارسلان کی موت کے بعد محمود غزنوی نے سلجوقیوں کو خراسان کے حدود میں پُرامن اور خوش قیام کی اجازت دے دی۔

12.4.3 سلطان طُغرِل بیگ

میکائیل نے غیر مسلم ترکوں کے ساتھ مقابلہ میں شہادت پائی۔ اس کے تین نامور لڑکے طغرل بیگ محمد، چغری بیگ داؤد اور بیغو تھے۔ طغرل بیگ محمد اپنے بھائی چغری بیگ داؤد کے ساتھ خراسان پہنچ گیا، پہلے غزنوی فرمانرواؤں کی ملازمت اختیار کی، پھر جب ان کی حکومت کمزور ہونے لگی تو طغرل اور اس کے بھائی داؤد کی زیر قیادت سلجوقیوں نے غزنوی سلطنت سے علیحدگی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ ابتداء میں سلجوقیوں کو محمود غزنوی کے ہاتھوں شکست ہوئی اور وہ خوارزم تک محدود ہو گئے۔ لیکن طغرل اور چغری داؤد کی زیر قیادت انہوں نے 421ھ/ 1028ء اور 422ھ/ 1029ء میں مرو اور نیشا پور پر قبضہ کرلیا، غزنویوں کے ساتھ مسلسل جنگ کے تین سال بعد پورے خراسان پر جس کا پایۂ تخت علم وعلماء کا شہر نیشا پور تھا، اپنے پنجے گاڑ دئے اور وہاں خود اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، اور بغداد میں عباسی خلیفہ قائم بامراللہ سے سندِ تصدیق چاہی۔ اس نے طغرل بیگ کے موقف کی تائید کی، پھر وہ بلخ، جرجان، طبرستان، خوارزم، ہمدان، رے اور اصفہان کے بھی مالک بن بیٹھے۔ 428ھ/ 1037ء میں غزنی پر حملہ کیا، 430ھ/ 1039ء میں جنگ دندانیقان میں انہوں نے غزنوی سلطنت کے بادشاہ مسعود اول کو شکست دے دی اور مسعود سلطنت کے تمام مغربی حصے سلجوقیوں کے ہاتھوں گنوا بیٹھا۔ طغرل بیگ نے شمال مشرقی اور مغربی ایران کے علاوہ ایران اور عراق کے مابین پہاڑی گذرگاہوں کے بشمول دیگر بعض اہم ممالک پر قبضہ کرلیا۔ چنانچہ اب بلاد الجبل، تبریز، حلوان اور شیراز بھی اس کے زیر تسلط آ گئے۔ 447ھ/ 18 ردسمبر 1055ء کو طغرِل بغداد کے دروازے پر اپنے ترکمانوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا، ان کو دیکھ کر بویہ قیادت کے عہد کا ترکی سپہ سالار اور بغداد کا فوجی گورنر بساسیری بھاگ گیا۔ خلیفہ قائم (468ھ-423ھ/ 1075ء-1031ء) نے طغرل اور اس کی فوج کا خیر مقدم کیا۔ طغرل نے بغداد کے اپنے اس دورے میں ملک الرحیم دیلمی بویہی کا استیصال کیا اور بغداد سے بنی بویہ کی سلطنت کی بیخ کنی کی۔

الغرض طغرل بیگ نے غزنوی اور بویہی سلطنتوں کو بے دخل کر کے مشرق اسلامی میں اپنی وسیع حکومت قائم کی۔ طغرل بک کی فتوحات سے حوصلہ پا کر عباسی خلیفہ نے اسے بغداد بلایا اور مشرق و مغرب کے شہنشاہ کے لقب سے نوازا، بغداد اور بیرونِ بغداد میں اس کے نام کا خطبہ جاری کیا اور سکہ پر اس کا نام کندہ کروایا۔

مشرقی مسلم ممالک کی تاریخ میں طغرل (455ھ-428ھ/ 1063ء-1037ء)، اس کے بھتیجے الپ ارسلان (465ھ-455ھ/ 1072ء-1063ء) اور الپ ارسلان کے بیٹے جلال الدین ملک شاہ (485ھ-465ھ/ 1092ء-1072ء) کی حکومتوں کا زمانہ نہایت درخشاں ہے۔ ان نومسلموں نے مسلمانوں کو از سر نو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر کے مغربی ایشیاء میں پھر سے مسلم قیادت منوائی۔

طغرل نے 455ھ/ 1063ء میں بعمر ستر سال انتقال کیا۔ اس کا پایۂ تخت مرو تھا۔ مدتِ حکومت 26 سال اور خلافتِ بغداد کی تولیت کی مدت 8 سال تھی۔ اس نے ایک ایسے خاندان کی بنیاد ڈالی جو عظمت وہیبت کے علاوہ علم دوست اور عمدہ اوصاف کے لئے آج تک چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ اس نے تمام مفتوحہ ملکوں کو اپنے بھائی بھتیجوں میں تقسیم کر دیا۔ وہ ایک راسخ العقیدہ، دیندار، پاکباز اور متقی فرمانروا تھا۔

12.4.4 سلطان اَلپ اَرسلان

طغرل خود لا ولد تھا۔ اپنے بھتیجے سلیمان بن داؤد کو اپنا جانشین بنا گیا تھا۔ چنانچہ وہ تخت نشین بھی ہوا، لیکن والیٔ قونیہ قتلمش بن اسرائیل بعض دیگر امراء اور پھر طغرل کے وزیر عمید الملک کندری کے اختلاف کے بعد الپ ارسلان (اپنے چچا طغرل بیگ کے بعد) سلجوقی سلطنت کے تخت پر بیٹھا۔

الپ ارسلان بڑا اولوالعزم، حوصلہ مند، بیدار مغز اور بہادر حکمراں تھا۔ فتح و نصرت اس کے ہم رکاب تھی، کسی مہم میں ناکام نہیں رہا۔ اپنے زمانہ میں اس نے ایران کی سلجوقی حکومت کو مشرق کا امپائر بنا دیا۔ اس کی حکومت کا ایک سرا ترکستان سے ملتا تھا اور دوسرا سرا شام سے۔ مشہور مدبر و عالم نظام الملک حسن طوسی کو اپنے باپ چغری بیگ کی سفارش پر وزیر سلطنت مقرر کیا، اس کے وقت میں نیشا پور رشکِ بغداد بن گیا۔ اس میں شمشیر ترکی کے ساتھ حکمتِ نظام الملکی ایک قابل لحاظ شئ تھی۔ الپ ارسلان کے دو کارنامے زیادہ اہم اور قابل ذکر ہیں، ایک حکومتِ قسطنطنیہ کے خطرہ کا انسداد اور دوسرے حرمین میں فاطمیوں کے بجائے عباسی خطبہ کا اجراء۔

اَلپ اَرسلان نے سلطنت کی توسیع کے ساتھ اسے انتظامی اور تمدنی حیثیت سے بھی ترقی دی، امن و امان قائم کیا۔ وہ فطری طور پر نہایت نرم دل، غریب پرور، علم وفن کا قدرداں اور سرپرست تھا۔ 459ھ/ 1067ء میں بغداد میں زائد خرچ سے مدرسہ نظامیہ قائم کرنے کے علاوہ ایک دوسرا عظیم الشان مدرسہ قائم کیا تھا۔ اس کا دارالحکومت اِصفہان تھا۔

خوارزمی گورنر یوسف الخوارزمی، خوارزمی ترکوں کے خلاف سلجوقیوں کی ایک مہم میں قیدی بنا کر اَلپ اَرسلان کے پاس لایا گیا، اس نے اَلپ ارسلان پر اپنی تلوار سے حملہ کیا، اس حملہ میں الپ ارسلان شدید زخمی ہوا اور 4 دن بعد 25 نومبر 1072ء/ 465ھ کو محض 42 سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ اسے مرو میں اس کے والد چغری بیگ کی قبر کے برابر میں دفن کیا گیا۔

مؤرخینِ اسلام نے سلطان اَلپ ارسلان کے عہد کو اسلام کا دورِ ترقی و عروج کہا ہے۔

12.4.5 سلطان جلال الدین ملک شاہ

اَلپ ارسلان نے اپنی زندگی ہی میں ملک شاہ اول کو ولی عہد (Crown Prince) بنا دیا تھا، چنانچہ اس کی وفات کے بعد ربیع الاول 465ھ/ 1072ء میں وہ تخت نشین ہوا، عباسی خلیفہ قائم نے بھی اس کی تصدیق کر دی، تخت نشینی کے بعد اس نے نظام الملک طوسی کو اتابک اور عماد الدولہ کا لقب عطا کر کے سلطنت کا مختارِ کل بنا دیا۔ ملک شاہ اول (وفات 485ھ/ 1092ء) اور اس کے دو ایرانی وزراء نظام الملک طوسی (وفات 485ھ/ 1092ء) اور تاج الملک کی زیر قیادت سلجوقی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ گئی، جس کی مشرقی سرحدیں چین اور مغربی سرحدیں بازنطینی سلطنت سے جا ملی تھیں، یعنی اس کی حکومت کاشغر سے یروشلم تک اور قسطنطنیہ سے بحرِ خزر/ بحرِ قزوین (Caspean Sea) تک قائم تھی۔ ملک شاہ نے دارالحکومت رے (مرو) سے اِصفہان منتقل کیا۔ اسی عہد میں نظام الملک نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا، جس میں ابوالفرج ابن الجوزی اور ابوالحامد غزالی جیسے اساطینِ علم وفن درس دیا کرتے تھے۔

ملک شاہ بڑا روشن خیال تھا۔ رفاہِ عام پر اس نے کافی رقم خرچ کی، سڑکیں اور مسجدیں بنوائیں، نہریں صاف کروائیں، شہروں کی دیواریں مرمت کی گئیں، حج کے راستوں پر کارواں سرائیں تیار کرائی گئیں۔ اس کے عہدِ حکومت میں ملک خوش حال اور پُر امن تھا۔ بغداد کے حماموں کا گندہ پانی بجائے دجلہ میں گرنے دئے جانے کے خاص موریوں کے ذریعہ باہر منتقل کیا جاتا تھا۔ وہ خود بھی صاحبِ علم اور علم وفن اور اہلِ علم وارباب کمال کا قدرداں تھا۔ اس نے سلجوقی حکومت کے جغرافیہ پر خود ایک رسالہ لکھا تھا۔

عمر خیّام نیشاپوری جو رباعیات کی وجہ سے مشہور ہے، مگر وہ نجوم وہیئت (یعنی فلکیات) کا بڑا ماہر تھا۔ اسے بلند پایہ ہیئت دانوں اور علمِ نجوم کے ماہرین میں مقامِ بلند حاصل تھا۔ اس نے شمسی اور قمری تقویموں (کیلنڈرس) میں اصلاح کی، ان میں ہم آہنگی کے طریقے ایجاد کئے، موسمیات پر تحقیقات پیش کیں اور لوند سال (Leap Year) کا جدید طریقہ نکالا اور سال کے دنوں کی صحیح تعداد مقرر کی۔ 468ھ-467ھ/ 1075ء-1074ء کے عرصہ میں ملک شاہ نے نظام الملک طوسی کے مشورہ سے رے (نیشاپور) میں ایک رصدگاہ (Observatory) قائم کی، جس کا اہتمام عمر خیّام نیشاپوری (517ھ-429ھ/ 1123ء-1038ء) کے سپرد تھا۔ ملک شاہ، نظام الملک اور عمر خیام نے رصدگاہ میں عرب وعجم کے مشہور ماہرانِ فلکیات کو جمع کیا۔ ملک شاہ کے نام سے عمر خیّام نے فارسی زبان میں ایک کیلنڈر ''تقویم جلالی'' تیار کیا۔ یہ کیلنڈر، عیسوی کیلنڈر/ گری گورین کیلنڈر (Gregorian Calendar) سے بھی زیادہ صحیح تھا، ایک رائے کے مطابق ایامِ کبیسہ (Leap years) کی پیچیدگیوں کی وجہ سے یہ کیلنڈر زیادہ دنوں تک استعمال میں نہ آیا۔

12.4.6 نظام الملک حسن بن علی طوسی

ایران کے ضلع نوقان میں واقع طوس ایک مردم خیز جگہ ہے۔ خواجہ ابو علی حسن نظام الملک طوسی 10 راپریل 1018ء/ 408ھ کو یہیں پیدا ہوا، اس کے علاوہ امام غزالی اور فردوسی جیسی دو بڑی مشہور شخصیتیں بھی یہاں گزری ہیں۔ عباسیوں کے زمانہ میں جس طرح ایرانی برامکہ خاندان شہرت ونا موری کی بلندی پر تھا، اسی طرح کچھ دنوں کے لئے سلجوقیوں کے وقت میں نظام الملک کا خاندان عروج پر تھا۔ الپ ارسلان نے اپنی تخت نشینی کے بعد قلمدانِ وزارت اس کے سپرد کیا اور جب ملک شاہ کو نظام الملک کی تدبیروں سے تاج وتخت ملا تو اس نے نظام الملک کو نہ صرف منصبِ وزارت عطا کیا، بلکہ سلطنت کا مختارِ کُل بنا دیا۔ نظام الملک نے جاہ وجلال کے ساتھ 30 سال وزارت کی اور ایسے ایسے کارنامے انجام دئے کہ اس کے سامنے برامکہ کی داستانیں ماند پڑ گئیں۔ ملک شاہی دور کی ساری درخشانی جو سلجوقیوں کا دورِ زریں شمار کیا جاتا ہے، نظام الملک ہی کی ضیا پاشیوں کا نتیجہ تھی۔

خلافت بغداد سے نظام الملک کے تعلقات بہت خوشگوار تھے اور وہ خلفاء کا دل سے احترام کرتا تھا، عباسی خلیفہ مقتدی بھی اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ اس نے سیاسیات اور قانونِ مملکت پر اپنی کتاب ''سیاست نامہ'' (سیرُ الملوک) ملک شاہ ہی کے کہنے پر لکھا جو اپنے موضوع پر لاجواب تصنیف ہے اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ذاتی فضل وکمال کے ساتھ وہ بڑا علم پرور اور علماء نواز تھا۔ اس کا دربار علماء ومشائخ کا مرجع تھا۔ اس کی مجلس میں امام الحرمین، شیخ ابو اسحٰق شیرازی، ابو القاسم قشیری اور ابو علی فارمدی جیسے جلیل القدر علماء اور ائمہ تشریف لاتے تھے، نظام الملک ان کی بڑی عزت وتکریم کرتا تھا، امام الحرمین اور ابو القاسم قشیری کے لئے

اپنی مسند خالی کر دیتا تھا۔ اپنے زمانے میں اس نے علم وفن کی بڑی خدمت اور تعلیم کی اشاعت کی بڑی کوشش کی۔ بلخ، نیشا پور، ہرات، اصفہان، بصرہ، مرو، موصل، آمل اور عراق کے تمام شہروں میں مدرسے قائم کئے، بغداد کا شہرہ آفاق مدرسہ نظامیہ اسی نے قائم کیا۔ اس نے ملک بھر میں بکثرت مسجدیں تعمیر کرائیں اور پُل بنوائے۔ قیام عدل کا اس کے نزدیک بڑا اہتمام تھا، غرباء پروری اس کا خاص وصف تھا، بڑا دیندار اور عابد وزاہد تھا۔

12.4.7 مدرسہ نظامیہ، بغداد

نظام الملک نے بڑے اہتمام سے بغداد کا مدرسہ نظامیہ تعمیر کرایا تھا۔ اس کی تعمیر پر دولاکھ دینار یعنی تقریباً دس لاکھ روپے صرف ہوئے، دوسال میں اس کی عمارت تعمیر ہوئی، ذیقعدہ 459ھ/ 1067ء میں بڑے اہتمام سے اس کا افتتاح عمل میں آیا، کئی لاکھ روپے سالانہ اس کا خرچ تھا، اس سے متعلق دارالاقامة (Hostel) بھی تھا، تمام طلبہ کو وظائف (Scholarships) ملتے تھے۔ اس دور کے منتخب علماء درس وتدریس کے لئے فراہم کئے گئے تھے، امام ابواسحٰق شیرازی، ابونصر صباغ، ابن الخطیب شارح حماسہ، ابوالحسن فصیحی، قطب الدین شافعی اور امام غزالی جیسے یگانۂ عصر علماء مختلف اوقات میں اس مدرسہ کی تعلیم وتدریس کی مسند پر بیٹھے۔

12.4.8 سلجوقی دور کے عباسی خلفاء

خلافت بنی عباس پر سلجوقی اقتدار کا آغاز 447ھ/ 1055ء سے ہوا۔ چنانچہ یہ اقتدار خلیفہ قائم کے دور خلافت میں شروع ہوکر خلیفہ ناصر (622ھ-576ھ/ 1225ء-1180ء) کے عہد تک جاری رہا، اس کا بیشتر حصہ صلیبی جنگوں میں گذرا۔ سلجوقی اقتدار کے خلفاءِ بنی عباس کا شجرہ حسب ذیل ہے:

قائم، مقتدی، مستظہر، مسترشد، راشد، راشد کے بعد اس کا چچا، مقتفی، اس کے بعد اس کا بیٹا، مستنجد، پھر اس کا بیٹا، مستضی اور اس کا بیٹا، ناصر خلیفہ مانا گیا۔ سلجوقیوں کے زمانہ میں خلفاء بنی عباس کو وہ تکالیف جھیلنی نہ پڑیں جو بویہ کے زمانہ میں برداشت کرنی پڑی تھیں۔

12.4.9 سلجوقی سلطنت مابعدِ تقسیم

سلجوقی حکومت کی تعمیر وتوسیع میں میکائیل کی تمام اولاد شریک تھی، اس لئے جب دولت آلِ سلجوق کا قیام عمل میں آ گیا اور 443ھ/ 1051ء میں خلافت بغداد نے اس سلطنت کی تصدیق کردی تو طُغرِل بیگ نے اپنے بڑے بھائی داؤد کے ذریعہ، مفتوحہ ممالک کو اپنے تمام بھائیوں اور بھتیجوں میں تقسیم کرادیا۔

خراسان کا بڑا حصہ داؤد نے خود لیا اور بست، ہرات اور سیستان بیغو کو ملے، طبس وکرمان داؤد کے لڑکے قاروت کے حصہ میں آیا اور عراق عجم طغرل بیگ کے حصہ میں پڑا، اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً بقدر حصہٗ رسدی تقسیم کا سلسلہ جاری رہا، چنانچہ بعد میں طُغرِل بیگ کے دوسرے بھائی ابراہیم نیال کو ہمدان، امیر یاقوتی بن چغری بیگ کو ابہر، رنگان اور نواحِ آذربائیجان اور قتلمش بن ارسلان کو گرگان اور دامغان ملے۔

485ھ/ 1092ء میں نظام الملک طوسی شہید کیا گیا۔ اس کی وفات کے بعد سلجوقیوں کا روشن ترین عہد ختم ہوگیا۔ ملک شاہ بھی اسی سال یعنی 485ھ/ 1092ء میں مرگیا، اس کے بعد اس کے بیٹوں میں لڑائیاں ہونے لگیں۔ 480ھ/ 1087ء میں نظام الملک نے فوجی ضروریات کے مدّنظر مقامی سپاہ کے اخراجات کی پابجائی کے لئے صوبہ جات کی مال گذاری حاکموں کو سپرد کردی تھی، اگر مرکزی حکومت ان کے حساب کتاب پر اچھی طرح نگرانی رکھتی اور حکام اسے اپنی موروثی جائیداد تصور نہ کرتے تو یہ طریقۂ عمل مضر نہ ثابت ہوتا۔ مُلک شاہی خاندان کے افراد میں تقسیم ہونے کے ساتھ ہی طاقتور مرکزی حکومت باقی نہ رہی، ایران کے سلجوقیانِ کبیر برائے نام 552ھ/ 1157ء تک سب کے صدر تصور کئے گئے۔ عراق کا سلجوقی خاندان بھی سلاجقہ کے مابین بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

12.4.9.1 سلجوقیانِ اعظم

اس طبقہ میں طغرل بیگ، الپ ارسلان، ملک شاہ، محمود اور برکیارُوق، ملک شاہ ثانی، محمد اور سنجر کے نام شامل ہیں۔ سلاجقۂ عظام کی حکومت خلفائے بغداد کی سابقہ مملکت کے مشرقی صوبوں پر، باستثنائے کرمان، مشتمل تھی، وہ اپنی سکونت اصفہان اور بغداد میں رکھتے تھے، جب کہ سلاجقۂ عظام کے آخری تاجدار سنجر کے عہد میں ان کا مرکز مرو بن گیا۔ جب 552ھ/ 1157ء میں سنجر بے اولاد مرگیا تو سلاجقۂ عظام کے حکمراں خاندان کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ سلجوقیانِ اعظم کا عہدِ حکومت 429ھ/ 1038ء سے 552ھ/ 1157ء تک رہا۔

12.4.9.2 سلاجقۂ عراق

محمد سلجوقی کی وفات (511ھ/ 1118ء) کے بعد اس کا تیرہ سالہ بیٹا محمود خراسان اور شمال مشرقی سرحدی صوبوں کے سوا پوری سلطنت کا وارث و جانشین ہوا۔ اس کے بعد سلطان کا خطاب اس کے بیٹے داؤد (527ھ-526ھ/ 1132ء-1131ء) نے اختیار کیا، پھر طُغرل اول، مسعود، ملک شاہ دوم، محمد دوم، سلیمان شاہ، ارسلان شاہ اور پھر طُغرل دوم (591ھ/ 1194ء) برسرِ اقتدار رہے، ان کا عہدِ حکمرانی 511ھ/ 1118ء سے 592ھ/ 1194ء تک ہے۔ قریب قریب یہ سب سلاطین کم عمری ہی میں تخت نشیں ہوئے اور اکثر قبل از وقت متشدّدانہ موت کا شکار ہوئے، ان میں سے بیشتر نے مشکل ہی سے حکومت کی، وہ اپنے اتابکوں اور امراء کے ہاتھوں میں محض آلۂ کار تھے، محمود کے بعد ہی سے یہ سلاطین محض نام کے حکمراں رہ گئے تھے۔

12.4.9.3 سلاجقۂ کرمان (جنوبی فارس)

اس سلسلے کا بانی اور مورثِ اعلیٰ چغری بیگ کا بیٹا قاؤرد قرّہ ارسلان بیگ تھا، جس نے اپنے اوغوزوں کے ساتھ 433ھ/ 1041ء کے قریب کرمان (جنوبی ایران) کی طرف کوچ کیا اور چند ہی سال بعد، یعنی 441ھ-440ھ/ 1049ء-1048ء میں اس نے کرمان کے صدر مقام بَردسیر پر قبضہ کرلیا، پھر اس نے اپنے ہی بل بوتے پر گرم سیر (گرم ساحلی علاقہ) میں شبانکاروں اور قُفسوں کے ساتھ لڑائیاں چھیڑ دیں اور طُغرل بیگ کی پرواہ کئے بغیر عُمان کا مالک بن بیٹھا۔

قاؤرد کے بعد اس کے بیٹوں کرمان شاہ اور بعد میں سلطان شاہ نے حکومت کی، اس کے بعد تُوران شاہ تخت وتاج کا وارث ہوا۔ بعد ازاں ایران شاہ، ارسلان شاہ، محمد، طُغرل شاہ، بہرام شاہ اور ارسلان شاہ دوم، تُوران شاہ دوم اور محمد شاہ تخت نشین ہوئے۔ سلاجقۂ کرمان کی حکمرانی کی مدت 582ھ-433ھ/ 1186ء-1041ء ہے۔

12.4.9.4 سلاجقۂ شام

464ھ-463ھ/ 1071ء-1070ء میں نصر مِرْوانی حلبی نے جب الپ ارسلان کی اطاعت اختیار کر لی تو آتسیز بن اَبَق (یا اَوَق) کی زیر قیادت ترکمانوں کے ایک جتھے نے فلسطین پر چڑھائی کی اور رَملہ، بیت المقدس اور عسقلان کے سوا جہاں فاطمی جمے رہے، یہودیہ کے سارے علاقے فتح کر لئے۔ وہ 468ھ/ 1076ء تک دمشق فتح نہ کر سکا، پھر مصر میں فاطمی سپہ سالار بدر الجمالی کے مقابلہ میں شکست کھانے کے بعد شام میں اس کا قافیہ اس قدر تنگ ہوا کہ اس نے تُتُش بن اَلپ ارسلان سے مدد طلب کی، تُتُش 470ھ/ 1077ء میں شام آیا اور دمشق اس کے حوالہ کر دیا گیا، تُتُش نے غدّاری کر کے آتسیز (Atsis) کو قتل کر دیا اور خود شہر کا مالک بن بیٹھا، عُقَیلی مُسلم بن قریش حلب پر قابض تھا، عُقیلی ایشیائے کوچک (روم) کے سلجوقی فرمانروا سلیمان کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا تو ملک شاہ نے خود بعجلت حلب پہونچ کر زنگیوں کے مورث اعلیٰ اور اپنے ترکی غلام آق سنقر کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ ملک شاہ کی موت (485ھ/ 1092ء) کے بعد سلاجقۂ شام کا بانی اور مورثِ اعلیٰ اَلپ ارسلان کا بیٹا، تُتُش حلب کا بادشاہ بنا، اس کے بعد اس کا بیٹا رضوان حلب کا بادشاہ اور اس کا دوسرا بیٹا دُقاق دمشق کا مالک بن گیا۔ دُقاق کی موت (497ھ/ 1104ء) کے بعد اس کے اتابک مختار کل طُغتگین نے پہلے ایک معصوم بچے کے نام پر، پھر دُقاق کے بھائی ارتاش کے نام پر خطبہ پڑھوایا، اور بعد ازاں خود مختار بن بیٹھا اور بوری خاندان کا بانی بنا۔ حلب کے بادشاہ رضوان کی وفات (507ھ/ 1114ء) کے بعد اس کا بیٹا اَلپ ارسلان اخرس صرف ایک سال کے لئے تخت نشین ہوا، لیکن اس کے خادم لؤلؤ نے جلد ہی اسے قتل کرنے کے بعد اس کے بھائی سلطان شاہ کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا، لیکن وہ خود 511ھ/ 1117ء میں مارا گیا، اس پر اہل شہر نے شہر کو۔ ایلغازی کے حوالہ کر دیا۔ اس طرح شاہی سلسلہ کے چوتھے سلطان پر سلجوقی حکومت شام سے ختم ہوگئی۔

12.4.9.5 سلاجقۂ روم (اناطولیہ)

اس خاندان کا بانی اور مورث اعلیٰ سلیمان بن قُتُلمش بن ارسلان بن سلجوق تھا، سلیمان دیگر ترکی امراء کی طرح ملاز کرد کی جنگ (464ھ/ 1071ء) کے بعد ایشیائے کوچک (روم) میں وارد ہوا، اسے 470ھ/ 1077ء کے قریب نائیسیا (Nicaea) کے فرمانروا کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے، بازنطینی سلطنت پر Alexius comnenus کی تخت نشینی کی وجہ سے مایوس ہو کر اس نے مشرق میں ارمنی بادشاہ Philaretus سے 477ھ/ 1085ء میں انطاکیہ کا شہر چھین لیا، سلیمان کے بعد اس کے بیٹے قلیج ارسلان اول اور پھر اس کے جانشین ملک شاہ اور مسعود، قلیج ارسلان دوم، رکن الدین سلیمان دوم، قلیج ارسلان سوم اور غیاث الدین کیخسرو اول، عزّ الدین کیکاؤس اول، علاؤالدین کیقباد، عزالدین کیخُسرو دوم، عزالدین کیکاؤس دوم، رکن الدین قلیج ارسلان چہارم، غیاث الدین کیخسرو سوم، غیاث الدین مسعود دوم اور علاؤالدین کیقباد سوم نے عنانِ حکومت سنبھالی۔ ان کا عہد حکمرانی 470ھ/ 1077ء سے 702ھ/ 1302ء تک رہا۔

قونیہ میں روم کے سلجوقیوں کی جگہ 700ھ/ 1300ء اوراس کے بعد کے زمانہ میں اوغوز ترکمانوں کا ایک دوسرا قبیلہ (عثانی ترکوں کا) برسرِ اقتدار آیا اور اسلام کی علم برداری میں سب سے زیادہ پیش پیش رہا، وہ 1529ء میں مغربی یورپ ویئنا (Vienna) میں گھس گئے اور عرب خلفاء کی مملکت کے تقریباً مساوی ہی وسیع ممالک پر اسلامی حکومت قائم کرلی، صرف پہلی عالمی جنگ کے بعد ہی ان کی یہ پوری حکومت ختم ہوگئی اور وہ اپنے سابقہ ایشیائی علاقوں ہی کو سنبھال سکے۔

12.4.9.6 اتابکین سلاجقہ

سلاطینِ دولتِ سلجوقیہ اپنے نوعمر اور کم سن شہزادوں کی اتالیقی پر مملوک سرداروں کو مامور کرتے اور انہی غلاموں کی نگرانی میں سلجوقی شہزادوں کی تربیت ہوتی، اس لئے ان مملوکوں یعنی ترک غلاموں کو اتابک (اتالیق/Tutor) کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اتابک کے معنی ترکی زبان میں ایسے امیر کے ہیں جو باپ کے قائم مقام سمجھا جائے۔ اتا بمعنی پدر اور بک بیگ کا مخفف ہے جس کے معنی سردار کے ہیں۔

جب سلاطین سلجوقیہ آپس میں لڑلڑ کر کمزور ہوگئے تو ان مملوکوں یعنی اتابکوں نے موقعہ پاکر اپنی مستقل حکومتیں جابجا قائم کرلیں۔ ظہیرالدین طُغتگین جو سلجوق تُتش الپ ارسلان کا مملوک تھا، وہ تتش کے نوعمر بیٹے وفاق سلجوقی کا اتابک مقرر ہوا اور وفاق کے بعد تتش سلجوقی کی سلطنت کا مالک ہوگیا اور دمشق میں حکومت کرنے لگا، اس خاندان میں تقریباً چھ حکمراں ہوئے، 549ھ/ 1155ء میں زنگیوں نے ان سے یہ حکمرانی چھین لی، صرف سیف الدولۃ کے خاندان میں 52 برس حکومت رہی۔

عمادالدین زنگی سلطان ملک شاہ سلجوقی کے مملوک کا بیٹا تھا۔ اس نے موصل اور حلب میں اتابکی سلطنت قائم کی۔ عراق کے سلجوقی سلطان مسعود کا ایک قبچاقی غلام تھا، اس نے آذربائیجان میں اتابکی سلطنت قائم کی، 531ھ/ 1137ء سے 622ھ/ 1225ء تک اس کے خاندان میں حکومت رہی۔ آخر میں یہ حکومت شاہانِ خوارزم کے مقبوضات میں شامل ہوگئی۔ سلطان ملک شاہ سلجوقی کا انوشگین نامی ایک مملوک تھا، اس کی اولاد میں شاہانِ خوارزم شاہیہ تھے۔

اسی طرح سَلغُر ایک اتابک سردار تھا جس نے فارس میں اتابکی سلطنت قائم کی۔ 543ھ/ 1149ء سے 686ھ/ 1287ء تک یہ حکومت اس خاندان میں رہی، اس خاندان میں نو بادشاہ ہوئے، تاتاریوں کے ہاتھوں یہ حکومت ختم ہوئی۔ مشہور ایرانی شاعر شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی اسی عہد کے تھے، انہوں نے فارسی زبان میں حکمت و دانائی پر مبنی ایک شاہکار کتاب ''گلستاں'' کے نام سے تصنیف کی۔

امیر سقمان قطبی جو قطب الدین اسماعیل سلجوقی کا غلام تھا، نے شہر غلاط میں اپنی حکومت قائم کی، 493ھ/ 1099ء سے 604ھ/ 1207ء تک امیر سقمان کی اولاد میں حکمرانی قائم رہی، یہ لوگ شاہانِ ارمن کہلائے، اس خاندان کا آخری حکمراں عزیز الدین ایلیان تھا، اس حکومت کے وارث سلاطینِ ایوبی ہوئے۔

ملک شاہ کا غلام سپہ سالار ارتق ترکمان تھا، اس کے لڑکے معین الدین سقمان نے سلطان برکیاروق کے عہدِ حکومت (495ھ / 1101ء) میں قلعہ کیفا پر قبضہ کرلیا اور حکمرانی شروع کردی۔ کچھ عرصہ بعد اس نے علاقہ ماردین پر بھی قبضہ کیا اور اپنی حکمرانی کے

حدود وسیع کر لئے، 502ھ/ 1109ء میں اس کی حکومت کے دو حصے ہوگئے، ایک کا مرکز قلعہ کیفا تھا اور دوسرے کا ماردین۔ قلعہ کیفا میں تقریباً دس حکمراں ہوئے، 620ھ/ 1223ء میں ایوبیوں نے ان سے حکومت چھین لی۔ ماردین میں تقریباً چودہ امراء ہوئے، 811ھ/ 1409ء میں آلِ عثمان نے ان سے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس خاندان کی حکومت دولتِ ارتقیہ کہلائی۔

الغرض چھٹی صدی ہجری میں تمام سلجوقی سلطنت پر سلجوقیوں کے افسرانِ فوج قابض ومتصرف ہوکر اپنی اپنی مستقل بادشاہتیں قائم کر چکے تھے۔

12.4.10 سلجوقی دور میں فارسی ادب کی نشو ونما

سلجوقی سلطنت میں فارسی ادب کی زیادہ سرپرستی کی گئی اور اس کی ترقی واشاعت میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ ملک شاہ اور سنجر جیسے سلجوقی بادشاہوں نے فارسی زبان وادب کی سرپرستی میں مثالی کوشش کی۔ عمید الملک کندری اور نظام الملک طوسی جیسے ان کے وزراء اور امراء نے بھی علم نوازی اور ادب پروری کا حق ادا کیا۔ ذیل میں پروفیسر فضل الرحمٰن کی زیرِ ادارت شائع کردہ اردو انسائیکلوپیڈیا جلد اول اور علاّمہ شبلی نعمانی کی شعر العجم کی مدد سے اس ضمن میں معلومات فراہم کی جارہی ہیں۔

سلجوقی دور عظیم شعراء، ادباء، مؤرخین، علماء، فقہاء اور مشائخ کا دور ہے۔ اس دور میں فارسی ادب میں عارفانہ عقائد بھی عام ہوئے۔ سلجوقی دور میں چند معروف صوفی شعراء کے وجود نے اس دور کی شاعری کو ایک امتیازی شان بخشی ہے، ان شعراء کی وجہ سے اس دور میں فارسی غزل توجہ کا مرکز بنی اور قصیدہ نگاری کی اہمیت نسبتاً کم ہوگئی۔ شیخ ابوسعید ابی الخیر، خواجہ عبداللہ انصاری ہروی، ابوالمجید مجدود بن آدم سنائی اور شیخ فریدالدین عطار اس دور کے نامور صوفی شعراء اور ادیب ہیں۔ صوفی شعراء کے علاوہ سلجوقی دور میں قصیدہ نگار بڑی تعداد میں گزرے ہیں، ابونصر علی بن احمد اسدی طوسی، حکیم ناصر بن خسرو بن حارث قبادیانی، ابومنصور قطران تبریزی، مسعودِ سعدِ سلمان، محمد بن عبدالملک، اوحدالدین محمد انوری اور افضل الدین بدیل بن علی خاقانی شیروانی بعض اہم اور معروف قصیدہ نگار ہیں۔ عہد سلجوقی کے دیگر معروف قصیدہ نویسوں میں ابوبکر زین الدین ازرقی، ابوالفرج رونی (جس نے لاہور میں زندگی گذاری)، مختاری غزنوی، عمعق بخاراتی، سید حسن غزنوی، خوارزم شاہیوں کا ملک الشعراء رشید وطواط، ادیب صابر، اثیر اخسیکتی، جمال الدین اسمعیل اور اس کا لڑکا کمال اسمعیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر شاعر کا فارسی قصیدہ نویسی میں اپنا مخصوص مقام ہے۔ اسی دور کا ایک شاعر ظہیر فاریابی قصیدہ نگاری میں انوری کا ہم پلّہ سمجھا جاتا ہے۔

سلجوقی دور میں رباعی کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ فارسی کا سب سے عظیم رباعی گو عمر خیام اسی عہد کا شاعر ہے۔ سلجوقی عہد میں عشقیہ مثنوی نگاری کو بھی فروغ حاصل ہوا، اس دور کا پہلا عشقیہ مثنوی نگار فخر الدین سعد گرگانی ہے۔ حکیم ابومحمد الیاس بن یوسف بن زکی بن موید نظامی گنجوی فارسی کا پہلا خمسہ نگار ہے۔

سلجوقی دور میں فارسی نثر کو بھی قابلِ قدر ترقی ہوئی۔ اس دور میں جو اہم نثری آثار وجود میں آئے وہ موضوع ومطالب کے لحاظ سے مختلف النوع اور تصوف، تاریخ، اخلاق، طب اور ادب وغیرہ سے متعلق ہیں۔ اس دور کے متعدد علماء نے عربی میں بھی تصنیف وتالیف کا کام انجام دیا۔ اس دور میں تصوف وعرفان پر چند بنیادی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں ترجمہ رسالہ قشیریہ، علی بن

عثمان ہجویری کی کشف المحجوب، شیخ ابوسعید ابوالخیر کے ملفوظات پر مشتمل اسرار التوحید اور شیخ عطار کی تذکرۃ الأولیاء اور احمد غزالی کی سوانح العشاق، تصوف کی اساسی کتب میں شمار کی جاتی ہیں۔ خواجہ عبداللہ انصاری کے رسائل نثری شعر اور جذب و کیفیت کے بے مثال نمونے ہیں۔

علاوہ ازیں عین القضاۃ ہمدانی کے مکاتیب اور تمہیدات، شیخ شہاب الدین سہروردی کی تالیفات، شیخ نجم الدین کبری اور شیخ مجد الدین بغدادی کے رسائل کا شمار بھی اس دور کے اہم عرفانی آثار میں ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام کا مقصد عوام کی رہنمائی تھی، اس وجہ سے ان کی مجالس اور تالیفات میں سادہ اور رواں فارسی زبان استعمال کی گئی ہے۔ ان کتابوں میں اس عہد کے لوگوں کے آداب وعادات اور افکار و زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ صوفیانہ نثر میں سادگی کے علاوہ جذب و شوق کی کیفیت جلوہ گر ہے۔

اس دور میں تاریخ کی چند بنیادی کتابیں تالیف کی گئیں۔ درحقیقت فارسی میں تاریخ نویسی کی روایت کا باقاعدہ آغاز سلجوقی دور ہی سے ہوتا ہے۔ یہ کتابیں بنیادی اہمیت اور افادیت کی حامل ہیں، ابوسعید عبدالحئ ابن ضحاک گردیزی غزنوی کی زین الأخبار فارسی کی اولین تاریخی کتب میں شمار ہوتی ہے۔ غزنویوں کے آغازِ سلطنت سے لے کر سلطان ابراہام بن مسعود کے اوائلِ سلطنت کے حالات بیان کرنے کے لئے ابوالفضل محمد بن حسین بیہقی کی تیس جلدوں میں تاریخ بیہقی کا شمار فارسی کی امّہاتِ کتب میں ہوتا ہے۔ ایران کے قدیم دور اور اسلامی عہد کے سلاطین کی تاریخ پر ایک معتبر کتاب مجمل التواریخ والقصص ہے، جو سلطان سنجر محمود بن ملک شاہ سلجوقی کے عہدِ سلطنت میں لکھی گئی۔ ابوبکر محمد راوندی کی راحۃ الصدور اس دور کی دوسری اہم تاریخ ہے، جس میں سلجوقی دور حکومت کی ابتداء سے خوارزم شاہیوں کے ہاتھوں اس دور کے خاتمے تک کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔

اس دور میں تاریخ کی بعض کتابیں عربی سے فارسی میں ترجمہ کی گئیں۔ ان میں ایک تاریخ بخارا یا مزاراتِ بخارا ہے، اس کا فارسی مترجم محمد بن زفر بن عمر ہے۔ دوسری کتاب تاریخِ یمینی ہے، اس کا مترجم ابواشرف ناصح بن ظفر جرباد قانی ہے۔ تیسری کتاب فتوح ابن اعثم کا فارسی ترجمہ ہے جو عربی میں خلافتِ راشدہ اور امویوں کی تاریخ ہے، اس کتاب کا مترجم احمد بن محمد ہروی ہے۔

ایران کی علاقائی تاریخوں میں فارس نامہ اور تاریخِ طبرستان خاصی اہم ہیں۔ اول الذکر میں قبل اسلام کی تاریخ فارس بیان کی گئی ہے اور اس کا مؤلف ابن البلخی ہے۔ دوسری کتاب طبرستان کی تاریخ اور بہاء الدین محمد بن حسن بن اسفندیار کاتب کی تالیف ہے۔ بیہق اور اس کے نواح کے علماء وفضلاء وغیرہ کے احوال بیان کرنے کے لئے ابوالحسن علی بن زید بیہقی نے تاریخِ بیہق لکھی۔

سلجوقی دور میں اخلاقیات، عمرانیات، ادبیات، انشاء اور مذہبیات وغیرہ پر بعض انتہائی اہم کتابیں لکھی گئیں۔ اخلاقی، ادبی اور طبی کتابوں میں سیاست نامہ، قابوس نامہ، کیمیائے سعادت، کلیلہ ودمنہ، چہار مقالہ، حدائق السحر، مقامات حمیدی، ذخیرۂ خوارزم شاہی اور مرزبان نامہ وغیرہ شامل ہیں۔

فصاحت وبلاغت، علمِ بیان وبدیع اور شعریات پر اس دور کی تین کتابیں اہم ہیں: پہلی محمد بن عمر رادویانی کی ترجمان البلاغۃ، دوسری رشید وطواط کی حدائق السحر اور تیسری شمس الدین محمد بن قیس رازی کی المعجم فی معاییر أشعار العجم ہے۔

سلجوقی دور میں نجوم، ہیئت وغیرہ پر بھی متعدد کتابیں لکھی گئیں جن سے فارسی نثر کے ارتقاء کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

12.5 خلاصہ

آلِ بویہ (سلاطینِ دیالمہ) خلافتِ عباسیہ پر متولی رہے، 447ھ - 322ھ/ 1055ء - 934ء یعنی تقریباً سوا سو سال تک یہ لوگ خلیفۂ بغداد اور عراق و فارس پر قابض و متصرف رہے۔ آل بویہ میں معزالدولۃ اور عضدالدولۃ جیسے قابل حکمراں اور ابن العمید اور صاحب ابن عباد جیسے زیرک وزراء گذرے ہیں۔ بویہی دور میں بعض علم دوست بھی رہے ہیں اور بعض مدارس بھی قائم کئے گئے۔ ان کے زمانے میں عربی سیادت کے تمام نقوش مٹ گئے۔ آل بویہ نے اپنے لئے امیرالأمراء کا خطاب تجویز کیا، جب کہ سلاجقہ نے سلطان کا خطاب۔ اسی عہد میں فوجی سرداروں کو جاگیریں دینے کا قاعدہ بڑے پیمانہ پر ایجاد ہوا۔

آل بویہ کے بعد سلجوقیوں نے ان کی جگہ لی اور وہ برسر اقتدار آئے۔ سلجوقیوں نے خاندان عباسیہ کے ساتھ عقیدت مندی کا برتاؤ کیا، سلجوقیوں کی طاقت بنی بویہ سے بدرجہا زیادہ اور بہتر تھی۔ ان کے زمانہ میں مسلمانوں کی ضائع شدہ طاقت وعظمت پھر بحال ہوئی، ان کی حکومت 430ھ/ 1039ء سے 700ھ/ 1300ء تک یعنی کم وبیش ڈھائی سو سال قائم رہی۔ ابتدائی زمانہ جس میں طغرل بیگ، الپ ارسلان اور جلال الدین ملک شاہ جیسے شہرہ آفاق سلاطین اور نظام الملک حسن طوسی جیسے مدبّر وزیر تھے، بڑا شاندار تھا۔ آخر میں ان کے بہت سے ٹکڑے ہوگئے، شروع ہی سے ان میں سلاجقۂ ایران، سلاجقۂ عراق، سلاجقۂ شام اور سلاجقۂ روم وغیرہ جیسے کئی طبقات قائم ہو چکے تھے، پھر ان میں اتابکوں کی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ سلاجقہ نومسلم سنی تھے انہوں نے عیسائیوں سے مقابلے کئے اور ان کے دلوں پر مسلمانوں کی شمشیر خارشگاف کی دہشت وہیبت پھر قائم کردی، لیکن آخری دور میں آپس کی نااتفاقی اور خانہ جنگی نے دولتِ سلجوقیہ کا خاتمہ کردیا۔

12.6 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھئے۔

1. جلال الدین ملک شاہ کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجئے؟
2. بویہی اقتدار میں جاگیردارانہ نظام پر تبصرہ کیجئے؟
3. سلجوقی خاندان کی ابتدائی تاریخ بیان کیجئے؟

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھئے۔

1. سلطنتِ آل بویہ پر ایک مختصر نوٹ لکھئے؟
2. نظام الملک حسن طوسی کی شخصیت اور اس کے کارناموں پر روشنی ڈالئے؟
3. الپ ارسلان کا تعارف کرائیے؟
4. سلاطینِ سلاجقہ پر ایک مختصر نوٹ لکھئے۔

12.7 فرہنگ

اوقاف	:	وقف کی جمع
عُشر	:	زمین کی محصولات کا دسواں حصہ
رصدگاہ/رصدخانہ	:	ستاروں کی گردش دیکھنے کی جگہ، جنتر منتر
زندان	:	قیدخانہ، جیل
بحری بیڑا	:	سمندری جنگی جہازوں کا قافلہ
مرغزار	:	سبزہ زار، گیاہستان
اِستیصال	:	بیخ کنی، جڑ سے اُکھیڑنا
اِنسداد	:	روک تھام
برامکہ	:	خلافتِ عباسیہ میں ہارون رشید کے دور میں ایک حکمراں خاندان۔
اِستبداد	:	ظلم وجور سے حکومت کرنا، مطلق العنانی
معزولی	:	موقوفی، برطرفی
مطلق العنان	:	بےلگام، خودسر، خودمختار

12.8 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. موسوعۃ الأدیان (المیسرۃ) — متعدد مصنفین (کویت)
2. العالم الإسلامی فی العصر العباسی — دکتور حسن أحمد محمود، أحمد ابراہیم الشریف (قاہرہ)
3. محاضرات تاریخ الأمم الإسلامیۃ (الدولۃ الإسلامیۃ) — الشیخ محمد الخضری بک (قاہرہ)
4. اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 11, 5 — متعدد مصنفین (پاکستان)
5. تاریخِ اسلام، ج3 (خلافت عباسیہ، جلد دوم) — شاہ معین الدین احمد ندوی
6. تاریخِ اسلام، ج2 — اکبر شاہ خان نجیب آبادی
7. تاریخِ اسلام پر ایک نظر — عبدالرحمٰن خان ایم اے
8. تاریخِ ملت، جلد 6 (خلافت بنی عباس، جلد2) — مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی

9. تاریخِ تہذیبِ اسلامی (حصہ سوم و چہارم) پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی۔

10. تاریخ الفخری محمد بن علی بن طباطبا عُرف ابن الطقطقی

اردو ترجمہ: مولوی محمود علی خان، ندوۃ المصنفین، دہلی۔ نومبر 1969ء / رمضان 1389ھ

11. تاریخِ عرب فِلِپ کے ہِٹی

اردو ترجمہ: پروفیسر سید مبارز الدین رفعت / محمد معین خاں، اپریل 2007ء، البلاغ پبلیکیشنز، نئی دہلی

اکائی 13 : طاہریہ، صفّاریہ، سامانیہ

اکائی کے اجزاء

13.4.6 صفار اور خلیفہ معتمد کی جنگ

13.4.7 یعقوب صفار کی موت

13.4.8 عمرو بن لیث صفّار

13.4.9 خاندانِ صفّاریہ کا خاتمہ

13.4.10 صفّاری دور میں فارسی شعر و ادب

13.5 سامانیہ

13.5.1 سامانیہ کا تعارف

13.5.2 سامانیہ کی ابتدائی تاریخ

13.5.3 نصر بن احمد سامانی اور اسمٰعیل بن احمد سامانی

13.5.4 احمد بن اسمٰعیل سامانی

13.5.5 ابوالحسن نصر بن احمد سامانی

13.5.6 منصور اول بن نوح بن نصر

13.5.7 عبدالملک بن نوح

13.5.8 سلطنت سامانیہ کا خاتمہ

13.5.9 سامانیہ اپنے عہدِ عروج میں

13.5.10 سامانی دور میں علم و ادب کی سرپرستی

13.5.11 سامانی دور میں فارسی ادب کی نشو و نما

13.6 خلاصہ

13.7 نمونے کے امتحانی سوالات

13.8 فرہنگ

13.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

13.1 مقصد

اس اکائی میں آپ تین سلطنتوں: سلطنتِ طاہریہ، سلطنت صفاریہ اور سلطنتِ سامانیہ کے بارے میں پڑھیں گے۔ اسے پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ دولتِ طاہریہ کی تاریخ کیا ہے، جنرل طاہر بن حسین اور عبداللہ بن طاہر کے علاوہ دیگر حکمرانوں نے ایران میں کس طرح اپنی سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔ اس اکائی میں آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ صفاریہ کون تھے، صفاریوں کا دائرہ حکومت کتنا وسیع تھا اور ان کے زوال کے اسباب کیا تھے۔ اسی طرح آپ اس اکائی میں یہ بھی جان سکیں گے کہ ماوراء النہر کے علاقہ میں سامانی خاندان کا قیام کس طرح عمل میں آیا، سامان خُدات، اسد بن سامان، نصر بن اسد اور اسمٰعیل بن اسد کے علاوہ دیگر حکمرانوں نے سامانی سلطنت کو کس طرح فروغ دیا اور پھر اس سلطنت کا خاتمہ کس طرح عمل میں آیا۔

13.2 تمہید

اس اکائی میں طاہریوں، صفاریوں اور سامانیوں کے بارے میں گفتگو کی جائے گی۔ طاہریوں کے بارے میں بتایا جائے گا کہ خراسان میں خلافت عباسیہ کے ماتحت یہ پہلی نیم خودمختار حکومت کیسے بنی، طاہر بن حسین کے اوصاف کیا تھے، طاہر کے بعد عبداللہ بن طاہر نے اپنی سلطنت کو کس طرح پروان چڑھایا۔ طاہری علویوں کے ساتھ کس طرح نبرد آزما ہوئے اور ان کی حکومت کیوں زوال پذیر ہوگئی۔ اسی طرح اس اکائی میں صفاریوں پر روشنی ڈالی جائے گی، اس کے بانی یعقوب بن لیث صفار کن خصوصیات کے مالک تھے، اور یہ کہ صفاری دور میں فارسی شعروادب کی کیا نوعیت رہی۔ اس اکائی کی آخری کڑی میں ماوراء النہر میں دولتِ سامانیہ کے قیام کے پس منظر اور روداد حکومت پر روشنی ڈالی جائے گی، یہ بھی موضوعِ گفتگو رہے گا کہ دولتِ سامانیہ میں علم وفن اور شعروادب کی کس طرح سرپرستی کی گئی۔

13.3 طاہریہ

13.3.1 طاہری سلطنت کا تعارف

طاہریہ، دولتِ عباسیہ کے ماتحت خراسان کا پہلا نیم خودمختار حکمراں خاندان تھا۔ اس کا بانی طاہر بن حسین تھا۔ 194ھ/ 810ء میں عباسی خلیفہ مأمون الرشید نے طاہر کو جب سپہ سالار مقرر کیا تو گویا اُس وقت سے اس خاندان کی حکومت کی بنیاد پڑ گئی، یا 205ھ/ 820ء میں مامون نے جب اسے خراسان کا گورنر مقرر کیا تھا تو اسی وقت سے خراسان میں اس کی اپنی مستقل حکومت شمار کی جانے لگی، اس اعتبار سے اس خاندان نے تقریباً 55 برس تک حکومت کی۔ خراسان میں کس ایرانی خاندان کی یہ سب سے پہلی نیم خودمختار سلطنت تھی جو 205ھ سے 259ھ/ 820ء سے 873ء تک قائم رہی۔ خاندانِ طاہریہ کے فرمانروا اپنے آپ کو خلیفۂ بغداد کا محکوم سمجھتے اور اس کے نام کا خطبہ پڑھتے تھے، لیکن دربارِ خلافت کو خراسان کے اندرونی انتظام میں کوئی دخل نہ تھا۔

طاہر کے بعد طلحہ بن طاہر، علی بن طلحہ، عبداللہ بن طاہر، طاہر بن عبداللہ اور محمد بن طاہر بن عبداللہ پے در پے پانچ والی یعنی گورنر خلفاء کے حکم سے مقرر ہوئے۔ یہ حکمراں عباسی خلفاء کے فرماں بردار رہے۔ خلفاء نے بھی ان کی خدمات کی قدر افزائی

کی۔ صفاریوں کے ساتھ نزاع میں ان ہی کی طرف اپنا میلان برقرار رکھا۔ خراسان میں زوالِ مملکت کے باوجود 301ھ/ 913ء تک بغداد میں پولیس افسر (یا پولیس کمشنر) کا عہدہ انہی کے پاس رہنے دیا۔ مشرق میں طاہریوں کی حکومت ایک صالح حکومت تھی، جس میں رعایا کے مسائل حل کیے جاتے تھے۔ طاہریوں نے ملک کے معاشی مسائل درست کیے، امن وامان بحال کیا، کارکنان حکومت پر کڑی نگاہ رکھی۔

13.3.2 جنرل طاہر بن حسین: بانی سلطنتِ طاہریہ

ذوالیمینین طاہر بن حسین بن مصعب بن رزیق بن ماہان، صوبہ ہرات میں واقع شہر بُوشَنج کے والیوں کے ایک پرانے خاندان سے تھا۔ طاہر کا دادا مصعب بن رزیق بوشنج اور ہرات کا حاکم تھا۔ طاہر کا پڑدادا یعنی مصعب کا باپ رزیق حضرت طلحہ بن عبیداللہ کا جو طلحۃ الطلحات خُزاعی کے لقب سے مشہور تھے، غلام تھا، مسلم بن زیاد بن ربیعہ نے اپنی گورنری کے زمانہ میں اس کو سیستان کا عامل مقرر کر دیا تھا۔ امویوں کے خلاف بغاوت کے زمانہ میں مصعب، ابومسلم کے حامی اور بنوعباس کے نقیب سلیمان بن کثیر خُزاعی کا کاتب (سکریٹری) تھا، آخر میں ہرات کا امیر ہوگیا، پھر مرو کے قریب بوشنج کے مقام میں سکونت پذیر ہوگیا۔ مصعب کی وفات کے بعد اس کا بیٹا حسین (200ھ-199ھ/ 815ء-814ء) میں بُوشَنج کا گورنر مقرر رہا اور اس کے بعد اس کا بیٹا طاہر، خاندانِ طاہریہ کا بانی بنا۔ طاہر بوشنج میں 159ھ/ 776ء میں پیدا ہوا۔ اس نے علم وادب اپنے وقت کے نامور علماء سے حاصل کیا، وہ تنو مند اور بہادر تھا، مامون جب مرو میں قیام پذیر تھا تو وہ اس کے دربار سے منسلک ہوگیا۔ اس نے سب سے پہلے عباسیوں سے آزادی حاصل کر کے ایک نیم خودمختار ریاست قائم کی۔

معرکۂ کارزار میں طاہر کی چابک دستی زبان زدِ خلائق تھی۔ دانائی، قوت فیصلہ اور سخاوت وغیرہ اس کے مخصوص اوصاف تھے۔ وہ علم وادب اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کرتا تھا، عربی زبان میں جو خط اس نے اپنے بیٹے عبداللہ کو دیارِ ربیعہ کا حاکم مقرر ہونے پر لکھا، وہ اس کے معاصرین کی نگاہ میں ایک ادبی شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

13.3.3 خراسان پر طاہر بن حسین کی تولیت

عباسی خلیفہ مامون الرشید ایرانی کنیز مراجل کا بیٹا تھا۔ اسے ایران میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ طاہر نے مامون کی سرپرستی میں اپنی فوجی ملازمت کی ابتدا کی۔ ذوالریاستین وزیر فضل بن سہل جو شمشیر وقلم دونوں میں یگانۂ روزگار تھا، نے طاہر بن حسین کو مامون سے الگ کر رکھا تھا، اس کے قتل کے بعد مامون کی توجہ طاہر کی طرف مبذول ہوئی۔ 810ء میں مامون نے اسے خراسان کا سپہ سالار بنایا۔ خلیفہ مامون کے سپہ سالار طاہر بن حسین نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ بغداد کا محاصرہ کر کے امین کی حکمرانی کا خاتمہ کیا اور بغداد کو فتح کر کے مامون کے حوالہ کیا۔

طاہر کی فتحِ بغداد کے بعد مامون نے صوبۂ خراسان کی حکومت مقررہ میعاد کے بجائے مستقل طور پر طاہر اور اس کے وُرثاء کو عطا کر دی، نیز اس نے طاہر کو عراق وایران کا حاکم، بغداد کا سپہ سالار اور سوادِ عراق کا مشیرِ مال مقرر کر دیا۔

مامون 202ھ/ 817ء سے پہلے بغداد میں داخل نہ ہوا اور لگاتار چار سال (یعنی 198ھ سے 202ھ/ 813ء سے 817ء تک) طاہر ہی بغداد میں بھی کارفرما رہا، جب مامون بغداد آیا تو اس نے طاہر کو پولیس آفیسر (یا پولیس کمشنر) کا عہدہ بھی عطا کر دیا، آخر میں اسے خراسان کی حکومت دے دی گئی۔

204ھ/ 819ء میں مامون کو اپنے مقتول بھائی خلیفہ امین کی دردناک موت ستانے لگی، اسے اس بات کا خوف بھی دامن گیر ہوا کہ طاہر اس کا زبردست حریف ہے، اس لئے اب اُسے طاہر کا قصہ پاک کر دینے کی فکر لاحق ہوئی، دوسری جانب طاہر نے ابو خالد وزیر سے ساز باز کر کے خراسان کی حکومت اپنے نام پر مستقل کرالی، مامون نے خراسان کی حکومت 205ھ/ 820ء میں دیدہ و دانستہ طاہر کے حوالہ کی۔ طاہر نے اپنا صدر مقام نیشاپور بنایا اور دو سال بعد خطبہ سے خلیفہ مامون کا نام حذف کرا دیا، چنانچہ اس کے دو دن کے بعد ہی نومبر یا دسمبر 821ء/ 206ھ میں اسے خفیہ طور پر زہر دے دیا گیا، جس سے وہ مر گیا۔

طاہر کا ایک قابل ذکر کام یہ ہے کہ اس نے اصولِ سیاست و جہانبانی کے متعلق ایک مفصل دستور العمل لکھا، جو جامعیت کے اعتبار سے بے مثال تھا، طبری اور ابن اثیر نے اسے پورا نقل کیا ہے، مامون نے اس کی نقلیں تمام ممالکِ محروسہ کے عُمّال کے پاس بھجوا دیں۔

13.3.4 طلحہ بن طاہر

طاہر کی وفات کے بعد اس کے بیٹے طلحہ کی بحیثیت گورنر جانشینی عمل میں آئی۔ اس کے عہد میں حمزہ نے اپنی طاقت کو خوارج کی مدد سے مضبوط کر کے سیستان کے بہت بڑے علاقے پر قبضہ جما لیا، خراسان کے جنوب مشرق میں واقع صوبہ سیستان خراسان کی سلطنت کا ایک ماتحت صوبہ تھا، حمزہ کی سرکردگی میں 212ھ/ 827ء میں یہاں بغاوت برپا ہوئی، طلحہ نے حمزہ پر فوج کشی کر کے اسے شکست دی، اس مہم سے واپس آنے کے بعد وہ بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔

13.3.5 عبداللہ بن طاہر

عبداللہ بن طاہر ہارون رشید کے دورِ خلافت میں 182ھ/ 798ء میں پیدا ہوا۔ مامون کی زیرِ تربیت اس کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ وہ اپنے والد کے عروج و فتح مندی کے وقت 17 سال کا تھا۔ عبداللہ نے اپنے ماتحت صوبوں کے حاکموں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا، انہیں گمنامی کی زندگی سے نکالا اور ان میں جوش عمل اور روشن دماغی کے اوصاف پیدا کئے، وہ اخلاقی اور مذہبی وجوہات کی بنیاد پر ہمیشہ اس بات کی مخالفت کیا کرتا تھا کہ ادنیٰ طبقے کے لوگوں پر کسی قسم کی زیادتی یا ظلم ہو۔ اس کا عقیدہ تھا کہ حصول علم کے ذرائع ہر کس و ناکس کے لئے مہیا ہونے چاہئیں، نہ کہ اسے خاص مراعات کی مستحق اقلیت کی میراث قرار دیا جائے۔ اس کے دربار میں شعراء کی بھیڑ رہتی تھی، عربی زبان میں بہت سے اشعار اس سے منسوب ہیں۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا اور اس زمانے کے ملحدانہ ادب کا سخت دشمن، وہ ماہر اقتصادیات بھی تھا، چنانچہ اس کے عہد میں خراسان کو بڑی خوشحالی نصیب ہوئی، وہ اپنی دانائی اور حسنِ تدبیر کو بروئے کار لایا اور ذرائع آمدنی کو برابر ترقی دیتا رہا۔

عبداللہ بن طاہر اپنی شجاعت اور دلیرانہ کارناموں کی وجہ سے طاہریہ خاندان کا بے حد ممتاز اور سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ وہ اپنی کئی خوبیوں اور خصوصیات کی وجہ سے اپنے باپ طاہر سے بھی فوقیت لے گیا۔ 207ھ/ 822ء میں وہ تخت وتاج سے محروم ہوگیا تھا، لیکن جب 213ھ/ 828ء میں علی کی وفات ہوئی تو اس نے خراسان کی عنانِ حکومت سنبھال لی، قبل ازیں اس نے بحکمِ مامون متعدد خدمات انجام دیں، خلیفہ مامون اسے اپنی سلطنت کا رکن سمجھتا تھا۔

13.3.6 طاہر دوم بن عبداللہ

حسن بن حسین، عبداللہ بن طاہر کی جانب سے طبرستان کا نائب امیر تھا، 228ھ/ 842ء میں اس کی موت کے بعد اس کی جگہ طاہر دوم بن عبداللہ نائب امیر مقرر ہوا۔ طاہر نے اپنے باپ کی وفات تک اس ملک میں کوئی ایک برس اور تین مہینے تک حکومت کی، اس کے بعد خلیفہ واثق نے طاہر کو خراسان کا امیر مقرر کر دیا، طاہر ثانی نے اپنے بھائی محمد بن عبداللہ کو اپنی جگہ طبرستان کا نائب امیر بنا دیا۔

طاہر دوم کے دورِ حکومت میں بُست (سجستان) کے ایک باشندہ صالح بن نصر نے سجستان پر قبضہ کرلیا، صفّاری سلطنت کا بانی یعقوب بن لیث صفّار اس کے ساتھ ہوگیا، لیکن طاہر دوم بن عبداللہ بن طاہر والیٔ خراسان نے سجستان واپس لے لیا، لیکن پھر ایک دوسرا شخص دِرہم بن حسین دوبارہ سجستان کے ایک بہت بڑے علاقے پر 238ھ/ 852ء میں قابض ہوگیا۔ طاہر دوم، درہم بن حسین کے خلاف فوج کشی میں کامیاب نہ ہوا۔

247ھ/ 861ء میں یعقوب بن لیث صفار اقتدار حاصل کر کے سارے علاقے کا مالک بن بیٹھا۔ 18 سال تک حکومت کرنے کے بعد 248ھ/ 862ء میں طاہر ثانی فوت ہوگیا۔ اس نے اپنے ملک کی توسیع کے سلسلے میں کوئی کوشش نہ کی، وہ سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور نمود ونمائش سے متنفر تھا۔ اس نے عدل وانصاف سے حکومت کی۔

13.3.7 محمد بن طاہر دوم بن عبداللہ

خاندانِ طاہریہ کا آخری بادشاہ محمد بن طاہر 248ھ/ 862ء میں تخت پر بیٹھتے ہی امورِ سلطنت خود انجام دینے لگا تھا، اس کے عہدِ حکومت میں طوائف الملوکی اور دہشت پسندی خلافت کے تمام ممالکِ محروسہ میں جاری تھی۔ دسمبر 861ء/ 247ھ میں خلیفہ متوکل کے قتل کے بعد احمد بن طولون حاکمِ مصر نے مصر میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ فوج نے تنخواہ نہ ملنے پر خلیفہ معتز کو قتل کر دیا۔ محمد بن طاہر کے بعد بغداد کی حکومت پر 253ھ/ 867ء میں اس کی جگہ اس کا بھائی سلیمان بن طاہر مقرر رہوا۔ طاہریہ خاندان کے جو والی بغداد کے حاکم مقرر ہوا کرتے تھے انہیں بغداد کے خزانہ کے بجائے مرو کے خزانہ سے تنخواہ ملتی تھی۔ مرو کا خزانہ بالکل خالی ہونے کی وجہ سے سلیمان نے بغداد کے خزانہ سے فوج کو تنخواہ دے دی، اہلِ شہر نے کُھلّم کُھلاّ بغاوت کر دی، یعقوب بن لیث صفّار نے موقع غنیمت پا کر طاہریہ خاندان کے نظم ونسق کو درہم برہم کر دیا۔

13.3.8 دولتِ طاہریہ کا خاتمہ

بنو طاہر نے ملک کی مشرقی سرحد کی حفاظت کی اور اس کا دائرۂ اثر ترکی ممالک تک وسیع کیا، نیز انہوں نے ترک شاہوں کی بغاوت کا خاتمہ کر کے اہلِ اسلام کی شوکت وعظمت بڑھائی، لیکن آئے دن علویوں کی شورشوں اور صفاریوں کے غلبہ کی وجہ سے مشرقی سرحد پر ان کی گرفت کمزور ہوگئی اور وہ ملک کے تحفظ اور اسے ترقی دینے میں ناکام ثابت ہونے لگے۔ یعقوب بن لیث صفّار نے طاہریوں سے رفتہ رفتہ ہرات، بوشنج، کرمان، سجستان، سیستان وغیرہ چھین لئے، کیوں کہ طاہریوں کا زور ٹوٹ چکا تھا، خود امیرِ خراسان اور آس پاس کے دوسرے امراء اس سے ڈرنے لگے تھے۔ چنانچہ انہی صورتِ حالات میں ان کی حکومت خود بخود 259ھ / 873ء میں زوال آشنا ہوگئی اور اس طرح یعقوب بن لیث صفار بانی دولتِ صفاریہ نے ملوکِ طاہریہ کا خاتمہ کر دیا۔

ایک آخری واقعہ جس نے طاہریہ حکومت کا صفایا کیا، وہ یہ ہے کہ: عبداللہ سجزی، یعقوب بن لیث صفار کا حریف تھا، اس نے یعقوب کے مقابلہ میں اپنے کو بے بس پا کر طاہری حکومت میں حصہ لگانے کے لئے نیشاپور پہنچا اور محمد بن طاہر کا محاصرہ کر لیا، یہاں کے علماء نے درمیان میں پڑ کر دونوں میں صلح کرادی اور محمد بن طاہر نے اسے طبسین اور قہستان کا حاکم بنا دیا، یعقوب صفار کو اس کی خبر ہوئی تو اُس نے محمد بن طاہر کو لکھا کہ عبداللہ سجزی کو اس کے حوالہ کردے، محمد بن طاہر نے انکار کیا، اس کے انکار پر خود یعقوب صفّار نیشاپور پہنچا، اس وقت طاہریہ میں کوئی دم باقی نہ رہ گیا تھا، اس لئے یعقوب بن لیث صفّار نے محمد بن طاہر اور اس کے پورے خاندان کو گرفتار کر کے 259ھ / 873ء میں طاہری حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ طاہری خاندان 54 برس حکمراں رہا۔

13.3.9 دولتِ طاہریہ میں علم وفن کی اِشاعت

خاندانِ طاہریہ میں جہاں شجاعت اور مردانگی کے جوہر تھے، وہاں ان میں علم سے بھی لگاؤ تھا، اسی طرح خراسان میں اشاعتِ حدیث کا بھی زبردست انتظام تھا۔ حافظِ حدیث ابن رافع قشیری نے اپنے مکان پر حدیث کا درس شروع کیا، طلبہ کے علاوہ خراسان کے نامور امیر طاہر کی اولاد بھی مع خدم وحشم حاضر ہوئی، طاہریہ کے زمانہ میں خراسان میں کثرت سے درسگاہیں قائم ہوئیں، جہاں سے بڑے بڑے اصحابِ فن پیدا ہوئے۔

13.3.10 طاہری دور میں فارسی شعروادب

فتح نہاوند کے بعد ایران پر تقریباً دوسو برس تک عربوں کا تسلط رہا، عربوں کے خلاف ایرانیوں کی بیشتر قومی تحریکوں کا مرکز یہی خراسان کا علاقہ قرار پایا، یہی علاقہ آنے والی کئی صدیوں تک فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت کا مرکز تھا۔ باوجود اس کے کہ طاہریہ خاندان فارسی زبان سے بہت کم آشنا تھا، تاہم اس کے دور میں بہت سے شعراء پیدا ہوگئے۔ شبلی نعمانی کی شعر العجم (حصۂ اول ص 27) کے مطابق منوچہری دامغانی نے ایک قصیدہ میں متقدمین شعراء کا ذکر کیا ہے، ان شعروں میں جن شعراء کے نام آئے ہیں، ان میں طاہریہ شعراء بھی ہیں، یعنی حنظلہ بادغیسی، محمود ورّاق اور فیروز مشرقی۔

حنظلہ بادغیسی سب سے پہلا شخص ہے جس نے باقاعدہ شاعری اختیار کی، 219ھ یا 220ھ/ 834ء یا 835ء میں انتقال کیا۔ عروضی سمرقندی (چہار مقالہ ص 27) کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ دیوان تھا۔ محمود وڑاق ہروی طاہریہ خاندان کے سب سے آخری فرمانروا محمد بن طاہر کے زمانے میں تھا۔ فیروز مشرقی دراصل یمن کا رہنے والا تھا۔ اس نے 283ھ/ 896ء میں وفات پائی۔ شبلی نے ان شعراء کے چند اشعار مجمع الفصحاء (یا مجموعۃ الفصحاء) سے نقل کیے ہیں۔ اردو انسائیکلو پیڈیا (قومی کونسل برائے ترقی اردو، دہلی) نے لکھا ہے کہ ''کہا جاتا ہے کہ حنظلہ بادغیسی (وفات 220ھ/ 835ء) اور محمود وڑاق ہروی (وفات 221ھ/ 836ء) اس دور کے شاعر ہیں، لیکن دونوں کی طرف منسوب اشعار اور ان کی وفات کی تاریخیں مشتبہ ہیں''۔

معلومات کی جانچ

1. طاہری سلطنت کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

2. عبداللہ بن طاہر کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تحریر کریں۔

13.4 صفّاریہ

13.4.1 صفّاریہ کا تعارف

صفّاریہ ایک خود مختار حکمراں خاندان کا نام ہے، جس کا بانی یعقوب بن لیث صفّار تھا، اس سلسلہ سلاطین کی ابتداء سجستان، سیستان اور اس کے بعد ایران کے بڑے حصہ پر قبضہ سے ہوئی۔ صفّاریہ حکومت 253ھ/ 867ء میں قائم ہوئی اور 298ھ/ 903ء میں ماوراء النہر کے سامانی حکمراں خاندان کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔ یعقوب بن لیث صفّار کے لواحقین سیستان میں 558ھ/ 1163ء تک مقیم رہے۔ الغرض صفّاری خاندان کی حکومت ایران میں تقریباً 35 سال تک برقرار رہی۔ اس میں کُل پانچ فرمانروا ہوئے: یعقوب بن لیث، عمرو بن لیث، طاہر بن محمد بن عمرو، لیث بن علی بن لیث اور معدل بن علی بن لیث۔

صفّاری سلطنت طاقتور فوج کی مالک تھی۔ حسنِ تدبیر میں اسے کمال حاصل تھا، وسیع مملکت اس کے قبضہ میں تھی۔ اس کا خزانہ اس قدر مال وزر سے پُر تھا کہ یعقوب بن لیث نے اپنی موت کے وقت اپنے خزانہ میں پانچ کروڑ دس لاکھ درہم اور آٹھ کروڑ دس لاکھ دینار چھوڑ رکھے تھے۔ ان خصوصیات کے باوجود صفّاریوں کی مدتِ حکومت انتہائی کم رہی، یعنی صرف پینتیس سال۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا بانی یعقوب بن لیث صفّار اپنی خود مختار حکومت کے قیام کا آرزومند تھا، اس نے خلافتِ عباسیہ کی سرحدوں کو پھلانگ کر خود خلافتِ بغداد کے مرکز تک اپنی سلطنت کو وسعت دینے کا عزم کیا، اس کے اس عمل نے جلد ہی اسے زوال آشنا کر دیا۔

13.4.2 یعقوب بن لیث صفّار: بانیٔ سلطنتِ صفّاریہ

یعقوب بن لیث صفّار اپنی شجاعت، تدبر و سیاست اور انتظامی قابلیت کے لحاظ سے بے نظیر تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جس شخص کو میں چالیس دن تک ساتھ رہنے کے بعد نہ پہچان سکوں، اس کو دوسرا شخص چالیس سال میں نہیں پہچان سکتا۔ یعقوب نے 253ھ/

867ء سے 264ھ/ 878ء تک حکومت کی، اس نے ایران پر اپنا تسلط جما کر ہندوستان کی سرحد تک سارا ملک لے لیا اور خلیفہ معتمد کے عہد میں شہرِ بغداد پر بھی فوج کشی کی۔ اس حکومت کی کم عمری اور اس کے اسبابِ زوال میں سے ایک بڑی اور اہم وجہ عباسی خلافت کے ساتھ اس کی کشمکش بھی ہے۔

یعقوب بن لیث اور اس کا بھائی عمرو بن لیث دونوں سجستان کے باشندے تھے اور پیشے کے اعتبار سے صَفار (مس گر/ٹھیٹھرا) تھے، یعنی تانبے اور پیتل کے برتنوں کی دکانیں کرتے تھے، لیکن یعقوب بن صفار نے آبائی پیشہ ترک کر کے رہزنی اور لوٹ مار کو اپنا شعار بنالیا، گو یہ معمولی طبقہ سے تعلق رکھتا تھا، مگر بڑا بہادر، حوصلہ مند، دانشور اور عالی دماغ آدمی تھا۔ دوست نوازی، سخاوت اور سادہ زندگی بسر کرنے میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا، اس کی انہیں صفات اور اخلاق میں اس کی کامیابی کا راز چھپا ہوا تھا۔

چوں کہ اس زمانہ میں خلافتِ عباسیہ کے کمزور ہوجانے کی وجہ سے جا بجا بغاوتیں اور سرکشیاں نمودار ہورہی تھیں، اس لئے خوارج نے بھی خروج شروع کیا اور سجستان میں تو ان کا زور خوب بڑھ گیا، ان کے مقابلہ میں اہلِ بیت یعنی علویوں کے طرفدار بھی نکل کھڑے ہوئے، انہیں میں بست کا ایک عرب زاہد شخص صالح بن نصر کنانی بھی تھا جو اہلِ بیت کی بہی خواہی کا دعویٰ کر کے خروج پر آمادہ ہوا اور بڑا نام پیدا کیا، اس کے اردگرد امراء، رؤساء اور عوام کا ایک گروہ جمع ہوگیا، یعقوب بن لیث اور اس کا بھائی عَمرو بن لیث دونوں چوں کہ پہلے سے دولتِ عباسیہ کے باغی تھے اور اس سے منحرف ہوچکے تھے، حصول مقصد کے لئے اسی گروہ میں شامل ہوگئے، رہزنی میں اس کا دلیرانہ کردار صالح بن نصر کنانی کی توجہ کا مستحق ٹھہرا اور یعقوب نے بھی اپنی قابلیت اور کارگزاری سے صالح کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل کرلیا تھا، چنانچہ صالح نے اپنے فوجی دستوں کی کمان اس کے سپرد کردی، 232ھ/ 846ء میں صالح نے سجستان پر قبضہ کرلیا اور خاندانِ طاہریہ کے ارکان کو وہاں سے نکال دیا، لیکن خراسان کے گورنر (والی) طاہر بن عبداللہ بن طاہر نے صالح سے سجستان واپس لے لیا۔

اس کامیابی کے بعد ہی صالح کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد دِرہم بن حسین نے موقعہ پاکر بلا مزاحمت سجستان پر دوبارہ قبضہ کیا، یعقوب صفار بھی اس کے ساتھ تھا، دِرہم میں فوجی تنظیم کی صلاحیت نہ تھی، اس لئے اس کی باگ ڈور صفّار کے ہاتھوں میں تھی۔ درہم کے ساتھیوں کو جب اپنے سردار کی کمزوری اور صفار کی اہلیت، قابلیت، حسنِ انتظام اور حسنِ عمل کا اندازہ ہوا تو وہ یعقوب کے ہم نوا بن گئے اور درہم کی جگہ اس کو اپنا سردار بنالیا، درہم نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ ساتھ چھوڑ کر الگ ہوگیا۔ یعقوب بڑا عالی دماغ تھا، اس نے سجستان کا بہت اچھا انتظام کیا، فوجی قوت کو بڑی ترقی دی اور چند دنوں میں اس کی قوت اتنی بڑھ گئی کہ اس نے سجستان سے خارجیوں کو ختم کر کے یہاں اپنی مستقل حکومت قائم کرلی، یہ حکومت تاریخ کی کتابوں میں صفاری حکومت کے نام سے جانی جاتی ہے۔

13.4.3 ہرات اور بوشنج پر قبضہ

یعقوب بن صفار کا اصل مقصد اہلِ عجم یعنی غیر عرب قوموں کی قوت اور ان کے غلبہ واقتدار کو توڑنا تھا، اسی لئے سجستان پر قبضہ کے بعد وہ خود کو خلیفۂ عباسی کا مطیع وفرماں بردار ظاہر کرتا رہا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دعوت شروع کردی، سجستان میں حکومت کے استحکام کے بعد اس نے طاہریوں کے ماتحت خراسان میں ہرات کا رُخ کیا، یہاں کے طاہری حاکم محمد بن ادریس کو

شکست دے کر ہرات اور بوشنج پر قبضہ کرلیا، لیکن والیٔ خراسان محمد بن طاہر بن احمد نے کرمان کی حکومت سپرد کرکے اس کی توجہ ہرات سے ہٹانے کی کوشش کی، بہرحال 253ھ/ 867ء ہی میں اس نے ہرات کو دوبارہ فتح کیا اور بعض طاہریوں کو قید کرلیا۔

13.4.4 فارس پر قبضہ

یعقوب بن لیث صفار تمام عباسی عُمّال کے خلاف اٹھا تھا اور والیٔ فارس علی بن حسین چوں کہ عباسی عامل تھا اور کرمان پر قابض ہونے کی کوشش کی تھی، اس لئے یعقوب کے دل میں اس کے تئیں قطعی نرم گوشہ نہ تھا، چنانچہ کرمان کے بعد اب فارس ہی کا نمبر تھا، اور علی بن حسین بھی ذہنی طور پر اس کے لئے نہ صرف تیار تھا بلکہ اس نے انتہائی باریک بینی سے مقابلہ کی تدبیر بھی سوچ رکھی تھی، اس نے پہاڑ اور نہر کے درمیان ایک نہایت تنگ دُرّہ کے دہانہ پر اپنی فوج لاکر ٹھہرادی تھی، تاکہ یعقوب صفار کسی سمت سے اس پر حملہ آور نہ ہوسکے، یعقوب کرمان سے سیدھا فارس کی راجدھانی شیراز پہنچا اور فوج نہر میں اتاردی اور دلیری کے ساتھ اسے عبور کرکے نہر کے دوسرے پار پہنچ گیا، اس کی یہ دلیرانہ جرأت دیکھ کر علی اور اس کی فوج نے ہمت ہاردی، علی گرفتار ہوا۔ اس طرح یعقوب بن لیث صفار 255ھ/ 869ء میں اہلِ فارس کو نقصان پہنچائے بغیر جب فارس کے پایہ تخت شیراز میں داخل ہوا تو پورا فارس از خود زیرنگیں ہوگیا۔ فارس پر قبضہ کے بعد یعقوب نے عباسی خلیفہ معتز کے پاس تحریری اطاعت نامہ اور بہت سے قیمتی ہدیے بھیجے، اس کے بعد فوراً یعقوب اپنی حکومت کو مستحکم کئے بغیر سجستان لوٹ گیا۔

13.4.5 فارس میں عباسی عُمّال کی تقرری

ادھر یعقوب صفار کی واپسی کے بعد خلیفہ معتز نے فارس میں پھر اپنے عُمّال مقرر کردئے، چنانچہ اس نے فارس کا علاقہ حارث بن سیما کے متعلق کردیا تھا، 256ھ/ 870ء میں ایک شخص محمد بن واصل بن ابراہیم تمیمی عراقی اور احمد بن لیث کردی نے فارس کے گورنر حارث کو قتل کرکے غاصبانہ قبضہ کرلیا تھا۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ 257ھ/ 871ء میں عباسی خلیفہ معتمد نے اپنے دور میں حسن بن فیاض کو وہاں کا حاکم بنایا۔

اس درمیان میں یعقوب زیادہ تر نواح سجستان میں غیر مسلم فرمانرواؤں سے لڑتا رہا، حالاں کہ خاندانِ طاہریہ سے اس کی کشمکش جاری رہی، اس نے طاہریوں سے بتدریج تمام خراسان خالی کرالیا اور قابض ومتصرف ہوکر وہاں اپنی مستقل حکومت قائم کرلی۔

257ھ/ 871ء میں یعقوب نے پھر فارس کا رخ کیا، خلیفہ معتمد کے بھائی اور اس کے ولی عہد (Crown Prince) موفق نے اس وقت فارس کو یعقوب صفار کے پنجہ سے بچانا ضروری سمجھا، چنانچہ اس نے بلخ، طمارستان، طخارستان اور سندھ کی سندِ گورنری خلیفہ معتمد (وفات رجب 279ھ/ 892ء) سے لکھوا کر یعقوب کے پاس بھیج دی، یعقوب نے اسے بسا غنیمت سمجھا اور بلخ وطخارستان کا بخوبی بندوبست کرکے فارس چھوڑ کر کابل پہنچا، اس نے وہاں رُخّج (Arachosia) کے شہزادوں کی طرف رجوع کیا اور یہاں کے فرمانروا رتبیل کو قتل کرکے بلخ، بامیان اور کابل پر قبضہ کیا اور یہاں کی بیش قیمت نایاب چیزیں، جن میں چند بت بھی تھے، خلیفہ معتمد کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجے، تاکہ اس کا یہ عمل راہِ خدا میں سندِ جہاد بن سکے۔

کابل کے بعد یعقوب نے بست اور کرخ پر قبضہ کر کے بوشنج میں علی بن حسین بن طاہر کو گرفتار کیا، کابل کا علاقہ گرچہ بنی اُمیّہ ہی کے ابتدائی دور میں بلکہ خلافت راشدہ ہی کے دور سے اسلامی حکومت کا باجگذار بن گیا تھا، لیکن وہ ایران وعراق وغیرہ کی طرح اسلامی ملک نہ تھا، صفاریوں نے اسے اسلامی قلمرو میں شامل کر کے اسلامی ملک بنا دیا، پھر یعقوب صفار سجستان سے ہرات اور ہرات سے خراسان کے شہروں کو قبضہ میں لانے لگا۔

محمد بن واصل عراقی نے دولتِ عباسیہ کے عامل حارث بن سیما کو قتل کر کے فارس پر قبضہ کر لیا تھا، خلافتِ عباسیہ سے ابن واصل کی مخالفت دیکھ کر یعقوب صفار سیدھا فارس پہنچا اور آسانی کے ساتھ ابن واصل اور اس کی فوج کو شکست دے کر تمام صوبۂ فارس پر قبضہ کر لیا، خراسان پہلے ہی اس کے قبضہ میں آچکا تھا، اب 261ھ/ 874ء میں فارس پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔

13.4.6 صفار اور خلیفہ معتمد کی جنگ

یعقوب صفار ایک جانب خلفاء کی اطاعت کا دم بھرتا تھا اور دوسری جانب ان کے عجمی عُمّال کے خلاف تھا، اس لئے عمّال سے جنگ کے سلسلہ میں وہ خلیفہ کے احکام کی پابندی نہیں کرتا تھا، ان حالات میں دونوں کے درمیان کشمکش کا پیدا ہونا یقینی تھا، چنانچہ بالآخر براہِ راست عباسی حکومت سے اس کے ٹکراؤ کی نوبت آگئی۔

معتمد نے عبیداللہ بن عبداللہ بن طاہر کے ذریعہ سے خراسان، جرجان اور طبرستان جیسے تمام مشرقی علاقوں میں صفار کی خودسری اور اس سے اپنی بیزاری کا اعلان کرا دیا اور خراسان کے مختلف حصے یہاں کے ممتاز اور صاحبِ اقتدار اشخاص کے متعلق کر دئے۔ یعقوب صفار نے خلیفہ معتمد کی خدمت میں ایک درخواست بھیجی، جس میں حسب ذیل مطالبات تھے:

''اس کو طاہر بن حسین کے رقبۂ حکومت کا والی (گورنر) بنایا جائے۔ طبرستان، رے، جرجان، آذربائیجان، کرمان، سجستان، سندھ جیسے تمام مشرقی ممالک کی گورنری عطا کی جائے اور بغداد اور سامرّہ کا محکمۂ پولیس اس کے متعلق کیا جائے اور جن لوگوں نے معتمد کا پہلا فرمان سنا ہے، انہیں جمع کر کے اُن کی منسوخی کا فرمان سنایا جائے''۔

یعقوب صفار نے عرض داشت بھیجنے کے بعد بغداد کا رخ کیا۔ عباسی حکومت کے تمام تر اختیارات خلیفہ معتمد کے بھائی اور ولیعہد موفق (وفات 278ھ/ 891ء) کے ہاتھوں میں تھے، معتمد مجبور محض تھا، موفق نے یعقوب کو بغداد کے ارادہ سے روکنے کے لئے اس کے تمام مطالبات منظور کر لئے، لیکن یعقوب صفار نے مطالبات کی منظوری کے بعد بھی بغداد کا سفر ملتوی نہ کیا، تُرک موالی (اہلِ عجم/ غیر عرب) اور خلیفہ معتمد جوشِ غضب سے پیچ و تاب کھانے لگے، اور ترکوں نے خود خلیفہ معتمد کی موجودگی میں یعقوب صفار سے بغداد کے قریب دیرالعاقُول میں گھماسان کا مقابلہ کیا اور فریقین میں بڑی خونریز جنگ ہوئی، صفار نے شکست کھانے کے بعد براہ خوزستان، جُندِ یشاپور کی طرف راہِ فرار اختیار کی، موفق نے کچھ دور تک اس کا پیچھا کیا، بعد ازاں اس نے فارس کو اس کے قبضہ سے چھڑانے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہوا۔

اگرچہ خراسان، طبرستان اور فارس میں احمد بن عبداللہ خجستانی، سعید بن طاہر، علی بن یحییٰ خارجی، حسن بن زید علوی اور رافع بن ہرثمہ وغیرہ کئی دعویدارانِ حکومت زور آزمائی میں مصروف تھے، لیکن چوں کہ یعقوب بن لیث صفاران میں سب سے زیادہ لائق،

عالی حوصلہ اور طاقتور تھا، اس کے قبضہ میں وسیع ملک بھی تھا، نیز ملکِ شام خلافتِ عباسیہ کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، عراق کے ایک بڑے حصہ پر زنگیوں نے قبضہ کر رکھا تھا اور ادھر خراسان و فارس وغیرہ کے مشرقی صوبے بھی قبضے سے نکل رہے تھے، اس لئے خلیفہ معتمد نے مناسب سمجھا کہ یعقوب صفار کو خراسان و فارس وغیرہ صوبوں کی باقاعدہ سند حکومت دربارِ خلافت سے بھیج دی جائے، تاکہ وہ اطاعت کے اقرار سے منحرف نہ ہو اور ملک میں بہتر نظم و نسق قائم ہو جائے، چنانچہ خلیفہ معتمد نے یعقوب کی شجاعت اور اپنی مصلحتوں کی بنیاد پر اُسے خوش کرنے کے لئے 265ھ/ 879ء میں یعقوب کو فارس کی حکومت کا فرمان بھیجا۔

13.4.7 یعقوب صفار کی موت

شاہی قاصد جس وقت یعقوب بن لیث صفار کے پاس فارس اور خراسان کی گورنری کا پروانہ لے کر پہنچا، اس وقت وہ مرض الموت میں مبتلا تھا، اس نے اپنے سامنے تلوار، سوکھی روٹی اور پیاز رکھ کر کہا کہ "میں بزورِ شمشیر سلطنت لوں گا، خلیفہ کا مطیع ہونا مجھے منظور نہیں ہے اور اگر تلوار نے میری مدد نہ کی تو سوکھی روٹی اور پیاز ہی میرے لئے بہت ہے"۔ گویا اس نے عباسی خلافت کی سند گورنری عملاً رد کر دی اور خلافت سے مکمل آزادی کے عزم کا اظہار کیا، وہ قولنج کی بیماری سے جانبر نہ ہو سکا اور تھوڑے ہی دنوں بعد جُندِ یشاپور میں 9/شوال 265ھ/ جون 879ء میں انتقال کر گیا۔

13.4.8 عمرو بن لیث صَفّار

یعقوب بن لیث صَفّار کے بعد اس کا بھائی عمرو بن لیث صفار اس کا جانشیں ہوا۔ اس نے سیاسی سمجھ بوجھ اور بالغ نظری کا مظاہرہ کیا اور دربارِ خلافت سے ٹکرانے کے بجائے خلیفہ کی خدمت میں اظہارِ اطاعت کا خط بھیجا۔ اس طرح اس نے خلافتِ بغداد سے اپنے تعلقات ہموار کر لئے، موفق نے اُسے خُراسان، اِصفہان، سجستان، نجستان اور سندھ کی گورنری اور بغداد و سامرّا کی پولیس افسری کے عہدہ سے نوازا اور خلعت بھیجی۔

13.4.9 خاندانِ صَفّاریہ کا خاتمہ

عمرو بن لیث صفار کے پوتے طاہر نے فارس پر قبضہ کر کے خلیفہ مکتفی سے اس کا ٹھیکہ لے لیا تھا، 293ھ/ 906ء میں وہ سیر و تفریح کی غرض سے سجستان گیا، فارس کا میدان خالی پا کر اس کے چچا لیث بن علی نے اپنے غلام سبک السکری کے ذریعہ اس پر قبضہ کرا لیا، لیکن چند دنوں کے بعد وہ لیث بن علی سے قطع تعلق کر کے خود فارس کا حاکم بن بیٹھا، 296ھ/ 909ء میں طاہر نے اس کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کی، سبک السکری نے اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا اور اسے اور اس کے بھائی یعقوب کو خلیفہ مقتدر (295ھ تا 320ھ/ 908ء تا 932ء) کے حوالہ کر کے اس سے فارس کا باقاعدہ ٹھیکہ لے لیا۔ ایک ہی سال بعد 297ھ/ 910ء میں لیث بن علی نے اسے فارس سے نکال دیا۔

چوں کہ سبک السکری نے خلیفہ مقتدر سے باقاعدہ فارس کا ٹھیکہ لے لیا تھا، اس لئے اس نے مونس کو سبک السکری کی مدد کے لئے بھیجا، اس نے شکست دے کر لیث بن علی کو گرفتار کر کے فارس سبک السکری کے حوالہ کر دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد اس نے بھی خراج دینا بند کر دیا، اس لئے مونس پھر اس کے مقابلہ پر مامور ہوا۔ اس نے سبک السکری اور خلیفہ مقتدر میں صلح کرانے کی کوشش کی،

لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی، وزیر ابن فرات کو سبک السکری کے ساتھ مونس کی ہمدردی کا علم ہوا تو اس نے واپس بلا کر محمد بن جعفر کو بھیجا، اس نے شکست دے کر سبک السکری کو فارس سے نکال دیا۔

لیث بن علی کی گرفتاری کے بعد اس کا بھائی معدل بن لیث سجستان میں اس کا جانشیں ہوا تھا، لیکن اب صَفّاری حکومت بہت کمزور ہو چکی تھی، چنانچہ 298ھ/ 911ء میں اسمٰعیل بن احمد سامانی نے فوج کشی کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔

13.4.10 صفاری دور میں فارسی شعروادب

طاہری حکمرانوں کے مقابلہ میں صفاری سربراہ فارسی زبان وادب سے زیادہ تعلق خاطر رکھتے تھے، یعقوب بن لیث صفار عربی سے تقریباً نابلد تھا، اس کی مدح میں جو قصائد عربی میں لکھے اور پڑھے گئے وہ انہیں سمجھ نہیں سکا، یہ بھی ایک وجہ تھی کہ اس دور کے شعراء اور ادباء نے فارسی کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا، یعقوب کے دبیر (سکریٹری) محمد بن وصیف سگزی کو، تاریخِ سیستان کا مؤلف فارسی کا اولین شاعر مانتا ہے۔اس دور کے معروف شعراء میں فیروز مشرقی (وفات 283ھ/ 896ء) اور ابوسلیک گرگانی شامل ہیں۔ یہ دونوں عمرو بن لیث صفار (287ھ-265ھ/ 900ء-879ء) کے معاصر بتائے جاتے ہیں۔ابوسلیک گرگانی صفاری دور کے شعراء میں زیادہ ممتاز ہے۔منوچہری دامغانی نے اسے قدیم شعراء میں شمار کیا ہے۔شبلی نعمانی نے مجمع الفصحاء سے شعرالعجم (جلد اول) میں اس کے بعض اشعار نقل کیے ہیں۔فارسی شاعری میں رباعی کی ایجاد اسی زمانے میں اسی خاندان کے ذریعہ ہوئی۔ دراصل صفاری عہد میں رباعی کی ایجاد کا بھی ایک پسِ منظر ہے جسے شبلی نعمانی نے شعرالعجم جلد اول میں ''تذکرہ دولت شاہی سمرقندی'' (ص 30) کے حوالہ سے لکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ یعقوب صفار کا ایک کم سن بچہ ایک دن اخروٹوں سے کھیل رہا تھا، ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڑھے میں جا کر گرا، بچہ کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرعہ نکلا:

غلطاں غلطاں ہمی رود تالب گو

یعقوب بھی موجود تھا، اس کو بچہ کی زبان سے یہ موزوں کلام بہت پسند آیا، لیکن چوں کہ اس وقت تک اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے، شعراء کو بلا کر پوچھا کہ یہ کس قسم کا بحر ہے؟ انہوں نے کہا: ہزج ہے۔پھر تین مصرعہ اور لگا کر رباعی کر دیا گیا اور دو بیتی نام رکھا گیا۔مدت تک یہی نام رہا، پھر دو بیتی کے بجائے رباعی کہا جانے لگا۔

13.5 سامانیہ

13.5.1 سامانیہ کا تعارف

سامانی یا بنوسامان، ایرانی بادشاہوں کا ایک خاندان ہے جو سامان خُدات نام کے ایک شخص کی نسل سے ہے۔سلطنتِ سامانیہ 261ھ/ 874ء میں ماوراء النہر میں قائم ہوئی، اپنے مورث اعلی اسد بن سامان کے نام پر یہ خاندان سامانی کہلاتا ہے۔ نصر بن احمد بن اسد سامانیوں کی آزاد حکومت کا پہلا حکمراں تھا، ماوراء النہر کے علاوہ موجودہ افغانستان اور خراسان بھی اس کی حکومت میں شامل تھے۔اس کا دارالحکومت بخارا تھا۔سامانیوں نے 394ھ/ 999ء یعنی کم وبیش سوا سو سال تک ماوراء النہر اور خراسان

میں شان وشوکت سے حکومت کی۔اس مدت میں اس خاندان میں دس فرمانروا ہوئے اوران کے نام یہ ہیں: نصر بن احمد بن اسد، اسماعیل بن احمد بن اسد سامانی، احمد بن اسماعیل، ابوالحسن نصر بن احمد ثانی، نوح اول بن نصر بن احمد، عبدالملک بن نوح، منصور اول بن نوح بن نصر، نوح دوم بن منصور بن نوح، منصور دوم بن نوح بن منصور، عبدالملک بن نوح۔ان لوگوں نے آزاد ایران کے تصور کو فروغ دیا۔خاقانی ترکوں اورآل سبکتگین کے ہاتھوں سامانی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

13.5.2 سامانیہ کی ابتدائی تاریخ

سامان خُدات، اپنا شجرۂ نسب ساسانی عہد کے ایک مشہور سپہ سالار بہرام چوبیں سے ملاتا تھا جو رے کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا تھا، وہ ضلع بلخ میں موضع سامان کا ایرانی سردار تھا، جب سامان خُدات کو بلخ سے راہ فرار اختیار کرنا پڑی تو وہ خراسان کے حاکم اسد بن عبداللہ القسری کے پاس پناہ گزیں ہوا، اسد نے اس کے دشمنوں کے خلاف اس کی مدد کی، سامان خُدات بعدازاں مسلمان ہوگیا۔اس نے اپنے بیٹے اسد بن سامان کا نام اسی مربی کے نام پر اسد رکھا۔اسد بن سامان ایرانی کو خلیفہ مامون الرشید بہت احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا، کیوں کہ یہ ایران کے ایک مشہور سردار کی اولاد سے تھا اوراس لئے بھی کہ خلیفہ مامون کو اپنے بھائی خلیفہ امین کے خلاف تختِ خلافت حاصل کرنے میں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی اس میں سب سے زیادہ دخل ایرانیوں کی مدد کو تھا۔اسد بن سامان خُدات کے چار بیٹے تھے: نوح، یحیی، الیاس اوراحمد۔ان لوگوں نے ہارون رشید کے زمانہ میں مشرقی خلافت کی سیاسی تاریخ میں نمایاں حصہ ادا کیا۔مامون کے خراسان کی گورنری کے زمانہ میں یہ چاروں بھائی خراسان میں تھے اورسب کے سب قابل تھے، مامون ہونہار لوگوں کا قدرداں تھا، اس لئے اس نے ان چاروں بھائیوں کو بھی آگے بڑھایا۔کہا جاتا ہے کہ خلیفہ مامون نے اپنے دورِ خلافت میں اسد کے بیٹوں کو باغی رافع بن لیث کے مقابلہ میں سپہ سالار ہرثمہ کی مدد کرنے کا حکم دیا اوروہ ہرثمہ سامانی اوررافع کے مابین معاہدہ کرانے میں کامیاب ہوئے۔خلیفہ امین کو شکست دینے کے بعد جب خلیفہ مامون خراسان سے عراق واپس آیا تواس نے غسان بن ثابت (یا غسان بن عبّاد) کو، جسے اس نے خراسان کا گورنر مقرر کیا تھا، حکم دیا کہ وہ اسد کے بیٹوں کو ملکی اور انتظامی عہدے سپرد کرے۔ چنانچہ 204ھ/819ء میں غسان نے نوح بن اسد کو سمرقند، احمد بن اسد کو فرغانہ، یحیی بن اسد کو اشروشنہ اورالشاش اورالیاس بن اسد کو ہرات کا حاکم بنایا۔

غسان بن ثابت کے بعد سلطنتِ طاہریہ کا مردِ آہن اور بانی طاہر بن حسین جب خراسان کا والی مقرر ہوا تواس نے ان کی قدردانی میں ان عہدوں کو مستقل کردیا۔گویا سامانی ایک طرح سے طاہریوں کے ماتحت حاکم تھے، اس طرح اسد بن سامان کی اولاد میں نسل درنسل حکومت رہی۔ چنانچہ کبھی تو طاہریہ کی طرف سے اورکبھی خلفائے بغداد کی طرف سے ان کو حکومت ملتی تھی۔اس خاندان میں بادشاہی لقب اسمٰعیل بن احمد بن اسد سامانی کے وقت سے استعمال کیا گیا، جو حقیقی معنوں میں ماوراء النہر میں اس خاندان کا پہلا خودمختار بادشاہ ہوا۔

نوح نے مامون کے دربار میں چند سال بسر کئے۔ مامون نے اسے ماوراء النہر میں طاہریوں کی جانب سے حاکم بنادیا، الیاس سب بھائیوں سے پہلے یعنی عبداللہ بن طاہر کے عہدِ حکومت میں فوت ہوا۔عبداللہ بن طاہر نے الیاس کے بیٹے ابواسحاق محمد کو ہرات میں اپنے باپ کی جانشینی کی اجازت دے دی۔

اس خاندان کی یہ شاخ اتنی اہم نہیں جتنی وہ جو احمد کی نسل سے ہے اور جس سے سامانی خاندان کا آغاز ہوا۔ نوح نے خلیفہ معتصم کے اشارہ پر مشہور ترکی سپہ سالار افشین کے بیٹے الحسن بن افشین کو ایک مذموم طریقے سے پھانسنے کی کوشش کی تھی، وہ لاوارث حالت میں فوت ہوگیا تو طاہر بن عبداللہ نے ماوراء النہر کے والی کا عہدہ یحیی بن اسد اور احمد بن اسد دونوں بھائیوں کو دے دیا۔
احمد بن اسد سامانی کے سات لڑکے تھے: نصر، اسمٰعیل، یعقوب، یحیی، اسد، اسحٰق، حمید۔

13.5.3 نصر بن احمد سامانی اور اسمٰعیل بن احمد سامانی

احمد بن اسد کے انتقال کے بعد 261ھ-260ھ/ 875ء-874ء میں اس کا لڑکا نصر بن احمد صوبہ سمرقند کے حاکم کے طور پر اپنے باپ کا قائم مقام ہوا، اسے خود مختار فرمانروا تصور کیا گیا، کیوں کہ اسے اس سال ماوراء النہر کا علاقہ جاگیر کے طور پر براہِ راست خلیفہ کی طرف سے عطا ہوا تھا، اب تک اس صوبہ کے حاکم کو حاکمِ خراسان ہی کے یہاں سے سندِ حکومت ملا کرتی تھی۔

260ھ/ 874ء میں بخارا میں طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ نصر بن احمد سامانی کے حکم سے یعقوب بن لیث صفاری کے مقابلہ میں جانے والی فوج نے اپنے سردار کو مار دیا اور خود بخارا کا رخ کیا، یہاں جب نوح کے سامنے نصر کے نائب احمد بن عمر نے ہتھیار ڈال دئے تو وہ اپنی مرضی کے مطابق حکمرانوں کو مقرر اور معزول کرتا رہا۔

خوارزمیوں کے ایک حملہ کی وجہ سے بخارا میں زبردست غارت گری مچی اور تباہی ہوئی اور اس حملہ کا کرتا دھرتا ان کا سردار حسین بن طاہر طائی تھا، گرچہ اس نے جلد ہی راہ فرار اختیار کی، لیکن فسادات حسب سابق جاری رہے، چنانچہ فقیہ ابوعبداللہ بن ابی حفص نے نصر کے پاس قیامِ امن کی ایک درخواست بھیجی، اسی کے پیشِ نظر نصر نے 261ھ/ 875ء میں اپنے بھائی اسماعیل سامانی کو بخارا کا والی یعنی گورنر مقرر کر دیا۔

حُسین بن محمد خارجی کا بخارا میں اسمٰعیل سامانی سے تصادم ہوگیا تھا، اس لئے سامانیوں نے جلد ہی اسے بے دست و پا کر دیا۔
اسمٰعیل نے بخارا سے چوروں اور ڈاکوؤں کو نکال باہر کیا، حسین بن طاہر طائی خوارزمی کو شکست دی اور بخارا کے شورش پسند اُمراء کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

نصر اور اسمٰعیل دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ چھڑنے سے تھوڑے عرصے پہلے کی بات ہے کہ اسمٰعیل نے خراسان کے بادشاہ رافع بن ہرثمہ سے معاہدہ کر کے اپنی حیثیت مستحکم کرنے کی کوشش کی، چنانچہ رافع نے خراسان کی حکومت بھی اس کے سپرد کر دی۔ حالاں کہ اس سے قبل رافع بن ہرثمہ کا خراسان میں محمد بن طاہر کی جانب سے بحیثیت نائب تقرر عمل میں آیا تھا، کیوں کہ 271ھ/ 884ء میں خلیفہ معتمد نے عمرو بن لیث صفار کے بجائے محمد بن طاہر کو جب خراسان کا والی مقرر کیا تھا تو اس وقت محمد بن طاہر بغداد میں ہی پولیس کمشنر کے عہدہ پر متمکن تھا، اس لئے اس نے رافع کو وہاں اپنا نائب بنایا۔ اسمٰعیل سامانی نے ترکستان میں بہت بڑی فتح حاصل کی، شاہ ترکستان کو اس کی اہلیہ کے ساتھ گرفتار کر کے سمرقند لایا اور پھر دریائے جیجوں/ آمو دریا (Oxus) کو عبور کر کے عمرو بن لیث کو گرفتار کیا اور اسے بغداد بھیج دیا جس کا ذکر صفّاریہ کے تذکرہ میں آچکا ہے، ان دو فتوحات نے اسے مستقل بادشاہ بنا دیا، اسمٰعیل نے محمد بن زید علوی کو جس نے طبرستان میں خروج کیا تھا، شکست دی۔

اسمٰعیل اور رافع کا معاہدہ نصر کے خلاف ایک جارحانہ اقدام تھا، اس لئے دونوں بھائیوں میں شدید ناراضگی پیدا ہوئی اور لڑائی تک نوبت پہنچ گئی۔ پہلی لڑائی 272ھ/885ء میں چھڑی، اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ اسمٰعیل نے سالانہ خراج ادا کرنے میں سست روی سے کام لیا تھا یا اس کی وجہ عمومی سازشیں تھیں۔ بہرحال ایک اسمٰعیلی سپہ سالار حَموَیہ بن علی نے نصر اور اسمٰعیل کو صلح پر آمادہ کیا، دونوں بھائیوں کے درمیان صلح ہوگئی، لیکن 275ھ/888ء میں دونوں کے درمیان لڑائی ازسرنو شروع ہوگئی، جس میں اسمٰعیل کو فتح ہوئی، نصر گرفتار ہوکر اسمٰعیل کے سامنے آیا، لیکن مصلحت اندیشی کی بنیاد پر اسے ان اعزازات کے ساتھ، جو ایک حاکم کے شایانِ شان ہوں، سمرقند واپس بھیج دیا، نصر اپنی وفات (279ھ/892ء) تک سمرقند میں برسرِ اقتدار رہا، اس دوران اسمٰعیل اس کے نائب کی حیثیت سے بخارا میں مقیم رہا، یہاں تک کہ وہ اس کا جانشیں بن گیا، اسمٰعیل دولتِ سامانیہ کا پہلا باقاعدہ امیر تصور کیا جاتا ہے، وہ اپنے خاندان کا سب سے قابل اور معتمد حکمراں تھا۔

اسمٰعیل سامانی کی وفات 295ھ/908ء میں ہوئی۔ اس کے زمانۂ اقتدار میں سلطنتِ سامانیہ میں کافی توسیع ہوئی، ماوراء النہر اور خراسان کے علاوہ، وہ علاقے بھی اس کے زیرِ اقتدار آ گئے جو عَمرو بن لیث صفاری کو مغلوب کرنے کے بعد اس کے قبضے میں آئے تھے، چنانچہ اسمٰعیل سامانی بہت جلد بادشاہت کے مرتبہ کو پہنچ گیا تھا، عباسیوں کے ساتھ اس کی وفاداری مشہور ہے، تاہم اسمٰعیل اور اس کے جانشینوں نے برائے نام دربارِ خلافت کی سیادت تسلیم کی، اسمٰعیل نے ماوراء النہر اور خراسان میں سات آٹھ سال حکومت کی، خلیفہ معتضد باللہ عباسی نے اسے ملکِ خراسان کی سندِ حکومت عطا کی۔ وہ ایک عادل، نیک نام اور فیاض حکمراں تھا۔ اس کی وفات کے بعد آٹھ بادشاہ خاندانِ سامانیہ میں اور ہوئے، ان میں سے اہم حکمراں کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

13.5.4 احمد بن اسمٰعیل سامانی

اسمٰعیل کی وفات کے بعد خلفائے بغداد نے ابونظیر احمد بن اسمٰعیل سامانی کو سندِ گورنری بھیجی، اس کا پایۂ تخت بخارا تھا، یہ بہادر، سیر چشم اور اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھنے والا تھا، جہانگیری کے ساتھ ساتھ جہاں داری کے اصولوں سے بھی خوب واقف تھا، اس نے اپنے طرزِ عمل سے اس بات کا کافی ثبوت بہم پہنچا دیا تھا کہ وہ ایران کے نہایت شریف اور سردار خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ارا کینِ سلطنت کے اشارہ سے قتل کیا گیا۔ اس کی مدتِ حکومت چھ سال رہی۔ اس کے عہد میں امراء ہوسِ حکومت کا شکار ہوکر آمادۂ بغاوت ہوگئے، چنانچہ ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہوگئی جس نے اس خاندان کے زوال میں بڑا حصہ ادا کیا۔

13.5.5 ابوالحسن نصر بن احمد سامانی

یہ نہایت خورد سالی یعنی آٹھ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اس کے اہلِ خاندان اس سے منحرف رہے اور مغلوب ہوئے، ہوش سنبھالنے پر وہ بڑا نامور بادشاہ ہوا، یہ بالکل اپنے دادا اسمٰعیل کا نمونہ تھا۔ اس نے کچھ ہی عرصہ میں اپنی سلطنت کے حدود کو اسمٰعیل سامانی کی حدودِ سلطنت سے زیادہ وسیع کرلیا۔ اسی کے دربار میں فارسی شاعر رودکی جو نابینا تھا، بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ رہتا تھا۔ احمد کی وفات کے فوراً بعد اس کے چچا اسحٰق اور اس کے بیٹے نصر کے درمیان تخت و تاج کے لئے کشمکش شروع ہوگئی، اس نے 331ھ/942ء میں 28 سال حکومت کر کے 38 سال کی عمر میں بخارا میں انتقال کیا، اپنی کریم النفسی سے اس کا لقب امیر سعید ہوا۔

13.5.6 منصور اول بن نوح بن نصر

منصور اول 350ھ/ 961ء میں اپنے بھائی عبدالملک کے مرنے پر خراسان اور ماوراء النہر کا بادشاہ ہوا، اس نے رکن الدولۃ دیلمی کی بیٹی سے شادی کی تھی، اس لئے عراق وفارس کے صوبوں میں بھی اس کی حکومت تسلیم کی گئی، سپہ سالار الپتگین اس کی تخت نشینی کے خلاف تھا، منصور اول نے اسے خراسان کی حکومت سے معزول کر کے اس کی جگہ ابوالحسین سیجور کو مقرر کر دیا تھا، اس لئے الپتگین اس کی تخت نشینی کی خبر سن کر غزنی بھاگ گیا اور اس پر اپنے غلام سبکتگین کی مدد سے قبضہ کر لیا، اس طرح وہ غزنوی خاندان کا بانی بن گیا۔

رکن الدولۃ دیلمی پر یہ بادشاہ غالب آیا اور اس سے کچھ سالانہ خراج مقرر کرا لیا، پندرہ سال حکومت کر کے 365ھ/ 975ء میں انتقال کیا، نوح اول کے اس لڑکے (یعنی منصور اول) کے بارے میں مشہور سیاح ابن حوقل نے لکھا ہے کہ وہ اپنے دور کا سب سے عادل بادشاہ تھا۔

13.5.7 عبدالملک بن نوح

عبدالملک بن نوح کو لوگوں نے سیف الدولۃ محمود غزنوی سے لڑوانا چاہا اور یہ اس سے لڑ پڑا۔ محمود غزنوی نے عبدالملک کو خراسان سے نکال باہر کیا اور خراسان کو فتح کر لیا۔ عبدالملک خراسان سے بھاگ کر اپنے دارالحکومت بخارا کی طرف چلا گیا، جب کہ اسی سال یعنی 389ھ/ 999ء میں ایلک خان کاشغر سے آکر بخارا اور ماوراء النہر پر قابض ہو چکا تھا، عبدالملک اس کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا، عبدالملک کا بھائی اسمٰعیل کسی طرح قید سے نکل گیا، وہ سامانی امراء اور فوجیں جو عبدالملک کی گرفتاری کے بعد منتشر ہو گئی تھیں، اسمٰعیل کے پاس جمع ہو گئیں، اس نے ان کی مدد سے ایک مرتبہ پھر ترکمانوں کو بخارا سے نکال دیا، لیکن اب سامانی حکومت کی قوت ختم ہو چکی تھی، یہ قبضہ محض چراغِ سحری کا آخری سنبھالا تھا، ایلک خان نے بہت جلد دوبارہ بخارا پر قبضہ کر لیا اور کئی سالوں بعد اسمٰعیل کو ایک عرب قبیلہ نے پکڑ کر قتل کر دیا، منتصر بن نوح سامانی نے کچھ سر اٹھایا، بلکہ ایلک خان سے خوب لڑا بھی، لیکن آخر میں اسے شکست ہوئی، چنانچہ اس کی شکست سے سامانی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

13.5.8 سلطنتِ سامانیہ کا خاتمہ

آخر میں سامانی حکومت بھی عباسیوں کی طرح کمزور ہوتی چلی گئی۔ سامانیہ ماوراء النہر کے دورِ زوال میں اس کے امراء میں خودسری پیدا ہو گئی اور حصولِ اقتدار کے لئے ان میں باہم حسد اور رقابت کا بازار گرم رہنے لگا، صوبہ دار باغی ہونے لگے اور خراسان اور غزنی کے علاقوں میں ان کے ایک سپہ سالار سبکتگین اور اس کے بیٹے محمود غزنوی نے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ دریائے سیر کے مشرق میں ترکستان میں قراخانی رہتے تھے۔ جامع تاریخِ ہند (ص 60) کے مصنفین پروفیسر محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی نے بارتھولڈ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "قراخانیوں کی حکومت میں تمام خانہ بدوش سلطنتوں کی طرح، آبائی جائیداد کا تصور شخصی قانون کے حلقۂ اختیار سے ریاستی قانون کے حلقہ میں منتقل ہو گیا تھا"۔ اس خاندان کے ایک حکمران بغرا خان نے 380ھ/ 990ء میں بخارا پر قبضہ کر لیا، لیکن اپنی بیماری کی وجہ سے اسے چھوڑ دینا پڑا اور اس کے بعد جلد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ لیکن جیسا کہ اوپر کی سطروں میں

بیان کیا گیا کہ 389ھ/ 999ء میں غالباً اسی خاندان کے دوسرے (کاشغر کے) حکمراں ایلک خان نے کسی مزاحمت کے بغیر بخارا وسمرقند اور ماوراء النہر کے دوسرے علاقوں پر قبضہ کرلیا اور سامانی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

13.5.9 سامانیہ اپنے عہدِ عروج میں

سامانیوں کی حکومت ماوراء النہر کی گورنری سے ترقی کرتی ہوئی ایک خود مختار سلطنت کے درجے تک پہنچی۔ سامانی حکومت اپنی پوری وسعت اور عروج کے زمانے میں ماوراء النہر اور خراسان کے علاوہ سیستان، کرمان، جُرجان، رے اور طبرستان پر مشتمل تھی۔ فارسی شاعر رودکی کے سرپرست نصر بن احمد کا عہدِ حکومت (331ھ - 301ھ/ 942ء - 913ء) اس خاندان کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا، عروج اس مفہوم میں کہ اس کی وفات کے بعد حکومت کا زوال نمایاں ہونے لگا۔ جو حالات قدیم ایرانی سلطنتوں کے لئے مہلک ثابت ہوئے تھے، وہی حالات اس سلطنت میں بھی پورے زور سے پیدا ہو گئے، مثلاً امراء کی شورش، شمالی بدویوں کی سرکشی اور ترک قبائل سے خطرات وغیرہ۔ جب اسمٰعیل اور احمد جیسے بارعب بادشاہوں سے تخت خالی ہو گیا تو آخرکار اس خاندان پر زوال کی مصیبت نازل ہوگئی۔

سامانیوں کا ایک بڑا کارنامہ خانہ بدوش (Migratory) ترک قبائل کی یلغار سے مملکت کی حفاظت کرنا ہے، اس مقصد کے لئے شمالی سرحدوں پر جگہ جگہ چوکیاں قائم تھیں، جنہیں رباط کہا جاتا تھا، یہاں جہاد کے لئے ہر وقت رضا کار موجود رہتے تھے، اس دور میں ترکوں میں اسلام تیزی سے پھیلا اور چوتھی صدی کے آخر تک مشرقی ترکستان یعنی کاشغر اور اس سے ملحق علاقے اور شمالی ترکستان سے لے کر روس میں وولگا کی وادی (Wolgan Valley) میں اسلام پھیل گیا۔

13.5.10 سامانی دور میں علم وادب کی سرپرستی

سامانی دور میں جہاں شجاعت اور بہادری کے جوہر نظر آتے ہیں، وہیں تہذیب وتمدن کے فروغ میں بھی ان کے عہد کو خوشگوار عہد کہا جا سکتا ہے۔ آلِ سامان کے دور میں علوم وفنون کی ترقی قابلِ ذکر ہے، شاہانِ سامانیہ علم اور علماء کے قدردان تھے، اس لئے اس عہد میں علم وادب کی دل کھول کر سرپرستی کی گئی۔ نصر دوم کا عہد علم وادب کی سرپرستی کی وجہ سے ممتاز ہے اور اس کے لڑکے نوح اول کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے بخارا میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا تھا، جس میں ہر علم وفن کی کتابوں کے لئے علاحدہ علاحدہ کمرے مخصوص تھے، مشہور فلسفی اور طبیب ابنِ سینا (جس کا باپ اسمٰعیلی فرقہ کا آدمی تھا) نے یہاں کی قیمتی اور نایاب کتابوں کی بڑی تعریف کی ہے۔ ابو صالح منصور بن اسحٰق کے علمی مذاق کے اثر نے ابوزکریا رازی فلسفی (وفات 320ھ/ 932ء) کو اس کا مدح خواں بنا دیا، اس نے اپنی ایک کتاب ''المنصوری'' اس کے نام پر کردی، مشہور فلسفی فارابی اور ابن سینا کا ابتدائی تعلق سامانی دربار سے تھا۔ علماء میں علمِ کلام کے ماہر امام منصور ماتریدی (وفات 330ھ/ 941ء) اور صوفیوں میں ابونصر سراج (وفات 378ھ/ 988ء) بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

13.5.11 سامانی دور میں فارسی ادب کی نشو ونما

سامانیوں کی سیاسی تاریخ سے زیادہ اہم ان کی حکومت کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو دیگر ایشیائی سلطنتوں سے بہت مشابہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اس خاندان کی سرپرستی میں صرف علوم وفنون ہی نے ترقی نہیں کی، بلکہ جدید فارسی ادب کا آغاز بھی اسی زمانہ میں ہوا، اب تک مسلمان جس قدر کتابیں لکھتے تھے وہ عربی زبان میں ہوتی تھیں، جولوگ عرب نہیں تھے مثلاً ایرانی اور تُرک، وہ بھی عربی ہی پڑھتے اور لکھتے تھے، یہ لوگ فارسی اور ترکی کے بجائے شاعری بھی عربی میں کرتے تھے، سامانی بادشاہوں نے اب فارسی زبان کی سرپرستی شروع کردی کیوں کہ وہ خود فارسی بولتے تھے۔

شاہانِ سامانیہ کا دورِ حکومت فارسی ادب کی ترقی کا زمانہ ہے۔ ان کا پایۂ تخت بخارا تھا، مگر ماوراء النہر، سیستان اور خراسان سے لے کر ایران کے مشرقی صحرائی علاقے اور رے تک اس خاندان کی حکومت تھی۔ ان بادشاہوں نے ایران کی تہذیبی روایات کا اِحیا کیا اور ایرانی رسم ورواج کو فروغ دیا۔ انہوں نے عربی زبان وادب کے مقابلہ میں ایرانی زبان وادب کی ترقی اور ترویج کی زیادہ کوشش کی۔ شُعراء، اُدباء اور عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے والوں کی سرپرستی کی، اپنی ان کوششوں کی وجہ سے سامانی بادشاہ اور ان کے دانش پرور وزراء فارسی ادب کی تخلیق میں معاون ثابت ہوئے۔ سامانی دور کو بہر حال یہ امتیاز حاصل ہے کہ اسے فارسی زبان وادب کی ترقی اور ترویج کا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور کے مشہور شعراء میں مسعود مروزی، رودکی (پورا نام ابوعبداللہ جعفر بن محمد رودکی، وفات 329ھ/ 940ء)، شہید بلخی (وفات 325ھ/ 936ء)، ابوطیب مصحفی، ابوالعباس ربنجی، شاکر بخاری، ابوالمؤید بلخی، ابوشکور بلخی اور دقیقی (پورا نام ابومنصور محمد بن احمد دقیقی، وفات 368ھ/ 978ء) ہیں۔

سامانی دور میں جہاں بڑی تعداد میں شعراء نے فارسی شاعری کی بنیادیں مستحکم کیں اور انہیں ترقی دی، وہیں اس دور میں نثر کی بعض اہم کتابیں بھی لکھیں گئیں۔ اس دور کے تمام نثری نقوش آج دستیاب نہیں ہیں، لیکن نثر کے جو نمونے ہم تک پہنچے ہیں ان میں شاہنامہ کا ایک مقدمہ ہے، یہ شاہنامہ طوس کے حاکم ابومنصور محمد بن عبدالرزاق طوسی (وفات 350ھ/ 961ء) کے حکم سے لکھا گیا تھا، لیکن اس عہد میں لکھے گئے دو اور نثری شاہناموں کی طرح یہ شاہنامہ بھی اب دستیاب نہیں، صرف اس کا مقدمہ باقی ہے جو ''مقدمۂ قدیم شاہنامہ'' کے نام سے معروف ہے۔

تاریخِ طبری کا فارسی ترجمہ بھی اسی دور کی یادگار ہے، ابوعلی بن محمد بلعمی (وفات 363ھ/ 971ء)، عبدالملک بن نوح (350ھ-343ھ/ 961ء-954ء) اور ابوصالح منصور بن نوح (366ھ-350ھ/ 976ء-961ء) کا وزیر تھا، اس نے امیر منصور کے حکم سے محمد بن جریر کی تاریخ طبری کو اضافوں کے ساتھ عربی سے فارسی میں منتقل کیا، ماوراء النہر کے چند علماء نے منصور بن نوح ہی کے حکم سے تفسیر طبری کو اسی دور میں فارسی نثر کا جامہ پہنایا، علاوہ ازیں رسالہ دراحکامِ فقہِ حنفی تالیف حکیم ابوالقاسم محمد بن سمرقندی (وفات 343ھ/ 954ء)، عجائب البلدان، حدود العالم اور قرآن کی چند تفسیریں بھی سامانی دور کے نثری نقوش ہیں۔ فارسی نثر کے ان نمونوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور کی نثر سادہ اور رواں تھی، زبان وبیان میں تکلّف اور تصنّع نہیں تھا۔ ایلک خان نے 389ھ/ 999ء میں اس ترقی یافتہ حکومت کو پامال کردیا۔

13.6 خلاصہ

خلافت بنی عباس کے آغازِ زوال میں عباسی حکومت کی، مختلف حصوں میں تقسیم عمل میں آئی، جس طرح مغرب کے ملکوں میں چھوٹی مسلم ریاستیں معرضِ وجود میں آئیں، ٹھیک اسی طرح مشرق کے ملکوں کی چھوٹی خودمختار مسلم ریاستیں بھی مختلف حکمرانوں کے ذریعہ قائم کی گئیں۔

اس ضمن میں سب سے پہلے طاہری خاندان قابل ذکر ہے، ایک ایرانی کنیز کا لڑکا طاہر بن حسین اس خاندان کا بانی تھا، 194ھ/ 810ء میں مامون نے اسے سپہ سالار مقرر کیا، 205ھ/ 820ء میں اس نے طاہر کو بشمول خراسان، بغداد کے مشرقی جانب کے تمام اسلامی علاقوں کا گورنر مقرر کیا، امین کی شکست میں سب سے زیادہ طاہر ہی نے حصہ لیا، چوں کہ اس نے دونوں ہاتھوں سے تیغ زنی کی تھی، اس لئے ذوالیمینین کہلانے لگا، خراسان میں اپنے پایہ تخت مرو میں انتقال سے قبل اس نے خطبوں سے خلیفۂ بغداد مامون کا نام حذف کردیا تھا، اس کے بعد اس کے پانچوں جانشینوں (طلحہ بن طاہر، علی بن طلحہ، عبداللہ بن طاہر، طاہر بن عبداللہ اور محمد بن طاہر بن عبداللہ) نے خراسان میں تقریباً 65 سال تک حکومت کی اور اس حکومت کا دائرہ اقتدار ہندوستان کی سرحد تک پہنچا دیا۔

یہ حکمراں گرچہ عباسی خلفاء کے فرمانبردار رہے، لیکن عملاً خراسان میں خودمختارانہ حکومت کرتے رہے، طاہریوں نے علویوں کا پیچھا کر کے ہمیشہ انہیں پسپا کیا، یعقوب بن لیث صفار نے طاہریوں سے تمام علاقے چھین کر صفاری حکومت قائم کی۔

صفاری حکومت کا بانی یعقوب بن لیث صفار تھا جو پیشے کے اعتبار سے مس گر یعنی تانبے اور پیتل کے برتنوں کی دکان کرتا تھا۔ اس خاندان کی ابتداء بجستان، سیستان اور اس کے بعد ایران کے بڑے حصے پر قبضہ سے ہوئی۔ یہ حکومت 253ھ/ 867ء میں قائم ہوئی، اس میں پانچ فرمانروا ہوئے: یعقوب بن لیث، عمرو بن لیث، طاہر بن محمد بن عمرو، لیث بن علی بن لیث اور معدل بن علی بن لیث ۔اس خاندان کی حکومت ایران میں تقریبا 35 سال برقرار رہی، 298ھ/ 903ء میں ماوراء النہر کے سامانیوں کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔اس کے بانی یعقوب نے خلیفہ معتمد کے دور میں شہر بغداد پر بھی فوج کشی کی، اس کے اس عمل نے جلد ہی اسے زوال آشنا کردیا۔صفاریوں کے دور میں فارسی زبان وادب کو فروغ حاصل ہوا، یعقوب کے انتقال کے بعد اس کے بھائی عمرو بن لیث صفار نے بیدار مغزی سے کام لیا اور خلیفہ کی خدمت میں اظہارِ اطاعت کا خط بھیجا، خلیفہ نے اسے عراقِ عجم، فارس اور خراسان کی حکومت سپرد کی، اس کے جانشینوں نے کسی طرح حکومت چلائی، بالآخر 298ھ/ 903ء میں اسمٰعیل بن احمد سامانی نے فوج کشی کر کے اس حکومت کا خاتمہ کردیا۔

سامان خُدات نامی بلخ کا ایک زردشتی امیر تھا، اسد بن عبداللہ حاکمِ خراسان نے اس کی مدد کی تھی، اس نے اسد سے متاثر ہوکر دین اسلام قبول کیا اور اپنے محسن کی یاد میں اپنے بیٹے کا نام اسد رکھا۔اسد کے چاروں بیٹوں نے مامون کی خدمت میں نمایاں کارنامے انجام دئے جس کے صلہ میں انہیں صوبہ جات کی گورنری عطا ہوئی۔اگرچہ نصر بن احمد (279-260ھ/ 92-874ء) سامان کا ایک پڑپوتا اس خاندان کا بانی تصور کیا جاتا ہے، دراصل نصر کے بھائی اسمٰعیل (294ھ-279ھ/

907-892ء) نے اس خاندان کو مستحکم بنایا، سامانی پہلے طاہریوں کے تحت نائب حاکم کی خدمت بجالائے، سامانی سلسلہ کے چوتھے حاکم نصر ثانی بن احمد (332ھ-301ھ/ 943ء-913ء) نے اپنے دائرہ حکومت کو زیادہ وسعت دی۔

290ھ/ 903ء میں ماوراء النہر کی سامانی حکومت نے صفاریوں سے خراسان اور علویوں سے طبرستان چھین لیا تو ماوراء النہر یعنی سمرقند و بخارا سے لے کر خلیج فارس اور بحیرۂ قزوین تک اس حکومت کے حدود وسیع ہو گئے، اس زمانہ سے صوبۂ ماوراء النہر بھی خلافت عباسیہ کی ماتحتی سے آزاد ہو گیا۔ سامانی خاندان نے ماوراء النہر اور ایران پر 974ء تا 999ء/ 389ھ کوئی سوا سو سال تک حکومت کی۔ اس سلطنت نے علوم وفنون اور تہذیب وشائستگی کے فروغ میں قابل قدر کردار ادا کیا، بخارا و سمرقند علوم وفنون کے مرکز بن گئے۔ تقریباً نصف صدی کے بعد خراسان، فارس اور طبرستان حکومت سامانیہ کے قبضے سے نکل گئے اور دولت بنی بویہ (دیالمہ) نے ان علاقوں پر اپنی حکومت قائم کر کے سامانیوں کو بے دخل کر دیا، پھر اس خاندان میں جلد ہی زوال آنا شروع ہو گیا، 384ھ/ 994ء میں اس خاندان کے ایک ترکی غلام الپتگین نے سلطنت سامانیہ کے اس حصہ پر جو دریائے جیحوں/ آمو دریا (OXUS) کے جنوب میں تھا، قبضہ کر لیا اور 380ھ/ 990ء سے 389ھ/ 999ء تک ترک ایلک خانوں نے دریا کے شمال کی سرزمین پر قبضہ کر کے اس خاندان کو نیست و نابود کر دیا۔

13.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. جنرل طاہر بن حسین کے بارے میں اپنی معلومات تحریر کریں۔
2. یعقوب بن لیث صفار کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تحریر کریں۔
3. سامانی دور کی ابتدائی تاریخ پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

1. صفاری دور میں فارسی شعر وادب کی نشو ونما پر روشنی ڈالیے۔
2. دولتِ سامانیہ کے قیام میں نصر بن احمد سامانی اور اسمعیل بن احمد سامانی کی خدمات پر روشنی ڈالیں۔
3. سامانیوں کے دور میں فارسی شعر وادب کی نشو ونما پر ایک جامع تحریر قلم بند کریں۔

13.8 فرہنگ الفاظ

زردشت	:	قدیم ایران کا مشہور فلسفی، دینِ آتش پرستی کا بانی
لواحقین	:	لاحق کی جمع، رشتہ دار، بھائی بندے
امر بالمعروف	:	بھلائی کا حکم دینا

نہی عن المنکر	:	برائی سے روکنا
معتمد علیہ	:	معتبر، بھروسہ مند
منحرف	:	باغی، غدّار
شحنہ/شہنہ	:	بازار کا افسر جو بازار کے نرخوں اور کاروبار پر نظر رکھتا تھا/کوتوال
قولنج	:	وہ درد جو پسلی کے نیچے ہوتا ہے
ماوراء النہر	:	ماوراء النہر وسط ایشیا کے ایک علاقے کو کہا جاتا ہے جس میں موجودہ ازبکستان، تاجکستان اور جنوب مغربی قازقستان شامل ہیں۔ جغرافیائی طور پر اس کا مطلب آمو دریا اور سیر دریا کے درمیان کا علاقہ ہے۔ ماوراء النہر کے اہم ترین شہر سمرقند و بخارا ہیں۔ دونوں شہر جنوبی حصے میں واقع ہیں۔

13.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. العالم الاسلامی فی العصر العباسی — دکتور حسن احمد محمود، احمد ابراہیم شریف (قاہرہ)
2. محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ (الدولۃ الاسلامیہ) — الشیخ محمد الخضری بک (قاہرہ)
3. موسوعۃ الأدیان المیسرۃ — متعدد مصنفین، (کویت)
4. ابن خلدون، جلد 3 — علامہ ابن خلدون
5. اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 10، 11 — متعدد مصنفین، (پاکستان)
6. اردو انسائیکلوپیڈیا، جلد اول — قومی کونسل برائے ترقی اردو، نئی دہلی، 1996ء
7. تاریخ اسلام، جلد 3، 4 (خلافت عباسیہ، جلد 1، 2) — شاہ معین الدین احمد ندوی
8. تاریخ اسلام، جلد 2،3 — مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی
9. تاریخ ملت، جلد 6 (خلافتِ بنی عباس، حصہ دوم) — مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی
10. A Short history of the Saracens — سید امیر علی

اکائی 14 : غزنویہ، خوارزم شاہی، غوریہ

اکائی کے اجزاء

14.1 مقصد

اس اِکائی میں آپ تین سلطنتوں : غزنویہ، خوارزم شاہی اور غوریہ کے بارے میں پڑھیں گے۔ اسے پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ غزنوی حکومت کی ابتداء کیسے ہوئی، ناصر الدین سُبُکتگین کا غزنوی سلطنت کے قیام اور استحکام میں کیا کردار رہا، محمود غزنوی کی ہندوستانی فتوحات کے اسباب کیا تھے، محمود غزنوی کے دور میں علم وادب کی ترقی کس قدر ہوئی، اور غزنوی سلطنت کا زوال کیسے ہوا۔ اس اِکائی میں آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ خوارزم شاہی خاندان وسلطنت کے قیام کا پسِ منظر کیا تھا، خوارزم شاہی سلطنت کی ترقی میں سلجوقی حکمرانوں کا کردار کتنا نمایاں رہا ہے، اور پھر خوارزم شاہی حکومت کو زوال کا منہ کیوں اور کن حالات میں دیکھنا پڑا۔ اسی طرح آپ اس اِکائی میں یہ بھی جان سکیں گے کہ غوری خاندان کی بنیاد کیا ہے، علاء الدین حسین جہاں سوز غوری کی شخصیت کس نوعیت کی تھی، سلطان شہاب الدین محمد غوری کی شخصیت، فتوحات اور شہادت کی مختصر اور مفید تفصیل کیا ہے۔

14.2 تمہید

اس اِکائی میں غزنویوں، خوارزم شاہیوں اور غوریوں کے بارے میں بالتفصیل گفتگو کی جائے گی، غزنویوں کے بارے میں بتایا جائے گا کہ ان کے جدِ اعلیٰ الپتگین نے سامانی فرمانرواؤں سے الگ ہٹ کر غزنی میں اپنی حکومت کی داغ بیل کس طرح ڈالی۔ علماء، ادباء، شعراء اور صوفیاء، نیز ہندوؤں کے ساتھ محمود غزنوی کا سلوک اور برتاؤ کیسا تھا، اور غزنوی حکومت کے دیگر حکمرانوں کی خدمات غزنوی سلطنت کے استحکام کے لئے کس حد تک مفید ہوسکیں۔ اسی طرح اس اکائی میں خوارزم شاہیوں پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔ خوارزم شاہ کا اطلاق کن پر ہوتا ہے، قطب الدین محمد، علاء الدین تکش خاں اور سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ نے خوارزمی سلطنت کو کس طرح بامِ عروج پر پہنچایا اور پھر سلجوقی سلطنت کی مساوی حکومت کے قیام میں نمایاں کردار ادا کرنے والے حکمراں تاتاری منگولوں کے سامنے کس طرح اور کیوں پست ہمت ہوگئے۔ اس اِکائی کی آخری کڑی میں غور، غوری خاندان، شنبسانی خاندان پر غزنویوں کی حکمرانی اور تسلط، غزنویوں اور غوریوں کے درمیان معرکہ آرائی، غوری سلطنت کی قیام پذیری کے لئے علاء الدین حسین جہاں سوز غوری کی ابتدائی کوششوں اور غوری برادران پر روشنی ڈالی جائے گی، آپ کو معلوم ہوگا کہ شہاب الدین غوری عُرف معز الدین محمد کے سامنے ملتان، اُچھ، نہروالہ، پشاور، لاہور، تبر ہندا اور ترائن کے بعد شمالی ہندوستان کی فتوحات کے دروازے کس طرح کھلتے گئے۔

14.3 غزنویہ

سامانیہ کے غلاموں میں الپتگین نامی ایک ترکی غلام تھا، جو سامانی فرمانروا عبدالملک بن نوح سامانی کی محافظ سپاہ میں نوکر تھا، وہ جلد ہی ترقی کرکے اس سپاہ کا سردار بنا، پھر 350ھ/ 961ء میں خراسان کا گورنر ہوگیا، لیکن عبدالملک بن نوح سامانی کی وفات کے بعد جب اس کی جانشینی کا مسئلہ پیش آیا تو امیر الپتگین نے اس کے لڑکے منصور کی نوعمری کی وجہ سے اس کی جانشینی کی مخالفت

کی ،لیکن پھر بھی ارکانِ سلطنت کی حمایت سے منصور سامانی تخت نشین ہوگیا، الپتگین اس نئے فرمانروا سے ناخوش تھا، اس لئے وہ 351ھ/ 962ء میں علمِ بغاوت بلند کرکے دارالامارت خراسان سے افغانستان کے مشرقی شہر غزنی چلا گیا۔ یہ شہر کابل سے 75 میل جنوب میں کوہستان بابا کی شاخ گل کوہ پر واقع ہے۔اس زمانہ میں یہ ایک معمولی سی بستی تھی، وہ اس علاقہ کے ملکی حکمرانوں کے خلاف فتح حاصل کرکے وہاں کا خودمختار حاکم بن بیٹھا، اس کے خراسان چھوڑنے کے بعد امیر منصور نے ابوالحسن محمد بن ابراہیم کو یہاں کا حاکم مقرر کیا، اس نے دومرتبہ الپتگین پر فوج کشی کی، لیکن دونوں مرتبہ ناکام رہا، آٹھ سال خوش حال حکمرانی کے بعد 365ھ/ 975ء میں امیر الپتگین کا انتقال ہوگیا۔ الپتگین خاندانِ غزنوی کا بانی تھا۔

الپتگین کے انتقال کے بعد امیر منصور سامانی نے اس کی جگہ اس کے لڑکے ابواسحٰق ابراہیم بن الپتگین کو غزنہ کا حاکم بنایا اور وہ اپنے برادرِ نسبتی سبکتگین کے صلاح ومشورہ سے حکومت کرتا رہا، لیکن ایک سال یا اس سے بھی کم عرصہ کے بعد ابواسحٰق ابراہیم کا انتقال ہوگیا۔

14.3.1 ناصرالدین سبکتگین: بانی سلطنتِ غزنویہ

ابواسحٰق ابراہیم کے انتقال کے بعد اہلِ غزنہ نے سبکتگین کے اوصافِ جہاں بانی کو دیکھتے ہوئے 366ھ/ 976ء میں اسے غزنہ کے تخت پر بٹھایا، چنانچہ اس وقت سے غزنوی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ یمین الدولہ سلطان محمود غزنوی اسی باپ کا نامور فرزند تھا، افغانستان وپنجاب کی غزنوی سلطنت (582ھ-351ھ/ 962ء-1186ھ) کا آغاز اسی طرح ہوا، لیکن اصل بانئ سلطنت الپتگین کا غلام اور اس کا داماد ناصرالدین سبکتگین تھا، سُبکتگین غزنوی حکومت کا سب سے ممتاز اور نمایاں فرماں روا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سبکتگین سامانیوں کی نسل سے تھا اور اس کا سلسلۂ نسب ایران کے بادشاہ یزدگرد تک پہنچتا ہے۔ وہ قابل اور ہنرمند تھا اور بچپن ہی سے اس میں اقبال مندی کے آثار نمایاں تھے، اس لئے بہت ہی جلد آقا کی نظرِ توجہ کا مرکز بن گیا اور اس کے مزاج میں اتنا رسوخ واعتماد پیدا کرلیا کہ اس نے اس کو غزنی کی فوجوں کا سپہ سالار بنادیا۔ اس نے 366ھ/ 976ء سے 387ھ/ 997ء تک حکومت کی، غزنوی سلسلہ کے سولہ حکمراں راست سبکتگین ہی کی نسل سے تھے، اس نے اپنے دائرہ حکومت کو وسط ایشیاء سے لے کر ہندوستان میں پشاور تک توسیع دی اور ایران میں خراسان کو بھی اپنے مقبوضات میں شامل کرلیا جہاں وہ پہلے سامانیوں کی ملازمت میں حاکم مقرر ہوا تھا۔

14.3.2 امیر سبکتگین غزنوی کی فتوحات

امیر سبکتگین کی شجاعت اور ناموری کا شہرہ اتنا پھیل چکا تھا کہ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے حکمراں اپنی مشکلات میں اس کی جانب رجوع کرنے لگے تھے۔ اسی زمانہ میں شہر بست کے حکمراں طغان کی حکومت پر ایک شخص ابوثور نے قبضہ کرلیا تھا، اس نے امیر سبکتگین سے مدد کی درخواست کی، سبکتگین نے ابوثور کو نکال کر بسث، طغان کو واپس دلایا اور طغان اس کی ماتحتی میں آگیا۔ بست غزنی سے کوئی سو میل کے فاصلے پر دریائے ہیرمند کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔

غزنی کے قریب قصدار کا قلعہ نہایت سنگین اور یہاں کا قلعہ دار بڑا سرکش تھا، امیر سبکتگین نے اُسے مغلوب کرکے خراج وصول کیا اور اس سے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا، نیز اس نے ہرات کی جنگ میں کامیابی حاصل کی۔

14.3.3 سبکتگین کے کارنامے اور وفات

امیر سبکتگین نے تقریباً بیس سال غزنی کے تخت پر حکومت کی، اس نے خراسان کو اپنی سلطنت کا حصہ بنایا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ہندوستان کی سرحد پر غزنی میں ایک ایسا اہم عسکری اور حکومتی مرکز قائم کیا جس نے برصغیر کی فتح کے لئے ایک فوجی صدر کیمپ (Base) کا کام دیا، اس کے علاوہ اس نے کابل سے لے کر پشاور تک کا علاقہ فتح کیا اور اپنے تدبر اور حُسنِ انتظام سے وہاں کامیاب حکومت قائم کر کے اور راستوں اور قلعوں کی درستی سے آئندہ فتوحات کی بنیاد ڈالی۔ شمال مغربی ہند کے راستے سے اسلام کا جو سب سے پہلا قافلہ 367ھ/ 980ء کے لگ بھگ اس ملک میں داخل ہوا، اُس کے میر کارواں ہونے کا فخر دولتِ غزنویہ کے اسی فرمانروا امیر سبکتگین کی قسمت میں لکھا تھا، اس آمد کی وجہ بھی خود یہاں کے راجہ جے پال کا عمل تھا، اس نے راجا جے پال کو شکست دے کر کابل اور پشاور میں اسلامی حکومت قائم کر دی تھی۔ اس کے علاوہ شمالی ہندوستان کے تمام راجاؤں کو شکست دے کر امیر سبکتگین نے اُس عسکری نظام پر کاری ضرب لگائی جو شمالی حملہ آوروں کو روک سکتا تھا۔ محمد قاسم فرشتہ نے اپنی کتاب تاریخِ فرشتہ میں متعدد واقعات لکھے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امیر سبکتگین اخلاق وعادات اور مزاج وطبیعت کے لحاظ سے بڑا نیک، خدا پرست اور انصاف پسند تھا۔ اس نے 56 سال کی عمر پائی اور بلخ کے قریب موضع ترمذ میں 387ھ/ 997ء میں وفات پائی اور غزنی میں دفن کیا گیا۔ اس کے دور میں خوش حالی اور فارغ البالی رہی۔

14.3.4 امیر محمود غزنوی

387ھ/ 997ء میں محمود بن سبکتگین غزنوی، غزنی کے تخت پر بیٹھا۔ محمود غزنوی نے تخت نشین ہوتے ہی نہایت قابلیت کے ساتھ سلطنت کے فرائض انجام دینا شروع کیا، یہ غزنوی خاندان کا سب سے زیادہ اولوالعزم اور فتح مند حکمراں تھا، اس کا شمار برّاعظم ایشیا کے نہایت نامور اور زبردست شہنشاہوں میں ہوتا ہے، اس نے 389ھ/ 999ء سے 1030ء تک یعنی کم وبیش تیس پینتیس سال بڑے جاہ وجلال کے ساتھ بادشاہت کی، اس کی سلطنت کے حدود بحرِ قزوین یا بحرِ خزر (Caspean Sea) سے پنجاب اور ترکستان سے گجرات تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا پایۂ تخت افغانستان کے ایک بلند خطۂ زمین پر واقع غزنہ (یا غزنی) میں تھا، جہاں سے شمالی ہند کے میدان صاف نظر آتے تھے اور اس کی طرف سے وادیٔ کابل کی راہ سے فوجیں بہ آسانی بھیجی جاسکتی تھیں۔

صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی کتاب ''ہندوستان کے عہدِ وسطی کی ایک جھلک'' (حاشیہ ص 31-30) میں محمود غزنوی کے عروج واقبال کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''یہ صحیح ہے کہ محمود غزنوی کے عروج واقبال کے لئے حالات سازگار تھے۔ شمال میں ان کی ہمسایہ سلطنتوں میں کچھ ایسے عجیب وغریب حالات پیدا ہو گئے تھے کہ ان کے حکمراں اپنی حکومت برقرار رکھنے سے بالکل معذور ہو رہے تھے، اسی لئے محمود کو اپنے سیاسی اور سپاہیانہ کمالات کے دکھانے کے مواقع ملتے گئے، سامانیوں کا خاتمہ ہو چکا تھا، ہندوستان میں ہندو حکمرانوں میں باہم کچھ ایسا نفاق اور کچھ ایسی رقابت تھی کہ وہ اپنے کسی مشترکہ دشمن کے خلاف علاحدہ محاذ قائم نہیں کر سکتے تھے، ایران کی حکومت زوال پذیر تھی، ان حالات کے مقابلہ میں نومسلم ترک غیر معمولی جوش وخروش سے بھرے ہوئے تھے، جس سے محمود کو قدم قدم پر کامیابیاں حاصل ہوتی گئیں''۔

محمود غزنوی کی فتوحات کا سلسلہ سکندرِ اعظم کی یاد دلاتا ہے، کیوں کہ اس کی تخت نشینی کا منشا ہی اپنی سلطنت غزنی کو وسعت واستحکام دینا تھا، چنانچہ وہ اپنی 33 سالہ حکمرانی میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ اس نے اپنے چاروں طرف کی مسلم وغیر مسلم حکومتوں کو ہلا ڈالا اور اپنی حکومت کے حدود میں غیر معمولی اضافہ کرتا گیا، وہ کبھی کسی مہم میں ناکام نہ ہوا اور ترکستان سے لے کر شمالی مغربی ہند تک نہایت طاقتور حکومت قائم کردی، محمود غزنوی نے کاشغر کی مسلم ایلک خانی حکومت، اپنے آقا سامانیوں کی سلطنت، دیلمیوں اور طبرستان کی حکومتِ آلِ زیاد، مشرقی سمت میں غوریوں کی سرزمین، جن میں سے کچھ مسلمان ہو چکے تھے، پھر اسی مشرقی سمت میں ملتان اور سندھ کی عرب حکومتوں اور اِدھر لاہور اور ہندوستان کے بعض دوسرے راجاؤں کی سلطنتوں کے کھنڈر پر اپنی عظیم الشان سلطنت غزنی کی بنیاد رکھی، 389ھ/ 999ء میں عباسی خلیفہ قادر باللہ نے محمود کی حکومت تسلیم کرلی تھی اور اسے خراسان کی حکومت کا پروانہ، لواء، خلعت اور یمین الدولۃ، امین الملت ولی اور امیر المؤمنین کے القاب عطا کئے تھے۔

14.3.5 محمود غزنوی کے حملے

چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک تو شمالی ہند کے راجپوت راجا اپنی مرضی کے مطابق حکومت کرتے رہے، انہیں بیرونی ممالک سے کوئی خطرہ نہیں رہا، عرب سندھ آئے تو راجپوت راجے مہاراجے بہت زیادہ پریشان نہیں ہوئے اور آٹھویں صدی میں اسلام کابل میں پھیلا تو بھی وہ زیادہ فکر مند نہیں رہے، لیکن جب سبکتگین اور محمود غزنوی سے ان کی مڈ بھیڑ ہوئی تو وہ پریشان ہوگئے۔ یہ دونوں نسلی تمدنی اور مذہبی حیثیت سے ان سے مختلف تھے، ان کا طریقۂ جنگ بھی ان سے بالکل علاحدہ تھا، اس لئے وہ پنجاب تک بڑھتے چلے آئے، وہ طاقتور جسم اور دیوہیکل قد کے مالک تھے، وہ بڑے سبک رو اور چالاک شہسوار تھے، ہر دفعہ بڑی تعداد میں تازہ بہ تازہ لشکری جنگ میں شریک ہوتے، جب کہ ہندو راجا زیادہ تر ہاتھیوں ہی پر بھروسہ کرتے رہے، ان کے ہتھیار بھی پرانے طرز کے تھے، پھر لشکری صرف ایک خاص طبقہ سے بھرتی کئے جاتے، عوام کی ایک بڑی تعداد کو سپہ گری کے لائق ہی نہیں سمجھا جاتا، اس لئے عوام بھی سیاسی انقلابات سے دلچسپی نہیں رکھتے اور ان کی دلچسپی کے اس فقدان نے ہندوستانی سماج کی بنیاد ہلا دی۔

تاریخ میں محمود کا نام زیادہ تر ہندوستان کی فتوحات کی وجہ سے روشن ہے۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں ہندوستان پر سولہ یا سترہ حملے کئے اور راجہ انند پال والئ پنجاب اور قنوج کو شکست دے کر پنجاب پر اس کے صدر مقام لاہور اور ملتان کے ساتھ قبضہ کیا اور اپنے نامور غلام ابوالنجم ایاز کو یہاں کا حاکم بنایا، اس جنگ میں انند پال نے میرٹھ، کالنجر، متھرا، مالوہ، اجمیر، گوالیار اور گجرات کے راجاؤں کو محمود سے جنگ لڑنے کے لئے متحد کرلیا تھا اور وہ سب اس جنگ میں شریک تھے۔ پھر چند برسوں میں محمود نے کشمیر، قنوج، کالنجر، کوہِ بالاناتھ، گوالیار اور گجرات کے راجاؤں کو مطیع بنایا، سندھ اور پیشاور سے لے کر پنجاب تک زیر نگیں کرلیا، ان فتوحات میں سب سے زیادہ اہم سومناتھ کی فتح شمار کی جاتی ہے، جو 416ھ/ 1025ء میں ہوئی۔ 405ھ/ 1014ء میں محمود غزنوی نے تھانیسر کو فتح کیا۔ اور 406ھ/ 1015ء میں اس نے کشمیر کو فتح کرنے کا ارادہ کیا اور حدود کشمیر میں پہنچ کر قلعہ لوہ کوٹ کا جو بلندی اور مضبوطی میں مشہور تھا، محاصرہ کیا، لیکن موسم کی شدت اور سخت برف باری کے سبب اس نے محاصرہ اٹھا کر غزنی کا رخ کیا۔

409ھ/ 1017ء میں محمود غزنوی نے قنوج پر فوج کشی کی، یہاں کے راجہ راجے پال نے اپنی قوت وحشمت کے باوجود اس کی خدمت میں ایلچی بھیج کر فرمانبرداری کا عہد و پیمان کیا، قنوج میں تین روز کے قیام کے بعد امیر محمد غزنوی نے ایک دو معرکے

اور سر کئے۔اسی اثناء میں اس نے متھرا پر چڑھائی کی اور بلا مقابلہ اسے فتح کر لیا۔ربیع الثانی 421ھ/ 1030ء میں محمود غزنوی نے اسہال کے عارضہ اور ناسازئ طبع کی وجہ سے انتقال کیا، تقریباً 60 سال کی عمر پائی اس کی مدت حکومت 33 یا 35 سال ہے۔ غزنی کے قصر فیروز میں تدفین عمل میں آئی

14.3.6 پنجاب اور ملتان پر فوج کشی

محمود غزنوی، اپنے دورِ حکومت میں سب سے پہلے 390ھ/ 1000ء میں ہندوستان میں داخل ہوا، اس نے جنوبی ہندستان کے جاٹوں کی سرکوبی کی اور چند سرحدی ضلعوں پر قبضہ کیا، دوسرے سال 391ھ/ 1001ء میں محمود غزنوی دس ہزار سواروں کے ساتھ پشاور کے قریب راجہ جے پال سے نبرد آزما ہوا، راجہ جے پال کے ساتھ جنگ میں بارہ ہزار سوار، تیس ہزار پیادے اور تین سو ہاتھی تھے، دریائے اٹک کے کنارے شدید ترین معرکہ آرائی کے بعد، راجہ جے پال کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار کر لیا گیا، محمود نے بڑھ کر دوسرے شہر یہند پر قبضہ کر لیا، جے پال نے خراج دے کر رہائی حاصل کی اور محمود غزنوی کا باجگذار بن گیا۔

ملتان کے قریب ایک ہندو راجہ کی راجدھانی تھی جس کا نام بھاٹیہ یا بھیرہ تھا، رائے یا بیہڑ ارائے نامی شخص یہاں کا حکمراں تھا اور وہ نہایت مغرور و متکبر تھا، 395ھ/ 1004ء میں محمود غزنوی نے بھاٹیہ پر حملہ کیا، اور بھاٹیہ (بھیرہ) اور اس کے مضافات سلطنتِ غزنی میں ملا لئے گئے، اس کے دوسرے سال محمود نے ملتان کے حاکم ابوالفتح داؤد کو اس کی سرکشی کی سزا دینے کے لئے ملتان پر فوج کشی کا ارادہ کیا، ابوالفتح داؤد نے انند پال سے مدد کی درخواست کی، چنانچہ انند پال محمود غزنوی کا راستہ روکنے کے لئے لاہور سے پشاور آیا، محمود غزنوی سے معرکہ آرائی میں اس نے شکست کھائی اور کشمیر کی طرف بھاگ گیا، اس مہم سے فارغ ہو کر محمود غزنوی نے ملتان میں ابوالفتح داؤد کو اس کے کیفر کردار تک پہنچایا اور غزنی لوٹ گیا۔

14.3.7 محمود غزنوی کے دور میں علم وادب کی ترقی

محمود غزنوی اسلامی تاریخ کا گوہر شب چراغ ہے، وہ جس درجہ کا فاتح اور کشور کشا تھا، اسی درجہ کا جہاندار، علم دوست اور علم پرور بھی تھا۔ وہ خود عالم، حنفی فقیہ، شاعر اور مصنف تھا، فصاحت و بلاغت میں یگانۂ روزگار تھا۔اس نے علم وادب کی سرپرستی کی اور اپنے دربار میں دنیا بھر کے منتخب شعراء، علماء اور فضلاء جمع کر دئے۔اس کے لئے مختلف علوم وفنون پر کتابیں لکھی گئیں، اس کے زمانہ میں فارسی زبان کو خاص طور پر ترقی حاصل ہوئی، عربی زبانوں کی ترویج و اشاعت میں جو مرتبہ حجاج بن یوسف ثقفی کو حاصل ہے، وہی مرتبہ فارسی زبان کی ترویج میں محمود غزنوی کو حاصل ہے، محمود نکتہ سنج شاعر تھا، اس نے شاعری کا ایک خاص محکمہ قائم کیا تھا، عنصری کو ملک الشعراء کا خطاب دے کر اسے شعبۂ شاعری کا افسر مقرر کیا، چار سو شعراء اس سے منسلک تھے، جن شعراء نے محمود کے دربار میں شہرت پائی، ان میں حسن بن اسحٰق فردوسی، ابوالقاسم حسن بن احمد عنصری، ابوالحسن علی بن قلوع فرخی، ابونصر علی بن احمد رسدی، ابوالنعیم احمد منوچہر دامغانی، عسجدی اور طوسی خاص طور پر مشہور ہیں، شاہنامۂ فردوسی جیسی عظیم فارسی شاعری کی زندہ جاوید کتاب جس نے عجم کی تاریخ کو زندہ کر دیا، محمود ہی کی یادگار ہے، اس نے علم و تعلیم کی عام اشاعت کے لئے غزنی میں ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا، جس کے ساتھ ایک عجائب خانہ (Museum) بھی تھا، اس میں دنیا کی تمام نایاب چیزیں موجود تھیں۔اس کے درباری علماء میں

ابوریحان البیرونی، ابوالحسن خمار اور ابونصر جیسے لوگ تھے، البیرونی اپنے زمانے کا سب سے بڑا محقق اور سائنسداں تھا، اس نے ریاضی، علم ہیئت (فلکیات)، تاریخ اور جغرافیہ پر شاہکار کتابیں تصنیف کیں، اس نے محمود غزنوی کی وفات کے تھوڑے عرصے بعد کتاب الہند لکھی اور اپنی دوسری کتاب قانونِ مسعودی محمود غزنوی کے جانشین مسعود غزنوی کے نام معنون کی۔

غزنویوں کے دور میں لاہور پہلی مرتبہ علم وادب کے مرکز کے طور پر ابھرا، یہاں کے شعراء میں مسعود سعد سلمان اور روفی بہت مشہور ہیں، یہ دونوں شاعر سلطان ابراہیم اور اس کے جانشینوں کے زمانے میں تھے، لاہور کے علماء میں حضرت علی بن عثمان ہجویری (465ھ-400ھ/ 1072ء-1011ء) بہت مشہور ہیں، حضرت ہجویری آج کل داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں، ان کی وجہ سے لاہور کے علاقے میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ فارسی زبان میں علم تصوف کی پہلی کتاب ''کشف المحجوب'' انہی کی تصنیف ہے۔ غزنوی دور میں خراسان کے ابوسعید، ابوالخیر (440ھ-357ھ/ 1039ء-968ء) اور غزنی کے سنائی (545ھ-465ھ/ 1151ء-1072ء) بڑے صوفی اور ولی گذرے ہیں، ابوالخیر اپنے عہد کے فارسی زبان کے پہلے بڑے رباعی گو شاعر تھے، خدا سے محبت اور اخلاقی تعلیم ان کا خاص موضوع ہے، سنائی غزنوی سلطنت کے آخری دور کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور فارسی میں صوفیانہ شاعری کے بانی ہیں، ان کا کلام سوز و گداز اور اخلاقی تعلیم سے بھرا ہوا ہے۔ عربی زبان کے مشہور ادیب بدیع الزماں ہمدانی (وفات 396ھ/ 1007ء) کی کتاب ''مقامات'' عربی انشاپردازی کا اعلیٰ نمونہ سمجھی جاتی ہے، اس کا تعلق غزنوی عہد سے ہے، وہ ہرات کا رہنے والا تھا۔ بہرام شاہ کے زمانہ میں اس کے لئے ابن المقفع کی کلیلہ و دمنہ کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

14.3.8 غزنوی دور میں فارسی ادب

غزنوی دور فارسی ادب کے لئے زبردست ترقی، توسیع اور ترویج کا زمانہ تھا۔ غزنوی بادشاہوں، امراء اور وزراء نے فارسی زبان وادب کی دل کھول کر سرپرستی کی، محمود غزنوی کے دربار سے چار سو سے زیادہ شعراء وابستہ تھے، اس دور میں غزنہ، بخارا، سمرقند، طبرستان، رے، اصفہان وغیرہ علم وادب کے مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔

غزنوی دور کی فارسی شاعری کا بیشتر حصہ قصائد پر مشتمل ہے، یہ قصائد تاریخی، سماجی اور خود ادبی لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس دور کے مشہور شعراء میں ابوالقاسم حسن بن احمد عنصری بلخی، ابوالحسن علی بن جولوغ فرخی سیستانی، ابونظر عبدالعزیز بن منصور مروزی متخلص بہ عسجدی، ابوالنجم احمد منوچہری دامغانی اور شاہنامے کا خالق ابوالقاسم منصور بن حسن فردوسی کے نام نمایاں ہیں۔ ان اہم اور عظیم شعراء کے علاوہ غزنوی دور کے اور متعدد شعراء کا نام تذکروں میں ملتا ہے، جن میں لبیبی، زینتی، مسعودی غزنوی، بہرامی، غضایری اور عیوقی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

غزنوی دور میں ایرانی علماء وادباء نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے عموماً عربی کو فارسی پر ترجیح دی ہے، اس کے باوجود اس دور میں چند اہم کتابیں فارسی نثر میں لکھی گئی ہیں۔ فلسفہ پر ابن سینا کی دانشنامۂ علائی، ریاضی ونجوم پر ابوریحان البیرونی کی التفہیم لأ وائل صناعۃ التنجیم، ابوالحسن خرقانی کی فارسی شرح نور العلوم، ابوابراہیم اسمٰعیل بن محمد بخاری کی شرح تعرف اور اسی طرح طب کی کتاب الأبنیہ عن حقائق الأدویہ وغیرہ غزنوی دور کی مشہور فارسی کتابیں ہیں۔

اس دور میں فارسی ادب عربی زبان وادب سے متاثر ہونے کے باوجود اپنی خصوصیات کا حامل ہے، نظم ونثر میں اظہارِ بیان میں سادگی ملتی ہے، عبارت آرائی، مضامین کی تکرار، طویل جملے اور حقیقت سے دور مطالب اس دور کے ادب میں کم نظر آتے ہیں۔

14.3.9 محمود غزنوی کی رواداری

محمود غزنوی کے زمانہ میں ہندوستان میں راجپوت آپس میں ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے اور پنجاب کے ہندو شاہیہ خاندان نے عام طور پر اپنی متشددانہ پالیسی اور جابرانہ حکومت کے ذریعہ عوام میں بددلی پیدا کر رکھی تھی، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خود سلطان کی فوج میں ہندو کثرت سے شامل تھے، اس نے اپنی فوج میں ہندوؤں کو معزز عہدوں پر بھی سرفراز کیا، اس کی فوج میں جن ہندو سپہ سالاروں نے عروج حاصل کیا، ان میں سوبندرراۓ، تلک اور ناتھ خاص طور پر مشہور ہیں۔ محمود غزنوی نے اپنی ساری عمر میں کبھی کسی ایک ہندو کو بھی جبراً مسلمان نہیں بنایا اور نہ اس کے دورِ حکومت میں حالتِ امن میں کسی مندر کو توڑنے اور بت شکنی کرنے کا کوئی واقعہ پیش آیا، اس نے ہندوستانی مقبوضات کے لئے اپنا سکّہ ہندی زبان میں جاری کیا۔

14.3.10 غزنوی سلطنت کا زوال

غزنوی سلطنت کو اُسی طرح زوال کا منہ دیکھنا پڑا جس طرح اس سے پہلے مسلم ایرانی اقوام کی نیم خودمختار چھوٹی ریاستوں کو دیکھنا پڑا تھا، جب تک بادشاہ روشن خیال، اولوالعزم اور طاقت ور تھا اور فوج پوری طرح اس کی فرمانبردار تھی، حکومت قائم رہی۔ محمود غزنوی کے انتقال کے بعد دولت غزنویہ پر زوال کے اثرات طاری ہوگئے، اُس نے اپنی اس سلطنت کا اپنے دونوں بیٹوں کے لئے وہی انتظام کیا تھا جو عباسی خلیفہ ہارون رشید نے اپنے دونوں بیٹوں امین و مامون کے لئے کیا تھا، محمود غزنوی کے دونوں بیٹے بھی آپس میں اسی طرح لڑے جیسے کہ امین و مامون لڑے تھے، مگر جس طرح مامون الرشید اپنے بھائی امین الرشید پر غلبہ پاکر شوکتِ سلطنت کو باقی رکھ سکا، محمود غزنوی کا بیٹا مسعود غزنوی اپنے بھائی محمد غزنوی پر غالب ہوکر سلطنت کی عظمت وشوکت کو باقی نہ رکھ سکا۔

محمود غزنوی نے ماوراء النہر، خراسان، غزنی اور پنجاب وغیرہ کی حکومت اپنے چھوٹے بیٹے محمد کو دی تھی اور خوارزم، عراق، فارس اور اِصفہان وغیرہ ممالک بڑے بیٹے مسعود کو دئے تھے، جیسے ہی باپ دنیا سے رخصت ہوا، مسلمان شاہی خاندانوں کی قدیم روش کے مطابق دونوں بھائیوں میں تخت وتاج کے لئے لڑائی شروع ہوگئی، آخرکار مسعود غالب آیا، اس نے غزنی پر حملہ کر کے اسے فتح کیا اور تخت نشین ہوگیا اور اپنے بھائی محمد کو قید کر کے اس کی دونوں آنکھیں بے بصارت کر دیں، لیکن اسے بہت دنوں تک حکمرانی نصیب نہیں ہوئی، ایک طرف وسط ایشیا کے سلجوقی ترک، غزنی کا علاقہ ویران کر رہے تھے اور غزنوی سلطنت کے شمال اور مغربی حصوں پر قبضہ کر لیا تھا، اب سلاطینِ غزنی کے قبضے میں صرف وہ علاقے رہ گئے تھے جو اس وقت مشرقی افغانستان اور پاکستان پر مشتمل ہے اور دوسری طرف طوائف الملوکی اور ترکی اور ہندی غلاموں کی سرکشی نے اندرونی امن وامان کی فضا کو تاریک کر رکھا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ مسعود کو معزول کر کے اس کے بھائی محمد کو دوبارہ تخت نشین کیا گیا۔

غزنوی سلطنت میں کل پندرہ حکمراں ہوئے، ان تمام حکمرانوں کے نام بالترتیب یہ ہیں: امیر سبکتگین، اسمعیل بن سبکتگین، محمود بن سُبکتگین، محمد بن محمود، مسعود بن محمود، مودود بن مسعود، علی بن مسعود، عبدالرشید بن محمود، فرخ زاد بن مسعود، ابراہیم بن مسعود، مسعود بن ابراہیم، ارسلان شاہ بن مسعود، بہرام شاہ بن مسعود شاہ، خسرو شاہ بن بہرام، ملک شاہ بن خسرو شاہ۔

ان تمام حکمرانوں میں دو تین ہی بادشاہ نامور گذرے ہیں، تاہم اس سلطنت میں ان کے علاوہ اور متعدد بادشاہ ہوئے ہیں جن کے نام ابھی اوپر مذکور ہوئے۔ یہ حکمراں کمزور اور بے اثر تھے اور سیاسی اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے، ان کے نام صفحاتِ تاریخ میں اس لئے آجاتے ہیں کہ محمود غزنوی کی طرح وہ بھی کسی مشہور شاعر کے مربیّ تھے۔ دورِ زوال کے غزنوی حکمرانوں میں سلطان ابراہیم کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے، اس نے اپنے چالیس سالہ دور حکومت میں سلطنت کو مستحکم کیا۔ اس کے عہد میں چار سو سے زائد مدارس، خانقاہیں، مسافر خانے اور مساجد تعمیر کی گئیں، اس نے غزنی کے شاہی محل میں ایک بہت بڑا دواخانہ قائم کیا جہاں سے عوام کو مفت دوائیں ملتی تھیں، اس دواخانے میں خصوصاً آنکھ کی بیماریوں کی بڑی اچھی دوائیں دستیاب تھیں۔ انھی میں ایک بہرام شاہ غزنوی بھی تھا۔ بہرام شاہ کے بیٹے خسرو شاہ نے علاء الدین غوری سے شکست کھا کر غزنی چھوڑ دیا اور ہندوستان آ گیا اور جب اس کے بیٹے خسرو ملک کو سلطان علاء الدین محمد غوری نے 579ھ/ 1186ء میں شکست دے کر لاہور پر قبضہ کرلیا تو غزنویوں کا سارا علاقہ غوریوں کے زیرِ نگیں آ گیا۔ دولتِ غزنویہ کی پژمردگی کا ہندوستان پر یہ اثر ہوا کہ مختلف حکومتوں اور ریاستوں نے پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا، یہاں تک کہ نگر کوٹ بھی غزنوی گورنر پنجاب سے چھین لیا گیا۔

بہر حال غزنوی سلطنت کا انتہائی برا حال تھا، شمال و مغرب میں خانانِ ترکستان اور سلجوقی شاہانِ ایران مسلط ہوگئے اور وسطی حصہ میں غوری خاندان کے افراد جن سے غزنویوں کی شادی بیاہ کے ذریعہ قریبی رشتہ داری تھی، لوٹ مار اور غارت گری کرنے لگے، علاؤ الدین جہاں سوز نے اپنے بھائیوں کے ساتھ غزنوی حکمراں کے وحشیانہ سلوک کے انتقام میں 557ھ/ 1161ء سے پہلے ہی غزنی جیسے خوبصورت شہر جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا اور بعد میں اس کے چھوٹے بھائی شہاب الدین محمد غوری فاتحِ شمالی ہند نے غزنویوں سے ہندوستانی دار الحکومت پنجاب یعنی لاہور کو بھی 579ھ/ 1186ء میں چھین لیا، اس طرح یہ عظیم الشان سلطنت سوا دو سو سال کے اندر نیست و نابود ہوگئی اور شہاب الدین غوری کے ہاتھوں غزنوی خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔

معلومات کی جانچ

1. ناصر الدین سبکتگین کے کارناموں پر اپنی معلومات قلم بند کیجئے۔
2. امیر محمود غزنوی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تحریر کریں۔

14.4 خوارزم شاہی

خوارزم شاہی حکومت، صوبہ خوارزم یا خیوہ میں قائم ہوئی۔ خوارزم دریائے جیحون (آمو دریا) کی زیریں گذرگاہ پر واقع ہے۔ خوارزم شاہی سلطنت وسط ایشیا اور ایران کی ایک سنی مسلم بادشاہت تھی جو پہلے سلجوقی سلطنت کے ماتحت تھی اور گیارہویں صدی عیسوی میں آزاد ہوگئی اور 617ھ/ 1220ء میں منگولوں کی جارحیت تک قائم رہی۔ جس وقت خوارزم خاندان ابھرا اس وقت خلافت عباسیہ کا اقتدار زوال کے آخری کنارے پر تھا۔ خوارزم شاہی حکمرانوں کے نام یہ ہیں: جدِ اعلیٰ انوشتگین، قطب الدین محمد خوارزم شاہ، اَتسز بن قطب الدین محمد خوارزم شاہ، اِیل اَرسلان بن اَتسز، محمود بن اِیل ارسلان، سلطان شاہ بن اِیل ارسلان، تکش خان بن اِیل ارسلان، سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ بن تکش خان اور جلال الدین منکبرنی بن علاء الدین محمد خوارزم شاہ۔

14.4.1 خوارزمی سلطنت کی بنیاد

ملک شاہ سلجوقی کا ایک ترک غلام انوشتگین قراجہ تھا جسے امیر بلباک سلجوقی نے گرجستان سے خریدا تھا۔ انوشتگین نے اپنی ذہانت وذکاوت کی بدولت ملازمت میں ترقی کی اور شاہی طشت دار (ساغر بردار) مقرر ہوگیا اور چوں کہ خوارزم کی مالیات شاہی مطبخ کے اخراجات کے لئے مخصوص کردی جاتی تھی، اس لئے ملک شاہی امیر کی موت کے بعد ملک شاہ نے اسے خوارزم کا شحنہ (حاکم) بھی بنا دیا تھا۔ انوشتگین اپنے اس عہدہ پر 490ھ/ 1096ء تک رہا۔ انوشتگین نے اپنے بیٹے قطب الدین محمد کو مرو میں سلجوقی حکمرانوں کے درمیان معقول تعلیم دلائی، سلطان سنجر سلجوقی کے پاس اس کی بڑی اہمیت تھی۔

انوشتگین کے بعد ملک شاہ کے بیٹے اور جانشین سلطان برکیارق نے سلطان سنجر سلجوقی سے خوارزم کی حکومت کے سلسلہ میں مشورہ کیا، پھر اس نے 491ھ-490ھ/ 1098ء-1097ءمیں انوشتگین کے ہونہار اور لائق فرزند قطب الدین محمد بن انوشتگین کو خوارزم کا حاکم مقرر کیا۔ ماضی میں یہ عہدہ اکثر سرکاری افسران کو دیا جاتا تھا اور شاہ کی اصطلاح خودمختاری یا آزادی کی علامت نہ تھی۔ اس نے تقریباً تیس سال تک بڑی وفاداری اور دلسوزی سے اپنے حکومتی فرائض انجام دئے اور سلجوقی سلاطین کا وفادار رہا۔ چوں کہ وہ عرصۂ دراز تک علاقۂ خوارزم کا حاکم رہا اور خوارزم کی مناسبت سے خوارزم شاہ مشہور ہوا، یا غالباً سلطان برکیاروق نے اسے خوارزم شاہ کا لقب دیا۔ اس کے بعد اس کی اولاد بھی اسی نام سے مشہور ہوئی اور اس خاندان کے تمام فرمانروا خوارزم شاہی فرمانروا کہلائے۔ بہر حال گیارھویں صدی عیسوی کے آخری برسوں میں قطب الدین محمد نے خوارزم میں ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھی۔ قطب الدین محمد نے اپنی کارگذاری اور حسنِ خدمت سے سلطان سنجر کے مزاج میں بڑا رسوخ اور اعتماد حاصل کرلیا تھا۔ سلطان سنجر نے بھی خوارزم کا نظم ونسق اس کے سپرد کیا تھا، 531ھ/ 1137ء میں قطب الدین محمد کا انتقال ہوگیا۔

امیر قطب الدین محمد کی وفاداری اور حسنِ خدمات کی بنیاد پر سلطان سنجر سلجوقی اس کے لڑکے اَتسز (Atisiz) کو بھی بہت مانتا تھا، سنجر اسے اپنے اسفار اور جنگوں میں اپنے ساتھ رکھتا تھا، چنانچہ قطب الدین محمد کی موت کے بعد سنجر نے، اتسز (550ھ-522ھ/ 1156ء-1128ء) کو خوارزم کی حکومت عطا کی، اسے بھی شروع میں سلطان کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل تھا، اس کے دربار میں کسی امیر کو اتنا اعزاز حاصل نہ تھا جتنا اَتسز کو حاصل تھا، اس سے دوسرے امراء میں حسد پیدا ہوا، انہوں نے سلطان اور اتسز کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر بدگمان کردیا، اتسز اب سلجوقیوں کا وفادار نہ رہا، بلکہ وہ گورخانوں کا باج گذار بن گیا اور 530ھ/ 1136ء میں اس نے سلطان سنجر کے خلاف علمِ بغاوت بلند کردیا اور دریائے جیجون (Oxus) کے زیریں حصے پر قابض ہوگیا۔ سلطان سنجر نے خوارزم پر 533ھ/ 1139ء سے 543ھ/ 1149ء تک تین حملے کئے، لیکن اتسز کی طاقت کو توڑا نہ جاسکا، جب 536ھ/ 1142ء میں قراخطائیوں نے سنجر کو شکست دے دی تو اتسز نے موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور شہر بلخ کو لوٹا اور زبردست قتل وخون کیا۔ اس اجمال کی تفصیل شاہ معین الدین ندوی نے اپنی کتاب تاریخ اسلام جلد سوم (خلافتِ عباسیہ جلد دوم) میں لکھی ہے، مختصر سی تبدیلی کے ساتھ وہ تفصیل یہاں قلم بند کی جارہی ہے:

اتسز خوارزم میں اپنی مستقل حکومت قائم کرنے کے لئے منصوبہ ہی بنا رہا تھا کہ سلطان سنجر نے فوج کشی کر کے اسے خوارزم سے نکال دیا اور اپنے بھتیجے سلیمان شاہ کو وہاں کا حاکم بنایا، اس میں حکومت سنبھالنے کی اہلیت نہ تھی، اس لئے اتسز نے دو ہی سال بعد 535ھ/ 1141ء میں پھر خوارزم پر قبضہ کر لیا۔

اتسز اور سلطان سنجر کی جنگ میں اتسز کا ایک لڑکا مارا گیا تھا، اس کے انتقام میں اتسز نے ترکستان کے غیر مسلم قراخطائیوں کو سلطان سنجر کے خلاف کھڑا کر دیا اور 536ھ/ 1142ء میں کئی لاکھ وحشی قراخطائی ماوراء النہر کے علاقہ پر ٹوٹ پڑے، سلطان کو شکستِ فاش ہوئی اور اس کے بے شمار آدمی قتل و گرفتار ہوئے، جن میں بہت سے علماء و فقہاء تھے، خود سلطان کی حرم قید ہوئی اور اس کا کُل خزانہ برباد ہو گیا اور ماوراء النہر کا علاقہ اس کے ہاتھوں سے نکل گیا اور خوارزم بھی سلجوقیوں سے آزاد ہو گیا۔

دوسری طرف سلطان سنجر کی شکست کے بعد خود اتسز خراسان پہنچا اور شہرِ بلخ کو لوٹا اور وحشیانہ قتل و غارت سے اسے ویران کر ڈالا اور وہاں کے بڑے بڑے علماء اور اربابِ کمال کو خوارزم لے گیا، البتہ نیشاپور علماء و مشائخ کی سفارش سے قتل و غارت کی مصیبت سے بچ گیا، لیکن اتسز نے سلجوقی حکومت کے تمام متعلقین کی املاک پر قبضہ کر لیا اور سلطان سنجر کا خطبہ بند کر کے اپنے نام کا خطبہ جاری کیا، مگر چند دنوں کے بعد اہلِ نیشاپور کی مخالفت سے ڈر کر سلطان سنجر کا خطبہ دوبارہ جاری کر دیا۔

گو اس وقت سلطان سنجر کی شکست سے اتسز کو آزادی مل گئی تھی، لیکن خراسان میں اس کا مستقل قیام ممکن نہ تھا، اس لئے سنجر کی واپسی کے بعد اس نے خراسان چھوڑ دیا اور سلطان سے تعلق منقطع کر کے خوارزم میں مستقل حکومت قائم کر لی۔

548ھ/ 1154ء میں خراسان پر مسلم ترک غزوں کا ایسا سخت حملہ ہوا کہ خراسان بالکل زیر و زبر ہو گیا، خراسان میں ترکمانوں کی اِس بغاوت نے ایران سے عملاً سلجوقیوں کی حکومت ختم کر دی اور اتسز خوارزم شاہ کو اپنی حکومت مضبوط کرنے کا موقعہ مل گیا اور 552ھ-551ھ/ 1158ء-1157ء میں تیس سال کی حکومت کے بعد اتسز کا انتقال ہو گیا۔

خوارزم کے بادشاہوں علاء الدین تکش اور علاء الدین محمد خوارزم شاہ نے اپنی سلطنت کو بہت بڑھایا علاء الدین تکش 583ھ/ 1172ء میں خوارزم کے تخت پر بیٹھا اور تکش نے خوارزم کی بادشاہت کو ایک عظیم سلطنت بنا دیا۔ اسمٰعیل بن حسن مصنف ذخیرہ خوارزم شاہی اور خاقانی شاعر اسی کے عہد میں ہوئے۔ تکش ہی نے 592ھ/ 1194ء میں ایران کے آخری سلجوق بادشاہ طغرل ثالث سلجوقی کو ایک لڑائی میں قتل کیا اور خراسان و عراق پر قابض ہو کر اپنی سلطنت کا رقبہ بڑھایا۔ نیز اس نے ایران اور وسط ایشیا فتح کرنے کے بعد عظیم سلطنتوں کی صف میں جگہ حاصل کر لی اور یہ ایسی بلند حیثیت تھی کہ اب خوارزم شاہ کا لقب اس سے فروتر معلوم ہوتا تھا، تکش نے اپنے سکّوں پر اپنا لقب سلطان ابن خوارزم شاہ اور محمد سلطان نے ابن سلطان لکھوایا۔ لیکن اس کی سلطنت سے باہر خود محمد خوارزم شاہ کو بھی لوگ خوارزم شاہ ہی کہتے رہے۔ 593ھ/ 1195ء میں خلیفہ ناصر کی فوج کو شکست دینے کے بعد تکش نے اس کے ساتھ امن و امان کی فضا سازگار کر لی اور عراق، خراسان اور ترکستان کے سلطان کی حیثیت سے اپنی تقرری کے سلسلہ میں ناصر کا فرمان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، اپنی حکومت کے اختتام پر تکش نے قزوین کے شمال میں واقع حسن بن صباح کے قلعہ الموت (آشیانہ عقاب) کی بدعتی مملکت کو کچل ڈالنے کا فیصلہ کیا، لیکن 597ھ/ 1200ء میں ترشیز جاتے ہوئے وہ انتقال کر گیا۔

14.4.2 سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ

تکش خان نے جب وفات پائی تو اس کی جگہ اس کا بیٹا سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ 590ھ/ 1194ء میں تخت نشین ہوا۔ اسے ''سکندر ثانی'' کا خطاب دیا جاتا ہے۔ اس نے تقریباً اکیس سال حکومت کی۔ اس نے اپنی حدودِ حکومت کو بڑی وسعت دی۔ غوری سلطنت کے بادشاہ شہاب الدین غوری کی وفات (602ھ/ 1206ء) کے بعد غور و غزنی تک اس کی حکومت کا ڈنکا بجنے لگا تھا، فارس کے بادشاہ اتابک سعد اور آذربائیجان کے بادشاہ اتابک ازبک کو بھی اُس نے شکست دی۔ سلطان محمد خوارزم شاہ سے دور دور تک کے سلاطین ڈرتے تھے اور دنیا میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، چنانچہ اب وہ نہ صرف مغربی ایشیا کی سیادت کے سلسلہ میں اپنے آپ کو سلاجقہ کا جانشین سمجھ سکتا تھا، بلکہ خود خلیفہ کے مقابلہ میں بھی وہ اسی قسم کا دعویٰ پیش کرسکتا تھا، 607ھ/ 1210ء میں آخری گورخانی فرمانروا پر علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی فتح کے بعد قراخطائی حکومت کا جوا بھی اتر گیا۔ اس کی سلطنت سیر دریا کے دائیں کنارے سے لے کر ان پہاڑی دُرّوں تک پھیلی ہوئی تھی جو ایران اور وادیٔ دجلہ کے درمیان واقع ہیں، جنوب میں اس کی سیادت جزیرہ نمائے عرب (عمان) میں بھی تسلیم کی جاتی تھی، ان دنوں خوارزم کا شمار عالمِ مشرق کے شاندار شہروں میں ہوتا تھا۔

اس ملک کی تاریخ میں خوارزم کو ایک اول درجہ کی طاقت کی حیثیت سے پہلی اور آخری بار جو ترقی نصیب ہوئی وہ اس کے وسیع تجارتی تعلقات کی مرہونِ منت تھی۔ سلطان محمد خوارزم شاہ ان تجارتی روابط کو اپنے سیاسی مفاد کے لئے استعمال کرنے کا خواہاں تھا، اسی وجہ سے اس کی چنگیز خان سے جنگ ہوئی اور اس کی سلطنت کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے خاندان کے تمام افراد گرگانج سے نکل گئے اور یہ شہر سخت مدافعت کے بعد صفر 618ھ/ اپریل 1221ء میں دشمن کے قبضے میں آ گیا اور پھر یہاں کی پوری آبادی کو قتل یا آمو دریا میں غرق کر دیا گیا۔

14.4.3 غوری برادران اور علاء الدین محمد خوارزم شاہ کے درمیان اختلافات

اس عہد کی ایک اہم حقیقت خود اپنی سرزمین اور ہندوستان دونوں ہی جگہوں میں غوریوں کی بڑھتی ہوئی طاقت تھی۔ غوری برادران (غیاث الدین غوری اور شہاب الدین غوری) نے خلیفہ ناصر کے اشتعال پر علاء الدین محمد خوارزم شاہ کے خلاف جارحانہ اقدام کیا، شروع شروع میں انہیں عظیم کامیابی نصیب ہوئی، پورا خراسان ان کے زیرنگین ہوگیا۔ ممتاز غوری جنگجو محمد خرنگ نے مرو کو فتح کرلیا۔ سرخس، نیشاپور اور ہرات بھی غوریوں کے قبضے میں آ گئے، خوارزم شاہ نے شادیاغ اور سرخس پر دوبارہ قبضہ کیا اور جب دوسرے سال ہرات کے خلاف پیش قدمی کی تو وہاں کے کوتوال عزالدین مرغزی نے صلح کی درخواست کی، لیکن شہاب الدین غوری نے پھر نیشاپور پر چڑھائی کردی اور طوس پر قبضہ کرلیا اور وہاں کے باشندوں کی جائیداد قرق کرلی اور غلّہ ضبط کرلیا۔ انہی اسباب کے پیشِ نظر امراء اور عوام دونوں ہی غوریوں سے متنفر ہو گئے، غیاث الدین غوری کا ہرات میں 27/ جمادی الاوّل 599ھ/ 13/ مارچ 1203ء میں جب انتقال ہوگیا تو شہاب الدین کو پسپا ہونا پڑا۔

شہاب الدین غوری عُرف معزالدین محمد کی واپسی نے مرو میں اس کے جنگجو محمد خرنگ کی صورت حال کو غیر محفوظ بنا دیا تھا، ایک خوارزمی فوج نے مرو پر قبضہ کر کے خرنگ کا سر کاٹ لیا اور اسے خوارزم بھیج دیا۔ خوارزم شاہ اس کے بعد بذاتِ خود ہرات کی جانب

روانہ ہوا۔ الپ غازی نے خود کو شہاب الدین کا نمائندہ بتلا کر محمد خوارزم شاہ کے سامنے بطور صلح ہرات سے دست بردار ہو جانے کی پیشکش کی، لیکن شہاب الدین غوری نے الپ غازی کے خوارزم شاہ کے ساتھ معاہدے کو رد کر دیا اور خوارزم کے خلاف نکل کر اور اس پر قبضہ کر کے کشمکش کے خاتمہ کا فیصلہ کیا، خوارزم شاہ نے اس اقدام کا اندازہ کر لیا اور ریگستان کے راستے خوارزم لوٹ گیا، شہاب الدین غوری نے مقدس جنگ کے نام پر تقریباً ستر ہزار آدمیوں کی فوج کُرزوار میں جمع کر دی جو اس کے صدر مقام سے انتہائی دور غالباً آمو دریا پر کسی جگہ واقع ہے۔ گورخاں نے خوارزم شاہ کی اپیل کے جواب میں سمرقند کے ''سلطان السلاطین'' سلطان عثمان کے ساتھ طراز کے اپنے مشہور جنرل تانیکو (یا تیانیکو) کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی، شہاب الدین غوری نے گورخاں کا نام سن کر واپس بھاگنے کا فیصلہ کیا اور خوارزمیوں نے اس کا تعاقب کیا، ہزار اسپ کے قلعہ کے نزدیک وہ لڑنے کے لئے مڑا، لیکن بری طرح شکست کھا گیا، متعدد غوری امراء اور اکابرین قید کر لئے گئے اور باقی ماندہ نے بے آب و گیاہ ریگستان کی ٹھوکریں کھائیں۔

شہاب الدین غوری جب غزنی پہنچا تو خوارزم شاہ نے اپنے قاصد کے ذریعہ مستقبل میں ان کے درمیان اتحاد کے وجود پر زور دیا، کیوں کہ دونوں ہی ختا سے عاجز آ چکے تھے، شہاب الدین غوری راضی ہو گیا، اس نے اپنے افسروں کو گورخاں کے خلاف ایک جنگ کے لئے تین سالوں میں تیار ہو جانے کا حکم دیا، لیکن دوسرے ہی سال یعنی 602ھ/ 1206ء میں اسمٰعیلی زاہدوں نے ہندوستان سے واپسی کے موقعہ پر سندھ کے قریب دمیاک میں اسے قتل کر دیا۔ اس افراتفری میں خوارزم شاہ نے غوری سلطنت کی اصلی سرزمین کو جو اَب تین حصوں میں منقسم ہو چکی تھی اپنی سلطنت میں ملا لئے۔

14.4.4 علاء الدین محمد خوارزم شاہ کا خلیفہ ناصر سے اختلاف

علاء الدین محمد خوارزم شاہ اپنے دور کے تمام مسلم سلاطین میں سب سے زیادہ طاقتور بادشاہ تھا، لیکن خلافتِ بغداد میں اسے اس کے مقبوضہ ملکوں کی سندِ حکومت کے علاوہ، جو ہر حکمراں کو مل جاتی تھی، کوئی امتیازِ خاص حاصل نہ تھا۔ اس کی یہ دلی خواہش تھی کہ سلجوقیوں کی طرح اسے بھی خلافتِ بغداد کی جانب سے سلطان کا خطاب ملتا اور بغداد میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا، لیکن خلیفہ ناصر اس کے لئے آمادہ نہ تھا۔ اس لئے 614ھ/ 1217ء میں عراقِ عجم پر قبضہ کے بعد اس نے بغداد پر فوج کشی کا ارادہ کیا۔

نیز اسی فصل میں کچھ ہی پہلے یہ بات گذر چکی ہے کہ غوری برادران نے خلیفہ ناصر کے اشتعال پر خوارزمی سلطنت کے خلاف جارحانہ اقدام کیا تھا۔ 613ھ-612ھ/ 1216ء-1215ء میں جب علاء الدین خوارزم شاہ نے غزنی پر قبضہ کر لیا تو اسے غوری دفتروں میں خلیفہ ناصر کے خطوط کا انکشاف ہوا، جن میں غوریوں کو سلطان خوارزم شاہ پر حملہ کے لئے اکسایا گیا تھا اور خوارزم شاہیوں کے افعال و کردار کو برا بھلا کہا گیا تھا، علاء الدین خوارزم شاہ کو اس وقت شدید غصہ آیا جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کے اور اس کے باپ کے ساتھ غوریوں کی مستقل عداوت کا ذمہ دار ناصر تھا۔

چنانچہ ہلاکو کے مسلمان سکریٹری علاء الدین عطا ملک جوینی کی کتاب ''تاریخ جہاں گشا'' (ج 2 ص 97-96، مطبع بریل لیڈن 1916ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ خوارزم شاہ سب سے پہلے خلافت یا امامت کے لئے خلیفہ ناصر کی عدم موزونیت، خلیفہ ناصر کو برطرف کر کے اس کی جگہ پر کسی مناسب شخص کو مقرر کرنے کے حق اور عباسی غاصب تھے اور خلافت امام حسین رضی اللہ عنہ کے اَخلاف کو ملنی چاہیئے تھی جیسے تین مسائل پر اپنے مذہبی محققین کی منظوری حاصل کی اور پھر اپنی ساری وسیع مملکت میں خطبہ سے خلیفہ ناصر کا نام

خارج کرادیا اور دوسری طرف خود خلیفۂ بغداد ناصر کو معزول کر کے اس کی جگہ اولادِ حضرتِ علی رضی اللہ عنہ میں سے کسی شیعی کو مسندِ خلافت پر بٹھانا چاہا۔

14.4.5 علاء الدین محمد خوارزم شاہ کا بغداد پر حملہ کی کوشش

اسی سبب سے علاء الدین محمد خوارزم شاہ نے اہلِ بیت کے ایک بزرگ اور اپنے پیر سید علاء الدین ترمذی (یا سید علاء الملک ترمذی) کو 614ھ/ 1217ء میں خلافتِ بغداد کے لئے کھڑا کیا اور عراق، خراسان اور ماوراء النہر کے سرداروں کے ساتھ بغداد کے خلاف بغرضِ جنگ روانہ ہوا، اس نے اپنی روانگی سے قبل امیر حلوان کو سندِ امارت عطا کر کے 15 ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ بغداد کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ خلیفہ ناصر نے (عوارف المعارف کے مشہور مصنف) عظیم صوفی شیخ شہاب الدین سہروردی کو خوارزم شاہ کے پاس افہام وتفہیم کے لئے بھیجا، لیکن جب شیخ نے خلیفہ ناصر کو اپنے مشن کی ناکامی کی اطلاع دی تو ناصر نے محاصرہ کے مقابلے کی تیاری کی اور عام طور پر مشہور ہے کہ بحالتِ مایوسی ناصر نے منگول کے سردار چنگیز خاں سے درخواست کی کہ وہ خوارزم شاہ کی سرکوبی کرے۔ خوارزم شاہ نے بغداد میں ہمدان کے قریب پہنچ کر سخت نقصان اٹھایا اور اپنی فوج کے ساتھ پسپائی اختیار کی، کیوں کہ اس سال بغداد میں سردی نہایت سخت تھی، برف باری ہو رہی تھی، سپاہیوں کے لئے حرکت کرنا ممکن نہ تھا۔

14.4.6 تاتاری

ساتویں صدی ہجری/ تیرہویں صدی عیسوی کا آغاز ساری دنیائے اسلام خصوصا وسط ایشیا (Central Asia) کی مسلم حکومتوں کے لئے بڑا نازک اور انتہائی ہولناک دور تھا، اسی زمانہ میں یعنی 623ھ/ 1226ء میں وحشی تاتاریوں کا طوفان اٹھا اور ترکستان سے لے کر وسط ایشیا اور روس تک چھا گیا اور چند برسوں میں مشرق کے سارے مسلم ممالک کو تہہ وبالا کر دیا، بے شمار مسلمان ذبح کئے گئے، سینکڑوں شہر خاک کا ڈھیر ہوگئے۔ اس کا آغاز علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی ایک غلطی سے ہوا۔ چوں کہ سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ نے ترکی غلاموں کی ایک فوج کی مدد سے ایران اور وسطی ایشیا میں ایک بہت بڑی سلطنت قائم کر لی تھی، اسی سبب سے اپنے عنفوانِ عروج پر طاقت کے نشہ میں اس نے چنگیز خاں کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی، وہ چنگیز خاں جس نے 612ھ/ 1215ء میں یلغار کرتے ہوئے شمالی چین اور پکینگ پر قبضہ کر لیا تھا، ابھی جب کہ علاء الدین محمد خوارزم شاہ خلیفہ ناصر کے خلاف عراق پر ناکام فوج کشی کی کوشش کر کے اپنے مقام پر پہنچا بھی نہیں تھا کہ چنگیز خاں کی فوجوں نے 617ھ/ 1220ء میں اس طرف رخ کیا اور خراسان اور دوسرے علاقوں کو تاراج کیا، قتل وغارت گری اس پیمانہ پر ہوئی کہ لوگ اسے آج تک نہیں بھول سکے، چنگیز خاں یہ تباہی مچا کر لوٹ گیا۔ خوارزمی فوج نے بھاگ کر ایران اور عراق میں پناہ لی اور وہ برسوں وہاں غارت گری کرتی رہی۔

14.4.7 شاہِ خوارزم کی مملکت کے زوال کے اسباب

خوارزم شاہی حکومت اگر ہوش کا ناخن لیتی، تدبّر وتدبیر، ہمت وحوصلہ اور منصوبہ بندی کے ساتھ جنگ لڑتی تو اس کی فتح متوقع تھی، مگر ایسا نہ ہوا۔ جامع تاریخ ہند (ص 108-105) میں شاہِ خوارزم کی مملکت کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اختصار کے ساتھ وہ اسباب یہاں درج کئے جا رہے ہیں۔

سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ اپنی ماں ترکان خاتون کی اس رائے کو رد نہ کر سکا کہ اس کا لڑکا قطب الدین ازلاق اس کا جانشین ہوگا، یقیناً اس کی جانشینی کی بات نے اس کے وفادار افسران کے اندازوں کو یکسر الٹ کر رکھ دیا تھا، اگر اس نے اپنے بیٹے جلال الدین منکبرنی کی رائے تسلیم کی ہوتی کہ ''چوں کہ شاہی خاندان نے کئی پشتوں تک ان رعایا کے ٹیکسوں پر گذر بسر کی ہے، اس لئے غزنی یا عراق یا اور کہیں محفوظ مقام کی طرف بھاگ جانے کی بجائے سیر دریا کے مشرقی کنارے پر ان کی خاطر منگولوں سے لڑا جائے'' تو یہ عدل وانصاف کے عین مطابق ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جلال الدین 30 سال سے کم عمر کا جوان تھا، تھوڑا سا جلد باز اور انفرادی مقابلوں میں اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دینے کی طرف بہت زیادہ مائل اور راغب تھا، اگر اس کی قیادت میں جنگ ہوتی تو مسلمان ڈٹ کر مقابلہ کرتے، آدمیوں اور ساز وسامان کی کمی نہ تھی، اگر کمی تھی تو ہمت اور تدبیر کی۔ لیکن پھر بھی اگر جلال الدین منکبرنی کی زیرِ قیادت ایک گشتی فوج باضابطہ جنگ سے گریز کرتی، منگولوں کو ایک ایسے ناواقف علاقے میں جہاں کی زبان وہ نہیں سمجھتے تھے چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے ذریعے خستہ حال کیا جاتا، ان کے وسائل کا راستہ بند کیا جاتا، قلعہ بند شہروں کی حفاظت اور ان کے باہر کی غیر فوجی آبادی کی اعانت وقیادت کی پالیسی اختیار کی جاتی تو خوارزم شاہی حکومت جنگ میں اپنی کامیابی کی توقع کر سکتی تھی۔

تاہم معاملہ یہ تھا کہ جلال الدین طاقت، جرأت اور ابھرنے کی صلاحیتیں رکھتا تھا جن کا یہ بحران متقاضی تھا، عوام اس کے وفادار تھے اور دفاعی فوج کے سردار کی حیثیت سے وہ اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جاتے، مگر سلطان اور اس کے درباری جلال الدین کی لیڈرشپ اور شہرت سے خوفزدہ تھے۔ مزید برآں بدقسمتی سے وہ ایک ہندوستانی ماں کا بیٹا تھا اور اس کا رنگ کالا تھا۔ محمد خوارزم شاہ نے اپنے درباریوں سے غلط مشورہ پا کر اپنی چار یا پانچ لاکھ کی فوج کو اپنے اہم شہروں کے اندرونی قلعوں (آرک) میں اس حکم کے ساتھ منقسم کر دیا کہ وہ منگولوں کے خلاف جمی رہے۔ اس طرح آرک میں متعینہ حفاظتی دستوں کے بند ہونے کے بعد میدانِ کارزار میں لڑنے والی کوئی فوج کہیں بھی حملہ آور منگولوں کے مقابلہ کے لئے باقی نہیں بچی، سلطان کے اسی مہلک قدم نے چنگیز خاں کی مکمل کامیابی کو یقینی بنا دیا۔

نیز سلطان جہاں کہیں گیا وہاں اس نے عوام کے دلوں میں منگول فوج کی دہشت پھیلا دی، اس نے شہریوں کو یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ اپنے مسکنوں کو چھوڑ دیں اور کسی محفوظ گوشہ میں چلے جائیں، کیوں کہ شہروں پر حملہ اور ان کا ملکِ چین کے شہروں کے مانند کچل دیا جانا یقینی تھا اور آخر میں ریاست کے سردار اور اس کے دفاع کی ایک ذمہ دار شخصیت کی حیثیت سے اس نے خود اپنی حفاظت کے لئے غیر مناسب فکر وتشویش کا اظہار کیا۔ جامع تاریخ ہند (حاشیہ ص 107) کے مطابق بارتھولڈ (ترکستان ص 385-380) نے پانچ مختلف اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی بتلایا ہے کہ اس فتویٰ کی بدولت بھی خوارزم شاہی مملکت روبہ زوال ہوئی جو سلطان نے زبردستی علماء سے خلیفہ ناصر کے خلاف لیا تھا، علماء اس کے سخت مخالف ہو گئے تھے اور یہ عداوت سلطان کی چند حرکات کی بنا پر اور بھی مشتعل ہو گئی، مثلاً مسلم صوفیاء کے کبروی مسلک کے بانی شیخ نجم الدین کبریٰ کے ایک شاگرد شیخ مجد الدین کو پھانسی دے دینا۔ بارتھولڈ کے مطابق ایک سبب یہ بھی تھا کہ شاہِ خوارزم کی پوری عسکری طاقت کی تشکیل بھاڑے (کرایہ) کے فوجیوں پر تھی، سلطان غیر فوجی شہریوں اور کسانوں پر سپاہیوں کو ترجیح دیتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ عوام کی وفاداری حاصل نہ کر سکا''۔

14.4.8 سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی اولاد

سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ کے چار بیٹے تھے: قطب الدین ازلاق یا ازلاغ، غیاث الدین تیز شاہ، رکن الدین غور شاہ اور جلال الدین منکبرنی۔ علاء الدین نے اپنی زندگی ہی میں چاروں میں ملک تقسیم کر دیا تھا، پہلے بڑے بیٹے قطب الدین ازلاق کو ولی عہد نامزد کیا تھا، لیکن پھر اس کا نام خارج کر کے چھوٹے بیٹے جلال الدین منکبرنی کو ولی عہد بنایا اور باپ کی موت کے وقت یہی ولی عہد تھا۔

14.4.9 جلال الدین منکبرنی پر تاتاریوں کی دوبارہ یورش

جلال الدین اپنے بھائیوں میں باپ کی جانشینی کا سب سے زیادہ اہل تھا، اس نے والد کی موت کے بعد تاتاریوں سے مقابلہ آرائی کا ارادہ کیا اور اس لئے بحیرۂ کاسپین کے جزیرہ سے نکل کر شہر تبریز اور پھر غزنین پہنچا، کئی بار چنگیزی فوج کو شکست دی، لیکن امراء کی فتنہ انگیزی سے بھائیوں میں اختلاف ہو گیا اور امراء کی جانب سے اس کے ہلاک کئے جانے کی تدبیر ہونے لگی، اس لئے وہ خوارزم چھوڑ کر نساء اور پھر غزنی چلا گیا۔ ادھر خوارزم کی طرف تاتاریوں نے رخ کیا، قطب الدین ازلاق نے مقابلہ کے بجائے خوارزم چھوڑ دیا، راستہ میں تاتاریوں نے اسے خدم و حشم کے ساتھ گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ مختلف گنجان آبادی والے محلوں کو آگ لگا دی اور باقی بچے محلوں کو لوٹ کر ویران کر دیا۔ ابنِ اثیر کے بیان کے مطابق تاتاریوں نے خوارزم میں دریا کا بند کھول دیا، اس سے سارا شہر مع آبادی کے تہہ آب ہو گیا۔ چنگیز نے طالقان کی آبادی کو ختم کر کے شہر کو زمین دوز کر دیا، طالقان کے بامیان کی آبادی کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور یہاں کے جانور تک زندہ نہ چھوڑے۔

بعد ازاں چنگیز نے جلال الدین منکبرنی کے مقابلہ کے لئے غزنین کا رخ کیا، جلال الدین کا تعاقب کرتے ہوئے وہ ساحلِ دریائے سندھ پہنچا اور اس کا محاصرہ کیا، اس نے اپنی جان ہتھیلی میں رکھ کر مقابلہ کیا اور دریا میں اپنا گھوڑا دوڑا دیا اور بچ کر ہندوستان چلا آیا۔ چنگیز نے اس کے اہل و عیال کو گرفتار کر لیا اور کل نرینہ اولاد کو جس میں شیر خوار بچے بھی تھے، قتل کر دیا۔ تاتاری فوج نے ہندوستان میں پنجاب تک جلال الدین کا پیچھا کیا، لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔ دوسری طرف چنگیز خاں نے غزنی اور غور پر قبضہ کر کے پوری آبادی کو قتل کر دیا۔

ماوراء النہر پر قبضہ کے بعد ہی تاتاری سارے وسط ایشیا میں پھیل گئے اور خراسان، فارس، آذربائیجان، ارمنستان، اران، کرج اور قفجاج کے سارے علاقوں کو زیر و زبر کرتے ہوئے روس تک پہنچ گئے۔ اب اقصائے چین سے عراق، بحرِ خزر (Caspian Sea) اور حدودِ روس تک اور بحرِ شمالی سے سرحد کا لمبا چوڑا رقبہ چنگیز کے قبضہ میں تھا۔ اس یورش میں تاتاریوں نے کسی ملک میں مستقل قیام نہیں کیا۔

تاتاری طوفان کے چھٹنے کے بعد جلال الدین منکبرنی خوارزم شاہ واپس آیا۔ عراق کا ملک علاء الدین محمد خوارزم شاہ نے اپنے لڑکے رکن الدین غور شاہ کو دیا تھا، وہ تاتاریوں کی یورش میں جاں بحق ہوا، اس کی موت کے بعد اس کے دوسرے بھائی غیاث

الدین تیز شاہ والیٔ کرمان ومکران نے اس کے علاقہ اور اتابک سعد بن وکلا سلغری والیٔ فارس کے بعض مقبوضات پر قبضہ کرلیا، لیکن عراق کے باشندے جلال الدین منکبرنی کی طرف مائل تھے۔

اس لئے جلال الدین 621ھ/ 1224ء میں کرمان ہوتا ہوا واپس آیا اور عراق وفارس کو غیاث الدین کے ہاتھوں سے چھڑا کر اتابک سعد کا علاقہ اس کے حوالہ کیا اور غیاث الدین کو اپنے ماتحت کی حیثیت سے عراق کی حکومت پر بحال رہنے دیا۔

عراق کے بعد جلال الدین نے خلافتِ عباسیہ کا علاقہ خوزستان پر فوج کشی کی، یہاں کے حاکم قشتمر نے خوزستان کے صدر مقام تستر کو بچالیا، اس کے علاوہ باقی علاقہ کو جلال الدین خوارزم شاہ نے تاخت وتاراج کردیا اور اس کی آبادی کو بے دریغ قتل کیا اور بڑھتا ہوا بغداد کے قریب پہنچ گیا، موصل کے گورنر مظفرالدین کوکبری نے بحکمِ خلیفہ ناصر اپنے لڑکے کو اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا، اس نے جلال الدین کی اطاعت قبول کرلی۔

خوزستان کو فتح کرنے کے بعد جلال الدین نے آذربائیجان پر حملہ کیا اور اس کے پایہ تخت تبریز پر قبضہ کرلیا، بعدازاں اس نے گرجوں کو مغلوب کرکے گرجستان اور گنجہ پر قبضہ کرلیا، آذربائیجان کے گورنر مظفرالدین ازبک نے گنجہ میں پناہ لی اور پھر یہاں سے بھاگ کر لاپتہ ہوگیا۔

14.4.10 جلال الدین خوارزم شاہ سندھ میں

مولانا سید ابوظفر دسنوی ندوی نے اپنی کتاب ''تاریخِ سندھ'' (حصہ اول ودوم، ص305) میں تاریخ فرشتہ (ج2 ص316، لکھنوء) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ: ''جب جلال الدین محمد خوارزم شاہ چنگیز خاں سے شکست کھا کر سندھ آیا اور لوٹ مار کرتا ہوا، لاہور پہنچا تو سلطان شمس الدین التمش نے اس کو ملک خالی کرنے کے لئے کہا، اس لئے مجبوراً وہ ملتان اور اُچھ ہوتا ہوا ٹھٹھ آیا، اس وقت ٹھٹھ میں راجہ جلشی (دراصل یہ لفظ جیسی یا جیسیہ ہے جو جے سنگھ کا معرّب ہے) خاندانِ سومرہ میں سے تھا، جب اس نے اپنے میں مقابلہ کی طاقت نہ دیکھی تو تمام مال واسباب اور اہل وعیال لے کر ایک کشتی کے ذریعہ کسی جزیرہ میں چلا گیا۔

620ھ/ 1223ء میں خوارزم شاہ نے ٹھٹھ میں مستقل قیام کیا اور آس پاس کے شہروں اور گاؤں کو خوب لوٹا، بندرگاہ دیبل جو پہلے ہی بہت کچھ تباہ ہوچکا تھا جلال الدین نے اس کو لوٹ کھسوٹ کر بے چراغ کردیا اور وہاں کے دیول کو گرا کر مسجد بنائی۔ اسی عرصہ میں اس نے ایک فوج گجرات کی طرف روانہ کی، جو لوٹ مار کر واپس آگئی، چنگیزی فوج کی آمد کی خبر جب جلال الدین کو ہوئی تو وہ مکران ہوکر عراق چلا گیا''۔

14.4.11 گرجستان پر جلال الدین خوارزم شاہ کا قبضہ

ابنِ اثیر (ج12 ص167) کے حوالہ سے شاہ معین الدین احمد ندوی نے اپنی کتاب تاریخ اسلام (ج4 ص358) میں لکھا ہے کہ ''گرجستان اسلامی قلمرو کی بالکل سرحد پر تھا، گرجی بڑے وحشی اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے اور ہر زمانہ میں وہ اسلامی حکومت کے حدود پر وحشیانہ تاخت کرتے رہتے تھے۔ خلاط، آذربائیجان، اران، ارزن الروم، دربند اور شروان وغیرہ کے علاقے ہمیشہ ان کے حملوں کا ہدف بنے رہے، کوئی قوت انہیں روکنے والی نہ تھی، وہ بے محابا ان ملکوں میں گھس آتے تھے اور نہایت وحشیانہ

طریقے سے قتل و غارت کرتے تھے، سرحد کے چھوٹے چھوٹے حکمراں ان کے مقابلہ سے عاجز تھے اور ان علاقوں کے مسلمان ان کے ہاتھوں بڑی ذلت اور بے بسی کی زندگی بسر کرتے تھے''۔

عباسی خلیفہ ناصر کے آخری زمانے میں جلال الدین خوارزم شاہ نے گرجستان پر فوج کشی کی تھی اور اس کا سلسلہ خلیفہ ظاہر کے زمانہ تک رہا اور اس میں اور گرجوں میں بڑی خون ریز لڑائیاں ہوئیں، جن میں ہزاروں گرجی کیفرِ کردار تک پہنچے، جلال الدین نے ان کے مرکز تفلیس پر قبضہ کر کے ان کی قوت بالکل توڑ دی، اس کے اس کارنامے پر ساری دنیائے اسلام اس کی مشکور ہوئی۔

14.4.12 خوارزمی حکومت کا خاتمہ

آذربائیجان اور گرجستان پر قبضہ کے بعد جلال الدین نے خلاط پر فوج کشی کی، اس کے اور خلاط کے فرمانروا ملک الأشرف ایوبی کے درمیان بڑی خون ریز لڑائی ہوئی، 626ھ/ 1229ء میں جلال الدین نے خلاط پر قبضہ کر کے تاتاریوں کی طرح اسے بالکل ویران کر دیا، لیکن ایک ہی سال بعد 627ھ/ 1230ء میں ملک الأشرف ایوبی نے ایشیائے کوچک کے فرماں روا علاء الدین کیقباد بن کیخسرو سلجوقی کی مدد حاصل کی اور جلال الدین کو شکست دے کر خلاط واپس لے لیا، اس شکست سے جلال الدین کی قوت کو بڑا صدمہ پہنچا اور اسے مجبور ہو کر اشرف اور علاء الدین کیقباد سے صلح کرنی پڑی۔

624ھ/ 1227ء چنگیز خاں کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا اکتائی قاآن تخت نشین ہوا، اس نے پھر جلال الدین کے مقابلہ کے لئے امیر جرماغون کو 80 ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا، جلال الدین نے خلاط کے فرمانروا اشرف ایوبی اور خلافتِ بغداد اور شام وروم کے تمام مسلم فرماں رواؤں سے مدد مانگی، مگر چوں کہ سب سے اس کے تعلقات خراب ہو چکے تھے، اسی سبب سبھوں نے اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ جلال الدین نے منگولوں کے حملے کی تاب نہ لا کر خلاط سے دیارِ بکر، دیارِ بکر سے آمد، آمد سے باسورہ آمد، باسورہ آمد سے میافارقین کے ایک گاؤں میں پناہ لی، تاتاریوں نے یہاں تک اس کا پیچھا کیا، اس لئے وہ یہاں بھی نہ ٹھہر سکا اور کوہستانی علاقہ کی طرف نکل گیا۔ یہاں جرائم پیشہ کُردوں نے اُسے پکڑ لیا۔ جلال الدین منکبرنی نے جب اپنے سلطان ہونے کی خبر انہیں دی اور ان سے کچھ وعدے کئے تو ان لوگوں نے اسے امان دے دی، لیکن اس کے ایک دشمن نے وسط شوال 628ھ/ 1231ء میں نیزہ مار کر اس کا کام تمام کر دیا۔ جلال الدین کے قتل کے ساتھ ہی خوارزمی سلطنت ختم ہوگئی۔

معلومات کی جانچ

1. سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ پر آپ اپنی معلومات تحریر کریں۔
2. عجم پر تاتاریوں کے حملے کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ روشنی ڈالئے۔

14.5 غوری خاندان کی حکومت

غور کا پہاڑی علاقہ (Hill Regions) غزنی اور ہرات کی پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے، دوسرے لفظوں میں کابل کے حدود میں غزنی سے دور ہرات کے مشرقی کوہستان میں غور ایک وسیع خطہ کا نام ہے۔ غور شہتوت، اخروٹ اور خوبانی کے درخت اور انگور کی بیلوں کے لئے مشہور ہے۔ غور، جس نے مسلم ثقافتی اثرات حال ہی میں قبول کئے تھے، کے پاس عہدِ وسطیٰ کے دو اہم ترین

جنگی سامان موجود تھے یعنی لوہا اور گھوڑے۔ غور کے باشندوں نے دوسری صدی ہجری کے شروع/نویں صدی عیسوی میں اسلام قبول کرلیا تھا اور یہاں سب افغانی قومیں آباد تھیں۔

14.5.1 غوری خاندان

پانچویں صدی ہجری کے اوائل یا اس سے کچھ قبل (یعنی دسویں صدی عیسوی میں) غور ایک آزاد ریاست تھی اور ایک ایرانی النسل تاجک خاندان کے زیرِ نگیں تھی جو تاریخوں میں شنبسانی خاندان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شنبسانی خاندان، شہاب الدین عُرف معزالدین محمد غوری جس کا ایک فرد تھا، کی ابتدائی تاریخ اسرار اور رومانس سے ڈھکی ہوئی ہے۔ تاریخ ناصری اور تاریخِ ہیثم نبی کی مدد سے منہاج السراج نے طبقات ناصری میں اوائلِ شنبسانی کا حال مرتب کیا ہے، معزالدین کے خاندان کا روایتی سورما ضحاک ہے جو اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ تسلیم کیا گیا۔ ایرانی علاقوں کی روایات میں ضحاک ایک ناپسندیدہ شخصیت تھی، مگر غزنی اور زبوستان کے علاقہ میں اسے مقبولیت حاصل تھی، روایت یہ تھی کہ جب فریدون نے ضحاک کی ''ہزار سالہ مملکت'' کا تختہ الٹ دیا تب اس کے وارثین غور میں آباد ہوگئے۔ شنبس جس نے اپنا نام خاندان کو دیا ضحاک کا ایک خلَف تھا، بقول منہاج السراج اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔

14.5.2 غوریوں پر غزنویوں کی حکمرانی

غوری خاندان کا پایہ تخت فیروز کوہ تھا، اس کے حکمراں شنبسانی شہزادہ محمد بن سوری سے سبکتگین خراج وصول کرتا تھا، محمد بن سوری نے سبکتگین کے انتقال کے بعد خراج دینا بند کردیا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کیا، اس وجہ سے محمود غزنوی نے اسے 399ھ/ 1009ء میں شکست دے کر اپنا محکوم بنالیا تھا جس کے بعد سے غور کے حکمراں غزنی کے باج گذار رہے اور یہ علاقہ غزنوی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا، محمود غزنوی نے غور کی صوبہ داری پر انہیں افغانوں کے ایک شریف شخص (محمد بن سوری کے بڑے لڑکے ابو علی سلطان) کو مامور فرمایا تھا جس کے خاندان میں غور کی حکومت بطور صوبہ داری چلی آرہی تھی، ابوعلی سلطان محمود کی حکومت کے زمانے تک برسرِ اقتدار رہا۔ منہاج طبقاتِ ناصری (ص 41) میں لکھتا ہے کہ اس نے غور میں کئی ایک اسلامی ادارے قائم کیے، جامع مسجد اور مدرسے بنوائے اور ان کی دیکھ بھال کے لئے اوقاف مقرر کیے، وہ علماء اور مذہبی پیشواؤں کی بڑی عزت کرتا تھا اور صوفیوں اور دنیا فراموش بزرگان کی خدمت کو اپنا فرض جانتا تھا۔ لیکن جب 422ھ/ 1030ء میں محمود غزنوی کی وفات ہوئی تو غوریوں نے زوال پذیر غزنویوں کے حالات سے پورا فائدہ اٹھایا اور دونوں سلطنتوں میں جھگڑے شروع ہوئے، جو کئی سال تک برابر جاری رہے، اتفاقاً سلطان بہرام غزنوی اور غور کے حاکم قطب الدین ابوعلی حسن بن محمد بن عباس میں کسی بات پر ناچاقی ہوئی اور پانچویں صدی ہجری کے بالکل اواخر/ بارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں یعنی 493ھ/ 1100ء میں ان دونوں میں جنگ ہوئی، اس لڑائی میں قطب الدین غوری مارا گیا، قطب الدین غوری کے بھائی سیف الدین غوری نے اپنے بھائی کے انتقام میں غزنی پر فوج کشی کرکے بہرام غزنوی کو غزنی سے نکال دیا اور خود تختِ غزنی پر قابض ہوگیا، بہرام غزنوی نے اطرافِ ملک سے امداد حاصل کرکے غزنی پر حملہ کیا اور سیف الدین غوری کو گرفتار کرکے نہایت بے دردی اور اذیت کے ساتھ قتل کردیا اور اس کی لاش شہر میں گشت کرائی۔

14.5.3 غزنی پر علاء الدین حسین جہاں سوز غوری کا قبضہ

آخر کار غور کے بادشاہ علاء الدین حسین جہاں سوز نے اپنے بھائی کے فریب کارانہ قتل کا انتقام لینے کے لئے 547ھ/ 1149ء میں غزنین کا محاصرہ کیا اور شدید ترین حملوں کے بعد اسے فتح کرلیا، اُس کی اجازت سے غوری فوجیوں نے غزنین میں سات دنوں تک قتل، غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم رکھا، غزنین کے بڑے بڑے سردار جو علاء الدین کے بھائی کے قتل کی سازش میں شریک تھے، کو پابہ زنجیر غور لایا گیا اور قتل کر کے اُن کے خون کو گارے میں ملا کر اُن عمارتوں کی تعمیر میں استعمال کیا گیا جو اُس وقت غور میں بن رہی تھیں۔ اسی سنگ دلی اور ظالمانہ کردار کی وجہ سے علاء الدین کو جہاں سوز کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ علاء الدین جہاں سوز غوری نے غزنی کی فتح کے بعد غزنی میں اپنا ایک نائب السلطنت مقرر کیا اور خود غور میں اپنے دارالحکومت فیروز کوہ کی جانب چلا گیا، اس طرح غزنی غور کی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔

بہرام غزنوی نے سلطان سنجر سلجوقی سے فریاد کی، اُس نے دوسرے سال غور و غزنی فتح کر کے بہرام غزنوی کو پھر اپنی طرف سے غزنی پر قابض کر دیا اور علاء الدین جہاں سوز کو گرفتار کر کے اپنے ہمراہ لے گیا، لیکن چند ہی روز کے بعد سلطان سنجر نے اسے اس کی قابلیتوں کی وجہ سے رہا کر دیا اور وہ غور میں پھر حکومت کرنے لگا۔ واضح رہے کہ سقوطِ غزنین سے قبل ہی یہاں کا بادشاہ خسرو شاہ اپنی جان بچا کر لاہور آ گیا تھا، جہاں (سات سال تک حکومت کرنے کے بعد) 555ھ/ 1160ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا خسرو ملک لاہور کے تخت پر باپ کا جانشین ہوا، یہ دولتِ غزنویہ کے سلسلہ کی آخری کڑی تھا۔ اس کے بعد ہی ترکانِ غز نے سلطان سنجر کو گرفتار کر کے چار سال تک اپنے قید میں رکھا، سلطان سنجر کے قید ہونے کے بعد علاء الدین غوری نے بہرام غزنوی کو بے دخل کر کے غزنی پر بھی قبضہ کر لیا اور 556ھ/ 1161ء میں انتقال کر گیا۔

علاء الدین غوری کو دولتِ غوریہ کا پہلا خود مختار بادشاہ سمجھنا چاہیئے، اس کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا سیف الدین ثانی غور کے تخت پر بیٹھا اور تقریباً ڈیڑھ سال حکومت کر کے ترکانِ غز کی ایک لڑائی میں اپنے ہی ایک سردار کے ہاتھ سے مارا گیا۔

14.5.4 غیاث الدین غوری

اُس کے بعد علاء الدین غوری کی حکومت اُس کے بھتیجوں میں اس طرح تقسیم ہوگئی کہ ایک بھتیجہ غیاث الدین غوری، غور کا بادشاہ تھا اور دوسرا بھتیجہ سلطان شہاب الدین غوری عُرف معز الدین محمد غزنین کا گورنر تھا۔ الغرض غیاث الدین غوری اور شہاب الدین غوری دونوں بھائی، طُغرل بیگ سلجوقی اور چغر بیگ سلجوقی کی طرح سلطنت میں باہم شریک تھے۔ غیاث الدین غوری خوارزم شاہ سے بھی برسرِ پیکار رہا اور خراسان کے نواحی علاقوں پر قابض ہو گیا، لیکن آخر میں اندخود میں شکست کھائی۔

14.5.5 سلطان شہاب الدین عرف معز الدین محمد غوری

شہاب الدین محمد غوری اپنے بڑے بھائی کا نہایت درجہ فرماں بردار تھا، غزنین میں اس کی حکومت آزاد تھی، اس کے باوجود وہ سکوں پر اپنے بڑے بھائی ہی کا نام کندہ کراتا رہا۔ شہاب الدین نہایت عالی ہمت، مستعد اور حوصلہ مند حکمراں تھا، ہندستان پر محمود

غزنوی کے آخری حملے اور سلطان محمد غوری کی آمد تک دو صدیاں گذریں۔ جس مردِ مجاہد نے شمالی ہندستان کے عسکری نظام کو محمود غزنوی کے بعد پھر درہم برہم کیا اور اس کی جگہ اسلامی نظامِ حکومت کی مستحکم بنیادیں قائم کیں، اس کا نام محمد غوری تھا، وہ کردار کی مضبوطی اور عقل وسمجھ میں محمود غزنوی سے بڑھ کر تھا، وہ شکست سے ہراساں نہ ہوتا، اس کی ہمت اور خوش تدبیری شکست کو فتح میں بدل دیتی، 602ھ/ 1206ء میں جب وہ شہید ہوا اُس وقت تقریباً سارے شمالی ہندوستان پر اسلامی پرچم لہرارہا تھا اور قطب الدین ایبک، محمد بن بختیار خلجی، التمش، ناصر الدین قباچہ اور دوسرے افسروں کا سلطان ایک ایسا منتخب گروہ چھوڑ گیا تھا جو اس کا کام جاری رکھ سکتے تھے۔ ہندوستان میں مسلم حکومت کے بانی ہونے کے باوجود یہاں کے باشندوں کے خلاف اس کے دل میں عناد، حقارت اور تعصب کا کوئی جذبہ نہ تھا، اس میں وفاداری اور اخلاقی شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

وہ شروع سے ہی ہندوستان کو فتح کرنے کا آرزومند تھا، چنانچہ اس نے اپنا وقت زیادہ تر ہندوستان میں فتوحات حاصل کرنے اور حملوں میں بسر کیا۔ مگر فتحِ ہندوستان کے لئے سب سے پہلے ضروری تھا کہ پنجاب کو پہلے کی طرح تاج وتختِ غزنین کے ساتھ وابستہ کیا جائے، جب کہ اس وقت پنجاب پر بہرام غزنوی کی اولاد خسرو شاہ (یا خسرو ملک) کی حکومت تھی، نیز غوریوں کو خوارزم شاہ سے لڑنے کے لئے اپنے لاہور کے غزنوی دشمنوں اور ملتان کے قرامطوں کا قلع قمع کرنے کی ضرورت پڑی۔

14.5.6 سلطان شہاب الدین محمد غوری کی فتوحات

شہاب الدین عُرف معز الدین محمد غوری نے 571ھ/ 1175ء میں سب سے پہلے ملتان پر حملہ کیا، یہ صوبہ اس وقت قرامطہ کے زیرِ نگیں تھا اور یہاں اسمعیلیوں نے دوبارہ قوت حاصل کر لی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل سلطان محمود غزنوی نے قرامطی حکمراں پر کاری ضرب لگائی اور ان کو ملتان سے بے دخل کر دیا تھا، مگر اس کی موت کے بعد انہوں نے پھر اقتدار حاصل کر لیا، معز الدین محمد غوری نے دوبارہ ان کی طاقت کو اکھاڑ پھینکا اور اس علاقہ میں قرامطی اقتدار پھر کبھی قائم نہ ہوسکا۔ اس نے ملتان فتح کر کے یہاں اپنا ایک والی مقرر کیا۔

پھر وہ سندھ کے شہر اُچھ (اُچ) کی طرف بڑھا، اسے 572ھ/ 1176ء میں تسخیر کر کے علی کرماج کے حوالہ کیا، اس نے سندھ کے زیریں علاقہ میں یلغار کر کے یہاں کے سومر حکمرانوں سے اپنا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرایا۔

شہاب الدین غوری نے 574ھ/ 1177ء میں اُچھ کے راستہ ریگستان کو طے کر کے گجرات میں داخل ہوا اور انھلواڑہ یا نہروالا (پٹن) پر یلغار کیا، جو اس وقت گجرات کے بگھیلا خاندان کے راجہ بھیم دیو دوم کا دارالسلطنت تھا، یہ راجہ کمسن تو تھا، مگر بہت بہادر اور جانباز تھا، اس کے پاس بہت بڑی فوج اور ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد بھی تھی، چنانچہ محمد غوری نے راجہ مول راج دوم اور اس کے چچا راجہ بھیم دیو دوم سے جنگ میں شکست کھائی۔ وہ سندھ پر علی کرماج کو حاکم بنا کر گجرات سے غزنی واپس چلا گیا۔

اس شکست کے بعد شہاب الدین محمد غوری کو یہ اندازہ ہوا کہ ہندوستان کی تسخیر سندھ اور ملتان کی راہ سے نہیں ہوسکتی ہے، بلکہ اس کا دروازہ پنجاب کی طرف سے کھل سکتا ہے، اس لئے اس نے اپنی راہ بدل دی اور پنجاب ہو کر ہندوستان کے قلب تک پہنچنے کی کوشش کی، اس نے پشاور پر حملہ کیا جو کہ غزنویوں کی ہندوستانی مملکت میں شامل تھا اور 575ھ/ 1180ء-1179ء میں اس پر قبضہ کرلیا۔

پشاور ترائن کی جانب پہلا قدم تھا اور اس کے دو سال بعد شہاب الدین محمد غوری نے لاہور پر حملہ کیا اور دو مرتبہ کی ناکامی کے بعد 582ھ/ 1186ء میں اسے فتح کرلیا، اب لاہور غوریوں کے قبضہ میں آ گیا۔ خسرو ملک غزنوی جو لاہور میں دولتِ غزنویہ کی آخری نشانی تھا، گرفتار کر کے گرجستان کے مالاروان قلعہ میں بھیج دیا گیا، جہاں کچھ عرصہ بعد 587ھ/ 1192ء میں اسے مار دیا گیا۔ 587ھ/ 1192ء تک دیبل، سیالکوٹ، ملتان، سندھ اور لاہور غور کی عملداری کے حصہ بن گئے اور پنجاب میں غزنویوں کی حکومت ختم ہوگئی۔ اس کی فتح کا اہم پہلو جو اکثر نظرانداز کر دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ راجپوت حکومتوں پر حملہ شروع کرنے سے قبل اس نے سندھ اور پنجاب میں اپنی طاقت مستحکم کی۔

پنجاب پر قبضہ ہو جانے کے بعد شہاب الدین غوری کے لئے ہندوستان پر حملہ کرنا آسان ہوگیا، اب اس کی سلطنت کی سرحد اجمیر اور دہلی کے بہادر راجہ پرتھوی راج کی سلطنت سے مل گئی، محمد غوری کو مزید قوت اس سے پہنچی کہ اس وقت قنوج اور دہلی و اجمیر شمالی ہند میں راجپوتوں کی یہ دو مضبوط اور طاقت ور حکومتیں تھیں، قنوج کی حکومت جے چند کے قبضہ میں تھی اور دہلی و اجمیر کی سلطنت کا فرماں روا پرتھوی راج تھا، لیکن ان دونوں میں سخت پھوٹ پڑی ہوئی تھی اور اس کا اثر یہ تھا کہ شمالی ہند کے اعیان و امراء دونوں راجاؤں کی حمایت میں بٹ گئے تھے، اس موقعہ کو غنیمت جان کر شہاب الدین محمد غوری نے 586ھ/ 1192ء میں تبرہندا (بھٹنڈا) کا قلعہ جو دہلی کے راجہ رائے پتھورا کے قبضہ میں تھا، پر حملہ کر کے اسے فتح کرلیا اور اسے ملک ضیاء الدین تولکی کے زیرِ انتظام کر دیا گیا اور بارہ ہزار سواروں کی ہندوستان اور غزنی کی ایک چنندہ فوج اس کے ذمہ کر دی گئی اور تبرہندا کے قلعہ کو آٹھ ماہ تک سنبھالے رکھنے کی ذمہ داری اسے دی گئی۔

یہ سن کر راجہ رائے پتھورا (پرتھوی راج سوم) اپنے سیاسی شعور کے تحت فوراً لڑائی کے لئے آمادہ ہوگیا۔ تھانیسر سے چودہ میل کے فاصلہ پر موضع ترائن (موجودہ تراوڑی) میں دونوں کا مقابلہ ہوا، پرتھوی راج کے راجپوت لشکر نے شہاب الدین معز الدین محمد غوری کو شکست دی، خود محمد غوری بری طرح زخمی ہوا، ایک خلجی فوجی سردار اسے میدان جنگ سے نکال کر بچا لے گیا۔ معز الدین کو شکست دینے کے بعد رائے پتھورا کی فوج تبرہندا (بھٹنڈا) کی جانب بڑھی، ملک ضیاء الدین نے اس قلعہ کی تیرہ مہینوں تک حفاظت کی، مگر بعد میں ہتھیار ڈال دئے۔ محمد غوری شکست خوردہ فوج کے ساتھ غزنی چلا گیا، وہاں اس نے افغانوں کو چھوڑ کر، اپنے غوری، خلجی اور خراسانی امیروں کو سخت سزائیں دیں اور ایک سال کی شب و روز کی تیاری کے بعد 588ھ/ 1193ء میں غوری یک بیک پھر ہندوستان آیا، تاج المعاصر کے مطابق، لاہور پہنچ کر معز الدین غوری نے قوام الملک رکن الدین حمزہ کو لاہور سے رائے پتھورا (پرتھوی راج) کے پاس قبولِ اطاعت کا پیام دے کر بھیجا، اس نے جب اطاعت سے انکار کر دیا تو ترائن گاؤں کے اسی میدان میں دونوں کے درمیان پھر ایک سخت جنگ ہوئی جس میں دہلی کے راجہ رائے پتھورا کا سپہ سالار کھنڈے رائے مارا گیا، پرتھوی راج گرفتار ہوا، اس طرح دہلی سمیت اجمیر تک کا علاقہ شہاب الدین غوری کے قبضہ میں آ گیا۔

14.5.7 شمالی ہندوستان کی فتح

ترائن کی فتح راجپوتوں کے لئے ایک بڑا حادثہ تھا، راجپوتوں کی سیاسی عظمت کو عام طور پر اور چوہانوں کے اقتدار کو خاص طور پر سخت دھکا لگا، ساری چوہان حکومت اب حملہ آوروں کے قدموں میں تھی، چوں کہ ترائن کی جنگ راجپوت شہزادوں کی ایک بڑی

جماعت کی مشترکہ کوشش تھی، اس لئے اس کے اثرات بڑے پیمانے پر محسوس ہوئے اور دور دور تک پست ہمتی پھیل گئی۔ ترائن کی فتح سے سیوالک کا پورا علاقہ جس میں قلعہ سرسوتی، ہانسی، سامانہ اور کہرام وغیرہ شامل تھے، سب شہاب الدین غوری کی سلطنت میں داخل ہوگئے اور بالآخر اس نے ہندوستان میں ترکوں کی سلطنت کی بنیاد ڈال دی۔ اس بڑی کامیابی کے بعد محمد غوری نے مفتوحہ ممالک اپنے بڑے معتمد فوجی سردار اور غلام قطب الدین ایبک کے سپرد کر دیا اور خود غزنی واپس چلا گیا۔

14.5.8 ترائن کے بعد مملکت کی توسیع

قطب الدین ایبک نے پہلے کہرام اور پھر دہلی کو پایہ تخت بنایا اور راجپوتوں کی بغاوت فرو کرتا رہا۔ اسی سال یعنی 588ھ/ 1192ء میں میرٹھ اور باران ڈور (موجودہ بلند شہر) جو راجپوتوں کے تحت تھے، پر ایبک نے قبضہ کیا، میرٹھ اور باران ڈور کی فتح فوجی، جغرافیائی اور سیاسی نقطۂ نظر سے بہت اہم تھی، کیوں کہ ان مقامات سے وہ گڑھوال حکومت پر حملوں کا انتظام کرسکتا تھا۔ 589ھ/ 1194ء میں کول (علی گڑھ) پر قطب الدین نے قبضہ کیا، 592ھ/ 1196ء-1195ء میں شہاب الدین شمالی ہند کے راجہ قنوج سے سرحدی جنگ کا فیصلہ کرنے اور گڑھوال اقتدار کا خاتمہ کرنے پھر ہندوستان آیا، اٹاوہ (یا چندوار) کے پاس دونوں کا مقابلہ ہوا، راجہ قنوج جے چند مارا گیا اور قنوج سے لے کر بنارس تک کا ملک شہاب الدین محمد غوری کے قبضہ میں آ گیا، اس فتح نے بنارس اور ہانسی جیسے مقامات پر فوجی چھاؤنیاں قائم کرنے کا موقع پیش کیا۔ غوری افغانستان چلا گیا۔ بعد ازاں قطب الدین نے گجرات، گوالیار، بیانہ اور بختیار خلجی نے جو قنوج میں غوری کا نائب تھا، پہلے اودھ اور بہار اور پھر مغربی بنگال فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کر دئے۔

14.5.9 سلطان شہاب الدین محمد غوری کی شہادت

602ھ/ 1206ء میں شمالی ہندوستان میں کھوکھروں کی بغاوت اور فتنہ وفساد کے سبب محمد غوری پھر ہندوستان آیا، اس سے فارغ ہوکر وہ غزنی واپس جا رہا تھا کہ رات کو دریائے جہلم (سندھ) کے کنارے پر واقع دمیک (یا دمیاک) نامی ایک مقام پر ایک کھوکھر اسمعیلی فدائی اس کے خیمہ میں گھس گیا اور سلطان شہاب الدین محمد غوری کو اس وقت شہید کر ڈالا جب کہ وہ مغرب کی نماز ادا کر رہا تھا، لاش غزنی میں دفن ہوئی۔

14.5.10 سلطان شہاب الدین محمد غوری کے کارنامے

سلطان شہاب الدین محمد غوری عرف معز الدین بن سام کو عہدِ وسطیٰ کی ایک عظیم ترین سلطنت کے قیام کا فخر حاصل ہے۔ بلا شبہ ہندوستانی معاشرہ کی کمزوری نے شمالی ہندوستان کی فتح کی راہ ہموار کر دی، ہندوستان میں ترکی سلطنت کے قیام میں معز الدین کی خدمات کا جتنا بھی اعتراف کیا جائے وہ کم ہوگا۔ اس نے اپنی دوررسی اور فوجی ہوشیاری سے دریائے آمو سے جمنا تک کے وسیع علاقے میں مہموں کا انتظام کیا اور محتاط اور جرأت مندانہ منصوبہ بندی کے ذریعہ اسے مستحکم رکھا، مفتوح علاقوں پر تنظیم کی حیثیت سے براہِ راست حکومت قائم کرنے کے لئے معز الدین کو ذرائع حاصل نہ تھے، زبان کا مرحلہ ایک نا قابل حل دشوار تھا، محمود کی جنگی کارگزاریوں کے بعد سے 150 سال کے عرصہ میں شمالی ہندوستان میں کچھ نومسلم آبادیاں قائم ہوگئی تھیں، معز الدین نے انتظامی

معاملات طے کرنے میں دو زبان بولنے والے مسلمانوں کی خدمات ضرور حاصل کی ہوں گی، لیکن ان کی تعداد اتنی نہ رہی ہوگی کہ وہ مرکزی، صوبائی اور مقامی انتظامیہ کی ضرورت پوری کر سکتے تھے۔

پنجاب سے بنگال تک پھیلے ہوئے وسیع علاقے کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کرنے کے لئے معزالدین کوفنونِ جنگ وانتظامیہ میں عمدہ تعلیم حاصل کئے ہوئے غلاموں پر تکیہ کرنا پڑا۔ اس نے بڑے بڑے رایوں کو ختم کر کے دیہی اور قصباتی علاقوں کو چھوٹے چھوٹے رایوں اور راوتوں کے تحت چھوڑ دیا، تاکہ عوام میں تبدیلیِ حکومت کا احساس کم ہو اور اس کی حکومت قائم رہ سکے۔ نیز اس نے صرف بڑے بڑے اور فوجی اہمیت کے شہروں اور تجارتی راستوں پر قبضہ رکھا، اس نے بڑے بڑے رایوں سے اس طور پر جنگ لڑی کہ وہ متحد ہو کر آپس میں نہ مل سکیں، چنانچہ وہ بہت سے علاقوں کی جزوی فتح پر ہی قناعت کر گیا اور معاملات کو بہت آگے نہ بڑھایا۔ غوری کی ثقافتی ترقی میں بھی معزالدین محمد غوری کے کارنامے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، درحقیقت اس نے اور اس کے بڑے بھائی غیاث الدین نے ہی غور کی ثقافتی طرزِ زندگی میں تبدیلی لائی۔ فنِ تعمیرات کی روایات میں بھی اس نے کچھ قابلِ قدر اضافے کئے۔

14.5.11 غوری سلطنت کی تقسیم

شہاب الدین محمد غوری کی شہادت کے بعد اس کی سلطنت اس کے مختلف غلام افسروں میں تقسیم ہوگئی، جن میں سے بلاذر، ناصرالدین قباچہ اور قطب الدین ایبک تین مشہور ترک سپہ سالار تھے۔ غزنین پر بلاذر نے، سندھ پر ناصرالدین قباچہ نے اور ہندوستان پر قطب الدین ایبک نے قبضہ کیا۔

معلومات کی جانچ

1. غوری خاندان کی تاریخ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔

2. شہاب الدین محمد غوری کے کارناموں پر روشنی ڈالئے۔

14.6 خلاصہ

سامانیوں کے غلاموں میں الپتگین نامی ایک ترک غلام تھا جو سامانی فرمانروا کی محافظ سپاہ میں نوکر تھا، جلد ترقی کر کے اس سپاہ کا سردار بنا، پھر 350ھ/ 961ء میں خراسان کا گورنر ہوگیا، لیکن بعد میں اپنے نئے فرمانروا کی ناخوشی کے باعث ریاست کے مشرقی حصہ میں چلا گیا اور 351ھ/ 962ء میں افغانستان کا شہر غزنہ اس علاقہ کے ملکی حکمرانوں سے فتح کر کے خود مختار بن گیا، افغانستان و پنجاب کی غزنوی سلطنت کا آغاز اسی طرح ہوا۔ لیکن اصل بانیٔ سلطنت الپتگین کا غلام اور داماد سبکتگین تھا، سبکتگین نے 366ھ/ 976ء سے 387ھ/ 997ء تک حکومت کی، غزنوی سلسلہ کے سولہ حکمراں راست سبکتگین ہی کی نسل سے تھے، غزنوی خاندان نے اپنے دائرۂ حکومت کو ہندوستان میں پشاور تک توسیع کی اور ایران میں خراسان کو بھی اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا، جہاں وہ پہلے سامانیوں کی ملازمت میں حاکم مقرر ہوا تھا۔ غزنوی خاندان کا سب سے زیادہ اولوالعزم اور فتحمند حکمراں سبکتگین کا بیٹا محمود غزنوی تھا جس نے 389ھ/ 999ء سے 422ھ/ 1030ء تک حکومت کی۔ محمود کی وجہ سے پنجاب، لاہور، ملتان اور سندھ کا

بھی کچھ حصہ غزنی کی سلطنت میں شامل ہوگیا۔ اس نے علم وادب کی سرپرستی کی، اس کے زمانے میں فارسی ادب کو ترقی ملی، اس کے درباری علماء میں البیرونی، ابوالحسن خمار اور ابونصر جیسے لوگ تھے۔ فردوسی، عنصری، فرخی، رسدی، عسجدی، اور طوسی وغیرہ چارسو درباری شعراء میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے، محمود کے عہد میں سوبندر رائے، تلک اور ناتھ جیسے ہندوسپہ سالاروں کو عروج حاصل ہوا۔ غزنوی حکمرانوں میں دوتین ہی بادشاہ نامور گذرے ہیں، باقی دیگر حکمراں سیاسی اعتبار سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے، غزنویوں کو ہمیشہ خلیفۂ بغداد کی اطاعت کا اقرار رہا۔ محمود کی وفات کے بعد غزنوی سلطنت کے حصے بخرے شروع ہوگئے، شمال ومغرب میں خانانِ ترکستان اور سلجوقی شاہانِ ایران مسلط ہوگئے، خراسان پر خوارزم شاہیوں نے قبضہ کرلیا اور وسطی حصے میں غوری خاندان کے افراد لوٹ مار اور غارت گری کرنے لگے، شہاب الدین محمد غوری نے غزنویوں کے ہندوستانی دارالحکومت پنجاب (لاہور) کو بھی 582ھ/ 1186ء میں ان سے چھین لیا، اس طرح غزنوی سلطنت سوا دوسو سال کے اندر نیست ونابود ہوگئی۔

خوارزم شاہی حکومت، صوبہ خوارزم یا خیوہ میں قائم ہوئی، خوارزم شاہی سلطنت وسط ایشیا اور ایران کی ایک سنّی مسلم بادشاہت تھی جو پہلے سلجوقی سلطنت کے ماتحت تھی اور گیارہویں صدی عیسوی میں آزاد ہوگئی اور 617ھ/ 1220ء میں منگولوں کی جارحیت تک قائم رہی۔ ملک شاہ سلجوقی کا ایک ترک غلام انوشتگین قراجہ تھا جو ترقی کرتے کرتے شاہی ساغر بردار مقرر ہوگیا تھا، بعد ازاں ملک شاہ نے اسے خوارزم کا شحنہ بھی بنادیا اور وہ اپنے اس عہدہ پر 490ھ/ 1096ء تک رہا۔ اس کے بعد اس کا جانشیں قطب الدین محمد خوارزم شاہ، اَتسیز بن قطب الدین محمد، اِیل اَرسلان اور علاء الدین تکش خان ہوئے، ان سب نے بالخصوص قطب الدین محمد خوارزم شاہ نے اپنی اپنی حکومتوں کو ترقی دی، دریائے جیحون کے کنارے تک اپنی سلطنت کو وسعت دے کر خراسان اور اِصفہان کو بھی فتح کرلیا، تکش خاں کے بیٹے سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ کو سکندر ثانی کا خطاب دیا جاتا ہے، اس نے 607ھ/ 1210ء میں بخارا وسمرقند بھی فتح کرلیا۔ بعد ازاں اس نے افغانستان کے ایک بڑے حصے کو غزنین تک فتح کیا، غوری برادران کے ساتھ ان کا جھگڑا رہا، پھر غوری دائرۂ سلطنت کو اپنی حکمرانی کا حصہ بنالیا، اس سلطنت پر بارہ سال اس عروج کے گذرے کہ وہ سلجوقی سلطنت کی ہم پلہ سمجھی جاتی تھی، اس نے شیعہ مذہب اختیار کرکے خلافتِ عباسیہ کو بیخ وبن سے اکھاڑ کر نیست ونابود کردینے کا ارادہ کیا اور اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بغداد کی طرف نکلا، مگر وہ اپنے اس ارادہ میں کامیاب نہ ہونے پایا تھا کہ چنگیز خان نے تاتاریوں کے ساتھ اس کے ملک پر حملہ کرکے اپنی طرف متوجہ کرلیا، چنگیز خاں کے ساتھ علاء الدین محمد کے تجارتی تعلقات تھے، لیکن پھر دونوں میں تعلقات خراب ہوگئے، علاء الدین محمد نے چنگیز خاں کو جنگ کی دھمکی دی، اس لئے اس کی زیرِ قیادت منگولی قوم عذابِ الٰہی بن کر دنیائے اسلام پر ٹوٹ پڑی، اس کے خون ریز حملوں سے وسط ایشیا کا پورا علاقہ جو تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا بالکل ویران ہوگیا، مشرق سے لے کر مغرب تک خاک اُڑنے لگی۔ علاء الدین محمد خوارزم شاہ بحرِ کاسپین کے کسی جزیرہ میں 617ھ/ 1220ء میں انتقال کرگیا۔ اس کے چار بیٹے تھے، وہ بھی باپ کے بعد منگولوں کے آگے آگے بھاگتے پھرے۔ اس کا بیٹا جلال الدین منکبرنی بھاگ کر ہندوستان آیا اور دو برس کے قیام کے بعد پھر واپس چلاگیا اور وہاں جاکر اس نے آذربائیجان، گرجستان اور خلاط فتح کئے، آخر 628ھ/ 1231ء میں جلال الدین منکبرنی کے قتل کے ساتھ منگولوں نے اس خوارزم شاہی خاندان کا خاتمہ کردیا۔

14.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. محمود غزنوی پر ایک مضمون لکھیے۔
2. محمود غزنوی کے دور میں علم و ادب کی ترقی پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. خوارزمی حکومت کا خاتمہ کس طرح ہوا؟ قلمبند کریں۔

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

1. شہاب الدین عُرف معزالدین محمد غوری کے کارناموں پر روشنی ڈالئے۔
2. ناصرالدین سبکتگین کی فتوحات اور کارناموں پر روشنی ڈالئے۔
3. شاہِ خوارزم علاءالدین محمد کی مملکت کے زوال کے اسباب قلم بند کیجیے۔

14.8 فرہنگ

ملحق	:	جڑا ہوا، ملا ہوا، پیوستہ
رایوں/راوتوں	:	راؤ، راجا، شہزادہ، سردار، ایک سرکاری خطاب
قصائد	:	(قصیدہ کی جمع)، نظم، منظوم شعر
فروتر	:	بہت کم، بہت نیچے
مدافعت	:	دفاع
قرق	:	ضبط
متنفر	:	بیزار
عسکری	:	سپاہی، فوج کی عسکر سے نسبت
صحیفہ	:	آسمانی کتاب
مِن وعَن	:	ہو بہو
رقابت	:	مخالفت، چشمک
اِسہال	:	پتلا پاخانہ، دست، پیٹ جلنا

گوہرِ شب چراغ : ایک قسم کی موتی جورات کو چراغ کی طرح چمکتی ہے۔

کشور کشا : بادشاہ، ملک کا مالک

نفع وضرر : فائدہ اور نقصان

14.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. موسوعۃ الأدیان المیسرۃ — متعدد مصنفین، کویت۔
2. اردو انسائیکلوپیڈیا (جلد 1) — قومی کونسل برائے ترقی اردو، نئی دہلی، 1996ء
3. جامع تاریخ ہند (عہدِ سلطنت) — پروفیسر محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی 2001ء
4. ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک جھلک — سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین، اعظم گڈھ
5. آبِ کوثر — شیخ محمد اکرام، تاج کمپنی، دہلی، 1991ء
6. مختصر تاریخِ ہند — مولانا سید ابوظفر دسنوی ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڈھ
7. مسلمانوں کا عروج وزوال — مولانا سعید احمد ایم اے، ندوۃ المصنفین، دہلی، طبع سوم، 1382ھ/1963ء
8. تاریخِ اسلام (جلد سوم) — مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی۔
9. شعرالعجم — علاّمہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین، اعظم گڈھ۔
10. تاریخِ سندھ (حصۂ اول ودوم) — مولانا سید ابوظفر دسنوی ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڈھ، 1390ھ/1970ء

بلاک:4 خاندانی حکومتیں-2

فہرست

اکائی 15 : ادریسیہ، مرابطیہ، موحدیہ

اکائی کے اجزاء

15.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ کو افریقہ جس کو مغرب عربی کہا جاتا ہے' کے مسلمانوں کی تین خاندانی حکومتوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی۔ ان حکومتوں کا اسلامی تاریخ میں نمایاں مقام ہے۔

15.2 تمہید

اس اکائی میں آپ کو تین خاندانی حکومتوں کے بارے میں واقف کروایا جائے گا۔ 1. ادریسیہ حکومت، 2. مرابطہ حکومت اور 3. موحدیہ حکومت۔ سلطنت ادریسیہ کا بانی ادریس بن عبداللہ بن الحسن ہے، یہ اس عظیم فتنہ میں شامل تھا جس کو علویوں نے عباسی خلیفہ موسیٰ الھادی کے خلاف برپا کیا، یہ حکومت مراکش میں 172ھ تا 342ھ قائم رہی، اس حکومت کے زوال کا سبب یہ بنا کہ یہ حکومت ایک عورت کی رائے پر آپس میں تقسیم کردی گئی، اس طرح ایک مجموعی طاقت منتشر ہوگئی۔

مرابطیہ حکومت مراکش میں قائم ہوئی، مراکش (مراکو) آج براعظم افریقہ کا ایک ملک ہے۔ اس حکومت کو ترقی دینے والا ایک نیک دل بادشاہ یوسف بن تاشفین 453ھ تا 541ھ مطابق 1061ء تا 1147ء ہے، اس میں کل 3 حکام ہوئے، اگر چہ اس حکومت کا پہلا حاکم یوسف بن تاشفین کا چچازاد بھائی ابوبکر بن عمر ہے جو کہ عبداللہ بن یٰسین کی نگرانی میں رہتے ہوئے کام کرتا تھا، عبداللہ بن یٰسین اس وقت کے پیر و مرشد تھے۔ مرابطین کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ابوبکر بن عمر اور یوسف بن تاشفین نے ایک خانقاہ میں عبداللہ بن یٰسین سے بیعت کی تھی اور خانقاہ کو عربی میں، رباط کہتے ہیں اس لئے یہ لوگ مرابطین کہلائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ابوبکر بن عمر نے اپنی فوج کی سرفروشی کو دیکھتے ہوئے ان کو مرابطین کا لقب دیا یعنی سرحد پہ جم جانے والی فوج، جو ربط الجاش سے ماخوذ ہے جس کے معنی بہادری ومضبوطی کے ہیں۔

موحدین کی حکومت مرابطین کے بعد بنی اور مراکش میں یہ حکومت 143 سال تک قائم رہی (524ھ مطابق 1130ء تا 667ھ مطابق 1269ء) اس میں کل پانچ بادشاہ ہوئے۔ اس حکومت کی بنیاد محمد بن تومرت نے رکھی، یہ ایک صوفی زاہد آدمی تھے۔ انھوں نے وعظ ونصیحت کے ذریعہ لوگوں میں اسلامی روح پیدا کرنی شروع کردی جس کی وجہ سے ان کے مریدین کا دائرہ دھیرے دھیرے بڑھتا گیا۔ محمد بن تومرت عہد سلجوقی کے مشہور عالم امام غزالیؒ کے شاگرد ہیں۔

اس دور میں جو حکمراں بہت مشہور ہوئے وہ عبدالمؤمن اور یعقوب المنصور ہیں جن کے کارنامے قابل ذکر ہیں۔

15.3 ادریسیہ حکومت

15.3.1 قیام حکومت

دولت ادریسیہ تاریخ اسلام کی پہلی علوی ہاشمی حکومت ہے جو بغداد سے دور مغرب اقصیٰ میں قائم ہوئی۔ اس سے پہلے بھی علویوں نے کئی مرتبہ اپنی حکومت کے قیام کی کوششیں کیں لیکن وہ ناکام بنادی گئی تھیں۔ علوین موقع کے منتظر تھے۔

ایک مرتبہ مدینے کے عباسی گورنر اور علویوں کے بعض خاندان کے درمیان کسی مسئلہ پر تنازع ہوگیا جس میں گورنر علویوں کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آیا، جس کی وجہ سے علویوں نے مدینہ میں حسین بن علی بن حسن کی قیادت میں بغاوت کر دیا اور یہ مکہ تک پھیل گئی۔ چنانچہ مدینے اور مکے والوں نے حسین بن علی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ جب اس کا علم خلیفہ عباسی موسی الھادی کو ہوا تو اس نے اس فتنہ کو جلد فرو کرنے کی غرض سے ایک فوجی لشکر مکہ روانہ کیا۔ جو انقلابیوں سے فتح کے میدان میں، جو مکہ سے تین میل کی دوری پر ہے، 169ھ/786ء مقابل ہوئی۔ اس جنگ میں حسین بن علی کو شکست ہوئی اور وہ اور ان کے ساتھی مارے گئے۔

اس جنگ میں بچ جانے والوں میں سے ایک شخص ادریس بن عبداللہ بن حسن تھا جو وہاں سے اپنے خادم راشد کے ساتھ مصر کی جانب فرار ہو گئے۔ اور چھپتے چھپاتے بھیس بدلتے ہوئے بڑی مشکل سے مصر پہنچے۔ مصر کی ڈاک کے عامل کو جب ادریس بن عبد اللہ کے علوی ہونے کا علم ہوا تو اس نے ان کی خوب خاطر مدارات کی اور انھیں ان کی خواہش کے مطابق چھپا کر بلاد مغرب بھیجنے کا انتظام کر دیا۔ چنانچہ وہ برقہ سے ہوتے ہوئے تلمسان پہنچے اور وہاں کچھ عرصہ آرام کرنے کے بعد طنجہ پہنچے۔ اور بالآخر دو سال کے مسلسل سفر کے بعد مراکش کے شہر ولیلیٰ پہنچ کر قیام کیا۔

ولیلیٰ پہنچ کر ادریس بن عبداللہ نے بربری قبیلے کے سردار اسحاق بن محمد بن عبدالحمید سے اپنا حال اور اپنا نام ونسب بیان کیا۔ اس نے ادریس کا پرجوش استقبال کیا اور ان کی خوب خاطر تواضع کی۔ چنانچہ وہ اور دیگر قبیلوں زواغہ، لواتہ، نوطہ، سدرطہ، مکناسہ اور غمارہ ادریس کے معتقد ہو گئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور عباسی حکومت کا قلادہ اپنی گردن سے نکال پھینکا۔ اس طرح ادریس بن عبداللہ کے قدم یہاں اچھی طرح جم گئے اور ان کی حکومت بھی مستحکم ہونے لگی۔ مراکش میں ابھی بعض قبائل یہودی، عیسائی اور مجوسی تھے۔ ان قبائل میں ادریس بن عبداللہ نے اسلام کی دعوت پیش کی جس کی وجہ سے بہت سے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ شاور اور تاول کے قبائل مقابلہ پر اتر آئے چنانچہ ان پر چڑھائی کی گئی اور انھیں بھی مغلوب کر لیا گیا بالآخر وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ اس طرح مغرب میں ادریس بن عبداللہ کی حکومت پوری طرح قائم ہو گئی، اس کے بعد اس نے ملک کے مشرق میں اپنی حکومت کو وسعت دی اور 173ھ میں تلمسان پر چڑھائی کی اور اس کو فتح کر لیا اور آگے بڑھ کر سبتہ کو فتح کر لیا اور یہاں کے باشندوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ تلمسان میں ادریس نے ایک شاندار مسجد بنائی جس کے منبر پر نقش ونگار ہے اس کے قیام کی تاریخ 174ھ درج کی۔

ادریس کی بڑھتی ہوئی طاقت اور مغرب میں اس کی حکومت کے قائم ہونے کا حال خلیفہ ہارون رشید کو معلوم ہوا تو وہ بہت فکر مند ہوا۔ چنانچہ وہ اس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ادریس بن عبداللہ کو اپنے ایک آدمی شماخ کے ذریعہ زہر دلوایا جس سے ادریس کی موت 177ھ میں واقع ہوگئی۔ ادریس کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اپنے وطن سے دور ایک مستقل حکومت مغرب میں قائم کی اور وہاں کے منتشر اور جنگجو قوم بربر کو متحد کیا اور ان کو دائرے اسلام میں داخل کیا جو اس سے پہلے کبھی ممکن نہ ہو سکا تھا۔

ادریسی حکام:

ادریسی حکومت میں درج ذیل حکمراں ہوئے ہیں:

1. ادریس بن عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی ابن ابی طالب (172ھ تا 177ھ)
2. ادریس الثانی (177ھ تا 213ھ)
3. محمد بن ادریس الثانی (213ھ تا 221ھ)
4. علی بن محمد بن ادریس (221ھ تا 234ھ)
5. یحیٰ الأول بن محمد بن ادریس (234ھ تا 250ھ)
6. یحیٰ الثانی بن علی بن محمد بن ادریس الثانی (250ھ تا 250ھ)
7. علی الثانی بن شہر بن ادریس الثانی (250ھ تا 265ھ)
8. یحیٰ الثالث بن قاسم ادریس الثانی (265ھ تا 292ھ)
9. یحیٰ الرابع بن ادریس بن عمر بن ادریس الثانی (292ھ تا 310ھ)
10. حسن بن محمد بن القاسم بن ادریس الثانی (310ھ تا 312ھ)

ادریس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ادریس ثانی کے ہاتھ حکومت کا نظام آیا، یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ادریس اول نے اپنی وفات سے پہلے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی البتہ اس کی ایک لونڈی کنزہ اس سے حاملہ تھی، اس کے خادم راشد نے بربروں کو اس پر راضی کرلیا کہ اس سے جو بچہ ہو اس کو امام تسلیم کرلیا جائے۔ ادریس اول کی وفات کے وقت ادریس ثانی اپنی ماں کے پیٹ میں تھا اور پھر اس نے اسی کے نام پر لوگوں سے بیعت لی، اور اس نے ادریس ثانی کی طرف سے امور سلطنت انجام دیتا رہا۔ جب راشد کا قتل ہوگیا تو ادریس کی کفالت بربری قائد ابو خالد یزید العبدی نے کیا۔ ادریس ثانی نے بہت جلد امور سلطنت سے واقف وآگاہ ہوکر قلمدان وزارت مصعب ابن عیسیٰ ازدی کے سپرد کیا اور رفتہ رفتہ اپنی حدود سلطنت کو وسیع کرکے قریبا تمام ملک مراکش پر قبضہ کرلیا، نہایت خوبی کے ساتھ حکومت کرنے لگا بہت سے عرب اندلس وافریقہ ومصر وشام سے آآکر ادریس ثانی کے پاس جمع ہونے لگے، ان لوگوں کی وجہ سے حکومت وسلطنت میں رونق اور شان وشوکت کے آثار نمایاں ہوگئے، اس نے فاس شہر قائم کیا اور اس کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ یہاں ایک جامع مسجد بنائی۔ 213ھ میں ادریس ثانی نے وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد بن ادریس الثانی اپنے باپ کی جگہ تخت نشین ہوا، یہ وہ زمانہ تھا کہ ادریس اول کا حقیقی بھائی سلیمان عبداللہ بن حسن مثنی بن حسن بن علی ابن ابی طالب مصر وافریقہ میں ہوتا ہوا تلمسان پہونچ گیا تھا۔ محمد بن ادریس الثانی نے اپنی دادی کنزہ کے مشورہ پر ادریسی حکومت کے علاقوں کو اپنے بھائیوں میں تقسیم کردی۔ یہ ایک عجیب وغریب قسم کا فیصلہ تھا جس سے ادریسی حکومت زوال وانتشار کا شکار ہوگئی، اور

رفتہ رفتہ 303ھ میں اس سلطنت کا مکمل خاتمہ ہوگیا۔ محمد بن ادریس الثانی کا انتقال 221ھ میں ہوا۔ اس کا جانشین اس کا نوعمر بیٹا علی بن محمد ہوا، اس نے تیرہ سال حکومت کی۔ اس کے دور حکومت کا کوئی قابل ذکر کارنامہ نہیں ہے۔ علی بن محمد کی وفات کے بعد اس کا بھائی یحیٰ الأول 234ھ میں تخت حکومت پر فائز ہوا۔ اس کے زمانے میں فاس اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ اس میں زبردست عمارتیں قائم ہوئیں، اس زمانے میں جامع القرویین تعمیر کی گئی۔ اس نے 250ھ تک حکومت کی۔ اس کی حکومت ادریسی انتشار واضطراب کا شکار ہوگئی۔ ادریس کی اولاد کے درمیان لڑائی اور خصوصاً خوارج سے جنگ وجدال کے سبب ملک کی معاشی وسماجی حالت ابتر ہوگئی، یحیٰ الثالث کے 292ھ میں قتل کے بعد یحیٰ الرابع نے زمام حکومت سنبھالی۔ اس کی حکومت سارے مراکش پر پھر سے قائم ہوگئی۔ یہ بڑا علم وفضل کا مالک، بہادر، محدث اور بڑا فقیہ اور عادل بادشاہ تھا۔ اس کا انتقال 310ھ میں ہوا۔ اس کے بعد ادریسی حکومت کو سنبھالنے والی کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

آخری زمانہ میں ادریسیوں کے پاس دو چھوٹی چھوٹی ریاستیں رہ گئی تھیں جن میں ریف کا ایک حصہ اور طنجہ سے سبتہ تک غمارہ کا علاقہ شامل تھا، یہ الگ بات ہے کہ موسیٰ ابن ابی العافیہ کی عداوت نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا، ادریسیوں کی سلطنت امویوں اور فاطمیوں کے درمیان تقسیم ہوگئی تھی، آگے چل کر اس خاندان کی ایک شاخ نے مالقہ میں ایک ریاست قائم کر لی تھی جہاں اس نے 20 سال سے کچھ زیادہ حکومت کی۔

15.3.2 نظم ونسق

ادریس ثانی کے گیارہ بیٹے تھے جن میں محمد سب سے بڑا تھا جو اس کا جانشین ہوا، لیکن اوپر ذکر کیا گیا کہ اپنی دادی کنزہ کے کہنے پر اس نے ریاست کو مختلف جاگیروں میں تقسیم کردیا، یقیناً ان میں کچھ جواں سال تھے، جس کی وجہ سے انتظام وانصرام اور حکومتی امور انتشار کا شکار ہوئے، اگرچہ اس نے اپنی سیادت ان سب پر قائم رکھی لیکن ان رقابتوں اور فتنوں کو نہ دبا سکا جو سر ابھار رہے تھے جس کے نتیجہ میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔

15.3.3 سماجی خدمات

خاندان ادریسیہ نے اپنی حکومت کے دوران کچھ نئی بستیوں کو آباد کیا، ادریس ثانی نے 192ھ میں فاس میں اپنا نیا پایۂ تخت تعمیر کیا، متعدد مساجد اس دور کی یادگار ہیں، قیروان کی مشہور ومعروف مسجد اسی دور کی یادگار ہے، جس کو فاطمہ بنت محمد نے بنوایا تھا جو عرصہ دراز تک علم وادب کا مینارہ نور تھی۔

15.3.4 علمی خدمات

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مغرب میں یہ پہلی اسلامی حکومت تھی جو اسلامی اور عربی بنیادوں پر قائم کی گئی، چنانچہ اس نے دین اسلام کو فروغ دینے میں بڑی قوت صرف کی۔ اس حکومت نے اسلام کی دعوت کو عام کیا، حفظ قرآن، تفسیر وحدیث اور فقہی مسائل پر اس دور حکومت میں خاص توجہ ہوئی، مساجد میں فقہاء ومحدثین کے حلقہ لگنے لگے، عربی سلطنت ہونے کے باعث یہاں اچھی خاصی تعداد

عرب علماء کی جمع ہوگئی، بربر قوم کو مہذب بنانے میں اس حکومت کا بڑا رول ہے، جامع القرویین جو شہر فاس میں ہے وہ عہد ادریسیہ میں 245ھ میں تعمیر کی گئی وہ مسجد کے ساتھ ساتھ عہد اسلامی کی قدیم ترین جامعہ بھی شمار کی جاتی ہے، اس حکومت کی شہرت تہذیبی وتمدنی ورثہ کو پھیلانے میں ہوئی، اس کی حسن تدبیر سے فاس تجارتی وعلمی مرکز بن گیا۔

معلومات کی جانچ

1. سلطنت ادریسیہ کا بانی کون ہے؟ اس کا پورا نام کیا ہے؟
2. سلطنت ادریسیہ کی مدت حکومت کتنی ہے؟
3. ادریس اول کی وفات کے بعد اس کا جانشین کون بنا؟

15.4 مرابطیہ

15.4.1 قیام حکومت

عہد اموی میں یمن کے بعض قبائل بربروں کے علاقہ جیسے تیونس، الجیریا، مراکش وغیرہ میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ ان لوگوں نے بتدریج اپنے وعظ ونصیحت اور اپنی عملی اسلامی زندگی کے نمونہ سے بربروں کو اسلام میں داخل کیا، بربروں نے عبداللہ بن یٰسین کو اپنا سردار بنانا چاہا مگر عبداللہ نے انکار کیا اور ابوبکر بن عمر کی جانب اشارہ کیا، نومسلم بربروں نے ابوبکر بن عمر کو اپنا سردار بنا کر امیر المسلمین کے نام سے پکارنا شروع کیا، مراکش میں ان دنوں کوئی مستقل حکومت قائم نہ تھی، بلکہ لوگ الگ الگ قبائلی حکومتوں میں بٹے ہوئے تھے، اور کوئی کسی کا محکوم نہ تھا۔ اس طوائف الملوکی کے زمانے میں ابوبکر بن عمر کی طاقت روز بروز بڑھتی گئی۔ ابوبکر بن عمر نے خدمت اسلام کا جوش پیدا کر کے ان کو خوب بہادر اور اولوالعزم بنا دیا اور مراکش سے مشرق کی جانب پیش قدمی کی اور بحملاسہ کو فتح کرلیا اور اپنے چچازاد بھائی یوسف بن تاشفین کو بحملاسہ کا حاکم مقرر کیا، 453ھ میں جب ابوبکر بن عمر کا انتقال ہوا تو یوسف بن تاشفین اس ملک کا بادشاہ ہوا، 460ھ میں یوسف نے شہر مراکش آباد کیا اور اس کو اپنا دارالسلطنت بنایا ان دنوں عیسائیوں نے اندلس کے مسلمان رئیسوں کو اپنے حملوں سے بہت تنگ کر رکھا تھا، انھوں نے یوسف سے مدد کی درخواست کی یوسف مدد کے لئے تیار ہوگیا، اور ایک طاقت ور فوج کے ساتھ اندلس روانہ ہوگیا۔ عیسائی بادشاہ ''الفانسو'' نے مقام زلاّقہ کے میدان میں مسلمانوں سے مقابلہ کیا، ایک سخت لڑائی کے بعد عیسائیوں کو شکست فاش ہوئی۔ اس جنگ نے ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ عیسائیوں کی طاقت جواب دے گئی اور یوسف بن تاشفین نے اندلس کی چھوٹی چھوٹی مسلمان حکومتوں کو ختم کر کے ان کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اس طرح اس کی حکومت اندلس میں بھی قائم ہوگئی۔ یوسف نے پچاس سال حکومت کی۔ یوسف کے انتقال کے بعد یہ حکومت چالیس سال اور قائم رہی۔ اس کے بعد جن لوگوں نے حکومت کی وہ موحدین کہلائے۔ یوسف کا انتقال 1106ء میں ہوا۔ اس کے بعد مرابطین کے تین حکمراں ہوئے۔ علی بن یوسف، تاشفین بن علی، اسحاق بن علی۔ ان کے عہد میں قرطبہ کے بجائے اشبیلیہ دارالحکومت رہا۔

15.4.2 نظم ونسق

یوسف بن تاشفین بڑا نیک دل اور عادل حکمراں تھا۔ اس کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ تاریخ اسلامی میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ جنگ زلاقہ نے مسلمانان اندلس کے لئے حالات کی اصلاح کا موقع پیدا کر دیا تھا لیکن انھوں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا، خطرہ سر سے ٹلا تو وہ پھر آپس میں لڑنے لگے۔ آخر یوسف تاشفین نے یہی بہتر سمجھا کہ خود اندلس پہنچے۔ چنانچہ وہ وہاں گیا اور وہاں مرابطین کی حکومت قائم کر کے امن و امان کی فضا ہموار کی اور اس وقت کے بادشاہ معتمد کو گرفتار کر کے مراکش بھیج دیا۔ وہاں اس نے قید کی حالت میں 1095ء میں وفات پائی۔ یوسف کے عہد حکومت میں جنگی ماحول زیادہ رہا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ عیسائی اپنی در اندازیوں سے مسلمان رؤساء کو مسلسل پریشان کیا کرتے تھے۔ یوسف اپنے عہد میں ان کے لئے سد سکندری بنا رہا اور عیسائیوں کے قدم جمنے نہیں دئے۔

15.4.3 سماجی ومعاشی خدمات

صحرائے اعظم میں اسلام کی اشاعت اور اندلس میں مسیحی یلغار کو روکنا اس حکومت میں خاص طور پر یوسف بن تاشفین کا بڑا کارنامہ ہے، شہر مراکش کی تعمیر بھی قابل فخر کارناموں میں شمار ہوتی ہے، اس طرح سے انھوں نے ایک نیم وحشی علاقہ میں مستحکم اور وسیع حکومت قائم کر کے تہذیب وتمدن کی بنیاد ڈالی۔ مرابطین کی حکومت صرف مراکش تک محدود نہیں رہی بلکہ اس میں بہت جلد اندلس، تیونس، الجیریا، طرابلس (لیبیا) بھی شامل ہو گئے تھے۔

بحری قوت کی جانب اس حکومت نے زیادہ توجہ کی، 551ھ تک مرابطین کی حکومت قائم رہی۔ اپنے بہادرانہ کارناموں سے ایک سو سال تک انھوں نے عیسائی طاقتوں کا ناطقہ بند رکھا۔ جنگ زلاقہ کے بعد یوسف نے ایک سکہ رائج کیا، اس پر لا الٰہ الا اللہ نقش کیا اور اس کے نیچے امیر المؤمنین یوسف بن تاشفین لکھا اور اس پر دائرہ اس آیت کا بنایا'' ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ''۔ ترجمہ،''جو اسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے راستہ کی تلاش میں رہے گا تو وہ طریقہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا'' اور دوسری جانب لکھا الأمیر عبداللہ امیر المومنین العباسی، اور دائرہ میں تاریخ ومقام اجرائے سکہ۔

معلومات کی جانچ

1. حکومت مرابطیہ کہاں قائم ہوئی؟
2. اس حکومت کے سب سے مشہور حاکم کا نام بتائیں؟
3. دولت مرابطیہ میں رائج سکہ کی ہیئت بیان کریں؟

15.5 موحدیہ

15.5.1 قیام حکومت

موحدین اصل میں ایک اصلاحی جماعت تھی جسے محمد بن تومرت نے مراکش میں قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد ملک کی اصلاح کرنا اور مسلمانوں کے اندر جو مفاسد اور برائیاں پیدا ہوگئی تھیں اسے دور کرنا تھا۔ آہستہ آہستہ انھوں نے فوجی تربیت بھی حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی مقبولیت اور قوت کو دیکھ کر مرابطین نے ان کے خلاف کاروائیاں شروع کی جن کی وجہ سے دونوں میں مقابلہ ہوا اور کئی معرکے ہوئے۔ بالآخر موحدین نے مرابطین کو مراکش میں شکست فاش دی اور اپنی حکومت قائم کر لی۔

محمد بن تومرت جو اس حکومت کا بانی ہے عوام میں ہر دلعزیز تھا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اس کو مہدی کہتے تھے، سوس کے مرابطی والی شکست دینے کے بعد مہدی نے تنمال کے دشوار گزار علاقہ میں رہائش اختیار کی، وہاں اس نے ایک حویلی اور ایک مسجد تعمیر کی۔ اس طرح اس نے موحدیہ کے پہلے دارالسلطنت کی بنیاد تنمال میں رکھی، مہدی اور موحدین کا مدفن بھی یہی مقام بنا۔ تنمال کی مسجد اور کھنڈرات کا انکشاف Edmond Doutte نے 1901ء میں مراکش کی سیاحت کے دوران کیا تھا۔ جب محمد بن تومرت کا 1130ء میں انتقال ہوا تو اس نے عبدالمومن کو اپنا جانشین بنایا۔ یہ کمہار کا بیٹا تھا، لیکن خدا نے اسے سپہ سالاری اور ملک گیری کے خاص جوہر عطا کیے تھے۔ عبدالمومن نے ابن تومرت کی جانشینی لیتے ہی موحدین کی جماعت کو لے کر ایک حکومت کی بنیاد رکھی۔ 1146ء میں مرابطوں کو شکست دے کر ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور مرابطوں کا آخری حکمراں اسحاق بن علی مارا گیا، اس کے ساتھ ہی عبدالمؤمن مراکش اور اندلس دونوں کا مالک بن گیا، پھر اس نے الجزائر، تیونس اور طرابلس کو فتح کیا۔ یہ 1163ء میں فوت ہوگیا۔ عبدالمؤمن کے بعد اس کی اولاد میں سے گیارہ بارہ برس یکے بعد دیگرے حکمراں بنے۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر عبدالمؤمن کا پوتا ابو یوسف یعقوب المنصور ہے جو 1184ء میں تخت نشین ہوا اور 1190ء میں اس نے وفات پائی۔ اس نے سلطان صلاح الدین ایوبی کی درخواست پر ایک سو اسی جہاز صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کی مدد کے لئے بھیجے تھے۔ موحدین بڑے پرجوش مجاہد تھے۔ ان کی لڑائیاں عیسائیوں سے برابر جاری رہیں۔ 1214ء میں انھوں نے سخت شکست کھائی اور اندلس سے نکل جانے پر مجبور ہوگئے۔ پھر اندلس عیسائی امراء اور عرب امراء میں بٹ گیا۔ اندلس میں مسلمانوں کی یہ آخری حکومت تھی۔

موحدین کی حکومت کے قیام اور اس کے استحکام میں سب سے بڑا ہاتھ عبدالمؤمن کا ہے۔ یہ سلطان نورالدین زنگی کا ہمعصر تھا اس کا مسلمانوں پر اتنا ہی احسان ہے جتنا نورالدین اور اس کے جانشین صلاح الدین کا ہے۔ عبدالمؤمن نے جتنی وسیع حکومت قائم کی اتنی بڑی حکومت شمالی افریقہ کے کسی خطہ میں مسلمانوں نے نہ اس سے پہلے قائم کی تھی اور نہ اس کے بعد قائم کر سکے۔

15.5.2 نظم ونسق

عبدالمؤمن تاریخ اسلام کا بہت بڑا حکمراں ہے، وہ بظاہر ایک معمولی انسان تھا، لیکن اپنی غیر معمولی قابلیت سے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ وہ شریعت کا بڑا پابند تھا اور اس نے اس بات کی کوشش کی کہ قرآن وسنت کے اصولوں کے

مطابق حکومت کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حکومت کے اکثر بادشاہ انصاف پسند تھے، یہاں تک کہ راہ چلتے فریادی بھی انھیں اپنی بات راستہ روک کر کہہ لیتے، تاہم اس حکومت کا ماحول بھی جنگ کا رہا۔ موحدین کے دو مشہور معرکہ ہوئے ایک ''ارک'' کی جنگ، دوسری ''العقاب'' کی جنگ، جنگ ارک یعقوب المنصور نے شمالی اندلس کے عیسائی حکمراں انفانسو سے ''ارک'' کے میدان میں لڑی، جس میں انفانسو کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اور جنگ عقاب منصور کے بیٹے الناصر نے 1214ء عیسائیوں سے لڑی، اس میں ناصر کو ایسی شکست ہوئی کہ پھر موحدین کا زور ٹوٹ گیا، اور یہیں سے موحدین کا زوال شروع ہوگیا۔ عبدالمومن کے عہد حکومت میں موحدین کو بڑی شان و شوکت حاصل ہوئی، اس نے مہدی کے عزائم کی تکمیل کے لئے مرابطین کی سلطنت کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، اور بزور شمشیر المغرب اور اندلس میں اس کے افکار کو نافذ کر دیا۔

مشہور مؤرخ ابن خلدون موحدین کی طرز حکومت کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

> ''ان کی حکومت کا یہ انداز تھا کہ علماء کی عزت کی جاتی تھی اور تمام معاملات میں ان کے مشورہ سے کام لیا جاتا تھا۔ دادخواہوں کی فریاد سنی جاتی تھی۔ رعایا پر حاکم ظلم کرتے تھے تو ان کو سزا دی جاتی تھی، ظالموں کا ہاتھ روک دیا گیا تھا۔ سیاسی ایوانوں میں مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں۔ تمام سرحدی علاقوں کو مضبوط کر دیا گیا تھا، اور غزوات و فتوحات کی روز افزوں ترقی تھی''۔

15.5.3 سماجی و معاشی خدمات

امرائے موحدین نے سماجی و معاشی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لاوارث یتیم بچوں کی صحت کا خیال رکھنا، ان کا باقاعدہ علاج و معالجہ کرانا ان میں پیسے، فقراء و مساکین میں روٹی، کپڑے اور پھل تقسیم کرنا، اسی طرح ضعیف عورتوں اور خانقاہ نشین لوگوں کو وظائف دینا ان کا معمول تھا۔

امیر یعقوب نے اپنی سلطنت میں مدرسہ اور شفاخانہ بھی قائم کیا، ان میں مراکش کا شفاخانہ بڑا شاندار تھا۔ اس شفاخانہ کے مریضوں کو جو کھانا دیا جاتا تھا اس کا خرچ تیس دینار یومیہ تھا۔ دواؤں پر جو خرچ ہوتا تھا وہ اس کے علاوہ تھا۔ یعقوب کو عمارتیں بنانے کا بھی بڑا شوق تھا اس کے عہد میں ایسی ساندار عمارتیں بنائی گئیں جن کی نظیر شمالی افریقہ کی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملتی، ان میں سب سے شاندار عمارت مراکش کی جامع کتبہ ہے، اس مسجد کا مینار ساڑھے تین سو (350) فٹ اونچا ہے، اس مسجد کے چند سال بعد دہلی کا قطب مینار تعمیر کیا گیا، لیکن کتبہ کا یہ مینار قطب مینار سے سو فٹ اونچا ہے، یہ مسجد اور اس کا مینار آج بھی موجود ہے۔ اس حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اب تک یورپ والے اسلامی حکومتوں پر حملہ آور ہو رہے تھے، لیکن عبدالمؤمن نے خود یورپ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ چار سو جنگی جہاز تیار کیے گئے، تین لاکھ دس ہزار سوار اور ایک لاکھ پیادہ فوج۔ لیکن عبدالمؤمن کو موت نے مہلت نہ دی اور وہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔ بعض مورخین کے مطابق اگر عبدالمؤمن کو ملک الموت نے کچھ اور مہلت دی ہوتی تو شاید آج یورپ کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہوتا۔

15.5.4 علمی خدمات

عبدالمؤمن کے بعد موحدین کی جماعت کا امیر اس کے لڑکے یوسف کو منتخب کیا گیا۔ یہ علم وادب کا بڑا شوقین تھا۔ اس نے مراکش میں جو کتب خانہ قائم کیا اس میں چار لاکھ کتابیں تھیں، اس زمانہ کے دو سب سے بڑے فلسفی ابن طفیل اور ابن رشد کا اس کے دربار سے تعلق تھا۔ اس حکومت میں علماء فقہاء اور محدثین کے وظیفے مقرر تھے، اندلس میں بنی امیہ کے زوال کے بعد سے موحدین کے زوال تک دو سو سال کی مدت ہوتی ہے یہ زمانہ اسلامی تاریخ میں بڑا اہم ہے۔ اس کی اہمیت ایک تو اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کے عروج کا یہ آخری دور تھا اس کے بعد زوال شروع ہوا دوسرے اسی زمانہ میں اندلس میں بڑی زبردست علمی ترقی ہوئی اور ایسے مصنف اور علماء پیدا ہوئے جو بغداد اور نیشاپور کے علماء سے کسی طرح کم نہ تھے۔

15.6 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے تین خاندانی حکومتوں کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں، جن میں سے پہلی حکومت ادریسیہ ہے جو مراکش میں قائم ہوئی، محمد بن ادریس اس کا بانی تھا، 172ھ تا 342ھ کے دوران یہ حکومت قائم رہی، یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ اسلامی اور عربی بنیادوں پر افریقہ میں یہ پہلی حکومت قائم ہوئی تھی، مشہور شہر فاس ان کا پایہ تخت رہا، شروع میں تو ان کو کافی عروج حاصل ہوا، لیکن کنزہ کی رائے کے مطابق جب حکومت کو مختلف بھائیوں میں تقسیم کر دیا گیا تو رفتہ رفتہ یہ تقسیم زوال کا سبب بن گئی، اس حکومت میں اسلامی تعلیمات کی اشاعت کا کام ہوا، حفظ قرآن اور تفسیر وحدیث کے علوم پر اس عہد میں خاص توجہ دی گئی۔

دوسری حکومت جو افریقہ کے ملک مراکش میں قائم کی گئی وہ مرابطیہ کی ہے، 551ھ تک یہ حکومت قائم رہی، اس کا پہلا حاکم ابوبکر بن عمر ہے، لیکن مرابطیہ کی حکومت میں سب سے زیادہ با اثر اور مشہور یوسف بن تاشفین ہے۔ وہ 453ھ میں ابوبکر بن عمر کا جانشین ہوا، 460ھ میں اس نے شہر مراکش قائم کیا، یوسف بن تاشفین نے اندلس کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو فتح کر کے انھیں بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ یوسف بن تاشفین کی تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت ہے، وہ بہت بہادر، نیک دل اور عادل حکمراں تھا، اندلس میں اس کے ذریعہ عیسائیوں کی شکست نے ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ یوسف نے ایک نیا سکہ بھی رائج کیا تھا، اس نے 50 سال حکومت کی اور اس کے بعد 40 سال تک مرابطیہ کی حکومت مزید قائم رہی۔

اس اکائی میں جس تیسری خاندانی حکومت کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ موحدیہ کی ہے، یہ حکومت مرابطیہ کے بعد مراکش میں ہی قائم ہوئی۔ موحدیہ وہ جماعت ہے جو اپنے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو کافر سمجھتی تھی، اس کا بانی محمد بن تومرت ہے، 143 سال یہ حکومت قائم رہی۔ مرابطیہ کی حکومت ختم کر کے یہ حکومت قائم کی گئی تھی۔ مرابطیہ کے آخری حکمران اسحق بن علی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس حکومت میں اہل علم کی بڑی قدر کی جاتی تھی، عدل وانصاف اور رعایا پروری کی بھی عمدہ مثالیں ملتی ہیں، تعمیری ذوق بھی اچھا تھا۔ اس نے کئی تعمیری یادگاریں چھوڑی ہیں۔ صلیبی جنگوں میں بھی موحدیہ نے دیگر مسلم حکمرانوں کو فوجی تعاون فراہم کیا ہے۔ 1214ء میں انھوں نے عیسائیوں سے شکست کھائی اور اس طرح اندلس مسلمان اور عیسائی امراء میں تقسیم ہو کر رہ گیا، 1269ء میں موحدین کے عہد کا خاتمہ ہوا، افریقہ میں اس کے جیسی بڑی حکومت جو عبدالمؤمن کے ذریعہ قائم کی گئی نہ اس سے پہلے ہوئی تھی اور نہ اس کے بعد۔

15.7 نمونے کے امتحانی سوالات

1. ادریسیہ حکومت کے حکمرانوں کا نظم ونسق کیسا تھا؟
2. مرابطیہ حکومت کے بارے میں ایک مضمون لکھئے۔
3. یوسف بن تاشفین کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
4. محمد بن تومرت کے بارے میں اپنی معلومات درج کریں۔
5. موحدیہ حکومت میں سب سے مشہور کون ہوا؟ اس کے بارے میں اپنی معلومات لکھیں۔
6. موحدیہ کے زمانے میں علمی حالات پر اپنی معلومات درج کیجئے؟

15.8 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. کتاب العبر — ابن خلدون
2. تاریخ الادب العربی، عصر الدول والامارات — ڈاکٹر شوقی ضیف
3. اردو دائرہ معارف ج1، ج2
4. تاریخ اسلام — جسٹس امیر علی، ترجمہ حسین رضوی
5. تاریخ اسلام ج3 — اکبر شاہ خاں نجیب آبادی
6. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ ا — ثروت صولت
7. دولة المرابطين — محمد علی الصلابی
8. دولة الموحدين — محمد الصلابی
9. الدولة العباسية ج5 — محمد شاکر
10. تاريخ الاسلام السياسى و الثقافى ج3 — حسن ابراہیم حسن
11. البيان المغرب في اخبار الأندلس و المغرب — ابن عذاری

اکائی 16 : ممالیک مصر (بحری و برجی)

اکائی کے اجزاء

16.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ اس بات سے واقف ہو جائیں گے کہ مملوک کون لوگ تھے۔ انھوں نے کس طرح حکومت قائم کی اور انھوں نے اپنے دور حکومت میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اسلامی تاریخ میں ان کی حکومت کی کیا اہمیت ہے۔

16.2 تمہید

اسلامی تاریخ میں مملوکوں کا عروج ایک عجیب وغریب واقعہ ہے۔ عربی میں لفظ مملوک کا معنی غلام ہے۔ یہ سلاطین کے ذاتی عملے یا امراء کے غلام تھے۔ اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے وسط ایشیا کے ترکی النسل سفید فام غلاموں کے لئے کیا گیا تھا۔ بعد میں مغربی ایشیا کے دوسرے علاقوں کے غلاموں کو بھی اس زمرے میں شامل کرلیا گیا۔ مملوکوں نے اپنی قابلیت سے اپنے آپ کو ممتاز کیا

اور آہستہ آہستہ کاروبار سلطنت پر حاوی ہو گئے اور حکومت کی کمزوری کی وجہ سے تخت سلطنت پر قابض ہو گئے۔ اس اکائی میں انھیں مملوک سلاطین کی حکومت، ان کے دور کے سماجی و معاشی حالات، مختلف علوم وفنون کی ترقی اور فن تعمیر و آرٹ کی صورتحال کے بارے میں بتایا جائے گا۔

16.3 مملوکوں کا عروج

ایوبی سلاطین نے مخصوص فوجی دستے قائم کرنے کے لئے مختلف علاقوں سے ممالیک کو حاصل کر کے ان کی باقاعدہ فوج تیار کیا تھا۔ ان کی خصوصی فوجی تربیت کی جاتی تھی۔ ساتھ ہی علوم وفنون کے مبادیات سے انھیں واقف کروایا جاتا تھا۔ ایوبی دور حکومت (1250ء-1171ء) میں مملوک افسروں اور سپاہیوں کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی جو بے حد جانباز اور فنون جنگ بالخصوص شہسواری اور تیراندازی میں بہت ماہر ہوتے تھے۔ ایوبی حکمرانوں کے زیر قیادت مملوک سپاہی صلیبی جنگوں میں اپنی بہادری کا سکہ جما چکے تھے۔ انھوں نے اپنی قابلیت سے اپنے آپ کو ممتاز کیا اور آہستہ آہستہ کاروبار سلطنت پر حاوی ہو گئے اور حکومت کی کمزوری کی وجہ سے، خود کو منظم کر کے تخت سلطنت پر قابض ہو گئے۔ اس طرح گذشتہ کل کے غلام، آج کے سپہ سالار اور آنے والے کل کے حکمراں بن گئے۔

پہلا مملوک سلطان جو تخت نشین ہوا عزالدین ایبک تھا جو شجرۃ الدر کا خاوند تھا۔ شجرۃ الدر دراصل ایوبی سلطان ملک صالح نجم کی باندی تھی جسے بعد میں نجم الدین نے نکاح کر لیا تھا۔ اس کی وفات کے بعد شجرۃ الدر نے عزالدین ایبک سے نکاح کر لیا تھا۔ شجرۃ الدر نے کچھ دنوں تک حکومت بھی کی تھی۔ ایبک نے سلطان بننے کے بعد سب سے پہلے شام کی ایوبی حکومت کو کچل دیا جو خود مصری ایوبیوں کا جائز وارث تصور کرتے تھے۔ بغداد کے عباسیوں کی طرح شام کے ناتواں ایوبی بھی منگولوں کے ہاتھوں بری طرح تباہ ہو چکے تھے۔ لیکن انھیں مملوکوں کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ ان کے ہاتھوں منگولوں کو عین جالوت کی فیصلہ کن جنگ میں ذلت آمیز شکست ہوئی۔ جس کے بعد منگولوں نے پھر کبھی شام کا رخ نہیں کیا۔ مملوکوں نے تقریباً پونے تین صدی (1517ء-1250ء) تک مصر و شام پر حکومت کی۔ ان کے زیر قیادت سلطنت کی چاروں طرف توسیع ہوئی۔ ان سلاطین کی سیادت عموماً مقامات مقدسہ یعنی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پر بھی قائم رہی۔

مملوک سلطان مطلق العنان ہوتے تھے۔ تاہم ایک مجلس وزراء امور سلطنت میں سلطان کو مدد دیا کرتی تھی، جس میں مملوکوں کے اعلیٰ سپہ سالار سلطان کی بائیں یا دائیں جانب اپنے اپنے رُتبے کے مطابق بیٹھا کرتے تھے۔ نشستوں کی یہ حسب مراتب ترتیب مملوک عہد کے آغاز ہی سے قائم تھی۔ نمائندہ سلطان جو سلطان کے عدم موجودگی میں مقرر ہوا کرتا تھا سپہ سالار اعظم یعنی امیر کبیر کہلاتا تھا، جس کا عہدہ بعد میں اتابک کے عہدے کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔ یہ سب کے سب اعلیٰ عہدہ داروں میں شمار ہونے لگے۔

16.4 بحری اور برجی مملوک سلاطین

مملوک سلاطین دو خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ (۱) بحری سلاطین اور (۲) برجی سلاطین۔ بحری سلاطین کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان کا سلسلہ ان محافظوں کی نسل سے چلا جن کے مکانات اور محلات دریائے نیل میں اس کے جزیرے روضہ کے قریب بنے

ہوئے تھے۔ برجی ممالیک اصل میں وہ خاص فوج تھی جس کو بحری مملوک سلطان قلاؤن نے بنائی تھی اور وہ قاہرہ کے قلعے کے برجوں میں رہا کرتے تھے۔ اس لئے ان کو مملوک کہا جاتا ہے۔ نسلی طور پر بحری سلاطین عموماً ترک تھے اور ان کے یہاں موروثی وراثت کا اصول قائم تھا۔ جب کہ برجی سلاطین کوہ قاف علاقہ کے کاکیشیاء النسل تھے۔ جنھیں چراکسہ کہا جاتا ہے۔ برجی مملوکوں کی حکومت کا بانی ملک الظاہر برقوق ہے جو 784ھ مطابق 1382ء میں تخت نشین ہوا۔ سلطان برقوق نے اپنے بیٹے کو جانشین مقرر کرا لیا۔ اس کا دوسرا بیٹا بھی کچھ عرصے کے لئے تخت نشین ہوگیا۔ لیکن اس کے بعد مملوک فوج نے موروثی سلطان بنانا گوارا نہ کیا۔ ان کے درمیان یہ معمول ہوگیا تھا کہ جس کو فوجی کمانڈروں کی اکثریت کی حمایت حاصل ہوتی تھی وہی سلطان بن جاتا تھا۔

16.4.1 بحری مملوک سلاطین (1250ء-1382ء)

تاریخی اعتبار سے بحریوں کو برجیوں پر فوقیت حاصل تھی۔ انھوں نے 132 سال تک حکومت کی اور اسلام کے چند نامور غازی پیدا کئے۔ ان میں ظاہر بیبرس، قلاؤن، اشرف خلیل اور ناصر محمد بہت مشہور تھے۔ ان کا مختصر تعارف پیش ہے۔

ظاہر بیبرس (1260ء-1277ء)

یہ بحری مملوکوں کا سب سے بڑا سلطان تھا۔ سلطان بننے سے قبل ہی صلیبی جنگ بازوں کو تباہ کر دیا۔ اس نے علویوں اور باطنیہ اسماعیلیہ کی ذریات کو بھی بیکار کر کے رکھ دیا۔ عین جالوت کی تاریخی جنگ میں سلطان قطز کے سپہ سالار کی حیثیت سے جب اس نے کمان سنبھالی تو مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور مصر منگولوں کے حملوں سے محفوظ ہوگیا۔

بیبرس کا دوسرا اہم کارنامہ یہ تھا کہ اس نے قاہرہ میں عباسی خلیفہ کا خیر مقدم کیا، دراصل یہ وہ واحد عباسی شہزادہ تھا جو منگولوں کے قتل عام سے بچ گیا تھا۔ بیبرس نے اسے قاہرہ بلا کر اسے عباسی خلیفہ نامزد کیا اور خود اس کے نام سے حکومت کرنے لگا۔ حالانکہ یہ عباسی خلافت برائے نام تھی، اصل اقتدار ممالک ہی کو حاصل تھا۔ تاہم بیبرس نے بغداد سے عباسی خلافت ختم ہونے کے بعد قاہرہ میں عباسی خلافت کا سلسلہ جاری کر دیا جسے بغداد سے منگولوں نے نکال دیا تھا۔ چنانچہ اس نے 1261ء میں خلافت کو بحال کیا۔ پھر بیبرس نے خود خلیفہ سے ''قیم الدولہ'' کا خطاب لے لیا اور اپنے آپ کو شریک حکومت مقرر کرا لیا اور باقاعدہ آداب [illegible] سوم کے ساتھ ملکی اقتدار اپنے پاس منتقل کرا لیا۔ مملوک عہد کے خاتمے تک صورتحال یہی رہی۔ خلیفہ ہر سلطان کی تخت نشینی پر اس کی اطاعت کا اقرار اور کل اختیارات اسے تفویض کر دیتا تھا۔ اس طرح خلیفہ کے تمام اختیارات زائل ہوگئے اور اس کی حیثیت ایک ایسے برائے نام حاکم کی سی رہ گئی، جس کو نہ تو کچھ اختیار حاصل تھا، نہ ہی اس کے پاس کوئی اثر و رسوخ تھا۔

بیبرس کا ایک اور اہم ناقابل فراموش کارنامہ یہ تھا کہ اس نے 1263ء سے لے کر 1271ء تک ہر سال فوجی مہم کے ذریعہ شام کے تقریباً تمام مسلم مراکز کو صلیبیوں کے قبضے سے واپس لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اسمعیلی باغیوں کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے کچل کر رکھ دیا جو ایک طویل عرصہ سے مسلم حکمرانوں کے لئے پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ بیبرس ایک عظیم سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب منظم کار اور مدبر سیاست داں بھی تھا۔ اس نے عوام کی سماجی اور معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لئے بہت سے اقدامات کئے۔

قلاؤن(1290-1279ء)

قلاؤن، ظاہر بیبرس کا لائق جانشین ثابت ہوا۔اس نے صلیبیوں کے ساتھ جنگی مہم کو جاری رکھا اور بچے ہوئے صلیبیوں کو نکال باہر کرنے کا کام مکمل کیا۔اس نے 1285ء میں طرطوس کے مضبوط قلعہ پر 38 دن کے محاصرے کے بعد قبضہ کرلیا۔اس کے بعد طرابلس پر بھی قابض ہوگیا۔سلطان قلاؤن کے انتقال کے بعد اس کے فرزند اور جانشین اشرف خلیل نے 1291ء میں عکہ کو فتح کرنے کا کام پورا کیا جو صلیبیوں کی آخری پناہ گاہ تھی اور اسی کے ساتھ فلسطین کی تاریخ میں ایک اہم ڈرامائی سین کا اختتام ہوا۔

اشرف خلیل کی وفات کے بعد اس کا چھوٹا بھائی ناصر محمد اس خاندان کا آخری معروف سلطان بنا۔اس کے بعد آنے والے 12 سلطانوں کی حالت کٹھ پتلی کی حیثیت سے زیادہ نہیں تھی۔سلطنت کی طاقت اب برجی مملوکوں کے ہاتھوں میں جانے لگی یہاں تک اس خاندان کے آخری سلطان صالح شعبان کو برقوق نے 1382ء میں معزول کردیا جو برجی مملوکوں کا سردار تھا۔

فہرست بحری سلاطین (1382ء-1250ء):

1. عزالدین ایبک 1250ء
2. علی بن ایبک 1257ء
3. قُطُز 1259ء
4. الظاہر بیبرس 1260ء
5. برکات خان بن بیبرس 1277ء
6. سلامش بن بیبرس 1279ء
7. قلاؤن 1279ء
8. الأشرف خلیل بن قلاؤن 1290ء
9. ناصر محمد بن قلاؤن (حکومت کا پہلا دور) 1293ء
10. کتبغا 1294ء
11. حسام الدین لاجین 1296ء

ناصر محمد بن قلاؤن (حکومت کا دوسرا دور) 1298ء

12. بیبرس II 1308ء

ناصر محمد بن قلاؤن (حکومت کا تیسرا دور) 1309ء

13. ابوبکر بن ناصر محمد 1340ء

14. کُجک بن ناصر محمد 1341ء

15. احمد بن ناصر محمد 1342ء

16. اسمعیل بن ناصر محمد 1342ء

17. شعبان بن ناصر محمد 1345ء

18. حاجی بن ناصر محمد 1346ء

19. حسن بن ناصر محمد (حکومت کا پہلا دور) 1347ء

20. صالح بن ناصر محمد 1351ء

حسن بن ناصر محمد (حکومت کا دوسرا دور) 1354ء

21. صلاح الدین بن حاجی 1361ء

22. شعبان بن حسن 1363ء

23. علی بن شعبان 1376ء

24. حاجی بن شعبان 1382ء

16.4.2 برجی مملوک سلاطین (1517ء-1382ء)

اگر چہ برجی مملوک سلطانوں نے بحری مملوک سلطانوں کے مقابلے میں زیادہ طویل مدت تک حکومت کی' لیکن اسلام کی تاریخ میں کوئی ایسا اہم رول نہیں ادا کر سکے جیسا کہ ان سے قبل بحری مملوکوں نے کیا تھا۔ ان میں سے صرف دو خوش قدم اور بوغا یونانی نسل کے تھے۔ باقی سب چرکس نسل کے غلام تھے۔ کل ملا کر 23 برجی سلطانوں کی حکومت 135 سالوں تک قائم تھی۔ ان میں سے صرف 9 سلاطین ہی موثر رہے جنھوں نے 124 سالوں تک حکومت کی۔ ان کے نام تھے: برقوق' فرج' مؤید شیخ' برس بے' جقمق' اینال' خوش قدم' قائت بے اور قانصوہ الغوری۔ باقی 14 صرف نام کے سلطان تھے اور کسی اہمیت کے مالک نہیں تھے۔ اس سلسلے کے آخری سلطان طومان بے کو عثمانی ترکوں نے جنگ میں بری طرح شکست دی اور طومان بے کو سولی پر چڑھا دیا اور مصر پر قابض ہو گئے۔ جزیرہ قبرص کی فتح اس خاندان کی واحد کامیابی تھی۔

فہرست برجی سلاطین (1517ء-1382ء):

1. برقوق 1382ء

2. فرج بن برقوق (حکومت کا پہلا دور) 1398ء

3. عبدالعزیز بن برقوق 1405ء

فرج بن برقوق (حکومت کا دوسرا دور) 1406ء

4. العادل المستعین باللہ

(یہ ایک عباسی خلیفہ تھے جن کو سلطان بنایا گیا) 1412ء

5. المؤید شیخ 1412ء

6. احمد بن المؤید 1421ء

7. سیف الدین ططر 1421ء

8. محمد بن ططر 1421ء

9. الأشرف برس بے 1422ء

10. یوسف بن برس بے (صرف 94 دنوں تک حکومت کی) 1438ء

11. جقمق 1438ء

12. عثمان بن جقمق 1453ء

13. سیف الدین اینال 1453ء

14. احمد بن اینال (صرف 4 مہینے تک حکومت کی) 1460ء

15. خوش قدم 1467ء

16. سیف الدین بل بے 1468ء

17. تیمور بغا 1468ء

18. قایت بے 1468ء

19. محمد بن قایت بے 1495ء

20. الظاہر قانصوہ 1498ء

21. الأشرف جانبلات 1500ء

22. الأشرف قانصوہ الغوری 1501ء

23. طومان بے 1517ء

معلومات کی جانچ

1. مملوک کی اصطلاح سے کیا مراد ہے؟

2. مملوک حکومت کی قیام کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟

3. بحری و برجی مملوکوں کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

16.5 سماجی، مذہبی اور معاشی حالات

مملوک سماج میں عوام کے مختلف نمایاں درجات تھے جن کی ساخت طبقاتی حق وراثت کے اصول پر قائم تھی۔ فوج میں صرف غلاموں ہی کو اعلیٰ عہدوں پر ترقی دی جاتی تھی۔ آزاد عوام کو صرف ادنیٰ مقام ہی ملتا تھا۔

سلطان کے ذاتی پاسبانوں کو ''خاصکی'' کہتے تھے۔ اسی طرح امیروں کے لئے بھی پہرہ دار مقرر ہوتے تھے۔ محکمہ فوج میں یہ شعبے شامل تھے: (الف) سلطان کی خصوصی فوج۔ (ب) جند الغلقة' اس میں بھرتی کئے ہوئے سپاہی ہوتے تھے جنھیں نقد تنخواہ یا جاگیر کی پیداوار کا حصہ ملتا تھا۔ (ج) سلاطین سابقہ اور امرائے کبار کے ذاتی سپاہی۔

فوجی مہمات کے متعلق عموماً مجلس امراء فیصلہ کیا کرتی تھی۔ امراء کو اپنا لشکر مسلّح کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے نقد روپیہ ملتا تھا تاکہ دشمن کے ملک پر چڑھائی کے وقت اپنی اپنی فوج لاسکیں۔

فوجی سرداروں کے علاوہ دیوانی عمال ''اصحاب القلم'' کا تقرر ہوتا تھا۔ عمائدین مذہب قانونی اور تعلیمی عہدوں اور دوسری کئی خدمات پر مقرر ہوتے تھے۔ نظم ونسق کے لئے باقاعدہ عمال ہوتے تھے جو غیر فوجی محکموں میں کام کرتے تھے۔ سلطان کے محاصل کا ذریعہ مالیانہ اراضی، جزیہ، جاگیروں کی آمد وغیرہ تھا۔ اس آمد میں سے وہ فوج اور عمال کا خرچ دیا کرتا تھا۔ بعض اوقات سلطان جبری خرید وفروخت کے ذریعہ بھی روپیہ پیدا کرلیا کرتا تھا۔ حکومت مقررہ قیمت پر مال خرید لیتی اور خریداروں کو مجبور کرتی تھی کہ وہ معینہ قیمتوں پر اس سے خریدا کریں۔ اس کے علاوہ کچھ اجارہ داریاں بھی تھیں، جن سے سلطان کو نفع ہوتا تھا۔ سلطان کا ایک اور حصول زر کا دل پسند ذریعہ یہ ہوا کرتا تھا کہ وہ کسی بڑے آدمی کے یہاں چلا جاتا اور مہمان کی حیثیت سے اس سے رقم خطیر لے لیا کرتا تھا۔

دوسرا طبقہ تاجروں اور فن کاروں کا تھا۔ چونکہ یہ لوگ زیادہ تر شہروں میں رہتے تھے، اس لئے زراعت پیشہ لوگوں کے مقابلہ میں جاگیرداروں کے استحصال سے محفوظ رہتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ لوگ نہ صرف خوشحال تھے بلکہ سماج میں ان کی حیثیت کاشت کاروں سے بہتر تھی۔

کاشت کار مملوک سماج کے سب سے نچلے پائدان پر تھے۔ حالانکہ سلاطین اور امراء نے زراعتی پیداوار میں اضافہ کرنے کے اقدامات کئے تھے مگر اس سے سب سے زیادہ فائدہ ان ہی کو پہنچتا تھا اور کاشت کاروں کو بہت تھوڑا حصہ ملتا تھا۔

مملوک سماج کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ ابتدائی سلاطین کے دورِ حکومت میں عوامی سطح پر ملک کے نظم وضبط کی حالت اطمینان بخش تھی۔ مملوکوں نے عوام کے اختلافات کی اصلاح کے لئے بہت سے اقدامات کئے جن میں شراب پر پابندی عائد کرنا' شراب کی دکانوں کو بند کرنا اور مجرموں کو ملک بدر کرنا شامل تھا۔ علاوہ ازیں مملوک حکمرانوں نے عوامی فلاح و بہبود کے بہت سے کام کئے۔ مثال کے طور پر غریبوں اور محتاجوں کی مدد کے لئے بہت سی پناہ گاہیں تعمیر کروائیں جو تکیہ کے نام سے مشہور تھیں۔ اسی طرح مسافروں کو پانی مہیا کرانے کے لئے مختلف جگہوں پر پانی کے چشمے قائم کئے۔

مملوکوں کا دوسرا اہم کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے مصر اور شام کے درمیان گھوڑوں کے ذریعہ ڈاک کا ایک مکمل نظام قائم کیا۔ ہر منزل (پوسٹ اسٹیشن) پر آگے سفر کے لئے گھوڑے تیار رہتے تھے۔ اس نظام کی تیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قاصدوں کو قاہرہ پہنچنے میں دمشق سے چار دن' حلب سے چھ دن لگتے تھے۔ اس کے علاوہ تیز ہوائی خبر رسانی کے لئے کبوتروں کو تربیت دی جاتی تھی اور انھیں استعمال بھی کیا جاتا تھا۔

مملوکوں نے ایوبیوں کی تقلید کرتے ہوئے اہل السنہ کی تعلیمات کی تبلیغ اور اشاعت میں دلچسپی لی۔ مذہبی تعلیم کے فروغ کے لئے بے شمار عالیشان مساجد تعمیر کروائیں جن کے ساتھ مدارس بھی ملحق ہوتے تھے۔ علماء کو حکومت کی سرپرستی اور امداد حاصل تھی۔ یہ لوگ عوام میں بے حد مقبول تھے۔ اسلامی شریعت ملک کا قانون تھی۔ حکومت فقہ اسلامی کے چاروں مکاتب فکر کو صحیح اور جائز تسلیم کرتی تھی۔

مملوک سماج میں صوفیہ اور درویشوں کو عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ حکومت کی طرف سے بہت سی خانقاہیں تعمیر ہوئیں اور ان کے انتظام کے لئے مالی امداد بھی دی گئی۔ عوام کے مذہبی عقیدے اور اعمال میں بہت سے غیر اسلامی عناصر جیسے توہم پرستی' بدعات وخرافات وغیرہ داخل ہو گئے تھے۔ قبر پرستی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا فطری نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ایک طرف مزین مزارات پر ہر طرح کے نذرانے آتے' وہیں مسجدیں ویران ہو گئی تھیں۔ بدلے ہوئے حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ اب سماج میں مصلحین پیدا ہوں جو لوگوں کو صحیح عقیدۂ اسلامی توحید کی طرف مائل کر سکیں۔ چنانچہ اس دور میں امام ابن تیمیہ وغیرہ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا، بالخصوص ابن تیمیہ نے اپنی تحریروں اور تعلیمات کے ذریعہ نہ صرف اس دور کے مسلمانوں کو متاثر کیا بلکہ آنے والی اصلاحی تحریکات کے لئے امام وپیش رو بن گئے۔

مملوک سماج کے معاشی حالات نسبتاً بہتر تھے۔ مصر اور شام دونوں ہی خوش حال تھے۔ مصری بندرگاہوں پر قابض ہونے کے ناطے سلاطین نے بھرپور تجارتی فوائد حاصل کئے۔ کیوں کہ ان ہی بندرگاہوں کے ذریعہ مشرق ومغرب کے درمیان بحری تجارت ہوتی تھی۔ لیکن ان تمام خوش حالیوں کے باوجود کچھ ایسے عوامل بھی تھے جنھوں نے عوام کے اقتصادی حالات کو بری طرح متاثر کیا۔ مثال کے طور پر سلاطین کے شاہانہ اخراجات نیز بے شمار عوامی منصوبوں کی تکمیل کے لئے عوام سے بے جا محصولات وصول کئے جاتے تھے۔ ان اقدامات سے عوام کے اقتصادی حالات خراب ہوتے گئے۔

چودھویں صدی کے دوسرے نصف میں وقتاً فوقتاً طاعون کی وبا پھیلنے کی وجہ سے عوام کی حالت اور خراب ہو گئی۔ اس وبا سے مصر اور پڑوسی ملکوں میں بڑی تعداد میں لوگوں کی موت ہوئی۔ سلطان برس بائے کے دورِ حکومت میں جب شدید طاعون کی وبا پھوٹ پڑی تو سلطان نے اسے عوام کے گناہوں کی سزا سے تعبیر کیا اور عورتوں پر گھروں سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی۔

معلومات کی جانچ

1. مملوک سلاطین کے محاصل کا ذریعہ کیا تھا؟

2. مملوک سماج میں صوفیہ اور درویشوں کی کیا حالت تھی؟

3. مملوکوں کی مذہبی پالیسی کیا تھی؟

16.6 طب اور دوسرے علوم کی ترقی

ناگزیر جنگی مصروفیات کے باوجود مملوک سلاطین نے علمی' ادبی اور فن کارانہ مشاغل کی فیاضانہ سرپرستی اور ہمت افزائی کی جس کی وجہ سے بڑی تعداد میں بلند پایہ علمی اور ادبی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ طب اور دوسرے علوم پر اس دور میں کئی مفید کتابیں لکھی گئیں اور مشہور اطباء اور علماء پیدا ہوئے۔ مصر میں چونکہ امن و امان حاصل تھا اور یہ منگولوں کے فتنے سے محفوظ تھا لہٰذا اقطاع عالم اہل علم و فضل اور ماہرین فن مصر کا رُخ کرنے لگے جس سے مصر اور پھر شام علم وفن کے مرکز بن گئے تھے۔

مملوکوں نے علم طب کے فروغ میں کافی دلچسپی لی۔ قاہرہ میں سلطان قلاؤن کا بنایا ہوا شاندار منصوری اسپتال اس بات کا شاہد ہے جس میں مریضوں کی دیکھ بھال کے لئے ہر قسم کی سہولیات مہیا تھیں۔ اس کا انچارج ابن النفیس اپنے وقت کا سب سے بڑا طبیب اور مشرح (Anatomist) تھا۔ اسی نے شریانوں کے درمیان دوران خون کا انکشاف کیا۔ اس کے تین سو سال بعد ولیم ہاروے سے اس انکشاف کو منسوب کرنا ابن النفیس کے ساتھ مغرب والوں کی ایک بڑی ناانصافی ہے۔

ابن النفیس علم طب پر کئی کتابوں کا مصنف ہے۔ اس کو زیادہ شہرت اپنی کتاب ''شرح تشریح القانون'' سے ملی۔ یہ ابن سینا کی کتاب ''القانون'' کی شرح ہے۔ اس میں اس نے بڑے علمی انداز میں پھیپھڑوں اور ان کے دوران خون کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ سلطان بیبرس کا شخصی طبیب بھی تھا۔ علم طب پر اس کی دوسری مشہور اور ضخیم کتاب تھی جس کا عنوان ''الشامل فی الطب'' تھا۔ علم طب پر یہ دائرۃ المعارف (Encyclopedics) کی حیثیت رکھتی ہے۔

ابن القف (1285ء-1233ء) اس دور کا ایک ماہر جراح (Surgen) تھا۔ اس کی کتاب ''عمدۃ الجرّاحین'' فن جراحت کی پہلی کتاب ہے۔ اس کی دوسری اہم کتاب حفظان صحت اور بیماریوں کے علاج پر مشتمل ہے۔

علاج امراض جسم طب کی ایک دوسری شاخ ہے جس نے مملوک دور میں نمایاں ترقی کی۔ شام اور مصر میں آنکھ کے امراض کے واقعات زیادہ ہونے کی وجہ سے اس شاخ کی ترقی پر خاص توجہ دی گئی اور بہت سے نامور اطباء پیدا ہوئے۔ اس موضوع پر خلیفہ ابن ابی المحاسن کی کتاب ''الکافی فی الکحل'' و رصلاح الدین یوسف کی کتاب ''نور العیون'' بہت مشہور ہوئیں۔ خلیفہ ابن المحاسن آنکھ کی سرجری میں بہت ماہر تھا۔ اسے اپنے فن پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک مرتبہ بغیر کسی جھجک کے ایک ایسے شخص کی آنکھ کی سرجری موتیا بند نکالنے کے لئے کر دی جس کی ایک آنکھ بالکل ناکارہ تھی۔

علاوہ ازیں اس دور میں علماء نے علم بیطریات (Vaternery)، علم فلکیات، علم حساب اور ٹریگنو میٹری میں بھی بہت دلچسپی لی۔ اس دور میں سوانحی اور تاریخی ادب، جغرافیا اور لسانیات پر بھی متعدد مشہور کتابیں لکھی گئیں۔ مثال کے طور پر ابوبکر ابن المنذر البیطار (متوفی 1340ء) کی کتاب ''کامل الصناعتین فی البیطرۃ والزردقۃ'' اور عبدالمومن دمیاطی (1306ء-1217ء) کی کتاب ''فضل الخیل'' بیطریات کے علم میں بہت مشہور اور مستند تھیں۔ علم حساب میں ابن الحصائم (1412ء-1352ء)، ابن الشاطر (1379ء-1304ء) اور ابن تیبوغا القاہری (1447ء-1359ء) بہت مشہور ہوئے۔ ابن خلکان (1282ء-1211ء) مصنف ''وفیات الأعیان'' محمد بن شاکر بن احمد الکتبی (متوفی 1363ء) مصنف ''فوات الوفیات'' صلاح الدین الصفدی (1363ء-1296ء) مصنف الوافی بالوفیا، تقی الدین احمد المقریزی (1442ء-1364ء) مصنف ''الخطط'' محی الدین نووی (1277ء-1233ء) مصنف المنہاج شرح مسلم، شمس الدین ذہبی (1348ء-1274ء) مصنف ''لسان المنیران'' ابن حجر عسقلانی (1449ء-1372ء) مصنف ''فتح الباری شرح البخاری'' جلال الدین السیوطی (1505ء-1445ء) مصنف ''حسن المحاضرۃ'' احمد النویری (متوفی 1332ء) مصنف ''نہایۃ الأرب'' احمد القلقشندی، مصنف ''صبح الآعشی'' وغیرہ بہت سے علماء اس دور میں پیدا ہوئے۔

16.7 مملوک دور میں فن تعمیر اور فنون لطیفہ (آرٹ) کی ترقی

مملوک سلاطین فن تعمیر اور فنون لطیفہ کے بڑے سرپرست تھے۔ اس دور میں عمارتیں بنانے کا کام بڑی سرگرمی سے ہوا۔ مصر نے سنگ تراشی اور فن تعمیر میں خوب ترقی کی۔ صلیبیوں کو شام سے نکال باہر کرنے کے بعد مملوکوں کو شام اور فلسطین کے عیسائی طرز کے فن تعمیر سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ ساتھ ہی ساتھ شمال میں سلجوقی فن تعمیر سے بھی روشناس ہوئے جو آرمینیوں اور بازنطینیوں کے سنگ تراشی کے تعمیری فن پر مبنی تھا۔ چونکہ یورپ اور مشرق کے درمیان ہونے والے ہر قسم کی سمندری تجارت پر مملوکوں کا کنٹرول تھا، ان کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوا جسے بڑی دریادلی کے ساتھ انھوں نے تعمیری کاموں پر صرف کیا۔

مملوک دور میں فن تعمیر کو اس بات سے بھی کافی فروغ ملا کہ بہت سے مسلمان کاریگر اور صنعت کار منگولوں کے حملے سے پہلے موصل، بغداد اور دمشق سے بھاگ کر مصر میں پناہ لینے کے لئے آبسے تھے۔ ان کے اثر سے میناروں کی تعمیر میں اینٹ کی جگہ پتھر کا استعمال کیا جانے لگا۔ خوبصورت اور مزین گنبدوں کی تعمیر کی گئی۔ خوبصورتی اور سجاوٹ کے لئے مختلف رنگ کے پتھروں کا استعمال کیا گیا۔

اس دور کی عمارتوں میں سے چند محلات اب بھی محفوظ ہیں جو فن تعمیر کی مہارت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس عہد میں متعدد قلعے قاہرہ، حلب، اور دمشق میں دوبارہ تعمیر ہوئے۔ بہت سے مقبرے، شفاخانے، حمام، حوض اور آبشارات کی بھی تعمیر ہوئی۔ مذہبی عمارات میں سے شاندار مساجد جن کے ساتھ مدرسے بھی ملحق تھے، تعمیر ہوئیں۔ ایوبیوں تک کے زمانے میں صرف ایک جامع مسجد ہر شہر یا مضافات کی جداگانہ بستیوں میں ہوتی تھی جہاں نماز جمعہ ادا کی جاتی تھی، لیکن مملوک عہد میں یہ دستور ہوگیا کہ اکثر سلاطین اور والیوں نے نماز جمعہ کے لئے بڑے شہروں میں جامع مسجدیں بنوائیں۔ بیبرس، قلاؤن، محمد الناصر، سلطان حسن، برقوق، مؤید اور قایت بے کی مساجد قاہرہ میں قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح ولایات کے صدر مقامات یعنی حلب، دمشق اور طرابلس میں بھی متعدد مساجد بنوائی گئیں۔

اس دور میں مسلم فن سجاوٹ کے دو خاص طریقوں کو خاطر خواہ ترقی ملی: (1) جیومیٹریکل ڈیزائن پر مبنی عربی گل کاری اور (2) کوفی خطاطی پر مبنی سجاوٹ کا فن۔

اسپین اور ایران کے برعکس مصر اور شام کے فن سجاوٹ میں حیوانی شکلوں کے استعمال سے پرہیز کیا گیا۔ اس دور کی تعمیرات اب بھی صحیح سلامت قائم ہیں جو طلبہ اور زائرین دونوں کے لئے کشش کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔

اس دور میں اپلائڈ آرٹ کی تقریباً سبھی شاخوں کو مذہبی امور سے جوڑ دیا گیا تھا۔ زیادہ تر اس کا استعمال مسجد اور مسجد سے متعلق تعمیری کاموں کو زینت دینے کے لئے کیا گیا۔ مسجدوں کے کانسے کے بنے ہوئے دروازے، مخصوص عربی طرز پر بنے ہوئے کانسے کی ناموسیں، جواہرات سے جڑے ہوئے قرآن کریم کی جزدانیں، مسجد کے محرابوں میں خوبصورت موزیک اور خطبہ دینے کے منبروں پر خوبصورت نقوش وغیرہ یہ سب اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ فنون ان کے یہاں بہت ترقی یافتہ تھے۔

مساجد کے بڑے دروازوں پر دھات کا کام کیا ہوا ہوتا تھا۔ مسجد کے لیمپ اور رنگین کھڑکیاں بہترین کانچ کے بنے ہوئے بیل بوٹوں اور عربی نقوش سے مزین ہوتے تھے اور مسجد کی اندرونی دیواریں بہترین چمکیلے ٹائلس سے آراستہ ہوتی تھیں۔

اسی طرح مخطوطوں کو مختلف رنگوں کے ذریعہ مزین کرنے کا فن بھی مملوک دورِ حکومت میں رائج تھا۔ اس فن کا زیادہ تر استعمال قرآن کو آراستہ کرنے کے لئے کیا جاتا تھا۔ اس دور میں مزین کئے ہوئے بہت سے مخطوطات قاہرہ کی قومی لائبریری میں آج بھی محفوظ ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ فن ان کے یہاں بہت رائج اور ترقی یافتہ تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس دور میں ٹیکسٹائیل، شیشے اور چاندی وغیرہ سے متعلق علوم وفنون بھی کافی ترقی پر تھے جن سے صلیبی لوگ بھی متاثر اور مستفید ہوئے اور بعد میں یورپ میں ان فنون کو پہنچانے کا ذریعہ بنے۔

16.8 خلاصہ

مملوک سلاطین کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ سلطنت کو مضبوط کریں۔ ان کے سب سے خطرناک دشمن تاتاریوں کو ہلاکو کی قیادت میں ملک شام میں مقام عین جالوت 1260ء میں فیصلہ کن شکست دی گئی، اور ان کی پیش قدمی کو ہمیشہ کے لئے روک دیا گیا۔ اس کے بعد صلیبی جنگ بازوں کو شام سے نکال باہر کرنے میں یہ سلاطین کامیاب ہوئے اور ان کی طاقت مستحکم ہوگئی۔

ناگزیر جنگی مہمات کی مصروفیات کے باوجود مملوک سلاطین علمی، فنی اور تعمیری مشاغل کی فیاضانہ سرپرستی اور ہمت افزائی کرتے رہے۔ اس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں بلند پایہ علمی اور ادبی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ یقیناً یہ بات قابل تعجب ہے کہ بظاہر غیر شائستہ، غیر تعلیم یافتہ، فولادی ہاتھوں اور گرم خون والے ان سپاہیوں نے علم اور استعداد علمی کو پروان چڑھانے میں کافی دلچسپی لی۔ یہ بات بھی مناسب طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ تعلیم اور تعمیر کی ترقی کے لئے خوش گوار ماحول پیدا کرنے میں یہ لوگ روح اسلام سے کس قدر متحرک ہوئے۔

16.9 نمونے کے امتحانی سوالات

1. مملوک شاہی خاندان کے قیام اور عروج پر ایک پرنوٹ لکھئے۔
2. مملوک حکمراں کی مذہبی پالیسی کو اُجاگر کیجئے۔
3. آرٹ اور فنِ تعمیر کی ترقی میں مملوکوں کی خدمات پر روشنی ڈالئے۔
4. مملوک دورِ حکومت میں سماجی اور اقتصادی حالات پر نوٹ لکھئے۔
5. مملوک دورِ حکومت میں علوم کی ترقی کا جائزہ لیجئے۔

16.10 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. کروسیڈ اور جہاد — محمد اکبر خان
2. صلیبی جنگ — سید صباح الدین عبدالرحمٰن
3. اردو دائرہ معارف اسلامیہ — دانشگاہ پنجاب لاہور، جلد 21، 1987
4. حسن المحاضرۃ، جلد 2 — جلال الدین السیوطی
5. النجوم الزاہرۃ، جلد 6 — ابن تغری بردی
6. موسوعۃ التاریخ الاسلامی، جلد 5
7. C.E. Bosworth, Islamic Dynasties
8. Abdul Ali, Islamic Dynasties of the Arab East
9. Abdul Aziz, Khowaiter Bayabars the First-His Endeavours and Achievements
10. P.K. Hitti, History of Syria

اکائی 17 : حمدانیہ، ایوبیہ

اکائی کے اجزاء

17.1 مقصد

اس اکائی میں طلبہ سے دو اہم خاندانی حکومتوں کا تذکرہ کیا جائے گا جن کی تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت ہے۔ اس اکائی کا مقصد آپ کو دونوں حکومتوں حمدانی اور ایوبی کے احوال، واقعات اور کارناموں سے واقف کروانا ہے۔

17.2 تمہید

اس اکائی میں آپ دو خاندانی حکومتوں کے احوال وکوائف اور نمایاں کارناموں کے بارے میں پڑھیں گے۔ پہلا خاندان حمدانی کہلاتا ہے۔ عہد عباسی کے آخری زوال پذیر دور میں جب چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہونے لگیں تو اسی دوران ایک خاندان جس کا تعلق خالص عرب قبیلہ بنو تغلب سے تھا جس کو بنو حمدان یا حمدانی سے موسوم کیا جاتا تھا، اس کے ایک فرد حمدان بن حمدون نے موصل کے قلعہ ماردین کو فتح کر کے 277ھ میں حمدانی خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی، یہ حکومت چوتھی صدی کے اواخر تک قائم رہی۔

دوسری حکومت ایوبیہ کہلاتی ہے۔ اس حکومت کا بانی صلاح الدین یوسف ہے جن کو تاریخ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کہا جاتا ہے جو نجم الدین ایوب کا ہونہار بیٹا تھا۔ اس خاندان کا تعلق کردوں کی شاخ روادی سے تھا جو عراق کے علاقہ کردستان میں قیام پذیر تھا۔ ایوبی حکومت کا دور چھٹی صدی کے اواخر سے شروع ہو کر ساتویں صدی کے وسط میں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جو ہلال، صلیب کی کشمکش میں الجھا رہا۔ اس خاندان میں 7 حکمراں رہے پہلا صلاح الدین ایوبی ہے اور آخری حکمراں توران شاہ ہے۔

یہ بات معلوم رہنی چاہیے کہ عماد الدین زنگی سلجوقی حکومت میں موصل کا حاکم تھا، حکومت ایوبیہ کا دور سلجوقی حکومت کے زوال کے بعد شروع ہوتا ہے، 569ھ مطابق 1174ء تا 648ھ مطابق 1250ء یہ حکومت قائم رہی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ سلجوقی حکومت کی کمزوریوں کے سبب زنگی خاندان نے جو حکومت کی ہے اس کے اختتام پر صلاح الدین نے ایوبی حکومت کی بنیاد رکھی، اور عجیب بات یہ ہے کہ عماد الدین، نور الدین اور صلاح الدین کے مقاصد میں قدرے اشتراک پایا جاتا ہے، بلکہ نور الدین اور صلاح الدین کی ذاتی سیرت میں اور طرز حکومت میں بھی بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ سلجوقی حکومت جب کمزور ہوئی تو موصل کے حاکم عماد الدین نے اپنی حکومت شام کے بعض علاقوں میں قائم کر لی، اس کا وارث اس کا بیٹا نور الدین ہوا، اس کے متعلق ابن اثیر نے لکھا ہے کہ "خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے علاوہ بادشاہوں میں نور الدین جیسی اچھی سیرت اور پاکیزہ اخلاق والا کوئی نہیں ملتا، آگے چل کر صلاح الدین کے پیش نظر بھی یہی کردار معیار رہا"۔

صلاح الدین، نور الدین زنگی کی فوج میں ایک افسر تھا، صلاح الدین کے چچا شیر کوہ کی سربراہی میں جس فوج نے مصر کو فتح کیا اس میں صلاح الدین شامل تھا 564ھ میں اس کو مصر کا حاکم مقرر کیا گیا، نور الدین کے انتقال کے بعد چونکہ اس کی کوئی اولاد لائق نہ تھی اس لئے صلاح الدین پوری سلطنت پر قابض ہو گیا، مصر میں حاکم رہنے کے دوران ہی اس نے یمن بھی اپنے زیر نگیں کر لیا تھا، اس طرح مصر، شام، یمن سب اس کی قلمرو میں تھے۔

عماد الدین زنگی نے بیت المقدس کی بازیابی کا خواب دیکھا تھا، لیکن اس کی زندگی حکومت کی تشکیل و تنظیم کے ساتھ صلیبیوں کی اقدامی کارروائیوں کا دفاع کرنے میں گزر گئی۔ نور الدین بھی اپنے والد کی طرح اس خواب کی تعبیر کے لئے کوشاں رہا لیکن اس کی زندگی وفا نہ کر سکی۔ دراصل فتح بیت المقدس صلاح الدین کے لئے مقدر تھی، اسی نے بیت المقدس کو 583ھ مطابق 1187ء میں حطین کی جنگ کے بعد فتح کر لیا۔

لیکن ایوبی حکومت کے اس عظیم حکمراں کے بعد اس خاندان کو کوئی ایسا لائق حکمراں نہ مل سکا جو اس حکومت کی کمان صحیح طریقہ سے سنبھالتا۔ صلاح الدین ایوبی کے بعد اس حکومت کا زوال شروع ہوا اور 648ھ میں یہ حکومت ختم ہوگئی۔ اس حکومت کے کئی ٹکڑے ہوئے۔ اس خاندان کی ایک شاخ 742ھ تک قائم رہی جو شاخ اس خاندان کی مصر میں حکمراں تھی اس کو ایوبیہ عادلیہ کہتے ہیں۔ مصر میں ان کے جانشین مملوک ہوئے۔

17.3 حمدانیہ

17.3.1 قیام حکومت

اس خاندان کے متعلق جن افراد کی تاریخ ملتی ہے، ان میں پہلا فرد حمدان بن حمدون بن حارث ہے جس نے امارت حمدانیہ کی بنیاد رکھی، 254ھ میں جو فوج الجزیرہ یعنی فرات و دجلہ کے درمیانی علاقے کے خارجیوں کے خلاف برسر پیکار تھی اس میں حمدان کا بھی ذکر ملتا ہے۔

حمدان نے منتشر عباسی حکومت سے فائدہ اٹھا کر 277ھ میں موصل کے ماردین قلعہ پر قبضہ کرلیا، لیکن 279ھ میں جب خلیفہ معتضد باللہ نے اقتدار سنبھالا تو ایک بار پھر اس نے خلافت عباسیہ کا اقتدار قائم کرنا شروع کیا، معتضد نے اس سے جنگ کی تو وہ وہاں سے فرار ہوگیا اور خلیفہ نے ماردین پر پھر سے قبضہ کرلیا۔ معتضد نے حمدان کا پیچھا کیا اس کو پکڑ کر قید کردیا یہاں تک کہ اس کے بیٹے حسین نے ہارون خارجی کے خلاف معتضد کی فوج کے ساتھ لڑائی میں حصہ لیا اور خوارج کو شکست دے دی۔ خلیفہ اس سے خوش ہو کر اس کو انعام و اکرام سے نوازا، اس کے بھائیوں کا اعزاز و اکرام کیا اور حمدان کو رہا کردیا۔ اسی وقت سے حمدانیوں کو شہرت حاصل ہونے لگی۔ حسین بن حمدان کو قرامطہ سے ہونے والی جنگوں میں نمایاں کارنامے انجام دینے کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔ خلیفہ مقتدر نے ابوالھیجاء عبداللہ جو حمدان کا فرزند تھا اس کو 292ھ میں موصل کا امیر مقرر کیا۔ نیز اس کے بھائی سعید کو نہاوند کے علاقہ پر مامور کیا اور بنو حمدان کے دیگر افراد کو مناصب عطا کئے۔ ابوالھیجا نے اپنے بیٹے حسن کو، جو ناصر الدولہ کے نام سے مشہور ہے، اپنی جگہ موصل کا امیر 308ھ میں بنایا۔ ناصر الدولہ نے اپنی حکومت موصل کے علاوہ دیار ربیعہ، دیار بکر کے علاقے جو دجلہ کے کنارے پر واقع خطوں میں تھی وسعت دے دی۔ دوبار اس نے 224ھ مطابق 935ء اور 333ھ مطابق 944ء میں آذر بائیجان کو اپنے حلقۂ اقتدار میں لانے کی کوشش کی۔ اس کا جانشین ابو تغلب ہوا جو ابوالھیجاء کا پوتا اور ناصر الدولہ کا بیٹا ہے، بیٹوں نے خود اس کے ضعف پیری کے سبب اسے 356ھ مطابق 967ء میں معزول کردیا تھا، اور اسے اردمشت کی طرف جلاوطن کردیا وہیں اس کا انتقال ہوا۔

بنو حمدان کا سب سے با اثر شخص علی بن ابوالھیجا عبداللہ بن حمدان ہوا جو سیف الدولہ کے لقب سے مشہور ہے اور ناصر الدولہ کا بھائی ہے۔ اس نے باقاعدہ ایک ایسی ریاست کی بنیاد رکھی جو خلافت عباسیہ کے اثر سے بھی آزاد رہی۔ پہلے تو وہ ناصر الدولہ کی ماتحتی میں لڑتا پھرتا رہا لیکن 333ھ میں بنو کلاب کی مدد سے وہ حلب میں داخل ہوگیا اور اس پر مصر کے حاکم اخشیدیوں کو کارروائی کرنا پڑی کیونکہ حلب ان ہی کے زیر اثر تھا، دو سال تک جنگ جاری رہنے کے بعد دونوں میں عارضی صلح ہوگئی، لیکن پھر اخشیدی کی موت

ہوئی، اس سے فائدہ اٹھا کر سیف الدولہ معاہدہ سے منحرف ہو گیا، لیکن 336ھ مطابق 947ء میں اخشیدی کے جانشین اس کے فرزند اونو جور سے مستقل صلح ہو گئی اور اس طرح سیف الدولہ نے اخشیدی سے حلب، حمص، لاذقیہ، انطاکیہ وغیرہ لے لیا، اس کی قلمرو میں شام کے سرحدی علاقے دیار مضر و دیار بکر وغیرہ شامل ہو گئے۔

ویسے یہ شامی عراقی ریاست موصل کے ماتحت سمجھی جاتی تھی کیونکہ ناصر الدولہ خاندان کا بزرگ ترین فرد تھا لیکن وسعت کے اعتبار سے اور سیاسی طور پر بھی وہ موصل سے زیادہ اہم تھی، چنانچہ عملاً سیف الدولہ موصل کی ریاست اور عباسی خلیفہ کے اثر سے یکسر آزاد تھا۔

سیف الدولہ نے پہلے بھی ارمنی فرمانرواؤں کو اطاعت پر مجبور کیا تھا، لیکن حلب کی حکومت کے بعد اسے بڑی ذمہ داریوں کا سامنا تھا، چنانچہ شامی عراقی سرحد کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اسی کے سر تھی جو کہ کیلیکیا سے شمشاط اور ارمینیا میں قالیقلا تک تھی، بازنطینیوں سے جنگ بھی اسے درپیش تھی، جو قبائل باغی تھے ان سے بھی نبرد آزمائی کرنی پڑی، اوائل عہد میں سیف الدولہ کو ملک و بیرون میں کامیابیاں نصیب ہوئیں لیکن آخر عہد میں اس کو شکستوں کا سامنا کرنا پڑا، دراصل 352ھ میں اس کے ہاتھ اور پاؤں پر فالج گرا جب کہ ادھر رومیوں سے جنگ جاری تھی جس میں اس نے نگرانی بھی کی اور رومیوں کو شکست بھی ہوئی، حبس البول کے عارضہ میں 356ھ میں حلب میں اس کا انتقال ہو گیا۔

سیف الدولہ کا دار الحکومت حلب تھا، اس نے ثانوی دار الحکومت میافارقین کو بنایا تھا، حلب کے باہر اس نے ایک شاندار محل بھی تعمیر کرایا تھا، وہ بلند پایہ ادیب و شاعر اور علم دوست اور اہم علم و فضل کا قدر شناس تھا۔ جس کے سبب اس دور کے بڑے بڑے شعراء اس کے دربار میں اس کی ادب نوازی اور دامن دولت و سخاوت سے وابستہ ہو گئے۔ سیف الدولہ جہاں ایک طرف شاعر و ادیب تھا تو دوسری طرح وہ شجاعت و بہادری کے اوصاف سے متصف تھا۔ چنانچہ اس نے رومیوں سے کئی جنگیں لڑیں۔ اکثر میں اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ ان فتوحات کا ذکر اس زمانے کے شعراء نے اپنے قصائد میں کیا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے خاندان کے بہت سے افراد کو اپنے پاس جمع کر لیا تھا، ان ہی میں مشہور زمانہ شاعر ابو فراس حمدانی بھی ہے جس کو سیف الدولہ نے منبج کا والی بنا دیا تھا۔

سیف الدولہ کا جانشین اس کا بیٹا سعد الدولہ ہوا لیکن نہ وہ پوری ریاست پر حکومت کر سکا اور نہ اس کی زندگی پرسکون رہی، اسے مسلسل ابو تغلب والی موصل، ابو فراس والی حمص، بازنطینیوں، فاطمیوں اور بنو بویہ سے نبرد آزما رہنا پڑا، اس کے مرنے پر اس کا بیٹا سعید ابو الفضائل مسند نشین ہوا، لیکن اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اسی کے حاجب لؤلؤ نے اسے 392ھ میں قتل کر دیا، 393ھ میں خود لولو مر گیا تو اس کا جانشین اس کا بیٹا منصور ہوا، 406ھ / 1015ء - 1016ء میں منصور کو صالح بن مرداس نے معزول کر دیا، عجیب بات یہ ہے کہ موصل و حلب دونوں کے فرمانرواؤں نے بازنطینی علاقے میں پناہ لی، اس خاندان کے متعلق بعض مورخین کا تبصرہ ہے کہ اس نے سیاست میں بڑا زبردست حصہ لیا اور انتہائی عروج کو پہنچ کر بری طرح زوال پذیر ہوا۔

17.3.2 نظم و نسق

عباسی دور کے آخر میں مختلف چھوٹی چھوٹی خاندانی حکومتیں قائم ہوئیں، جس کے سبب ملک میں دائمی سکون و استحکام قائم نہ ہو

سکا، پھر بھی بنوحمدان کی ریاست میں بالخصوص سیف الدولہ اور ناصر الدولہ کے دور حکومت میں رعایا کو امن و امان حاصل ہوا، سیف الدولہ نے باقاعدہ دربار بھی قائم کیا جس سے ضرورت مندوں اور اور فریادیوں کو آسانی ہوئی، عام ملکی قوانین اور نظم و نسق عہد عباسی میں بالعموم جو پائے جاتے ہیں وہی تھے۔

17.3.3 معاشی وسماجی خدمات

ہم پڑھ آئے ہیں کہ یہ زمانہ مسلسل جنگوں کا ہے، رومیوں، بازنطینیوں اور پھر داخلی شورشوں سے بھرپور ہے، لیکن پھر بھی عباسی دور حکومت میں جب بھی حکمرانوں کو ذرا موقع ملتا وہ تعمیر و ترقی اور عیش و عشرت کے سامان مہیا کرنے میں کسر نہ چھوڑتے، سیف الدولہ کی پے در پے فتح سے خراج و غنیمت میں کافی اضافہ ہوا، ناصر الدولہ و سیف الدولہ دونوں نے ہی لوگوں کو ایسی فضا فراہم کی جس میں علم کے ساتھ ساتھ تجارت وغیرہ فروغ پا سکے۔

17.3.4 علمی خدمات

بنوحمدان اور بالخصوص سیف الدولہ سے وابستہ شعراء و ادباء نے اس عہد میں ادب کو حیرت انگیز ترقی دی، سیف الدولہ بڑا سخی، علم دوست و ادب نواز شخص تھا، خود بھی زبردست ادیب تھا، یوں تو ناصر الدولہ نے بھی علم و ادب کی اچھی سرپرستی کی، لیکن سیف الدولہ نے شعر و ادب کو اپنے عطیات سے آسمان پر پہنچا دیا، متنبّی جیسا شاعر اسی دربار سے وابستہ تھا، متنبّی (965ء-915ء)/(303ھ-354ھ) اس دور میں عربی کا بہت بڑا بلکہ سب سے قدر آور شاعر ہے، شروع سے ہی یہ قدر و منزلت اور بلند مقام کی تلاش میں رہا، لغت و ادب میں کمال پیدا کرنے کے بعد اس نے رزق اور قدر و منزلت کی تلاش میں متعدد جگہوں کا سفر کیا، نہ صرف اس کا دیوان مطبوعہ موجود ہے بلکہ اس کی 40 سے زائد شروحات لکھی گئی ہیں، اس کی شاعری میں فلسفہ کی بھی آمیزش ہے لیکن وہ روایتی انداز سے بالا، ضرب الامثال اور حکمتوں کے ساتھ اس کو استعارات و تشبیہات کے استعمال میں کمال حاصل تھا، اس کی شاعری وصف نگاری، مدح و ہجو گوئی پر مبنی ہے۔

ابوفراس کی سرپرستی سیف الدولہ نے کی تھی جو اس کا چچا زاد بھائی تھا، ابوفراس جہاں ایک شجاع شخص تھا وہیں اس کی شاعری بڑی تابناک تھی، اس کا طبع شدہ دیوان موجود ہے، اس کی شاعری میں متانت و سنجیدگی کے ساتھ فطری رنگ و آہنگ اور بادشاہی جلالت شان تھی، حتی کہ صاحب بن عباد جیسے باذوق ادیب نے یہ تبصرہ کیا کہ شاعری امرء القیس پر شروع ہوئی اور ابوفراس پر ختم ہو گئی، شاعری کا اکثر حصہ عذر و استعطاف یعنی معذرت طلبی پر مبنی ہے، اس کی شاعری کا وہ حصہ جو رومیوں کی قید کے زمانے کا ہے وہ بہت شاندار ہے، اس کی شاعری عامیانہ و سوقیانہ اور رکیک مضامین سے پاک ہے۔

ابن نباتہ (768ھ-686ھ مطابق 1366ء-1287ء) مصری شاعر و نثر نگار ہے، اس نے اپنے آپ کو مختلف درباروں سے وابستہ کیا لیکن بالآخر وہ سیف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہوا اور اسے خوب نوازا گیا، اس کی شاعری میں فنون بلاغت خوب پائے جاتے ہیں، نثر میں یہ اپنے پیشرو قاضی فاضل کی تقلید کرتا ہے۔

اسی طرح سری بن احمد بن سری الکندی معروف بہ سری الرفاء (366ھ مطابق 976ء) نے شعروادب میں اپنی مہارت وشہرت کے بعد اپنے آپ کو سیف الدولہ سے وابستہ کیا اور اس کی مدح کی، سیف الدولہ نے بھی اس کی خوب سرپرستی کی، اس کے انتقال کے بعد یہ بغداد چلا گیا، یہ شاعر کے ساتھ بلند پایہ ادیب بھی تھا، اس کا دیوان مطبوعہ ہے۔

ابو الفرج اصفہانی نے اپنی ضخیم وبیش قیمت کتاب الاغانی کا خود نوشت نسخہ سیف الدولہ کو پیش کیا تھا، ابو الفرج (356ھ-283ھ مطابق 967ء-897ء) اس دور کا بہت بڑا صاحب اسلوب ادیب ہے، جس کے اسلوب کی نقالی کی جاتی ہے، یہ ایک اچھا شاعر تھا، اس کی کتاب اغانی مطبوعہ ہے اور 21 ضخیم جلدوں میں ہے، اس کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو زمانہ جاہلیت، ابتدائی زمانہ اسلام اور عہد اموی کی بہت سے اخبار واحوال ضائع ہوجاتے، اس نے اس کو 50 برس کے عرصہ میں مکمل کیا۔ جب اس نے اس کتاب کو سیف الدولہ کو پیش کیا تو سیف الدولہ نے اس کو معذرت کے ساتھ ایک ہزار دینار سے نوازا۔ مختصر یہ کہ اس موضوع پر یہ کتاب منفرد ہے۔ فارابی جیسا فلسفی بھی سیف الدولہ کی سرپرستی میں رہا، فارابی (260ھ تا 339ھ) ترکستان کے علاقہ فاراب میں پیدا ہوا، یہ متعدد زبانوں میں ماہر ہونے کے ساتھ مختلف علوم وفنون کا ماہر تھا، اس کے بارے میں ایسا بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس نے ستر زبانیں سیکھی تھیں، ثعالبی نے اپنی کتاب یتیمۃ الدہر میں علم وادب کی سرپرستی کرنے پر بنوحمدان اور خاص طور پر سیف الدولہ کی بڑی تعریف کی ہے۔

معلومات کی جانچ

1. سیف الدولہ کا ادبی ذوق کیسا تھا؟
2. ابوالھیجاء کون تھا؟
3. کیا سیف الدولہ اور ناصر الدولہ نے الگ الگ ریاست قائم کی؟

17.4 ایوبیہ

17.4.1 قیام حکومت

جس طرح اللہ رب العزت نے کعبہ کو عزت بخشی ہے اسی طرح بیت المقدس کو بھی معزز بنایا، کعبہ سے اس دین کا آغاز ہوا جس کو محمد رسول اللہ ﷺ پوری دنیا کے لئے لے کر آئے، تاہم بیت المقدس قبلہ اول ہے اور تیسرا حرم ہے، بیت المقدس پر مسلمانوں نے حضرت عمر کے زمانے میں بغیر کسی لڑائی کے صلح کے ذریعہ قبضہ کیا، یہ قبضہ سلجوقیوں کے زمانہ تک قائم رہا، لیکن جب سلجوقیوں کا زوال ہوا تو شام اور ایشیائے کوچک ایک بار پھر چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ گئے یہ حکومتیں آپس میں لڑا کرتی تھیں، جب عیسائیوں نے مسلمانوں کی یہ کمزوری دیکھی تو انھوں نے صلیبی جنگوں کا آغاز کیا (صلیبی جنگ اس کو کہتے ہیں جو عیسائیوں نے بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننے کے لئے لڑی)۔ اس زمانہ میں عیسائیوں کی حکومت یورپ کے براعظم میں تھی، سلجوقیوں کے زوال کے بعد جرمنی، فرانس، اٹلی اور یورپ کے دوسرے ملکوں سے ایک زبردست فوج بیت المقدس روانہ ہوئی پہلی فوج کو مقصد میں کامیابی نہ

عیسائیوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ عیسائیوں نے ایشیائے کوچک اور شام کا تمام ساحلی علاقہ فتح کر کے 412ھ میں بیت المقدس بھی فتح کرلیا۔ یہاں عیسائی سپاہیوں نے مسلمان مردوں عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا۔ جن لوگوں نے مسجد اقصیٰ میں پناہ لی ان کو بھی نہیں چھوڑا۔ کہتے ہیں کہ اس قتل عام میں ستر ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ جب فلسطین پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا تو اسلامی دنیا میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی۔ فلسطین جغرافیائی اور دینی اعتبار سے اسلامی دنیا کا دل ہے اگر اس پر غیر مسلموں کا قبضہ ہوجائے تو اسلامی دنیا دو حصوں میں بٹ جائے گی۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ فلسطین پر عیسائیوں کا قبضہ خاموشی کے ساتھ گوارا کرلیں، انھوں نے عیسائیوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی، جن لوگوں نے عیسائیوں کے مقابلہ میں نام پیدا کیا ان میں پہلا مشہور شخص زنگی خاندان کا عظیم فرد عمادالدین زنگی ہے۔ عمادالدین سلجوقی حکومت کی طرف سے شہر موصل کا حاکم تھا۔ جب سلجوقی حکومت کمزور ہوگئی تو اس نے اپنی سلطنت بہت وسیع کرلی اور عیسائیوں کو شکستوں پر شکستیں دیں۔ لیکن بدقسمتی سے عمادالدین کا اسی عرصہ میں انتقال ہوگیا اور فلسطین تک نہیں پہونچ سکا۔ عمادالدین ہی وہ بہادر تھا جس نے تن تنہا متحدہ یورپ کا کامیاب مقابلہ کیا۔ عمادالدین کے بعد اس کے لڑکے نورالدین زنگی نے تاریخ میں بڑا نام پیدا کیا، اس نے بیت المقدس کی بازیافت کے لئے گردونواح کی چھوٹی چھوٹی مسلمان حکومتوں کو ختم کر کے ان کو اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔ مصر میں فاطمی حکومت کمزور پڑ چکی تھی، اس کو بھی ختم کیا، نورالدین ابھی حملہ کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا، نورالدین کی عمر 58 سال تھی اور اس نے 28 سال حکومت کی۔

اس کے بعد اس مردآہن کا دور آیا جس کو تاریخ سلطان صلاح الدین ایوبی کے نام سے جانتی ہے۔ صلاح الدین بڑا بہادر و فیاض تھا، لڑائیوں میں اس نے عیسائیوں کے ساتھ اتنے اچھے سلوک کیئے کہ عیسائی آج بھی اس کی عزت کرتے ہیں، اس کو جہاد کا اتنا شوق تھا کہ ایک مرتبہ اس کے نیچے کی جانب سے جسم کے آدھے حصہ میں پھوڑے ہوگئے تھے، اس کا کہنا تھا کہ جب گھوڑے سے اترتا ہوں تو تکلیف ہوتی ہے اور گھوڑے پر سوار رہتا ہوں تو سکون ملتا ہے۔ جنگ میں کبھی صلاح الدین کو شکست نہ ہوئی، صلیبیوں کے شیر دل رچرڈ نے شکستہ دل ہوکر معاہدۂ امن کا پیغام بھیجا، 22/شعبان 588ھ/3 ستمبر 1192ء کو صلح نامہ عکہ پیش کیا گیا تو اس کے ہاتھ کانپ گئے، اس کے بعد ہی وہ یورپ چلا گیا، جنگ میں اس غلبہ کا سبب جہاں اس کا جوش وجذبہ اور غیرت دینی تھی وہیں اس نے اس کے لیے سخت محنت کی تھی، اس نے کردستان سے تونس تک ان اقوام کو ایک کردیا جو بکھری ہوئی تھیں اور جن کی عادات تک مختلف تھیں۔ صلاح الدین اپنے کارناموں کی وجہ سے نورالدین سے بھی بازی لے گیا۔ بیت المقدس کی فتح اس کی سب سے بڑی خواہش تھی، لہذا حطین کے میدان جنگ میں عیسائیوں سے بڑا سخت معرکہ ہوا۔ عیسائیوں کو شکست ہوئی ان کے کئی ہزار آدمی مارے گئے کئی ہزار افراد گرفتار ہوئے اور صلاح الدین نے آگے بڑھ کر آسانی سے بیت المقدس پر قبضہ کرلیا اور تمام فلسطین سے مسیحی حکومت کا خاتمہ کردیا۔

جانشینی کے معاملہ میں صلاح الدین سے بھی چوک ہوئی۔ اس نے زمانہ کے غلط رواج کے تحت اپنی سلطنت اپنے بیٹوں میں تقسیم کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ طاقت ورسلطنت تقسیم ہوکر کمزور پڑ گئی اور 648ء میں ایوبی خاندان کی حکومت ختم ہوگئی جگہ ترک غلاموں کی حکومت قائم ہوئی جو ممالیک کی حکومت کہلاتی ہے۔

اہل یورپ سے بیت المقدس حاصل کرنے کے لئے جو صلیبی جنگیں لڑی گئیں ان کی تعداد عموماً 8 بتائی جاتی ہے، ان میں سے پہلی 1096ء تا 1099ء ہوئی، آخری 1248ء تا 1249ء ہوئی، تیسری جنگ ان میں سب سے بڑی اور مشہور ہے جو 1189ء تا 1192ء میں ہوئی، اس کی قیادت برطانیہ کے رچرڈ، فرانس کے بادشاہ فلپ اور جرمن کے بادشاہ فریڈرک باربروسہ نے کی، اس میں بھی صلیبیوں کو شکست ہوئی۔

صلاح الدین کی موت پر ابن خلکان کا تبصرہ ہے کہ ''اس کی موت کا دن اتنا تکلیف دہ تھا کہ ایسا تکلیف دہ دن اسلام اور مسلمانوں پر خلفائے راشدین کی موت کے بعد کبھی نہیں آیا''۔

اس عہد کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ملک کامل نے 1229ء میں بیت المقدس بغیر کسی لڑائی کے ایک دوستانہ معاہدہ کے ذریعہ عیسائیوں کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ ایک بڑا افسوس ناک معاہدہ تھا۔

مختصر طور سے سمجھنے کے لئے: ایوبی حکومت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے،

1. خود صلاح الدین کا دور جو تشکیل و تعمیر کا دور تھا، جس پر اس کی شخصیت کی مہر ثبت ہے، اپنے خاندان میں شخصیت کے اعتبار سے وہ سب سے زبردست ہے اگر چہ بہت سے امور میں اس کے جانشینوں کی حکمت عملی اس کے خلاف رہی،
2. اس کے ابتدائی جانشینوں کا دور جو ملک الکامل کی وفات تک جاری رہا یہ دور تنظیم کا تھا۔
3. آخری دور جس کو ایک طویل دور انحطاط و زوال کہا جا سکتا ہے۔

17.4.2 نظم و نسق

اس حکومت کے اکثر بادشاہ انصاف پسند اور صحیح فکر رکھنے والے تھے، رعایا پروری، عدل گستری ان کا شیوہ تھا، دشمن کی للکار پر وہ اپنے عیش و آرام کو چھوڑ دیتے تھے۔ صلاح الدین کی انصاف پسندی اور نظم و نسق کی بہتری کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ تجارتی مفاد کی خاطر اور فوجی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بھی صلاح الدین نے پیزا اور دوسرے اطالوی شہروں سے معاہدہ کیے، اور صورت حال کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ اس کو فرنگی ہی وہ اسلحہ پہنچانے لگے تھے جو دوسرے فرنگیوں کے خلاف استعمال ہوتا تھا۔

اس نے تمام ٹیکس کو کالعدم قرار دیا تھا، عہد فاطمی کے سکوں کو بھی ختم کر دیا تھا۔ شورشوں کے تسلسل کے سبب مصارف کا بوجھ بڑھ گیا تھا، آمدنی کی کمی تھی۔ صلاح الدین کا طرز حکومت عام بادشاہوں سے بالکل مختلف تھا، رعایا کا ہر فرد اس کے پاس پہنچ سکتا تھا، گرچہ اس کی اکثر زندگی جنگ میں گزری، پھر بھی اس نے بہت سے تمدنی کام کیے اور رفاہ عام کے کاموں کو انجام دیا، ابن جبیر نے اسکندریہ کے متعلق جو لکھا ہے اسے پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ فاطمیوں کے بعد مصر و شام میں مسلمان کس درجہ ترقی کر گئے تھے اور تمدنی آثار وہاں کس قدر نمایاں تھے، وہ لکھتا ہے:

> ''ہم نے اب تک کوئی شہر ایسا نہیں دیکھا جس کی سڑکیں اسکندریہ سے زیادہ چوڑی ہوں اور جس کی عمارتیں اسکندریہ کی عمارتوں سے زیادہ بلند ہوں یا جو اس کی طرح قدیم و خوبصورت ہوں یہاں کے بازار شاندار ہیں، اور شہر کی عظمتوں میں وہاں کے مدرسے اور شفا خانے اضافہ کرتے ہیں''

بیت المقدس کی بازیافت ایوبی حکومت کے پہلے 2 حکمراں کا اصل مقصد تھا جس کی وجہ سے حکومت میں جنگی ماحول بنا رہتا تھا۔

17.4.3 سماجی ومعاشی خدمات

قاہرہ پر قبضہ کرنے کے بعد جب صلاح الدین نے فاطمی حکمرانوں کے محلوں کا جائزہ لیا تو وہاں بے شمار جواہرات اور سونے چاندی کے برتن جمع تھے۔ صلاح الدین نے یہ ساری چیزیں اپنے قبضہ میں لانے کے بجائے بیت المال میں داخل کردیں۔ شام میں نورالدین کے زمانہ میں خوب مدرسے اور شفاء خانے قائم ہوئے۔ ان مدرسوں میں طلباء کے رہنے اور کھانے کا انتظام بھی سرکار کی طرف سے ہوتا تھا۔ قاہرہ میں جو شفاء خانہ تعمیر ہوا وہ سب سے شاندار تھا، صلاح الدین کے زمانے میں جس کثرت سے مدرسے، شفاء خانے اور مسافر خانے بنائے گئے ان کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، اس کے زمانہ میں حکومت کی ساری آمدنی رفاہ عام کے کاموں پر خرچ ہوتی تھی اس معاملہ میں اس کا عہد نظام الملک طوسی اور نورالدین زنگی سے بھی زیادہ زریں ہے۔ اس کو دیکھ کر اس زمانہ میں امراء اور عورتوں تک نے مدرسہ قائم کرنا شروع کردیا تھا۔

17.4.4 علمی خدمات

ایوبی سلاطین علم وادب کے بھی بڑے سرپرست تھے۔ ان کی اس سرپرستی کی وجہ سے اندلس سے کئی اہل علم مصر اور شام آگئے، ان میں ایک مشہور عالم اور صوفی ابن عربی ہیں، جن کا نام ابوبکر محمد بن علی محی الدین تھا، یہ شیخ اکبر کے نام سے بھی مشہور ہوئے، (1240ء) میں ان کا انتقال دمشق میں ہوا، یہ مختلف ممالک کا سفر کرتے ہوئے جب مشرق میں پہنچے تو پھر اپنے وطن واپس نہ گئے، ان کی کئی مشہور کتابیں ہیں۔ دوسرے ابن بیطار جو اپنے زمانہ کے سب سے بڑے ماہر نباتات تھے، ان کا انتقال 1248ء میں دمشق میں ہوا، ان کے شاگردوں کی بھی اچھی تعداد ہے، جن میں ابن أبی اصیبعۃ قابل ذکر ہیں، انھوں نے کئی سو ایسی جڑی بوٹیاں دریافت کیں جو علاج میں کام آسکتی ہیں۔ یہ لوگ اندلس اور شمالی افریقہ میں موحدین کی حکومت کے زوال کے بعد مصر اور شام آگئے تھے۔

ایوبیوں نے مدارس کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کیا، یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ انھوں نے بعض ایسے مدارس کی بھی بنا ڈالی جن میں چاروں مذاہب کی فقہ پڑھائی جاتی تھی، انھوں نے صوفیہ کے طریقوں اور سلسلوں کا بھی استقبال کیا، ایوبیوں کی سلطنت میں مہاجر علماء وادباء کی تعداد بھی خوب نظر آتی ہے، وہ علماء اور قاضیوں کی حکومت میں شرکت کے بھی قائل تھے۔

17.5 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے دو خاندانی حکومتوں کے بارے میں پڑھا، ان میں سے ایک حمدانیہ حکومت ہے، اس کی بنیاد ایک تغلبی خاندان جس کو حمدانی کہتے ہیں اس کے ایک فرد حمدان نے موصل میں 277ھ میں رکھی، اس کے بیٹے ابوالھیجاء نے اس کی بنیادیں مضبوط کیں، اس حکومت میں دو حکام بہت زبردست ہوئے ایک ناصرالدولہ دوسرا سیف الدولہ، پہلے نے موصل میں زمام حکومت سنبھالی دوسرے نے حلب میں مضبوط ریاست کی بنیاد رکھی۔

حمدانی حکومت میں سب سے بااثر سیف الدولہ ہوا، اس کو فتوحات بھی خوب حاصل ہوئیں، اس نے اپنی سلطنت کی سرحدوں کو بہت وسعت دی، انطاکیہ، لاذقیہ، حلب، حمص اور شام کے ساحلی علاقے اور دیار مضر و دیار بکر وغیرہ سب اس کی قلمرو میں شامل

تھے، اس کے زمانے میں شعر و ادب نے بھی خاص ترقی کی، اس کی علم و ادب دوستی پر مورخین نے اچھا تبصرہ کیا ہے، عموماً سیف الدولہ کی شامی عراقی ریاست موصل کے حاکم ناصر الدولہ کے تابع سمجھی جاتی تھی، لیکن سچ یہ ہے کہ سیف الدولہ موصل کی ریاست اور عباسی خلافت کے اثر سے یکسر آزاد رہا، تاریخ میں بنو حمدان کی بڑی اہمیت ہے، سیاست میں ان کا حصہ بہت اہم تھا، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انتہائی عروج پر پہنچ کر یہ خاندان بری طرح زوال پذیر ہوگیا اور 406ھ میں حمدانی عہد کا خاتمہ ہوگیا،

اس اکائی میں جس دوسری خاندانی حکومت کے بارے میں ہم نے پڑھا وہ ایوبی حکومت ہے، نور الدین زنگی کی فوج نے مصر پر حملہ کیا، فوج کا سپہ سالار شیر کوہ تھا، اس نے مصر کو فتح کرلیا، اس فوج میں شیر کوہ کا بھتیجہ صلاح الدین بھی شامل تھا، وہ نور الدین زنگی کی فوج میں ایک افسر تھا، مصر کی فتح کے بعد 564ھ میں اس کو مصر کا حاکم مقرر کیا گیا، نور الدین کے انتقال پر اس نے تمام سلطنت پر قبضہ کیا اور باقاعدہ حکومت کی بنیاد رکھی۔

صلاح الدین عام سلاطین کی طرح نہ تھا، اس کی بہادری و شجاعت کے ساتھ اس کی سادگی، رعایا پروری اور عدل گستری مثال تھی۔ اس نے متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو متحد کیا، بہت منظم انداز میں اہل یورپ کا مقابلہ کیا، بالآخر 1187ء میں حطین کی جنگ کے بعد بیت المقدس کو فتح کرلیا۔

ایوبی سلاطین کی تعداد کل 7 ہے، بدقسمتی سے صلاح الدین کو کوئی صحیح وارث نہ مل سکا اور یہ حکومت دن بہ دن کمزور ہوتی گئی، عجیب بات یہ ہے کہ صلاح الدین جیسے مجاہد، عادل اور دور اندیش فاتح نے بھی زمانہ کے رواج کے مطابق اپنی سلطنت کو تین جانشینوں میں تقسیم کردیا، جو ایوبی حکومت کے خاتمہ کا اصل سبب ہے، 1250ء میں یہ حکومت مکمل طور پر ختم ہوگئی۔

ایوبی حکومت میں عام طور پر رعایا کے ساتھ انصاف کیا گیا، علماء کی قدر کی گئی، قاضیوں کو ان کا صحیح مقام دیا گیا، صلیبی جنگوں کے تسلسل کے باوجود تہذیبی و تمدنی کام کیے گئے، چنانچہ جہاں بیت المقدس کی فتح اس عہد کا کارنامہ ہے وہیں مدارس کی کثرت بھی اس عہد کی یادگار ہے۔

17.6 نمونے کے امتحانی سوالات

1. حمدانی حکومت کے بانی کے بارے میں اپنی معلومات درج کریں؟
2. سیف الدولہ کی ذاتی زندگی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
3. ابوالھیجاء کی ریاست کتنے حصوں میں تقسیم ہوئی؟
4. صلاح الدین ایوبی نے حکومت کی بنیاد کس طرح رکھی؟
5. ایوبیہ کی نسبت کس کی طرف ہے؟
6. صلاح الدین کی ذاتی زندگی اور طرز حکومت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
7. کل کتنی صلیبی جنگیں لڑی گئیں، ان کے متعلق اپنی معلومات لکھیں؟

18.1 مقصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد طلبا ایران کی تین خاندانی حکومتوں صفوی، قاچاری اور پہلوی حکومت کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں گے۔ یہ حکومتیں کس طرح قائم ہوئیں، ان کے اہم کارنامے کیا ہیں اور پھر کس طرح وہ زوال سے دوچار ہوئے، ان سب امور سے طلبا واقف ہو جائیں گے۔

18.2 تمہید

خاندانی حکومتوں کی اس اکائی میں ہم ایران میں قائم ہونے والی مختلف خاندانی حکومتوں کا مطالعہ کریں گے، ان ہی میں صفوی حکومت ہے جس کا بانی شاہ اسمعیل صفوی 907ھ تا 930ھ مطابق 1501ء تا 1524ء ہے۔ یہ صفوی خاندان کا ایک فرد ہے جس کا حسب ونسب حضرت موسیٰ کاظم سے ملتا ہے جو اہل تشیع کے ساتویں امام ہیں، یہ خاندان گیلان کے شہر اردبیل میں آباد تھا، درس وتدریس ان کا پیشہ تھا، اس خاندان کے بزرگوں کے ہاتھ پر لوگ کثرت سے بیعت کرتے تھے اور کسب فیض کرتے تھے، شیخ صفی الدین اسی خاندان کے فرد ہیں جو تعلیم وارشاد کے میدان میں مرجع عوام کی حیثیت اختیار کر گئے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ یہی وہ بزرگ ہیں جن کے نام کی طرف اس خاندان کی نسبت کرتے ہوئے اس کو صفوی خاندان اور اس خاندان کی حکومت کو صفوی حکومت کہا جاتا ہے۔

دوسری حکومت جو ایران میں قائم ہوئی وہ قاچاری حکومت تھی۔ ایران میں زندی خاندان کی حکومت (1163ھ تا 1208ھ مطابق 1750ء تا 1794ء) قائم رہی لیکن پھر آغا محمد خاں نے مسلسل کئی فتوحات اپنے قبیلے کی مدد سے حاصل کیں، اس طرح اس نے آخری زندی حکمراں لطف علی پر غلبہ حاصل کر کے اپنی حکومت قائم کر لی، اس کا تعلق قبیلۂ قاچار سے تھا اسی نسبت سے اس عہد کو قاچاری عہد کہا جاتا ہے۔

قبیلۂ قاچار ترکوں کی ایک شاخ ہے، اہل ایران ان کو ترکمان بھی کہتے تھے، چوتھی صدی ہجری میں دریائے جیحون کے مضافات میں یہ قبیلہ آباد تھا۔

قاچاریوں کا ذکر صفوی عہد میں بھی ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی ان کی اہمیت تھی، شاہ اسماعیل صفوی نے قاچاری ترکوں میں سے جو اس کے والد کے مریدین تھے ان کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔

تیسری حکومت جو ایران میں قائم ہوئی وہ پہلوی حکومت ہے۔ جب قاچاری حکومت کے آخری عہد میں ایران کی داخلی صورت حال بہت خراب ہوگئی، آس پاس کے ملکوں کی بے پناہ ترقی کے سامنے ایران درماندگی و پریشانی کا شکار تھا، افلاس، ناخواندگی اور بیماری نے اس کی کمر توڑ دی تھی، روسیوں کا غلبہ حد درجہ بڑھ چکا تھا، ایرانی عوام میں قومی بیداری کا شعور پیدا ہو چکا تھا، وہ تبدیلی چاہتے تھے، اسی دوران بعض ایسے واقعات ہوئے جس کے سبب 1925ء میں قاچاری عہد کا خاتمہ ہوا اور رضا شاہ پہلوی کی حکومت قائم ہوئی، ایرانی تاریخ میں اس دور کو ایران کا زریں عہد کہا جاتا ہے جس میں بے شمار اصلاحی کوششیں ہوئیں اور ہر

شعبہ میں ملک کو ترقی واستحکام دینے کی کوشش کی گئی، رضا خاں پہلوی اس حکومت کا پہلا تاجدار ہوا جو اعلیٰ حضرت رضا شاہ پہلوی کبیر کے نام سے مشہور ہوا۔

18.3 صفوی حکومت

18.3.1 قیام حکومت

ساسانیوں کے بعد صفویوں نے ایران کو ملی وحدت کی علامت بناتے ہوئے مذہبی بنیاد پر ایک آزاد ملکی حکومت قائم کی، جس کا بانی شاہ اسماعیل صفوی ہے، اس نے اثنا عشریہ مذہب کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دے کر اہل ایران کو متفق و متحد کر دیا،

شاہ اسماعیل صفوی جب جوان ہوا تو سلسلہ صفویہ کے تمام مریدوں نے اس سے بیعت کر لی، ارشاد و ہدایت کی یہ وراثت تو اسے خاندانی طور پر ملی لیکن فوجی اور سیاسی شعور اس کو قدرت کی طرف سے ملا تھا، چنانچہ اس نے اپنے مریدوں میں ایک نئی روح پھونکی اور جذبہ سرفروشی پیدا کیا اور رفتہ رفتہ انہیں مسلح کر دیا، اس طرح اس کے مریدین کی ایک فوج تیار ہوگئی جو اس کو پیر و مرشد کے ساتھ لشکر کا قائد بھی تسلیم کرتی تھی، اور اس کے اشارے پر جان دینے کو اپنے ایمان کا جزء سمجھتی تھی۔ اس نے سات ترک قبائل کو بھی اپنا ہمنوا بنالیا، اس اتحاد سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

اسماعیل نے سب سے پہلے شروان کا رخ کیا اور شروان کے شاہ کو شکست دے کر اسے قتل کر کے اپنے والد کا بدلہ لیا۔

اس فتح کے بعد وہ آذربائیجان کی سمت چلا اور وہاں کے حکمران الوند بیگ آق قویونلو کو شکست دے کر فتح یاب ہوا، پھر تبریز میں فاتحانہ داخل ہوا اور تاج شاہی پہن کر 907ھ مطابق 1501ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

اس نے پھر خراسان وغیرہ کا رخ کیا جہاں ازبکوں کا تسلط تھا اور انہیں شکست دے کر وہ علاقے بھی اپنے زیر نگیں کیے۔ شاہ اسماعیل اور ظہیر الدین بابر کا اتحاد بھی ازبکوں کی شکست سے ہی وجود میں آیا۔ جبکہ مرو کے قیدیوں میں بابر کی بہن بھی لائی گئی تو اسماعیل نے اس کو عزت واحترام کے ساتھ بابر کے پاس واپس کر دیا، اس طرح ان دونوں کے اتحاد کا آغاز ہوا۔

ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ عثمانی ترک اس حکومت کے مخالف تھے، مذہبی اختلاف کے سبب دونوں حکومتوں کے درمیان سخت کشیدگی پائی جاتی تھی، چنانچہ شاہ اسمٰعیل اگر غالی شیعہ تھے تو سلطان سلیم عثمان انتہا پسند سنی، چنانچہ سلطان سلیم نے ازبکوں کو ان کا مخالف پا کر اس نئی ابھرتی ہوئی حکومت کا خاتمہ کرنے کا عزم کیا، اسمٰعیل نے بھی تیاری کی، 920ھ مطابق 1514ء میں چالدران کے مقام پر دونوں کے درمیان خوں آشام معرکہ ہوا جس میں ترکوں کو فتح ہوئی اور وہ تبریز تک داخل ہو گئے، اس جنگ میں ایرانیوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور یہ شکست شاہ اسمٰعیل پر بہت گراں گزری، بعض مورخین کے مطابق اس کے بعد کبھی شاہ اسمٰعیل کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

سلطان سلیم کی واپسی کے بعد شاہ اسمٰعیل پھر تبریز میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا، لیکن دیار بکر اور مشرقی ایشیائے کوچک کے صوبے ہمیشہ کے لئے صفویوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ شاہ اسمٰعیل واپسی کے بعد ترکوں سے جنگ کی تیاری میں مصروف ہوگیا، لیکن زندگی نے مہلت نہ دی اور 38 سال کی عمر میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

شاہ اسمٰعیل کا شمار ایران کے عظیم بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ اس نے آذر بائیجان، خراسان، عراق، فارس، کرمان اور خوزستان کو فتح کر کے اپنی حکومت کو وسعت دی، کچھ مدت تک دیار بکر و بلخ کے علاقے بھی اس کے زیر نگیں رہے، اگر چہ دشمنوں کے لئے یہ بہت سخت تھے اور غالی شیعہ تھے، بعض اندیشوں اور مخالفتوں کے باوجود شاہ اسمٰعیل نے اثنا عشریہ کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا، جس کے نتیجہ میں ایران کی ایک بڑی آبادی نے مذہب اثناء عشری اختیار کیا۔ اور جنھوں نے اختیار نہیں کیا ان کو بزور شیعیت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جس کی وجہ سے ہزار ہا لوگوں نے ایران چھوڑ دیا۔ لیکن بحیثیت مجموعی وہ عادل بادشاہ تھا، اس نے 930ھ مطابق 1524ء میں انتقال کیا۔ پوری مملکت میں اس کا ماتم منایا گیا۔

شاہ اسمٰعیل کے بعد ان کا بیٹا شاہ طہماسب اول تخت نشین ہوا۔ 1526ء میں جب عبید اللہ خاں ازبک نے خراسان پر حملہ کر دیا۔ اس کے تین سال بعد طہماسپ نے عبید اللہ خاں ازبک کو شکست دی۔ 1530ء میں عبید اللہ ازبک نے ہرات کا محاصرہ کیا۔ لیکن جیسے ہی اس کو طہماسپ کے آنے کی اطلاع ملی عبید اللہ ازبک وہاں سے بھاگ گیا۔ سلطان سلیمان خان نے بادشاہ بننے کے بعد چار مرتبہ آذر بائیجان پر حملہ کیا اور پھر بغداد پر قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف سام میرزا نے جو طہماسپ کا بھائی تھا بغاوت کر دی۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر عبید اللہ ازبک نے ہرات پہنچ گیا۔ لیکن جب اسے پتہ چلا کہ شاہ طہماسپ تبریز سے خراسان آ گیا ہے تو وہ پھر فرار ہو گیا۔ طہماسپ نے 1547ء میں گرجستان اور 1550ء میں شروان کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد اپنے لڑکے اسماعیل مرزا کو ایک لشکر کے ساتھ روم کو فتح کرنے کے لئے روانہ کیا۔ 1558ء میں سلیمان کا ایک بیٹا جس کا نام بایزید تھا باپ سے ناراض ہو کر طہماسپ کی پناہ میں آ گیا، طہماسپ نے اس کا پر جوش استقبال کیا اور اس کو اپنے دار السلطنت قزوین میں رہنے کی جگہ دی۔ چونکہ جب طہماسپ کے بھائی القاص میرزا نے بغاوت کر کے استانبول بھاگ گیا تھا تو سلیمان خاں نے اسے اپنے یہاں پناہ دی تھی۔ 1560ء میں سلطان سلیمان نے اپنا سفیر تحائف کے ساتھ طہماسپ کے پاس بھیجا، طہماسپ نے 1560ء میں دولت عثمانیہ کے ساتھ صلح کر لی اور سلیمان کے بیٹے بایزید کو باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔ چونکہ تبریز زیادہ تر عثمانی حملوں کا شکار رہتا تھا اس لئے طہماسپ نے اپنے دار السلطنت کو قزوین منتقل کر دیا تھا۔

جب مغل بادشاہ ہمایوں شیر شاہ سور سے 1544ء میں شکست کھانے کے بعد ایران چلا گیا تو طہماسپ نے اسے اپنے یہاں پناہ دی، عزت و اکرام سے پیش آیا اور اس کو فوجی مدد دی۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی حکومت کو دوبارہ حاصل کر سکا۔ ایران کو اس کے عوض قندھار ملا۔ ہمایوں نے اسی سفر ہجرت میں تربت جام میں حمیدہ بیگم سے نکاح کیا اور اسی کے شکم سے اکبر پیدا ہوا۔ تربت جام میں ہمایوں کا لکھا ہوا کتبہ ابھی بھی موجود ہے۔ 1562ء میں ایران و انگلینڈ میں ایک معاہدہ ہوا۔ ملکہ الزابتھ کا سفیر انٹونی جنکسن ایران آیا اور قزوین میں شاہ سے ملا۔ طہماسپ نے اس کا استقبال کیا اور اس کے ساتھ پوری مہربانی کے ساتھ پیش آیا۔ شاہ طہماسپ 1576ء میں 54 سال حکومت کرنے کے بعد انتقال کر گیا۔ صفوی دور کے بڑے بادشاہوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے باپ کی طرح حوصلہ مند اور بہادر نہ تھا لیکن جو سلطنت اسے وراثت میں ملی تھی اس کو اس نے بہتر طریقے سے قائم رکھا۔ شروع میں عیش و عشرت کی طرف راغب رہا لیکن درمیانی دور سے عیاشی وغیرہ سے توبہ کی اور شریعت کے مطابق احکام جاری کئے۔

طہماسپ کے جانشینوں میں شاہ اسماعیل ثانی اور شاہ محمد خدا بندہ کا دور قابل تذکرہ واقعات سے خالی ہے۔ البتہ شاہ عباس اعظم کا دور خاندان صفویہ کا زرین دور کہلاتا ہے۔ جب وہ تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر 18 سال سے زیادہ نہ تھی۔ مملکت کے تمام کام مرشد قلی خاں استاجلو کے سپرد تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران چاروں طرف سے مخالفین سے گھرا ہوا تھا۔ مغرب کی طرف سے عثمانی، مشرق کی طرف سے ازبک، دوسری طرف مرشد قلی خاں نظم حکومت پر قبضہ کئے ہوئے تھا۔ لیکن ایک رات شاہ عباس نے دوسرے دشمنوں کو ختم کرنے کا عزم کیا، ایک بری فوج جمع کی تا کہ ایک گروہ سے جنگ کی جائے اور دوسرے کو طاقت کے زور سے ختم کر دیا جائے۔ حیدر مرزا کو اس منصوبے کے تحت استانبول بھیجا اسی دوران عبدالمومن خان پسر عبداللہ خاں ثانی نے مشہد کا محاصرہ کرلیا۔ لیکن اتفاق سے جب شاہ عباس تہران پہنچے تو بیمار ہو گئے اور مشہد تک نہ پہنچ سکے۔ ازبکوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر مشہد کو برباد کر دیا، وہاں کے کافی لوگوں کو قتل کیا اور اس کے بعد سبزوار کو تباہ کیا اور وہاں بھی لوگوں کا قتل عام کیا۔ اسی دوران شاہ عباس کی صحت ٹھیک ہوگئی اور عبداللہ خاں ازبک کا انتقال ہوگیا۔ لہٰذا 1597ء میں شاہ عباس خراسان آئے اور عبداللہ خاں کے بھانجے کو شکست دی اور ازبکوں کو اس طرح کچلا کہ کافی عرصے تک خراسان ازبکوں کے حملوں سے محفوظ رہا۔ اس زمانے میں انگریزوں سے ایرانی فوج کو جدید طرز پر مسلح کرنے کے لئے مدد لی گئی اور ایران میں توپ سازی کی صنعت شروع ہوئی جس کے بعد ایران جدید آتشی ہتھیاروں اور توپوں سے مسلح ہوگئی۔ اس سے پہلے وہ تلوار و تیروں جیسے روایتی ہتھیاروں سے لڑتے تھے۔

قراباغ کے حکمراں تہمورن خاں گرجی کا قتل ہوگیا تو شاہ عباس 1615ء میں گرجستان آئے اور وہاں قتل عام کر دیا، محمد پاشا جو سلطان احمد خاں عثمانی کا صدر اعظم تھا دوبارہ گرجستاں کی طرف آیا اور پھر دوبارہ صفویوں اور عثمانیوں میں صلح ہوگئی۔ پھر عثمان خاں دوم کے دور میں خلیل پاشا جو عثمانیوں کا صدر اعظم تھا بڑے لشکر کے ساتھ حملہ آور ہوا اور شاہ عباس کو شکست ہوئی لیکن دوبارہ شاہ عباس نے عثمانی افواج پر 1622ء اور 1624ء میں فتح حاصل کی اور بغداد تک فتح کرلیا اور پھر روضات کی زیارت کے لئے گیا اور وہاں تعمیرات بھی کرائیں۔

1602ء میں اسپین کے بادشاہ فلپ سوم نے اپنا ایک سفیر عباس کے پاس مشہد بھیجا کہ ایران اس کو اجازت دے تا کہ بحرین پر پرتگالیوں کے تصرف میں نہ رہے۔ لیکن شاہ عباس نے شیر اوستی کو صاف جواب نہیں دیا۔ 1612ء میں الہ وردی خاں نے اپنے بیٹے اماقلی کو بندر جرون کو فتح کرنے کے لئے بھیجا لیکن اسی سال الہ وردی خاں کا انتقال ہوگیا اور اس کے بیٹے کو ایران کے بگلیر بیگی کا منصب ملا۔ اسپین اور ایران نے معاہدہ کیا کہ ایران خشکی کے راستے سے اور انگریز سمندر کے راستے سے حملہ کریں گے اور اس طرح سے خلیج فارس پر پرتگالیوں کے قبضہ کو ختم کر دیں گے۔ ایرانی اور انگریزی فوجوں نے 1621ء کو قلعہ ہرمز کا محاصرہ کیا اور اس قلعہ کو فتح کرلیا۔

شاہ عباس، صفوی بادشاہوں میں سب سے اہم مقام رکھتے ہیں۔ شاہ عباس کو انتقال کے بعد جنت مکان اور خلد آشیاں کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے 1591ء میں اپنے دارالسلطنت کو قزوین سے اصفہان تبدیل کیا، اور پھر اس کو آباد کیا، اور بڑی عالی شان عمارتیں تعمیر کیں، جیسے عالی قاپو و میدان بزرگ نقش جہاں اور مسجد شاہ اور برے پر فراباغ اور پورے ایران میں کارواں سرائیں تعمیر کرائیں۔ شاہ عباس نے چاہا کہ پورے ایران میں ایک سکہ چلے، لہٰذا ایران میں عباسی سکہ رائج کیا۔ لیکن شاہ عباس بہت سخت دل تھا۔ جو کشت و خون گرجستان میں اس نے کیا اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بھی سخت ظلم

کیا۔ اپنے باپ کو جس کی بینائی کم ہو چکی تھی اس کو بالکل اندھا کرا دیا۔ اس کے بعد دو بھائیوں کو اندھا کرا دیا۔ اپنے بڑے بیٹے صفی میرزا کو اس ڈر سے کہ وہ بغاوت نہ کر دے قتل کرا دیا۔ اور دو بیٹوں امام قلی میرزا اور خدا بندہ میرزا کو اندھا کرا دیا۔ اسی وجہ سے اس کی موت کے بعد کوئی لائق شہزادہ نہ رہا کہ جو اس کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالتا اور صفوی حکومت کی طاقت شاہ عباس کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد شاہ صفی نے 14 سال حکومت کی، کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام نہیں دیا، شاہ صفی کے بعد اس کا لڑکا شاہ عباس دوم 1622ء میں تخت پر بیٹھا۔

شاہ عباس دوم نے اپنی حکومت کے اوائل میں آدھا ملین مالیات رعایا پر معاف کر دیئے جس کی وجہ سے وہ عوام میں کافی مقبول ہوا۔ اس کا رول دوسرے مذاہب کے ساتھ بھی بہتر تھا۔ اس نے قندھار کو جو اس کے باپ کے عہد میں ایران کے قبضہ سے نکل گیا تھا دوبارہ فتح کر لیا۔ اگر چہ اورنگ زیب نے قندھار کی بازیابی کی بہت کوشش کی لیکن قندھار فتح نہ ہو سکا۔ روس نے اس دور میں گرجستان کے عوام کو اکھیڑ پھینکنے کے لئے مہم شروع کی تہمورشاہ خاں کے ذریعہ کی گئی دفاعی کوشش ناکام رہی اور 1660ء میں وہ ایران آیا اور معافی کی درخواست کی۔ شاہ عباس دوم نے اس کی خطا کو معاف کر دیا۔ اس کے عہد میں ایک ازبک امیر امام قلی خاں نے ایران میں پناہ لی۔ شاہ عباس اس کے ساتھ بہت محبت سے پیش آیا۔ نذر محمد، بلخ کا حکمراں بھی شاہ جہاں کے ڈر سے ایران ہی آ گیا تھا، شاہ عباس نے اس کی مدد کے لئے ایک فوج بھی دی تھی۔ شاہ عباس نے ایک فوج قراولان جزایری کے نام سے تیار کی۔ اس میں 600 فوجی تھے جو پورے طور پر نئے اسلحہ جات سے منظم تھے۔

شاہ عباس نے ایک شاندار عمارت قاپو، باغ سعادت اور چہل ستون 1647ء میں اصفہان میں تعمیر کئے، ایک پل جس کا نام خواجہ ہے تعمیر کیا، یہ ایران کے سب سے خوبصورت پلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شاہ عباس اول کے بعد شاہ عباس دوم صفوی بادشاہوں میں شہرت حاصل کیا۔ شاہ عباس دوم کے بعد شاہ سلیمان 1694ء-1666ء نے حکومت کی اور اس کے بعد شاہ سلطان حسین نے 1722ء-1694 تک حکومت کی جو آرام طلب تھا۔ دیگر مذاہب کے ساتھ سخت گیر تھا۔ اس نے خانقاہوں کو تباہ کر دیا اور صوفیا کو شہر بدر کر دیا۔

صفوی عہد کی ابتداء جتنی شاندار تھی اختتام اتنا ہی خراب اور شرمناک ہوا، صوفیوں نے ایلخانیوں کی حکومت کو ختم کر کے ایک نئے عہد کی بنیاد رکھی تھی اور ایرانیوں کو ایک نقطہ پر متحد کیا تھا، لیکن سلطان حسین نے افغان محمود کو صفوی تاج پہنایا حکومت اس کے سپرد کر دی اور افغان فاتحانہ دارالحکومت میں داخل ہو گئے اس طرح سات ماہ کا محاصرہ ختم ہوا، لیکن پھر محمود کا تھوڑے دن بعد انتقال ہو گیا تو اس کے بھائی و جانشین اشرف کو ایران سے نکال دیا گیا اور نادر قلی نے صفوی خاندان کے طہماسپ ثالث کو تخت پر بٹھا دیا لیکن چند ہی روز بعد اسے نااہل سمجھ کر معزول کر دیا اور عباس سوم کے لقب سے اس کے آٹھ ماہ کے بچے کی بادشاہت کا اعلان کر دیا، یہ بچہ تھوڑے ہی عرصہ بعد مر گیا، 26 رفروری 1738ء کو نادر قلی نے شاہ کا لقب اختیار کر لیا، اس طرح صفوی عہد کا خاتمہ ہو گیا۔

18.3.2 نظم ونسق

عمومی طور پر اس عہد میں ایران کا داخلی نظم ونسق متداول رہا، صورت حال اکثر و بیشتر ہنگامی رہی، مختلف جنگیں ہوئیں، زیادہ تر بادشاہ عدل پرور اور کامیاب بادشاہ ہوئے، شیعہ مذہب کو سرکاری مذہب قرار دینے اور سنی مذہب کا ایران سے صفایا کرنے کے

سبب داخلی حالات خراب ہوئے، لیکن بالعموم عہد صفوی ایران کا ایک عظیم الشان عہد ہے۔ اس لئے کہ اس دور میں یکسوئی پیدا ہوگئی تھی اور ملک جھگڑوں سے پاک ہوگیا تھا۔

18.3.3 سماجی ومعاشی خدمات

عہد صفوی میں فتوحات کا سلسلہ وسیع ہونے سے مملکت کی حدود میں وسعت ہوئی، اس طرح آمدنی میں اضافہ ہوا، نئی بستیاں بسائی گئیں، مغربی ممالک سے تجارتی تعلقات بڑھانے کی حوصلہ افزا کوششیں ہوئیں، کئی خوبصورت تعمیرات اسی عہد کی دین ہیں، صفی کے زمانے میں ایک زبردست قحط بھی پڑا جو سقوط اصفہان کا بڑا سبب بنا۔

شاہ عباس اعظم نے اصفہان کو دوبارہ بسایا تھا، اس کی از سرنو تعمیر کی تھی، یہی صفویوں کا دارالسلطنت تھا، اس کو کبھی ''نصف جہاں'' کہا جاتا تھا، اس دور کی کئی مشہور تعمیرات مثلاً میدان شاہ، علی قاپو نامی عمارت، مسجد شاہ، مسجد شیخ لطف اللہ وغیرہ یادگار ہیں، چہل ستون، چہار باغ کی بڑی شہرت ہے، بعض پل بھی بہت عمدہ تعمیر کیے گئے، غرض کہ حرفت وصنعت اور فن تعمیر اس دور میں عروج کو پہنچا۔ مساجد، سرائیں، باغات، محلات، بازار، پل وغیرہ نہ صرف تعمیر کیے گئے بلکہ ان کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔

کاشی کاری ترقی کر کے اس دور میں سیلسی کہلانے لگی اور اپنے عروج کو جا پہنچی، اسی طرح اس دور میں برتنوں پر مینا کاری، نقاشی اور قالین بافی کی صنعت کی کوئی نظیر نہیں، دھات کی صنعت بھی اس دور کا ایک اہم باب ہے۔

18.3.4 علمی خدمات

چونکہ صفوی خاندان خود صاحب علم وفضل اور سخن سنج وسخن شناس تھا، ارشاد وہدایت میں یہ خاندان ممتاز تھا، اس لئے علم پروری اور ادب دوستی بہرحال اس عہد میں جاری رہی، علماء ادباء وشعراء کی حوصلہ افزائی کی گئی بعض حکام تو اہل علم وادب کے گھر ان سے ملنے جایا کرتے تھے، اس زمانے میں ہندوستان میں تیموری حکومت تھی، اس کی شاہانہ فیاضیوں کے سبب ایرانی شعراء ادھر کھنچے چلے آتے تھے اس لئے صفوی بادشاہوں نے ان کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کی، یہی نہیں بلکہ وہ تمام علوم وفنون کی قدر کرتے تھے اور اہل علم کی عظمت وتوقیر کے قائل تھے، علوم وفنون کی ترویج واشاعت میں کبھی بخل سے کام نہ لیا۔

صفوی دور کی مدت دوسو سال ہے، اس طویل عرصہ میں اس دور میں ہمیں نقاشی اور خوش نویسی کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔

اگرچہ علماء وشعراء کی انھوں نے پشت پناہی کی ہے لیکن ان میں بھی شیعہ علماء وشعراء سرفہرست ہیں جن کو انھوں نے مختلف دینی مسائل کو بیان کرنے اور مرثیہ گوئی کے لئے راغب کیا تاکہ لوگوں کی اس مذہب سے عقیدت استوار ہوجائے، اسی خیال کا اظہار بعض دیگر مورخین نے بھی کیا ہے، پھر بھی متعدد نامور شعراء اور ان کی ادبی کوششیں اس دور کی یادگار ہیں یہ الگ بات ہے کہ اس عظیم بادشاہی دور میں علم وادب کا میدان سمٹتا چلا گیا جس کی وجہ یہی رہی کہ، صفویوں نے عثمانی ترکوں کی دشمنی کے باعث صرف شیعہ علماء وشعراء کی حوصلہ افزائی کی۔

وحشی بافقی کی مثنوی، فرہاد وشیریں، ہاتفی، خرجردی کا شاہنامہ (شاہ اسمٰعیل) امیدی تہرانی کا ساقی نامہ وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں۔

شیخ بہائی علماء کی صف میں سرفہرست ہیں ان کو شیخ الاسلام کے منصب پر حکومت صفویہ نے فائز کیا، ان کی تصانیف میں جامع عباسی، تشریح الافلاک خلاصۃ الحساب اور کشکول وغیرہ ہیں، ان کے علاوہ اس دور میں اور بھی علماء رہے جن کی متعدد تصانیف کا تذکرہ ملتا ہے جیسے ملا صدرالدین شیرازی کی اسفار اربعہ، شواہد الربوبیہ، شرح اصول کافی، کتاب الہدایہ، شرح حکمت الاشراق اور ملا محمد باقر مجلسی کی حیات القلوب، حلیۃ المتقین وغیرہ۔

مورخین و تذکرہ نویسوں میں خواندمیر، حسن ردملو صاحب احسن التواریخ، سکندر منشی اور مرزا مہدی وغیرہ کے علاوہ اور بھی متعدد لوگوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

معلومات کی جانچ

1. صفوی حکومت کا بانی کون تھا؟
2. اس دور میں کل کتنے بادشاہ ہوئے؟
3. صفوی خاندان کہاں آباد تھا، اس خاندان کا حسب ونسب کس سے ملتا ہے؟

18.4 قاچاری حکومت

18.4.1 قیام حکومت

آغا محمد خاں قاچار نے اس وقت ایران کو منظم کر کے مرکزی حیثیت دی جبکہ ایران طوائف الملوکی کا شکار ہو رہا تھا، کرمان، اصفہان، کردستان اور آذربائیجان وغیرہ میں چھوٹی چھوٹی علحدہ حکومتیں قائم ہو چکی تھیں، اس نے پہلے زندی حکومت کو ختم کیا، پھر فوجوں کو منظم کر کے اصفہان کا رخ کیا، اصفہان کی فتح کے بعد کردستان، عراق، عجم اور آذربائیجان وغیرہ سب خود ہی اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔

محمد خاں قاچار نے اپنی راہ میں آنے والے یا جس پر بھی شبہ ہوا ان سب کو راہ سے ہٹا دیا، چنانچہ آذربائیجان میں افشار قبیلے کا سردار علی خاں تھا، وہ خود ایران کا تخت حاصل کرنا چاہتا تھا، محمد خاں نے کمال چالاکی سے اس کو راضی کر لیا کہ ہم دونوں آپس میں جنگ کرنے کے بجائے زندیوں سے جنگ کریں اور آپ کی زمینیں آپ ہی کے پاس رہیں، اس نے اس کے دربار کا سردار اعلیٰ ہونا منظور کر لیا پھر محمد خاں نے اس کی آنکھیں نکلوا دیں، اس طرح افشار قبیلہ کی طاقت ختم ہو گئی اور وہ انتشار کا شکار ہو گیا۔

محمد خاں نے اپنے بھائیوں میں سے بھی بعض کو قتل کیا، بعض کی آنکھیں نکلوا دیں اور بعض فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

آغا خاں نے ایران کے بیشتر علاقے فتح کر لیا لیکن اپنی بادشاہت کا اعلان نہیں کیا، 1210ھ مطابق 1796ء میں اس نے ایک ہجوم کے سامنے اعلان کیا کہ تاج شاہی تو میرے پاس ہے لیکن میں اس کو اسی وقت پہنوں گا جب آپ تاعمر اس کے وفادار رہنے کا حلف اٹھائیں، جب لوگوں نے حلف اٹھا لیا تو اس نے تاج پہنا اور شاہ اسماعیل کی مزار سے لائی گئی تلوار کمر پر لگائی، اس طرح اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور ساتھ ہی صفویوں کی جانشینی اور شیعہ مذہب کی حمایت کا بھی اعلان کیا۔

آغا محمد خاں کی اکثر زندگی جنگ اور ملکوں کو سر کرنے میں گذری، چنانچہ اس نے کردستان کو مسخر کیا، روسیوں کا مقابلہ کیا، خراسان کو اپنے قبضہ میں لیا، قلعہ شوشی کو فتح کیا، 1211ھ مطابق 1797ء کی بات ہے محمد خاں قلعہ شوشی کی تسخیر کے تین دن بعد رات میں سو رہا تھا اس کے دو محافظوں میں جھگڑا ہو گیا، ان کی آوازوں سے اس کی نیند میں خلل واقع ہوا تو یہ سخت غضبناک ہوا، آخر اس نے حکم جاری کر دیا کہ صبح تک یہ اپنا فرض انجام دیں اور صبح ہوتے ہی ان کو قتل کر دیا جائے، اس اٹل شاہی حکم کے بعد دونوں محافظ اپنا جھگڑا بھول گئے اور طے کر لیا کہ جب یہ سو جائے تو اس کو ٹھکانے لگا دیں، چنانچہ دونوں نے بالآخر اس کا خاتمہ کر دیا۔

آغا محمد خاں قاچار شخصی طور پر ظالم تھا، حکومت کے استحکام کے متعلق اس کا نظریہ تھا کہ رعایا پر سختی کی جائے، حتی کہ وہ کہتا تھا کہ اگر ممکن ہو تو دس گھروں کے مابین ایک دیگچہ ہو جس میں وہ کھانا پکائیں، اگر ان کے ساتھ آسانی روا رکھی گئی تو فارغ البال ہو کر فتنہ سے باز نہ رہ سکیں گے، چنانچہ اس نے ایران کے بہترین افراد کو قتل کر کے اپنی بادشاہت کو مستحکم کیا تھا۔

آغا محمد خاں صرف ایک شخص کو پسند کرتا تھا، اسی کو اس نے اپنی زندگی میں اپنا ولی عہد نامزد کیا تھا اور وہ اس کا بھتیجہ فتح علی شاہ تھا لیکن وہ بھی اپنے چچا کے ظلم وستم سے بہت گھبراتا تھا، اس کے متعلق مورخین کا کہنا ہے کہ وہ سلیم الفطرت تھا۔

محمد خاں نے اپنی سخت گیری کے ذریعہ امن وامان قائم کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے قتل کے فوراً بعد فتنے سر ابھارنے لگے، جب اس کا قتل ہوا تو اس کا ولی عہد بھتیجہ شیراز میں تھا، محمد خاں کا ایک وزیر بہت باتدبیر تھا اگرچہ سراسیمگی پھیل رہی تھی لیکن اس نے اپنے زیر اثر فوج کی مدد سے حالات بگڑنے نہ دیا یہاں تک کہ ولی عہد فتح علی شاہ دارالسلطنت تہران آپہنچا اور اس کا شاندار استقبال کیا گیا، اس کی حکومت 1211ھ تا 1250ھ مطابق 1797ء تا 1834ء قائم رہی۔

اگرچہ آغا محمد خاں نے اپنے بھتیجے کی خاطر تخت کے تمام دعویداروں کو راستے سے ہٹا دیا تھا لیکن پھر بھی بغاوتیں سر ابھارتی رہیں، فتح علی شاہ کے چچا صادق خاں شقاقی نے کردوں کی مدد سے قزوین پر چڑھائی کی لیکن اس پر غلبہ حاصل کر کے اسے قتل کر دیا گیا، حسین قلی نے بغاوت کی، نادر مرزا افشار نے بھی علم بغاوت بلند کیا اسے بھی قتل کر دیا تھا، اسی طرح دیگر بغاوتیں بھی ہوئیں لیکن ان کو دبانے میں فتح علی شاہ کامیاب رہا۔

اس دور کا ایک قابل توجہ واقعہ یہ ہے کہ حاجی ابراہیم جو محمد خاں قاچار کا ایک مدبر وزیر تھا اور جس کی مدد سے ہی فتح علی شاہ کی تخت نشینی ممکن ہوئی تھی اور جس کی حسن تدبیر سے قاچاری حکومت کو استحکام حاصل ہوا تھا، وزارت اعلیٰ اسی کے پاس تھی اور عوام میں بھی اسے بے پناہ مقبولیت حاصل تھی، چنانچہ اس سے جب فتح علی کو خطرہ لاحق ہوا تو پہلے اس کے اقرباء کو بڑے بڑے عہدوں سے ہٹایا پھر انھیں قتل کیا اور بالآخر قاچار حکومت کے اس محسن و مدبر وزیر کو بھی قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ناصر الدین شاہ تخت پر بیٹھا جس کے بارے میں مورخین کا کہنا ہے کہ وہ قاچاری بادشاہوں میں سب سے اچھا بادشاہ تھا۔ اس کے دور میں ایران میں جدید افکار داخل ہوئے۔ اس نے یورپ کے کئی دورے کیے، تجارتی وصنعتی کاموں کے لئے بیرونی کمپنیوں کو ٹھیکے دیے گئے اور ان کو کافی مراعات دی گئیں لیکن ایران کی اقتصادی حالت دن بدن بگڑتی گئی اور ایک قوم پرست نوجوان کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا اس کے بعد مظفر شاہ نے تخت سنبھالا۔ اس کے دور میں حکومت کی غلط پالیسیوں اور فضول خرچیوں سے ملک دیوالیہ ہو گیا۔ مختلف صوبوں میں بدامنی پھیل گئی۔ ملک میں دستوری حکومت کے قیام کا مطالبہ ہونے لگا۔

مورخین کے مطابق یہ کہنا ممکن ہے کہ 1218ھ مطابق 1803ء تک فتح علی شاہ نے ایران کی داخلی یورشوں پر کنٹرول حاصل کرلیا تھا لیکن بیرونی سیاست ایران پر اثر انداز ہورہی تھی، بالآخر ایران اور روس کی 1803ء میں جنگ چھڑ گئی جو دس سال تک جاری رہی، 1805ء میں نپولین نے روس پر حملہ کردیا تو فتح علی نے نپولین سے معاہدہ کرلیا، لیکن رفتہ رفتہ نپولین کا زوال ہوا، ادھر کرجستان کا الحاق روس کے ساتھ ہوگیا، بالآخر ایران میں اپنے پاؤں جمانے کے لئے انگریزوں نے کوششیں تیز کردیں، اس کے لیے انھوں نے روس وایران میں ''معاہدہ گلستان'' کرادیا جس میں ایران نے دربند، باکو، شروان، شوش، قراباغ اور طاش کا کچھ حصہ روس کے سپرد کردیا، ساتھ ہی کرجستان، واغستان منگریلیا، ایمریشیا اور انجاسیہ کے دعووں سے بھی دست بردار ہوگیا اور تمام نزاعی علاقے روس کے سپرد کردیا، اس کے عوض روس نے عباس مرزا سے وعدہ کیا اس کو تخت ایران کے حاصل کرنے میں مدد دی جائے گی، خاص طور پر اس معاہدے اور روس کے ذریعہ ایران کو پے در پے دی جانے والی شکستوں کے نتیجہ میں ایران میں ایک بار پھر داخلی یورشوں کا آغاز ہوگیا، لیکن اسی اس دوران 1833ء میں فتح علی کی موت ہوگئی پھر محمد شاہ اس کا جانشین ہوا، لیکن حالات بد سے بدتر ہوتے گئے، یہاں تک کہ تحریک مشروطیت کا آغاز ہوگیا اور قومی آزادی کی تحریک چل پڑی، شوری وجود میں آئی، ملی تحریک چلی، اور پہلوی عہد کا آغاز ہوا، اس عہد کا آخری بادشاہ احمد شاہ ہے جسے دستور پسندوں نے 1909ء میں منتخب کیا تھا۔ بالآخر اس کو 1925ء میں قومی اسمبلی کے ذریعہ معزول کرکے ایک فوجی کمانڈر رضا خاں خود بادشاہ بن گیا۔ اس طرح ایران میں قاچاری حکومت کا زوال ہوگیا۔

18.4.2 نظم ونسق

کہا جاسکتا ہے کہ محمد خاں کے نظم ونسق کا حال تو ظلم وجبر پر مبنی تھا، وہ اس لئے کہ وہ کبھی کبھی تو اپنے امراء تک کو فروخت کردیتا تھا، ان پر جرمانے عائد کرتا تھا، امیر غریب سب کی سزا ایک ہی ہوتی، عدل کے معاملات میں سختی سے عمل کرتا، اس نے اپنی سخت گیری سے شاہراہوں کو محفوظ کردیا تھا، اس کے آخری ایام میں آزادانہ تجارت ہوتی تھی، پھر آگے چل کر ایران کے داخلی حالات خراب ہوتے گئے، سخت بے اطمینانی پھیل گئی، فتح علی شاہ کے عہد میں رعایا کے ساتھ غلاموں کے جیسا سلوک روا رکھا گیا، تاجر اور صنعت کار مطمئن نہ ہوسکے، خزانے میں جو کچھ آتا وہ سب تاوان کی شکل میں روس کی نذر ہوجاتا، اس طرح لوگ قاچاری حکومت سے بددل ہوتے گئے، ناصر الدین اور پھر محمد علی شاہ کے زمانے میں یہ نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئی، فوج بے بسی کی حالت کو پہنچ گئی، مدارس حکومت کی بے توجہی کا شکار ہوگئے، افلاس عام ہوگیا اور حد یہ کہ لوگ غروب آفتاب کے بعد گھروں سے نکلنے سے ڈرنے لگے، عدلیہ کا کوئی نظم نہ رہا، لوٹ کھسوٹ کے ساتھ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کا نظام ملک میں عام ہوگیا۔

18.4.3 سماجی ومعاشی حالات

قاچاری عہد اگرچہ یورشوں سے گھرا رہا لیکن پھر بھی اسی عہد میں ایران میں محمد بن عبدالوہاب کی تحریک پہنچی، جمال الدین افغانی نے ایران میں جمہوریت کی تحریک کی بنیاد ڈالی، ناصر الدین کے عہد میں بعض اصلاحات ہوئیں اس نے تار برقی کا منصوبہ نافذ کیا، بحیرۂ کارون میں جہاز رانی شروع ہوئی، مٹی کے تیل کی باقاعدہ دریافت ہوئی، سڑکیں تعمیر ہوئیں، بینک قائم ہوئے، ملک میں پیدا ہونے والی تمباکو بیرون ملک فروخت کی گئی، لیکن تمباکو کا ہی ٹھیکہ جو انگریزوں کو دیا گیا تھا ایک ایسا قضیہ بن گیا جس نے ملک

کو بلوؤں کی آگ میں ڈھکیل دیا اور پھر ناصر الدین کو 1896ء میں قتل کر دیا گیا، ناصر الدین کی تعلیم میں بھی دلچسپی تھی، اس لئے تہران میں کالج بھی کھولا جس کا نام دار الفنون تھا اس میں اس نے جدید تعلیم رائج کرنے کے لئے انگریزی، روسی اور فرانسیسی پروفیسر مقرر کیے۔

18.4.4 علمی خدمات

قاچاری عہد میں اکثر بادشاہ اگرچہ استبدادی فطرت رکھتے تھے لیکن پھر بھی علمی وادبی تحریک چلتی رہی، خود فتح علی شاہ کے بارے مورخین کا کہنا ہے کہ اگرچہ اس میں قاچاری عہد کے تمام استبدادی عناصر تھے لیکن وہ شعراء وادباء کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

قاچاری عہد میں ناصر الدین تک تو وہی قصیدہ خوانی کا دور رہا لیکن پھر قومی ادب وجود میں آیا جس میں قومی جدو جہد اور حب الوطنی کا عنصر ظاہر ہے، فتح علی صبا نے قصیدہ گوئی کے باعث شہرت حاصل کی اور علمی صلاحیتوں کے سبب قم اور کاشان کی گورنری پائی، مرزا عبدالوہاب اس دور کا مشہور شاعر ہے، ناسخ التواریخ، جام جم، آئینہ سکندری، گنج دانش، آتش کدۂ آذر وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں۔

ادب کا جو جدید دور شروع ہوا اس میں بھی ایران پیچھے نہ رہا، چنانچہ ناصر الدین کے قائم کردہ کالج دار الفنون میں بیرونی اساتذہ کی نگرانی میں سائنسی اسلوب میں نصابی کتابیں لکھی گئیں، شروع میں فرانسیسی ناول وڈراموں کے فارسی میں ترجمے کیے گئے۔

قاچاری عہد کے آخری دور میں جو رسائل واخبار شائع ہوئے قومی بیداری میں ان کا بڑا حصہ رہا، ان میں سے اختر، قانون، حبل المتین، ثریا، پرورش، اور اسرافیل، نسیم شمال، مساوات، نوبہار وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

معلومات کی جانچ

1. قاچاری حکومت کا بانی کون ہے؟
2. قاچاری حکومت میں نکلنے والے بعض اہم اخبارات کی نشاندہی کریں؟
3. زندی حکومت کا خاتمہ کس نے کیا؟
4. قومی آزادی کی تحریک کب چلی؟

18.5 پہلوی حکومت

18.5.1 قیام حکومت

رضا خاں 1878ء میں صوبہ مازندان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا، والد اور دادا پہلے سے ہی فوج میں ذمہ دار عہدوں پر رہے، رضا شاہ 14 سال کی عمر میں پرشین قازق بریگیڈ میں بھرتی ہوا، یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ وہ دور ہے جب ایران کے عوام قومی آزادی کے جذبہ سے سرشار، تبدیلی کے متمنی اور کسی بہتر متبادل کے منتظر تھے۔

1918ء میں روس میں اشتراکی حکومت قائم ہوئی تو اس نے اپنی سرگرمیاں شروع کیں، اس نے ایک بااثر شخص مرزا کوچک خاں کو اپنی حمایت دی، جس کے ذریعہ اس نے آذربائجان میں قاچاری حکومت کے خلاف بغاوت کر دی احمد شاہ قاچار نے قازق ڈویژن کو مقابلہ کے لئے بھیجا لیکن اس کو شکست ہوئی، رضا شاہ نے اس شکست کا ذمہ دار فوج کے روسی افسر کو ٹھہرایا اور بالآخر اپنے جاں نثار ساتھیوں کی مدد سے ایسے روسی افسروں کو الگ ہونے پر مجبور کر دیا اور خالص ایرانیوں کی فوج منظّم کی، اس دور کا ایک اور بااثر شخص ضیاء الدین طباطبائی مدیر ''رعد'' تھا جس کو بڑی مقبولیت حاصل تھی، اس نے جب قازق بریگیڈ کو روسی اثر سے آزاد دیکھا تو وہ خود چونکہ روس کو ملک کا دشمن سمجھتا تھا اس لئے اس نے رضا خاں کے ہیڈ کوارٹر قزوین آکر ملاقات کی، دونوں میں یہ طے پایا کہ تہران میں داخل ہو کر بزور طاقت حکومت حاصل کر لی جائے، قازقوں کا حال برا تھا، رضا خاں نے یہ سوچ کر آمادگی ظاہر کی کہ محبِّ وطن عوام کی مدد و حمایت تو ان کو حاصل ہو ہی جائے گی، لیکن ان کے ڈویژن کا حال برا تھا، فوجیوں کو عرصے سے تنخواہیں تک نہ ملی تھیں ان کے پاس وردیاں تک نہ تھیں، یہ ضیاء الدین طباطبائی ہی تھا جس کی مدد سے ان کی تنخواہیں شروع ہوئیں اور فوج نئے ساز و سامان سے آراستہ ہوئی، پھر اس نے منظّم ہو کر ایک نئے جذبہ سے تہران کی طرف کوچ کیا، آخری قاچاری بادشاہ احمد شاہ نے شاہی فرمان کے ذریعہ روکنا چاہا لیکن ان لوگوں نے اس فرمان پر توجہ نہ کی، راستے میں مازندان اور سیستان کے خود مختاروں کو شکست دے کر تہران کے تابع کیا اور بالآخر 26 فروری 1921ء کو تہران میں فاتحانہ داخل ہوئے، تہران کا مرکزی بریگیڈ اور پولیس قازقوں سے مل گئی، احمد شاہ نے نئی صورت حال کا استقبال کرتے ہوئے شاہی فرمان جاری کر کے رضا خاں کو ''سردار سپاہ'' کا خطاب دیا اور فوج کا سپہ سالار کل مقرر کر دیا، کاظم خاں کو سپہ سالار دوم کا منصب دیا، جبکہ وزارت عظمیٰ سید ضیاء الدین طباطبائی کو دی۔

حالات کچھ اس طرح کے ہوئے کہ رضا خاں کو وزارت عظمیٰ اکتوبر 1923ء میں دی گئی، اس کے ساتھ ساتھ وہ وزیر جنگ بھی تھا، اس کی حیثیت فوجی آمر کی سی تھی لیکن اس کے باوجود اس کو عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل تھی، کیونکہ اس کی فوجی تنظیم اور اصلاح کی کوششیں سب پر ظاہر تھیں۔

اس درمیان رضا خان نے کئی معرکے سر کیے، آخر میں جب فارس کے رہزنوں کی سرکوبی کر کے تہران واپس آیا تو ایسا محسوس کیا جانے لگا کہ اب حکومت اسی کے ہاتھ میں ہوگی، اس دوران ایرانی بادشاہ فرانس میں مقیم تھا، اس کی طویل غیر حاضری کے سبب مجلس نے اس کے بھائی محمد حسین مرزا کو اس کا جانشین بنا دیا لیکن اس میں نظم و نسق کی بالکل صلاحیت نہ تھی، 1925ء کے آخر میں مجلس نے اس کو معزول کر کے حکومت کی سربراہی رضا خاں کے سپرد کر دی، 14 دسمبر 1925ء کو رضا شاہ سے ملقب ہو کر رضا خاں نے پہلوی عہد حکومت کی بنیاد رکھی، اپریل 1926ء میں اس کی تاج پوشی ہوئی اور اس کے بیٹے محمد رضا شاہ کو ولی عہد سلطنت مقرر کیا گیا، اسی کے ساتھ بادشاہ کے اختیارات پر مشتمل ایک مسودۂ قانون تیار کر کے منظور کیا گیا، رضا شاہ کو ایران میں جدیدیت کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

رضا شاہ پہلوی کے بیٹے محمد رضا شاہ صرف 22 برس کی عمر میں بادشاہ بنائے گئے ابتدائی دور بڑے خطرات سے پُر تھا۔ ملک پر روسی اور برطانوی اور امریکی فوجیں قابض رہیں لیکن جلد ہی برطانوی اور امریکی فوجوں نے ایران چھوڑ دیا۔ البتہ روسی افواج ہنوز ملک میں موجود رہیں، آخر 1946ء میں انھوں نے اس شرط پر ایران خالی کر دیا کہ شمالی ایران میں تیل نکالنے کے لئے انھیں کو مراعات دی جائیں۔ ایران اسلامی دنیا کا پہلا ملک ہے جہاں پہلی مرتبہ تجارتی پیمانے پر تیل نکالنے کا آغاز ہوا۔ تیل کے یہ ذخیرے

قاچاری عہد میں ایک برطانوی کمپنی نے 1908ء میں دریافت کیا تھا۔ شاہ ایران نے ملک میں اصلاحات جاری کرنے اور عوامی بے چینی کو دور کرنے کی غرض سے ''انقلاب سفید'' کے نام سے کئی اقدامات کئے۔ یہ اصلاحات مفید ہونے کے باوجود اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکے۔ ملک کی فوجی صلاحیت بڑھانے کی غرض سے بے دریغ روپیہ بہایا گیا جس سے گرانی میں بے تحاشا اضافہ ہوگیا۔ محمد رضا پہلوی نے مخالف عناصر کو دبانے کے لئے آمرانہ طریقہ اختیار کرنے لگے۔ دوسری طرف یہودیوں کی خفیہ تنظیم ''فری میسن''، کو ملک میں عروج حاصل ہوا۔

ایران میں صفوی دور سے ہی علماء کا گہرا اثر رہا ہے۔ انھوں نے قاچاری عہد میں اپنی قوت کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب محمد رضا شاہ پہلوی مغرب کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی اور انھوں نے علماء کا حق استرداد ختم کرنے کی کوشش کی جو علماء کو 1906ء میں عطا ہوا تھا تو علماء کی طرف سے احتجاج شروع ہوا جو وقفہ وقفہ سے جاری رہا اور وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کرتا گیا۔ بالآخر یہ تحریک شاہ ایران کی معزولی اور بادشاہت کے خاتمہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور مارچ 1978ء کو استصواب رائے عامہ کے ذریعہ پہلوی حکومت کے پچاس سالہ دور کا خاتمہ ہوگیا۔ بلکہ ایران سے ڈھائی ہزار سالہ، بادشاہت کا بھی خاتمہ ہوگیا اور ایران کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا۔

18.5.2 نظم ونسق

رضا خاں نے اپنے دور حکومت میں فوج منظم کی، ہمسایہ ممالک کے ساتھ معاہدے کیے جن سے ایران کے تعلقات اس سے پہلے کبھی اچھے نہ رہے، تعلیم کے میدان میں خاص پیش رفت کی، ملکی زبان کو ترقی دی، تیل کے کنووں پر ایران کی مکمل ملکیت قائم کی اور اس طرح کے متعدد اقدامات کیے جس سے ملک وعوام کو استحکام ملا۔

دوسری جنگ عظیم میں رضا شاہ پر اتحادیوں کا سخت دباؤ تھا کہ وہ روس کو جنگی سامان پہنچانے کا راستہ بھی دے اور تیل بھی فراہم کرے، اس نے اتحادیوں کا دباؤ نہ قبول کیا اور بالاخر 1941ء میں ولی عہد محمد رضا شاہ پہلوی صغیر کے حق میں دست بردار ہوگیا، اور زندگی کا باقی حصہ جنوبی افریقہ میں گزارا۔

پہلوی حکومت کی یہ خوش نصیبی کہی جاسکتی ہے کہ اس کا وارث لائق و بیدار مغز اور مدبر تھا، اس نے اصلاحات کے کام کو آگے بڑھایا اور ہر شعبہ کو منظم کرنے کے لئے نیز ملک کی ترقی کے لئے سات سالہ منصوبہ تیار کیا، زمینوں کی اصلاح کا قانون بنایا، جنگلات وغیرہ کو قومی ملکیت میں داخل کیا، مختلف ادارے قائم کیے اور اس طرح نظم ونسق کی صورت حال کو خوب سے خوب تر بنایا، صوبائی تقسیم اسی دور کی یادگار ہے۔

18.5.3 سماجی ومعاشی خدمات

پہلوی حکومت کی اصلاحات اور سماجی ومعاشی خدمات ایران کا بہترین سرمایہ ہیں، خود رضا خاں نے اپنے دور میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے مختلف اسکول قائم کیا، پھر دارالسلطنت تہران میں ایک یونیورسٹی 14 فروری 1935ء میں قائم کی، ملکی صنعت پر زور دیا، نئی صنعتیں قائم ہوئیں، پرانی صنعتوں کو ترقی دی گئی، چاول، شکر اور سیمنٹ تیار کرنے کے لئے کارخانے لگائے گئے، اگر چہ

ناصرالدین قاچار کے زمانے میں ریلوے کی ابتدا ہو چکی تھی لیکن رضا خاں نے اس کو خاطر خواہ وسعت دی، سرنگیں کھود کر ندی نالوں پر پل تعمیر کر کے ریلوے کو وسیع کیا گیا، سیاسی استحکام کے بعد قومی بینکاری شروع ہوئی، تہذیب جدید نے اسی دور میں اپنے پیر ایران میں جمائے۔

رضا خاں کے فرزند محمد رضا شاہ پہلوی کے عہد میں منصوبہ بندی کے ساتھ کام آگے بڑھتا رہا، متعدد منصوبے تیار کیے گئے، مختلف ادارے قائم کرنے کے ساتھ معدنیات کی دریافت کی گئی، سڑکوں اور ریلوے کی مزید توسیع ہوئی، بجلی کی پیداوار میں اضافہ کیا گیا، تجارتی مراکز قائم کیے گئے، زراعت و آبپاشی پر قابو پانے کے لئے متعدد منصوبے بنائے گئے اور ان پر عمل درآمد ہوا، بین الاقوامی معاہدات، علاقائی تجارت کا فروغ، پیٹرولیم اور پٹروکیمکل صنعتیں اور بینکنگ وانشورینس وغیرہ کو نہ صرف شروع کیا گیا بلکہ غیر معمولی فروغ دیا گیا۔

18.5.4 علمی خدمات

پہلوی دور حکومت میں ایک طرف ملکی زبان کو ترقی دی گئی، اسکول، کالج اور یونیورسٹیز قائم کیے گئے، دوسری طرف زبان و ادب پر خاص توجہ دی گئی بالخصوص زبان کو آسان بنانے کے لئے متعدد اقدامات کیے گئے، 1950ء میں اسی مقصد سے رضا شاہ کے حکم سے ایک ادارہ قائم ہوا جس کو فرہنگستان کا نام دیا گیا، اس نے ''مجلّہ نامہ فرہنگستان'' شایع کیا اور فارسی کو ایک خاص نہج دینے کی کوشش کی، نئے لسانی رجحانات اور ان کے اشکال کو دور کیا اور غیر ملکی زبانوں کے الفاظ کا متبادل تلاش کیا۔

اس دور میں مختصر افسانہ نویسی نے بڑی ترقی پائی، تنقید، تحقیق و تاریخ کو بھی فروغ ملا، جدید شاعری وجود میں آئی، اس میں نئے نئے رجحانات اور آزادی افکار نے جگہ پائی، بعض نئی ہیئت بھی اس دور کی شاعری کی یادگار ہیں۔

پہلوی عہد میں علمی ترقی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور کے آخری عہد میں ایران میں دو سو رسائل و اخبارات شائع ہونے لگے، جن میں دانشکدۂ ادبیات ارمغان، سخن اور یغما قابل ذکر ہیں، اخبارات میں سب سے زیادہ اشاعت کیہان اور اطلاعات کی ہوئی۔

18.6 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے ایران میں قائم ہونے والی تین خاندانی حکومتوں کے متعلق معلومات حاصل کیں، ایرانی تاریخ میں ان تینوں کی بڑی اہمیت ہے اور ان کا دور حکومت بھی خاصہ طویل ہے۔

چنانچہ صفوی حکومت کا باقاعدہ آغاز 1501ء میں ہوتا ہے اور 1737ء میں اس دور کا مکمل خاتمہ ہوتا ہے، اس عہد میں کل 11 / بادشاہ ہوئے ہیں، شاہ اسماعیل کے بعد سب سے زیادہ شہرت شاہ عباس اعظم کو ہوئی، اس دور میں ایران کو منظم کر کے ایک نقطہ پر متحد کیا گیا، بہت سے رفاہی اور سماجی کام انجام دیے گئے، تعمیرات کے ساتھ صنعتوں کا آغاز ہوا، اس دور میں نقاشی و مینا کاری اپنے عروج پر تھی، قالین بافی کی صنعت کا جواب نہ تھا۔

صفوی عہد میں بھی قاچاری خاندان کی اہمیت تھی، شاہ اسماعیل نے اپنے والد کے مرید قاچاریوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا، اس کا بانی آغا محمد خاں قاچار ہے، اس نے 1210ھ مطابق 1796ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا، اس کا جانشین اس کا بھتیجہ فتح علی شاہ ہوا، 1924ء میں باقاعدہ اس عہد کا خاتمہ ہوا، اس دور میں ایران کی رعایا پر بہت مظالم ہوئے، بالخصوص ابتدائی عہد میں ان کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک کیا گیا، لیکن بعد کے دور میں بڑی حد تک سماجی حالات بہتر ہوئے، آزادانہ تجارت کی ابتدا ہوئی، مدارس و اسکول قائم ہوئے، ناصرالدین قاچار نے تہران میں ایک کالج بھی قائم کیا، عصری تعلیم کے لئے بیرونی اساتذہ کا تقرر کیا، تعلیم پر توجہ دی اور سائنسی اسلوب میں نصابی کتابیں تیار کی گئیں، اس دور میں ایران میں مٹی کے تیل کی دریافت ہوئی اور ریلوے کا آغاز ہوا۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس عہد کے آخر میں داخلی حالات بگڑتے گئے افلاس عام ہوتا گیا، لوگ بے اطمینانی کا شکار ہوتے گئے، حتیٰ کہ عوام نے آزادی کی تحریک چھیڑ دی، تحریک مشروطیت کا آغاز ہو گیا، بالآخر 1924ء میں اس عہد کا خاتمہ ہو گیا اور پہلوی عہد کا آغاز ہوا۔

قاچاری عہد میں مجلس شوریٰ وجود میں آچکی تھی، اسی مجلس نے رضا خاں پہلوی کبیر کو 1923ء میں وزارت عظمیٰ دی، یوں تو رضا خاں کی حیثیت ایک فوجی افسر کی تھی لیکن اس کی اصلاحات کو دیکھ کر عوام اس کے گرویدہ تھے، باقاعدہ رضا خاں نے شاہ کا لقب 14 ستمبر 1925ء کو اختیار کیا اور پہلوی دور حکومت کی بنیاد رکھی، اس کا جانشین اس کا بیٹا محمد رضا شاہ پہلوی صغیر ہوا،

پہلوی عہد ایرانی تاریخ کا تابناک عہد ہے، اس دور میں بے شمار اصلاحات ہوئیں، متعدد شعبے قائم کیے گئے، صوبوں کا قیام ہوا، نظم ونسق کے ادارے قائم ہوئے، ملکی زبان کے ساتھ بے شمار جدید تعلیم کے ادارے قائم ہوئے، حرفت وصنعت اور معدنیات کی دریافت ہوئی، ملکی ترقی کے لئے منصوبہ بندیاں کی گئیں، علمی وادبی ترقی کی راہ ہموار کی گئی، ان تبدیلیوں اور اصلاحات کے لحاظ سے یہ عہد ایرانی تاریخ میں اہمیت کا حامل رہا۔

18.7 نمونے کے امتحانی سوالات

1. صفوی حکومت کے بانی کے متعلق اپنی معلومات درج کریں؟
2. قاچاری عہد میں تعلیمی حالات کیسے تھے؟
3. ایران میں قومی بیداری وآزادی کی تحریک کے بارے میں اپنی معلومات لکھیں؟
4. رضا شاہ پہلوی کے عہد کی اصلاحات قلمبند کریں؟
5. پہلوی عہد کے ترقیاتی کاموں پر روشنی ڈالیں؟
6. پہلوی حکومت کے قیام کے اسباب قلمبند کریں؟

18.8 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. تاریخ مفصل ایران — عبداللہ رازی
2. تاریخ ایران — پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی
3. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ — جلد دوم وسوم، ثروت صولت
4. اردو دائرہ معارف اسلامیہ

Malcolm, History of Persia .5

E,G.Brown, History of Persian literature .6

A literary History of Persia .7

اکائی 19 : صلیبی جنگیں اوران کے اثرات

اکائی کے اجزاء

19.1 مقصد

اس مقالہ کو پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی تاریخ میں صلیبی جنگوں کی کیا اہمیت ہے؟ اور اس کے تاریخی پس منظر کیا ہے؟ یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ صلیبی جنگوں کو تاریخ کا ایک المناک واقعہ کیوں قرار دیا گیا ہے؟ درحقیقت یہ یورپ اور ایشیا، مغرب اور مشرق، مسلمانوں اور عیسائیوں، صلیب اور ہلال کی جنگ ہے جس میں یورپ کے عیسائی صلیبی جنگ بازوں کو مکمل طور پر شکست ہوئی اور ان جنگوں کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔

19.2 تمہید

اسلامی حکومت کے قیام اور فتوحات کے ابتدائی دور سے ہی عیسائی دنیا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کمربستہ ہوگئی۔ خاص طور سے مسلمانوں نے جب یورپ کے مختلف مقامات پر اپنی حکومت قائم کرلی تو عیسائیوں کی نظروں میں یہ سلطنتیں خار کی طرح کھٹکتی رہیں۔ وہ اپنی ازلی عداوت کی وجہ سے مسلمانوں کا اقتدار اور اثر ہر جگہ سے ختم کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ اسی جذبہ کے تحت یورپ کے عیسائیوں نے بیت المقدس (یروشلم) کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھین لینے کی مہم چھیڑی۔

بیت المقدس یہودیوں' عیسائیوں اور مسلمانوں تینوں کے نزدیک مقدس ہے۔ تینوں اس کا احترام کرتے ہیں۔ یہودیوں کو وہاں سے رومیوں نے نکال باہر کیا تھا۔ جب رومیوں نے مسیحیت قبول کر لی تو تعصب کے جوش میں رہے سہے یہودیوں کو بھی وہاں سے نکال دیا۔ خلیفہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیت المقدس مسلمانوں کے قبضے میں آیا تھا۔ مسلمانوں نے کبھی بھی کسی عیسائی یا یہودی پر اس مقدس شہر کے دروازے بند نہیں کئے تھے اور نہ ہی کسی غیر مسلم کے ساتھ کوئی ظلم زیادتی کی۔ اس کے باوجود عیسائی پادریوں نے یورپ بھر میں گھوم گھوم کر مسلمانوں کے ظلم وستم کی گڑھی ہوئی داستانیں سنانے لگے اور لوگوں کو جوش دلا کر بیت المقدس کی فتح کے لئے آمادہ کر لیا۔ اس طرح یورپ کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے بیچ جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جنھیں صلیبی جنگ کہتے ہیں کیونکہ حملہ آور فرنگیوں کا نشان جنگ صلیب کا ایک تمغہ تھا جسے وہ اپنے سینوں سے لگا کر چلتے تھے۔

19.3 صلیبی جنگ کے اسباب

مختلف سیاسی، اقتصادی، سماجی اور مذہبی عوامل کے زیر اثر پوری عیسائی دنیا آپسی اختلافات کو بھلا کر مسلمانوں کے خلاف متحد ہو گئی اور اس جنگ کا آغاز ہوا۔ اس کا خاص مقصد مسلمانوں کا ایشیاء اور یورپ میں بڑھتے ہوئے اقتدار اور اثر کو ختم کرنا تھا۔ اس لئے اس جنگ کی فوری وجہ یہ تھی کہ گیارہویں صدی عیسوی میں مشرقی یورپ میں سلجوقیوں نے بڑھ کر یونانی علاقے اور ایشیائے کوچک پر اپنی حکومت قائم کر لی تو یورپ والے اس کو برداشت نہیں کر سکے کیونکہ یورپ کے مغربی اور مشرقی محاذوں پر مسلمانوں کا خطرہ بڑھ گیا۔ صحیح معنوں میں صلیبی جنگ کی ضرورت اس لئے پڑی کہ عیسائیت کی فلاح کے لئے ترکوں کو یورپ کی طرف بڑھنے سے روکا جائے کیونکہ گیارہویں صدی میں وہ بہت تیزی کے ساتھ یورپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

سلجوقی ترکوں نے بازنطینیوں (Byzantines) کو ایسی فیصلہ کن شکست دی کہ بازنطینی سلطنت متزلزل ہو گئی اور بازنطینی شہنشاہ ایشیاء کوچک میں اپنے مقبوضات کو سلجوقیوں سے آزاد کرانے کے لئے پوپ اربن ثانی سے فریاد کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس فریاد نے یورپ کے عیسائی دنیا کو متحد کرنے میں ایک اہم کڑی کا کام کیا۔ صلیبی جنگ کا دوسرا سبب یورپی جاگیرداروں کے وراثت سے محروم چھوٹے بیٹے تھے جن کے لئے اپنے وطن میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ وہاں کے دستور کے مطابق باپ کا بڑا بیٹا ہی وراثت کا مالک ہوتا تھا اور اس کے چھوٹے بیٹے کے لئے اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے اپنے وطن میں ان کا کوئی مستقبل نہیں تھا اور وہ وہاں کے سماج کے لئے بھی بوجھل اور خطرہ بنے ہوئے تھے، چنانچہ انھیں اسلامی مشرق میں نوآبادیاں قائم کرنے کے لئے قسمت آزمائی کا موقع فراہم کرنا تھا۔

تیسرا خاص سبب یہ تھا کہ یورپ میں جاگیرداری نظام کی روز افزوں ترقی اور بادشاہوں کی بڑھتی ہوئی قوت نے مغربی یورپ کے لئے دو خوفناک خطرے پیدا کر دیے تھے۔ ایک طرف تو اس جنگجو معاشرے کی باہمی عداوت ومنافرت سے شدید تصادم کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ دوسرے پوپ کا روحانی اقتدار خطرے میں تھا' لہٰذا مغربی عیسائیت کی وحدت کو برقرار رکھنے اور پاپائیت کو بحال کرنے کے لئے ضروری تھا کہ باہمی عداوت رکھنے والی قوتوں کا رُخ بدلا جائے۔ پوپ اربن دوم نے لوگوں کے مذہبی جذبات اس لئے ابھارے کہ اس کا مذہبی اقتدار قائم ہو' کیونکہ اس کا اختلاف نہ صرف یونان کے امپائر بلکہ اس زمانے کے انگلستان' جرمنی اور

فرانس کے حکمرانوں سے بہت بڑھ گیا تھا۔ اس لئے اس نے اپنے کھوئے ہوئے اثرات کو بحال کرنے کے لئے صلیبی جنگ کے نام پر ایک مذہبی جنون پیدا کر دیا اور مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کی نفرت پھیلائی۔ بہانہ یہ تراشا گیا کہ سلجوقی حکومت بیت المقدس میں مسیحی زائرین کے ساتھ بُرا سلوک کرتی ہے جو گناہ بخشوانے اور تزکیہ نفس کے لئے وہاں جاتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کے خلاف مظالم اور بدعنوانیوں کی طرح طرح کی داستانیں مشتہر کرنے لگے۔ یہ غلط افواہ نہایت سرعت سے تمام یورپ میں پھیل گئی اور اس نے عام عیسائیوں کے دلوں کو نفرت سے بھر دیا۔

اٹلی کے تجارتی بندرگاہوں کے تجارتی عزائم نے چوتھے سبب کا کام دیا۔ یورپ کے تاجروں نے بھی اس جنگ کو ہوا دی کیونکہ وہ، خصوصاً اٹلی کے تاجر مشرق میں اپنی تجارتی منڈی قائم کرنے کی خاطر ایسے مشرقی سواحل چاہتے تھے، جہاں ان کے تجارتی بیڑے پہنچ کر مشرق کے بازاروں پر چھا جائیں۔ اس غرض سے ان تاجروں نے اپنے اپنے جہاز دیے کر صلیبیوں کی فوجی نقل وحرکت میں بڑی مدد پہنچائی اور ساتھ ہی ساتھ تجارتی مال بھی لانے اور لے جانے لگے اور اس طرح مقدس مذہبی لڑائی کا رشتہ تجارتی نفع اندوزی سے جڑ گیا۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کا سیاسی انتشار ان صلیبی جنگوں کا سب سے بڑا سبب بنا۔ 1092ء میں سلطان ملک شاہ کے انتقال کے بعد مضبوط سلجوقی سلطنت بکھرنے لگی اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ ملک شاہ کے بعد اس کا لڑکا رکن الدین کے لقب سے اس کا جانشین ہوا مگر اس کا بھائی محمد بھی تخت کا دعویدار ہوگیا جس کے بعد خونریز خانہ جنگی ہوئی۔ اسماعیلیوں یعنی حسن بن صباح کے فدائیوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے بھی بڑا خلل رہا اور انھوں نے شمالی ایران، عراق اور شام پر قبضہ کرلیا جس سے سلجوقیوں کی حکومت اور بھی کمزور ہوگئی۔ خلافت بغداد بھی بہت کمزور ہو چکی تھی۔ ادھر مصر کے فاطمی حکمراں بھی عام مسلمانوں کے دشمن بن گئے تھے اور صلیبیوں کی مدد کے لئے تیار بیٹھے ہوئے تھے۔ ان تمام حالات کا جائزہ لیتے ہوئے پوپ اربن ثانی نے نومبر 1095ء میں فرانس کے کلیر ماؤنٹ کے تاریخی اجتماع میں صلیبی جنگوں کو خدا کی مشیت قرار دیا اور یورپ کو اسلامی مشرق پر ٹوٹ پڑنے کی تلقین کرتے ہوئے بتایا کہ مقدس جنگ سے بیت المقدس کی تسخیر کے علاوہ ایشیائی ممالک کی دولت وثروت پر بھی مکمل قبضہ مقصود ہے۔ اس زمانہ میں یہ دیوانہ پن تھا کہ پوپ جو کچھ بھی کہتا تھا سب اس کی تائید کرتے تھے۔ لوگوں کو یہ بھی لالچ دی گئی کہ ان کو اس جنگ سے دنیا کا آرام وعیش اور آخرت کی مغفرت بھی حاصل ہوگی۔ یورپ کے بادشاہوں اور عوام کو یہ بھی بتایا گیا کہ اسلامی خلافت اب کمزور اور ناتواں ہو چکی ہے اس لئے وہ عیسائی لشکروں کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔ اس لئے جب کلیر ماؤنٹ کے تاریخی اجتماع میں صلیبی جنگ کا اعلان کیا گیا تو سب نے لبیک کہا اور زائرین کے مسلّح قافلوں کی روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

19.4 صلیبی جنگوں کی کیفیت

صلیبی جنگوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ بعض مورخین کے مطابق سات مرتبہ صلیبیوں نے حملے کئے اور بعض کے مطابق نو مرتبہ۔ دراصل 9 میں سے 2 صلیبی جنگیں ایسی ہیں جن میں صلیبیوں کا مقابلہ مسلمانوں سے نہیں ہوا بلکہ وہ مقابلے سے پہلے آپس ہی میں الجھ گئے تھے۔ اس طرح ان کی تعداد 7 ہو جاتی ہے۔ ان جنگوں کی ابتداء 1096ء میں ہوئی اور یہ سلسلہ 1292ء تک قائم

رہا۔ تقریباً دوسو برس کی اثنا میں صلیبی حملہ آوروں کا سیلاب یورپ سے شام اور فلسطین پہنچتا رہا۔ شروع کے پانچ صلیبی دستے بدنظمی اور آپسی لوٹ مار کی وجہ سے ناکام رہے۔ ان دستوں کی ناکامی کی بنا پر مغربی مورخین نے ان کو صلیبی جنگوں میں شامل نہیں کیا ہے۔

1097ء میں 1,50,000 سے زیادہ صلیبی جنگ باز گاڈفرے (Godfrey) کی قیادت میں یورپ کے مختلف علاقوں سے آکر قسطنطنیہ میں اکٹھے ہوئے تاکہ وہاں سے ایشیائے کوچک (Asia Minor) ہوتے ہوئے شام اور فلسطین میں جاسکیں۔ اس طرح پہلی صلیبی جنگ کا آغاز ہوا۔ اس وقت ایشیائے کوچک پر سلجوقی سلطان قلیج ارسلان کی حکومت تھی۔ ایشیائے کوچک پہنچنے پر صلیبیوں نے نقیہ (Nicaea) شہر کا محاصرہ کرلیا اور ایک مہینے کی جنگ کے بعد اس پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد دوریلیم (Dorylaeum) کے مقام پر ایک فیصلہ کن جنگ میں سلجوقی لشکر کو پسپا کردیا اور کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ اس کے نتیجے میں ایشیائے کوچک کا مغربی آدھا حصہ بازنطینی شہنشاہ الیکسیس (Alexius) کے دائرہ اقتدار میں آگیا۔ ٹارس کی پہاڑیاں (Taurus Mountains) عبور کرنے کے بعد صلیبی لشکر کا ایک دستہ بالڈون (Baldwin) کی قیادت میں آرمینیہ کے مشرقی علاقے میں داخل ہوگیا جہاں صلیبیوں نے 1098ء میں اڈیسہ (Edessa) (الرہا) پر قبضہ کرلیا جو مسلم ایشیاء میں پہلی عیسائی ریاست بنی۔

صلیبی لشکر کا دوسرا خاص دستہ انطاکیہ (Antioch) شہر پہنچا جہاں ایک سلجوقی امیر کی حکومت تھی۔ صلیبیوں نے اس شہر کا محاصرہ کرلیا اور تقریباً نو مہینے کے بعد اس پر قابض ہوگئے۔ انطاکیہ پر جب ان کا تسلط ہوا تو مسلمانوں کا قتل عام شروع کردیا۔ دو ہزار ترکوں کے سر کاٹ کر فوجی کیمپ کے گرد نمائش کے لئے لٹکا دیے گئے۔ سلجوقی خاندان کے نوجوان ان کے والدین کے سامنے مارے جاتے۔ انسانیت سوز حرکتیں جتنی ہوسکتی تھیں سب عمل میں آگئیں۔ عورتوں کی عصمت ریزی اور شراب نوشی کے ذلت آمیز فواحش سب دیکھنے میں آئے۔ ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) کے مطابق ان لاطینی وحشیوں کی وجہ سے عورتوں اور بچوں کو کہیں پناہ نہیں ملی، مسجدیں بے رحمانہ طریقے پر مسمار کی گئیں، ہر گھر مذبح خانہ بنا ہوا تھا، گلی کوچے میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور دس ہزار آدمی موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ اس طرح انطاکیہ شمالی شام میں دوسری عیسائی ریاست کا دارالسلطنت بنا جس کو بوہمنڈ (Bohemond) کے نگرانی میں رکھا گیا۔

انطاکیہ سے یہ فوج شمالی شام کی طرف بڑھ کر معرۃ النعمان پہنچی جہاں تین دن تک قتل عام کرتی رہی۔ شام کے زرخیز ترین شہروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ وہاں تقریباً ایک لاکھ مسلمان قتل اور اسی قدر زندہ گرفتار کئے گئے۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر صلیبیوں نے فلسطین کے رملہ شہر پر قبضہ کرلیا جس کو مسلمان چھوڑ کر پہلے ہی فرار ہوچکے تھے۔ اور بالآخر جون 1099ء میں 40,000 صلیبی جنگ باز بیت المقدس پہنچ گئے اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ 15 رجولائی کو انھوں نے شہر پر دھاوا بول دیا اور 70,000 سے زیادہ مسلمانوں کا قتل کیا۔ 1109ء میں شام کے شہر طرابلس (Tripoli) پر بھی صلیبیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس طرح پہلی صلیبی جنگ کے نتیجے میں مسلم ایشیاء میں چار عیسائی ریاستیں قائم ہوگئیں۔

بیت المقدس پر تصرف حاصل کرنے کے بعد چند سال کے اندر ہی صلیبیوں نے فلسطین کے بڑے حصے پر قبضہ کرلیا۔ مسلمانوں میں خونریزی اور غارتگری سے بے چینی ضرور پیدا ہوئی لیکن وہ یورپ کی طرح کوئی متحدہ محاذ نہیں قائم کرسکے۔ اس وقت خلافت

عباسیہ بے جان ہوچکی تھی اور سلجوق خانہ جنگی میں مبتلا تھے۔ اس سے فائدہ اُٹھا کر صلیبیوں نے اپنی بربریت اور سفاکی جاری رکھی۔ مؤرخ لین پول کے مطابق صلیبیوں نے مسلمانوں پر زندگی تنگ کردی۔ انھوں نے اپنے سرداروں کو اشتعال دیا کہ وہ مسلمانوں پر بلاوجہ اور بلاسبب لوٹ مار کے حملے شروع کر دیں۔ اس طرح انھوں نے مسلمانوں کو ایسا نقصان پہنچایا جس کا بیان کرنا دشوار ہے۔

19.5 مسلمانوں کا ردِعمل: عمادالدین زنگی اور نورالدین زنگی

مندرجہ بالا نازک حالات میں عمادالدین زنگی' اتابک موصل' نے سب سے پہلے صلیبیوں کے مقابلے کے لئے بہادرانہ قدم اُٹھایا۔ بارہویں صدی عیسوی میں سلجوقی سلطنت کا بڑا حصہ متفرق چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔ ان ہی میں عمادالدین زنگی موصل کا فرماں روا ہوگیا۔ وہ ملک شاہ کے غلاموں میں سے ایک غلام کی اولاد میں سے تھا۔ اس میں غیر معمولی قسم کی سیاسی ہوشمندی تھی۔ اس نے یہ اچھی طرح محسوس کرلیا تھا کہ صلیبیوں کے خلاف مسلمانوں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ ان کا متحد نہ ہونا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس نے صلیبیوں کے خلاف ایک منظم محاذ قائم کیا۔ اس غرض سے اس نے جزیرہ ابن عمر، نصیبین، سنجار اور حرّان جیسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ختم کرکے شام کی طرف آگے بڑھا اور وہاں بھی مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستوں مثلاً حلب' حماۃ اور حمص وغیرہ کو ختم کرکے ان پر قابض ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے عیسائیوں کے قلعہ اثارب پر زبردست حملہ کیا اور اس پر فتح پائی۔ اس قلعہ کی بڑی فوجی اہمیت تھی۔ صلیبیوں کے خلاف اس کی دوسری بڑی کامیابی عیسائیوں کے قلعہ الرُہا پر قبضہ تھا جہاں مسلمانوں پر بڑے مظالم ہوئے تھے۔ الرُہا کی تسخیر فتح الفتوح تھی۔ یہ شہر شام اور فلسطین میں سبھی عیسائی ریاستوں کے لئے قوت کا بڑا مرکز تھا۔ اس سے عیسائیوں میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی۔ اس کے نتیجے میں یورپ کی قوتیں پھر متحد ہوئیں اور دوسری صلیبی جنگ (1149ء-1147ء) کا سلسلہ شروع ہوا۔ مگر اس سے پہلے ہی عمادالدین زنگی کو اس کے غلاموں نے ذاتی دشمنی کی وجہ سے 1147ء میں قتل کردیا۔ لیکن وہ اپنی زندگی میں ایسے کام کر گیا تھا جسے تمام نصرانی دنیا بھی مل کر نہ مٹا سکتی تھی۔

عمادالدین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نورالدین زنگی جانشین بنا۔ یہ بڑا ہی نیک دل، حق شناس، عادل اور جوانمرد سلطان تھا۔ بیت المال سے اپنے لئے ایک کوڑی بھی نہیں لیتا تھا۔ جتنا مال خزانے میں آتا فوج اور قلعوں کی درستی یا رعایا کی تعلیم اور دوسری ضروریات پر صرف کر دیتا تھا۔ وہ اپنی موت تک برابر صلیبیوں سے معرکہ آرائی کرتا رہا۔ اس نے حلب (Aleppo) کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور 28 سال تک پورے شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی۔ اس کا صلیبیوں سے پہلا تصادم اس وقت ہوا جب الرُہا کے عیسائیوں نے فرانسیسی فوجی مدد کے بل بوتے، جو ان کے پاس جوسلن ثانی (Joscelin II) کی قیادت میں پہنچی تھی' اس کے خلاف بغاوت کردیا۔ الرُہا پر عیسائیوں نے وقتی طور پر قبضہ بھی کرلیا اور بڑی تعداد میں مسلمانوں کو ہلاک کیا۔ نورالدین فوراً اپنی فوج لے کر اس شہر میں پہنچا' بغاوت کو کچلا اور الرُہا پر دوبارہ قبضہ کرلیا اور جوسلن کو گرفتار کرکے اندھا کر دیا کیونکہ وہ مسلمانوں کا کٹر دشمن تھا اور ان سے بہت نفرت کرتا تھا۔ اس کے بعد اس نے الرُہا کے علاقے اور شمالی سرحدوں سے عیسائیوں کی قوت کو کچل دیا۔ اس طرح اپنی آخری عمر تک نورالدین صلیبیوں پر دباؤ بناتا رہا اور ان پر حملہ کرتا رہا۔ 1154ء میں اس نے دمشق بھی فتح کرلیا اور پھر اس کو اپنا مرکز بنایا اور یہ بیت المقدس کو واپس لینے کی طرف پہلا قدم تھا۔ 1174ء میں جب نورالدین کا انتقال ہوا تو اس کے نائب صلاح الدین ایوبی کے لئے اس بات کے لئے راستہ ہموار ہوگیا تھا کہ وہ شام اور فلسطین کو صلیبیوں سے آزاد کرا سکے۔

19.6 شام اور فلسطین کو آزاد کرانے میں صلاح الدین ایوبی کا رول

عماد الدین زنگی کے زمانے میں دو کرد بھائی زنگی سلطنت کے دست و بازو بن گئے تھے۔ ایک کا نام نجم الدین ایوب تھا اور دوسرے کا شیر کوہ۔ نجم الدین کا بیٹا سلطان صلاح الدین تھا جس نے صلیبی جنگوں میں سب سے بڑھ کر ناموری حاصل کی۔ اس نے عماد الدین اور نور الدین کے شروع کیے ہوئے کام کو پورا کیا اور ایوبی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

نور الدین زنگی بیت المقدس پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا' لیکن اسے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں مصر کی سمت سے صلیبی اسے نقصان نہ پہنچائیں جہاں فاطمی حکمراں تھے جو صلیبیوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ اس لئے اس نے شیر کوہ کو 1169ء میں مصر بھیج دیا تاکہ وہاں کے حالات پر قابو پاکر صلیبیوں کے لئے مصر کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ شیر کوہ اپنے بھتیجے صلاح الدین کو بھی ساتھ لے گئے۔ جب اس کا انتقال ہوا تو صلاح الدین نے اس کی جگہ لے لی۔ اس نے اپنی طاقت کو مضبوط کیا اور وہاں کے حالات پر قابو پانے کے بعد 1171ء میں آخری فاطمی خلیفہ العاضد کو معزول کر دیا اور اس کا نام خطبہ سے خارج کر کے عباسی خلیفہ کا نام پڑھوا دیا۔ اس طرح مصر نور الدین زنگی کا ایک صوبہ بن گیا اور اس کا تعلق باقی دنیائے اسلام سے استوار ہو گیا۔

1174ء میں نور الدین زنگی کا انتقال ہو گیا تو اس کے کمسن بیٹے کے خلاف شام میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ صلاح الدین فوج لے کر مصر سے شام پہنچا اور سارے انتظامات درست کیے۔ اب اس نے فلسطین اور بیت المقدس کو واپس لینے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ راستے کی ایک بڑی رکاوٹ اسماعیلی باطنی فدائین تھے جنھوں نے صلیبیوں کی امداد میں دو مرتبہ اس پر قاتلانہ حملہ کر چکے تھے۔ صلیبیوں کے خلاف پیش قدمی کرنے سے پہلے ان پر قابو پانا ضروری تھا۔ اس لئے 1176ء میں اس نے مصیاد کا محاصرہ کر لیا جو فدائین کے سردار رشید الدین سنان کا صدر دفتر تھا۔ سنان کو مجبوراً اس کے راستے سے ہٹ جانے کی شرط پر صلح کرنی پڑی۔

اب صلاح الدین صلیبیوں پر منظم طریقے سے حملہ آور ہوا اور فتوحات حاصل کیں۔ ان کے خلاف پیش قدمی کرتے ہوئے یکم جولائی 1187ء میں طبریہ (Tiberias) شہر کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ چند دنوں کے بعد صلیبیوں نے 20,000 سپاہیوں کے لشکر سے اس پر حملہ کر دیا۔ حطین کے مقام پر دونوں فوجوں میں خوفناک جنگ ہوئی۔ یہ ایک فیصلہ کن جنگ تھی جس میں صلیبیوں نے فاش شکست کھائی۔ اس جنگ میں صلیبیوں کے تمام بڑے بڑے امراء اور حکمراں گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے بعد 2 / اکتوبر 1187ء نوے سال کے بعد صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو صلیبیوں سے واپس لے لیا۔ سلطان نے ساری مسیحی آبادی کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا۔ وہ جس فراخدلانہ اور روادارانہ انداز میں بیت المقدس میں داخل ہوا اس کی تعریف یوروپین مورخوں نے بھی کی ہے۔ گبن لکھتا ہے کہ اس ترک فاتح نے مفتوحوں کو کسی مصیبت اور پریشانی میں مبتلا نہیں ہونے دیا۔ اس نے جنگ کے یتیموں اور بیواؤں میں خیرات تقسیم کی۔ جنگ کے زخمیوں کے علاج اور دیکھ بھال کے لئے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں۔

یروشلم پر فتح کے بعد فلسطین کے باقی شہروں پر قبضہ کرنا سلطان صلاح الدین کے لئے آسان ہو گیا۔ مثال کے طور پر جنوب میں لاذقیہ' جبلہ' صہیون اور شمال میں الکرک اور شوبک اور دیگر مقامات شقیف، ارنوں، کوکب اور صفد وغیرہ 1187ء کے اواخر تک مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے۔ اب صرف چند ساحلی مقامات جیسے انطاکیہ، طرابلس، عکہ اور صور ہی صلیبیوں کے قبضے میں رہ گئے۔

صلاح الدین نے بیت المقدس پر قبضہ کرلیا تو یورپ میں غیظ وغضب کی لہر پھر اُٹھی۔ جرمنی کا قیصر فریڈرک، انگلستان کا رچرڈ شیر دل اور فرانس کا فلپ دوم اپنے آپسی اختلافات کو بھلا کر شام اور فلسطین کی طرف اُمڈ پڑے اور تیسری صلیبی جنگ (1192ء-1189ء) کا آغاز ہوا۔ چار سال تک صلاح الدین کے خلاف معرکہ آرائی ہوتی رہی، مگر صلاح الدین ہی ان پر بھاری رہا۔ جب صلح ہوئی تو بیت المقدس اور دوسرے شہر تو مسلمانوں کے قبضہ میں رہے۔ صرف ساحل عکہ پر ایک مختصر سی ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی۔ تیسری صلیبی جنگ کے خاتمہ کے چند ماہ بعد 10 رفروری 1193ء میں 55 سال کی عمر میں صلاح الدین ایوبی کا انتقال ہوگیا۔

دوسری اور تیسری لڑائیوں سے عیسائیوں کے لئے کوئی خاص نتائج مرتب نہیں ہوسکے تو پوپ انوسینٹ سوم (Innocent III) نے یورپ کو چوتھی صلیبی جنگ (1204ء-1202ء) کے لئے اُبھارا۔ اس میں زیادہ تر فرانس کے امراء شریک ہوئے۔ جب وہ یہ مقدس فوج لے کر وینس (Venice) پہنچے تا کہ وہاں جہازوں پر سوار ہو کر شام کے ساحل پر اتریں، تو وینس کے تاجروں کو اس مقدس جنگ سے زیادہ اپنی تجارت کی فکر ہوئی جنھوں نے مشرق کی تمام بندرگاہوں پر قبضہ کرلیا تھا اور قسطنطنیہ تک ان کی تجارت پھیلی ہوئی تھی۔ مگر ان کی اس تجارت میں زارا کا شہران کا رقیب تھا، وینس کے تاجروں نے صلیبیوں کو جہاز اس شرط پر دینا منظور کیا کہ وہ عیسائی شہر زارا کو فتح کر کے وینس کے ماتحت کردیں۔ صلیبی تیار ہوگئے اور زارا فتح کرلیا گیا۔ جیسے ہی یہ لشکر شام کی طرف روانہ ہوا قسطنطنیہ کے شہنشاہ کا بھتیجا الیکسیس (Alexius) اپنے چچا کے خلاف صلیبیوں سے فوجی امداد کا طلب گار ہوا اور ان کو ہر قسم کی مراعات پیش کی۔ لالچ میں آ کر صلیبی جنگجو جو مسلمانوں سے لڑنے کا حلف اُٹھائے تھے دوسرے مسیحی شہر پر حملہ آور ہونے کے لئے روانہ ہوگئے اور اس شہر (قسطنطنیہ) کو بہت بری طرح سے لوٹا اور وینس کے تاجروں نے ہر قسم کی رعایتیں حاصل کیں۔ اس حملے کے نتیجہ میں قسطنطنیہ کی شہنشاہی اس قدر کمزور ہوگئی 1453ء میں یہ ترکوں کے قبضہ میں آگیا۔ اس اندوہناک مہم کے بعد صلیبی جنگوں کا زمانہ تقریباً ختم سا ہوگیا۔

اس کے بعد اگرچہ صلیبیوں کا مسلم ایشیاء پر حملوں کا سلسلہ 1292ء تک قائم رہا، لیکن ان کو پستی اور شکست کے سوا کچھ بھی نہیں ملا۔ پانچویں صلیبی جنگ (1221ء-1218ء) سے ان لشکریوں کی ذہنی شکست کا ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ اب وہ مقدس مقامات کو آزاد کرنے کے بجائے مصر کی طرف بڑھے لیکن وہ اپنی مقصد میں بری طرح ناکام ہوئے۔ چھٹی صلیبی جنگ (1229ء-1228ء) میں جرمنی کا شہنشاہ فریڈریک دوم (Frederick II) پوپ کے ایماء سے یروشلم گیا تو اس نے مصر کے سلطان الکامل سے صلح کرلی اور مسیحی زائرین کے لئے فلسطین میں داخل ہونے کی اجازت حاصل کرلی اور ایک دفاعی معاہدہ بھی کرلیا' لیکن پوپ اس سے خوش نہیں ہوا اور اسے کلیسا سے خارج کردیا۔

1244ء میں جب سلطان مصر نے بیت المقدس پر مکمل قبضہ کر کے تمام مسیحی فوجوں کو شام سے نکال دیا تو فرانس کا بادشاہ لوئی نہم (King Louis IX) 50,000 فوج کے ساتھ بیت المقدس فتح کرنے کی غرض سے روانہ ہوا۔ اس وقت ایوبی سلطان صالح نجم الدین شام میں مصروف تھا۔ صلیبی لشکر 1800 جہازوں میں سوار ہو کر پہلے قبرص (Cyprus) پہنچا اور ساتویں صلیبی جنگ (1250ء-1249ء) کا آغاز ہوا۔ وہاں سے صلیبی دمیاط کے لئے روانہ ہوئے۔ دمیاط فتح کر کے قاہرہ کی طرف پیش قدمی کی۔ اس نازک گھڑی میں سلطان صالح کے انتقال کے بعد اس کی ملکہ شجرۃ الدر نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کی قیادت میں مسلمانوں نے منصورہ میں صلیبیوں کو بری طرح شکست دی اور بادشاہ لوئی نے ہتھیار ڈال دئے اور قید ہوگیا بعد میں فدیہ دے کر رہا ہوا۔

19.7 صلیبی جنگوں کے اثرات

ان صلیبی جنگوں کے دوررس سیاسی، تجارتی، اقتصادی، معاشرتی اور علمی اثرات مرتب ہوئے جن سے یورپ والوں کو بہت فوائد حاصل ہوئے۔ ان جنگوں کی وجہ سے پوپ کو اپنے سیاسی اثرات بڑھانے کا موقع مل گیا۔ پہلے تو یہ اثرات مذہبی تھے، مگر ان مذہبی اثرات سے فائدہ اُٹھا کر وہ مغربی یورپ کی تمام حکومتوں پر سیاسی حیثیت سے بھی اثر انداز ہونے لگا جس سے وہاں مذہبی اور سیاسی کشمکش بڑھ گئی۔ ان لڑائیوں کا سب سے زیادہ اثر بازنطینی سلطنت پر پڑا جس کی سرحد یورپ میں دریائے ڈینوب اور ایشیاء میں اناطولیہ اور شام تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کو مسلمان فتح نہ کر سکے تھے۔ مگر چوتھی صلیبی جنگ کے دوران صلیبیوں نے اس کو اس قدر لوٹ کر برباد کر دیا تھا کہ عثمانی سلطنت نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر قبضہ کر لیا۔

ان جنگوں کی وجہ سے یورپ کے تاجروں کو بڑے تجارتی فوائد حاصل ہوئے۔ ان کو مشرق میں ایک تجارتی منڈی مل گئی کیونکہ مشرق کے تمام بڑے بڑے بندرگاہوں میں انھوں نے تجارتی حقوق پیدا کر لئے تھے۔ اس طرح قسطنطنیہ کی تجارت وینس اور جنیوا کے بندرگاہوں میں منتقل ہو گئی تھی۔ وینس کے تاجروں نے تو اسکندریہ کے مسلمانوں سے اپنی تجارت کی خاطر دوستانہ تعلقات بھی پیدا کر لئے تھے۔ یہاں تک کہ ان لڑائیوں کے ختم ہونے کے بعد بھی ان کی تجارت بدستور جاری رہی۔ اس کے علاوہ انگلستان، جرمنی، ڈنمارک اور ناروے کے تجارتی بیڑے بھی بحرِ قلزم میں پہنچنے لگے۔ جس سے ان ملکوں کی دولت میں اضافہ ہونے لگا۔ تجارت بڑھی تو بینک بھی قائم ہونے لگے۔ زرِ مبادلہ کی سرگرمیاں بھی بڑھیں اور بحری قوانین کا نفاذ بھی صلیبی جنگ کے ہی زمانہ سے شروع ہوا۔ اس تجارت سے یورپ میں مرچوں، مسالہ جات اور عطریات کا رواج بھی ہونے لگا۔ روئی اور ریشم کی صنعتیں شام سے یورپ میں آنے لگیں۔ ہندوستان سے مسالہ اور جواہرات اور چین سے چینی برتن آنے لگے۔ اس کے علاوہ بہت سے نئے پودے اور پھل، نئے رنگ، پوشاک، شکر، لیمو، خوبانی، تربوزے، ململ، آئینے اور تسبیح کے دانے بھی یورپ میں مشرق سے آنے لگے۔

مسلمانوں کے طور طریقہ دیکھنے کے بعد صلیبیوں کے مذاق میں بھی تبدیلی آئی۔ یورپ کا طرزِ عمارت بھی بدل گیا۔ ان کی عمارتوں میں عرب کے تمدن کے اثرات پائے جانے لگے۔ ان کے باشندوں کا معیارِ زندگی بھی بڑھ گیا۔ اس سے پہلے ان کا عام خیال تھا کہ مسلمان بُت پرست ہیں اور محمدؐ کی پوجا کرتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں سے میل ملاپ بڑھنے کے بعد ان کی یہ غلط فہمی جاتی رہی۔ جب ان کا آپسی ملنا جلنا بڑھا تو دونوں میں ہمسایہ کے دوستانہ تعلقات پیدا ہونے لگے اور عیسائی اپنے یہاں مقامی کاریگروں اور کاشتکاروں کو رکھنے لگے۔ عیسائیوں نے اپنا یوروپی لباس چھوڑ کر عربوں کا آرام دہ لباس پہننے لگے۔ وہ ایسی غذائیں بھی کھانے لگے جن میں مسالہ اور شکر کا استعمال ہوتا تھا۔ انھوں نے مقامی باشندوں سے شادی بیاہ کا رشتہ بھی قائم کرنا شروع کر دیا۔

ان جنگوں کے علمی اثرات بھی مرتب ہوئے۔ یورپ کے جغرافیہ دانوں اور مورخوں نے لٹریچر میں مفید اضافہ کیا۔ اس کے بعد یورپ والوں کو مشرق کی زبانوں کو سیکھنے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ 1311ء تک یورپ میں مشرقی زبانوں کے چھ اسکول کھل گئے اور مشرق کے بہت سے قصے یورپ میں لکھے جانے لگے۔ یورپ کے ملکوں کی زبانوں میں عربی کے الفاظ بدلی ہوئی شکلوں میں استعمال ہونے لگے۔ تجارت، جہاز رانی اور موسیقی کے بھی اصطلاحات عربی زبان سے لئے گئے۔

عیسائی مورخوں نے ان لڑائیوں کی تاریخیں بھی لکھیں جن سے تاریخی ادب میں مفید اضافہ ہوا۔ان پر اچھی اچھی نظمیں بھی لکھی گئیں۔فرانسیسی شاعری پر تو صلیبی لڑائیوں کا اچھا خاصا اثر پڑا۔ان کی وجہ سے عربی داستانی ادب بھی مغرب میں فروغ پانے لگا۔الف لیلہ اور کلیلہ و دمنہ کی کہانیاں بھی مغرب میں سنائی جانے لگیں۔

ان جنگوں نے یورپ کو باہری وسیع دنیا خصوصاً اسلامی مشرق سے روشناس کرایا۔یورپ کے تہذیب و تمدن کی ترقی پر اس کا نمایاں اثر پڑا۔یورپ کے پادری اور صلیبی جب عربی کتابیں پڑھنے لگے تو عربی شاعری نے ان کے دلوں پر بہت اثر کیا اور یورپ میں شاعری عربی طرز پر مقبول ہوگئی۔ان میں ادبی تحریک کا بھی آغاز ہوا۔اسلامی ادب کے زیر اثر ان میں مساوات کا جذبہ ابھرا۔اسلامی عقیدے سے فیضیاب ہو کر انھوں نے پوپ کی من گھڑت معجزات کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔غرض یہ کہ عیسائی مذہب نے ایک نیا روپ لے لیا جسے پروٹسٹنٹ چرچ کے لقب سے پکارا گیا۔پہلی صلیبی جنگ کے بعد اس نئے مذہبی رجحان کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ساتھ ہی ساتھ وہ اسلامی ادب میں بھی دلچسپی لینے لگے۔مثال کے طور پر ایک انگریز صلیبی رابرٹ نے قرآن مجید کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔اس طرح صلیبی جنگوں کی بدولت مغربی یورپ میں لکھنے پڑھنے اور تحقیق کا رجحان پیدا ہوا۔اس کے نتیجہ میں مختلف علوم و فنون خصوصاً ریاضیات، ہندسہ، طب اور علم کیمیاء وغیرہ پر عربی کتابوں کا یورپی زبانوں خاص طور سے فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا۔کیونکہ اس دور میں فرانسیسی زبان ہی عام فہم تھی اور تمام یورپ کی زبان سمجھی جاتی تھی اس طرح اسلام کا پیغام مغرب میں پہنچا۔یہ ضرور ہے کہ یہ ترجمے کلیۃً صحت کے حامل نہ تھے۔مگر پھر بھی اپنا اثر کر گئے۔یہی رجحان بعد میں ان میں نشاۃ ثانیہ کا بھی سبب بنا۔

ان جنگوں کا ایک بڑا منفی اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کے خلاف ایک مذہبی جنون پیدا کر دیا گیا اور ان کے خلاف ہر طرح کی نفرت پھیلائی گئی۔ایک طویل مدت گزرنے کے بعد بھی نفرت کی یہ آگ وقتاً فوقتاً ان کے دلوں میں سلگتی رہتی ہے۔میدان جنگ میں ناکام ہو جانے کے بعد بھی انھوں نے مسلمانوں سے دشمنی اور عناد جاری رکھا۔یہ ان ہی جنگوں کا نتیجہ ہے کہ بڑی تعداد میں متعصب مستشرقین پیدا ہوئے جنھوں نے اسلامی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کیا۔وہ اب بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش اور پروپگنڈہ میں مصروف ہیں۔

آخر میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ صلیبی جنگوں سے جو نتائج برآمد ہوئے اور مشرق اور مغرب پر ان کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ دور رس بھی تھے۔مجموعی طور پر ان سے مغرب کو فوائد زیادہ اور نقصانات کم ہوئے۔اس کے برعکس اسلامی دنیا کو ان حروب سے جو نقصانات پہنچے ان کا دائرہ بہت وسیع ہے اور جو فائدہ حاصل ہوئے وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے پاس جو معاشرتی، ثقافتی، علمی اور اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ تھے مسلمانوں کو دینے کے لئے ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا جب کہ وہ مسلمانوں کی دولت، ثروت اور علمی میراث سے متاثر اور مالامال ہوئے۔وہ ان لڑائیوں کے مسلم سورماؤں جیسے عماد الدین زنگی، نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کے کردار اور شجاعت سے مرعوب اور متاثر رہے جیسا کہ حسب ذیل یورپ کے مورخین کے بیانات سے ظاہر ہے۔

مشہور مورخ گبن کے مطابق عماد الدین زنگی نے فرنگیوں سے انطاکیہ میں لڑ کر اپنی سپہ گری کی شہرت قائم کی۔اس نے اپنے عوام کی امیدوں کو پورا کیا۔اس کے سپاہی اپنے فوجی کیمپ ہی کو اپنا ملک سمجھتے تھے۔ان کو اپنے اس آقا کے فیاضانہ انعامات کے عطا کرنے پر پورا بھروسہ رہتا، اور وہ بھی ان کی عدم موجودگی میں ان کے خاندانوں کی پوری نگہبانی کرتا تھا۔

اس کے بعد اس کے بیٹے نور الدین نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کی قوت کو متحد کیا، حلب کی حکومت میں دمشق کا اضافہ کیا، شام کے عیسائیوں کے خلاف بڑی طویل لڑائی لڑتا رہا، اس نے اپنی سلطنت کی سرحد دجلہ سے نیل کے ساحل تک بڑھا دی۔ عیسائی خود اس کی ہوشمندی، شجاعت، انصاف پسندی اور سیرت کی طہارت کو تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ اس مقدس سپاہی نے اسلام کے پہلے چار خلفاء کے جوش وخروش اور سادگی کا اعادہ کیا تھا۔ اس کے محل میں سونا اور ریشمی کپڑے نہیں دکھائی دیتے تھے۔ اس کی مملکت میں شراب کا استعمال ممنوع تھا۔ بیت المال کی آمدنی صرف عوام کی خدمت میں صرف ہوتی تھی۔ اس کی خانگی زندگی بہت ہی سادہ تھی۔ اس کی ملکہ اپنے اخراجات کے لئے کچھ رقمیں مانگتی' تو وہ کہتا ''مجھ پر خوف الٰہی طاری رہتا ہے۔ میں مسلمانوں کا صرف خزانچی ہوں۔ میں ان کے مال کا ناجائز مصرف نہیں لے سکتا۔ حمص میں میری ملکیت میں تین دکانیں ہیں' یہی تم لے سکتی ہو''۔

اسی طرح صلاح الدین ایوبی کی رواداری، انصاف پسندی اور شجاعت کی تعریف تمام یورپین مورخوں نے کی ہے۔ گبن لکھتا ہے کہ انصاف کا تقاضا ہے کہ اس ترک فاتح کی رحم دلی کی تعریف کی جائے۔ اس نے مفتوحوں کو کسی مصیبت اور پریشانی میں نہیں ڈالا۔ وہ بیت المقدس پر قبضہ کے بعد عیسائی قیدیوں سے بھاری رقمیں وصول کرسکتا تھا، لیکن صرف تیس ہزار کی رقم لے کر اس نے سترہ ہزار قیدیوں کو آزاد کردیا۔ دو تین ہزار کو تو اس نے رحم کھا کر یونہی چھوڑ دیا۔ جب یروشلم کی ملکہ اس کے سامنے آئی تو اس نے اس سے مہربانی سے باتیں کیں۔ اس نے جنگ کے یتیموں اور بیواؤں میں خیرات تقسیم کئے۔ جنگ کے زخمیوں کے علاج اور دیکھ بھال کے لئے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں۔ اس نے جس فیاضانہ رحم دلی کا ثبوت دیا' اس سے وہ نہ صرف تعریف وتحسین بلکہ محبت کئے جانے کا مستحق ہے۔

یورپ کا دوسرا نامور مورخ لین پول بھی صلاح الدین کے بارے میں رقمطراز ہے کہ جب یروشلم مسلمانوں کے حوالے کیا جا رہا تھا تو اس کی سپاہ اور ذمہ دار افسروں نے شہر کے گلی کوچوں میں انتظام قائم کررکھا تھا اور ہر قسم کی زیادتی کو روکتے تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ کسی عیسائی کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ شہر سے باہر جانے کے سبھی راستوں پر سلطان کا پہرہ تھا تاکہ فدیہ دینے والے شہر سے باہر کسی روک ٹوک کے بغیر محفوظ طریقے سے چلے جائیں۔

لین پول مزید کہتا ہے کہ صلاح الدین کے بھائی العادل نے ایک ہزار غلام صلاح الدین سے مانگ کر آزاد کردیئے۔ اس کے علاوہ صلاح الدین نے خود شہر میں یہ منادی کرائی کہ تمام بوڑھے جن کے پاس زرفدیہ ادا کرنے کو نہیں ہے، وہ آزاد کئے جاتے ہیں کہ جہاں چاہیں وہاں جائیں۔ جن عیسائی عورتوں کے شوہر مرچکے تھے' انھیں صلاح الدین نے بلا کر خزانے سے روپے دیے اور وہ جہاں جہاں گئیں، اس عزت اور فیاضی کا چرچا کیا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے صلاح الدین کا نام مسلمانوں کے محبوب حکمرانوں کی فہرست میں ہارون رشید اور بیبرس کے ساتھ اب تک سرفہرست ہے۔ یورپ میں تو گانے والوں اور ناول نگاروں کے لئے وہ ایک محبوب موضوع بنا ہوا ہے۔ اور آج بہادری کا پیکر سمجھا جاتا ہے۔

اس کے بعد لین پول کا یہ کہنا ہے کہ صلاح الدین کے ان احسانات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو وہ وحشیانہ حرکتیں یاد آتی ہیں جو شروع کے صلیبیوں نے 1099ء میں بیت المقدس کی فتح پر کی تھیں۔ جب گوڈفرے (Godfrey) یروشلم کے راستوں سے گزرا تو وہاں مردہ پڑے اور جان بلب زخمی پڑے ہوئے تھے۔ ان بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو صلیبیوں نے سخت اذیتیں دے کر مارا

تھا۔ قدس کی چھتوں اور برجوں پر جہاں مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے، وہیں ان صلیبیوں نے انھیں اپنے تیروں سے زخمی کر کے گرایا تھا۔ ان کے اس کارنامے سے انسانیت کی گردن شرم سے جھک جاتی ہے۔ انھوں نے جو ہولناکیاں کیں ان سے چنگیز خاں اور ہلاکو کی سفاکیاں بھی ماند پڑ گئیں۔ لیکن یہ بڑے افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ صلیبی اور اس قسم کی لڑائیوں سے مسلم حکمرانوں نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ وہ مخالفین کے خلاف متحدہ محاذ پیش کرنے میں ناکام رہے۔ اس لئے ان کے نفاق اور اختلاف سے فائدہ اُٹھا کر یورپ کی سامراجی حکومتیں ان کو مسلسل نقصان پہنچا رہی ہیں۔ سسلی اور اسپین کے مسلمانوں کا خون بہانے کے بعد مطمئن نہیں ہوئے، تو سلطنت عثمانیہ کے مسلمانوں کا گلا گھونٹنے کے لئے برابر متحدہ کوشش کرتے رہے اور وہ کامیاب بھی رہے۔ اور یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ انھیں طاقتوں نے اسرائیلیوں کا بیت المقدس پر قبضہ کرا کر صلیبی جنگ میں اپنی شکست کا بدلہ لیا۔

19.8 خلاصہ

1092ء میں سلجوقی سلطان ملک شاہ کے انتقال کے بعد جب مضبوط سلطنت بکھرنے لگی اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو مسلم ایشیاء میں ان ناموافق حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اور متعدد سیاسی، اقتصادی، تجارتی، معاشرتی اور مذہبی عوامل کے زیر اثر یورپ میں عیسائی دنیا کے مشرقی اور مغربی دونوں بازو اپنے ذاتی اور تاریخی اختلافات کو بھلا کر مسلمانوں کے خلاف متحد ہو گئے اور ان کے خلاف لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا جو تاریخ میں صلیبی جنگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یورپ کے عیسائیوں نے صلیبی جنگ کے نام پر ایک مذہبی جنون پیدا کر دیا اور مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کی نفرت پھیلائی۔ بہانہ یہ تراشا گیا کہ بیت المقدس ان ہی کی اصل عبادت گاہ ہے اور وہ اس سے کسی حال میں دست بردار نہیں ہو سکتے اور یہ کہ سلجوقی حکومت بیت المقدس میں مسیحی زائرین کے ساتھ برا سلوک کرتی ہے۔ اس لئے اس کو بے دینوں (مسلمانوں) سے آزاد کرانا یورپ کے پوپ اور پادریوں نے دینی فرض قرار دے دیا۔ اس کو ہوا فرانس کا باشندہ راہب پیٹر نے دی جو 1092ء میں فلسطین کے مقدس مقامات کی زیارت کے لئے گیا تھا۔ اور مسلمانوں کے خلاف من گھڑت داستانیں مشتہر کرنا شروع کر دیا۔ پوپ اربن ثانی اور اس کے پادریوں نے یورپ بھر میں گھوم گھوم کر بیت المقدس کے عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں کے ظلم وستم کی داستانیں سنانے لگے اور لوگوں کو جوش دلا کر بیت المقدس کی فتح کے لئے آمادہ کیا اور صلیبی جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں صلیبی جنگ کا عہد بہت ہی نازک ترین دور تھا۔ پوری عیسائی دنیا ان کی اور ان کے مذہب کی بیخ کنی کے لئے اُمڈ پڑی تھی۔ تقریباً دوسو برس (1292ء-1096ء) کے اثنا میں صلیبی حملہ آوروں کا سیلاب یورپ سے شام اور فلسطین پہنچتا رہا۔ پہلی صلیبی جنگ میں عیسائیوں کو کامیابی بھی ملی۔ بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے مسلم ایشیاء میں چار عیسائی ریاستیں بھی قائم کرلیں۔

بیت المقدس پر صلیبیوں کے قبضہ کے ردّعمل کے طور پر مسلم دنیا نے عمادالدین زنگی، نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی جیسے سورماؤں کو جنم دیا جنھوں نے بڑی پامردی، بہادری اور ہمت سے ان کا مقابلہ کیا اور ان کے ارادوں کو ملیا میٹ کر دیا۔ اور ان کو مسلم ایشیاء سے نکال باہر کیا۔ بلاشبہ یہ مسلمانوں کی تاریخ کا بہت ہی زریں کارنامہ ہے۔

ان صلیبی جنگوں کے دوررس سیاسی، تجارتی، اقتصادی، معاشرتی اور علمی اثرات مرتب ہوئے جن سے یورپ والوں کو بہت فوائد حاصل ہوئے۔ یہی اثرات ان کے درمیان نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کا سبب بھی بنے۔ اس کے برعکس مسلم دنیا کو ان لڑائیوں سے جو نقصانات پہنچے ان کا دائرہ بہت وسیع ہے اور جو فائدے حاصل ہوئے وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے پاس مسلمانوں کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا جب کہ وہ مسلمانوں کی دولت، ثروت اور علمی میراث سے متاثر اور مالا مال ہوئے۔

ان جنگوں کا ایک بڑا منفی اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کے خلاف ایک مذہبی جنون پیدا کر دیا گیا اور ان کے خلاف ہر طرح کی نفرت پھیلائی گئی۔ ایک طویل مدت گزرنے کے بعد بھی نفرت کی یہ آگ ان کے دلوں میں وقتاً فوقتاً سلگتی رہتی ہے جس کی وجہ سے میدان جنگ میں ناکام ہو جانے کے بعد بھی انھوں نے مسلمانوں سے دشمنی اور عناد جاری رکھا۔ وہ اب بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش اور پروپگنڈہ میں مصروف ہیں۔

19.9 نمونے کے امتحانی سوالات

1. صلیبی جنگوں کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالئے۔
2. صلیبی جنگوں کے اسباب پر نوٹ لکھئے۔
3. عمادالدین زنگی اور نورالدین زنگی کے کارناموں کا ذکر کیجئے۔
4. شام اور فلسطین کو صلیبیوں سے آزاد کرانے میں صلاح الدین ایوبی کا رول متعین کیجئے۔
5. صلیبی لڑائیوں کے اثرات کا جائزہ پیش کیجئے۔

19.10 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. کروسیڈ اور جہاد — محمد اکبر خاں
2. صلیبی جنگ — سید صباح الدین عبدالرحمٰن
3. مختصر تاریخ اسلام — مولانا غلام رسول مہر
4. اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانشگاہ پنجاب، لاہو، جلد 12
5. Abdul Ali, Islmic Dynasties of the Arab East.
6. T. A. Archer, The Crusades.
7. S. Atia Aziz, Crusade, Commerce and Culture.
8. P. K. Hitti, History of Syria.
9. Edward Gibbon, The History of the Decline and Fall of the Roman Empire.

بلاک:5 عثمانی حکومت

فہرست

اکائی 20 : عثمانی حکومت کا قیام

اکائی کے اجزاء

20.1 مقصد

اس اکائی کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی کے آخر میں قائم ہونے والی ایک چھوٹی سی جاگیر، ایک مستحکم اور

عقیدت واحترام کا تھا۔ بتوں اور بت خانوں کے بارے میں یقین کی حد تک ان میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ جو بھی ان کی بے ادبی کرے گا وہ ضرور بالضرور ہلاک ہو جائے گا۔ قتیبہ بن مسلم جب اس علاقے میں داخل ہوا تو اس نے جابجا بت خانے دیکھے جن کے بارے میں اسے بتایا گیا کہ ان کی بے ادبی کرنے والا ہلاک ہو جاتا ہے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد قتیبہ نے ان بت خانوں میں آگ لگا دی مگر اس کے باوجود اسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ قتیبہ بن مسلم کے اس اقدام کا اثر ترکوں پر پڑا۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے بت پرستی چھوڑ دی اور ان کی ایک تعداد دائرہ اسلام میں بھی داخل ہو گئی۔

اموی حکومت میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کا مختصر زمانہ (101ھ/720ء-99ھ/717ء) اس اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ ان کے عہد خلافت میں خلافت راشدہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ خاص طور پر انہوں نے اسلامی دنیا کے مفتوحہ اور دیگر علاقوں میں اسلام کی اشاعت پر بہت زیادہ توجہ دی۔ انہوں نے مختلف حکمرانوں کو اس حوالے سے خطوط لکھنے کے علاوہ مسلم دعاۃ کو بھی غیر مسلم علاقوں میں دین کی دعوت دینے کے لیے بھیجا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں انہوں نے ماوراءالنہر کے ترک بادشاہوں اور سرداروں کو بھی خطوط لکھے جن میں اسلام کی دعوت پیش کی گئی تھی۔ ان میں سے بعض نے اسلام کی دعوت قبول کر لی اور مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مشہور داعی عبداللہ ابن معمر الیشکری کو بھی اسلام کی دعوت عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے ماوراءالنہر کے ترک علاقوں میں بھیجا اور ان کی دعوت پر خطے کے بعض قبائل مسلمان ہو گئے۔

البتہ ترکوں میں اسلام کی دعوت اس وقت زیادہ عام ہوئی۔ جب اموی خلیفہ ہشام، کے زمانہ خلافت (105ھ/742ء تا 125ھ/743ء) میں اسلام کے ایک بڑے مبلغ اور داعی ابوصیدا ماوراءالنہر کے علاقے میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے پہنچے اور کہا جاتا ہے کہ ان کی دعوت سے متاثر ہو کر بڑے پیمانے پر ترکوں نے اسلام قبول کیا۔ لیکن اس زمانے کے حالات وواقعات کا مطالعہ وتجزیہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اموی دور بلکہ عباسی خلافت کے زمانہ عروج میں معتصم باللہ کی حکومت (227ھ/842ء-218ھ/833ء) کے زمانے تک ترکوں میں اسلام کی اشاعت عام نہیں ہوئی تھی، کیونکہ اس زمانے تک اس علاقے سے جزیہ اور خراج کی رقمیں اسلامی بیت المال میں آتی تھیں۔

20.5 ترک دارالخلافہ بغداد میں

اسلامی دنیا میں ترکوں کی اہمیت کو سمجھنے اور ان کو متعارف کرانے کا سہرا عباسی خلیفہ منصور (158ھ/775ء-136ھ/754ء) کے سر بندھتا ہے جس نے سب سے پہلے ترکوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس کے زمانے میں فوج میں ایرانیوں کا اثر بہت زیادہ بڑھ گیا تھا اور وہ اس کی حکومت کے لیے خطرہ بنتے جا رہے تھے۔ فوج میں ترکوں کی بھرتی سے اس کا مقصد شاید یہ رہا ہو کہ ایرانیوں اور عربوں کے فوج میں اثرات کو کسی قدر کم کیا جائے۔ البتہ اس نے اپنے زمانہ حکومت میں جن ترکوں کو فوج میں بھرتی کیا ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ بنیادی طور پر فوج اور انتظامیہ دونوں جگہوں پر عربوں اور ایرانیوں کو ہی غلبہ حاصل رہا۔ مامون کے زمانے میں ایرانی اثرات بہت زیادہ بڑھ گئے کیونکہ اس کی ماں ایرانی نسل کی تھی۔ لیکن خلیفہ معتصم باللہ (218ھ/822ء تا 227ھ/842ء) پہلا عباسی خلیفہ ہے جس کے زمانے میں ترک بڑے پیمانے پر منظر عام پر آئے اور فوج میں ان کو نمایاں مقام حاصل ہوا۔

عباسی خلیفہ مامون کے بعد جب اس کا بھائی معتصم خلیفہ ہوا تو اس کی پریشانی یہ تھی کہ فوج اور انتظامیہ ہر جگہ ایرانیوں کو غلبہ حاصل تھا اور عرب کمزور پڑ چکے تھے۔ اسے ایک ایسے خاص گروپ کی ضرورت تھی جو ایرانیوں کے مقابلے میں اس کی مدد کر سکے۔ چونکہ معتصم کی ماں ترک کی تھی اس لیے فطری طور پر اس کا جھکاؤ ترکوں کی جانب ہوا کہ وہ اس کی اقتدار میں ایرانیوں کے مقابلے زیادہ مدد کر سکیں گے۔

چنانچہ معتصم نے بڑے پیمانے پر فوج میں ترکوں کی بھرتی شروع کی۔ اس نے ہزاروں کی تعداد میں ترک غلام خریدے، انہیں اسلامی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت بھی دی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عباسی فوج میں ترکوں کی تعداد اور طاقت دونوں میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ معتصم نے پچاس ہزار سے زیادہ ترکوں کو دارالخلافہ بغداد میں لا کر آباد کیا۔ فوج میں ہی نہیں انتظامیہ میں بھی انہیں بڑے بڑے عہدے اور منصب دیے گئے یہاں تک کہ صرف فوج میں ترکوں کی تعداد ستر ہزار ہوگئی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلم دنیا میں ترکوں کو سب سے پہلے عروج خلیفہ معتصم عباسی کے زمانے میں حاصل ہوا۔

عباسی خلیفہ معتصم نے بڑے پیمانے پر وسطی ایشیا سے ترکوں کو دارالخلافہ بغداد میں لا کر فوج میں بھرتی کیا۔ ترکوں پر مشتمل ایک خاص فوجی دستہ بنایا۔ ان کے لیے طلاکاریشمی لباس تجویز کیا اور زریں پٹکے ان کی فوجی وردی میں شامل کیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی فوجی دستے دوسری فوجوں کے مقابلے ممتاز معلوم ہونے لگے اور عام لوگوں میں یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ اہم اور خاص فوجی دستے ہیں۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ترک غلام دارالخلافہ لائے جاتے، ان میں سے کچھ کو منتخب کر کے محافظ شاہی دستے میں شامل کر لیا جاتا۔ بقیہ کو فوجی تربیت دے کر فوج کا حصہ بنا دیا جاتا۔ انہیں میں سے کچھ ممتاز ترک فوجیوں کو فوج کے سپہ سالار کی ذمہ داری بھی دی جاتی۔ جیسے جیسے ترکوں کی تعداد اسلامی افواج میں بڑھتی گئی فوج کے ساتھ ساتھ حکومت اور انتظامیہ میں بھی ان کا اثر و نفوذ بڑھتا گیا اور چوں کہ انہیں خلیفہ کی خاص سرپرستی حاصل تھی۔ اس لیے وہ نہ تو کسی سے ڈرتے تھے اور نہ ہی کسی کی پروا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ معتصم کے زمانے ہی میں ان کی وجہ سے دارالخلافہ بغداد میں امن وقانون کے مسائل کھڑے ہونے لگے اور ان کی شکایتیں خلیفہ تک پہنچنے لگیں۔ چنانچہ اس نے ترکوں کے لیے بغداد شہر سے باہر سامرا کے مقام پر ایک فوجی چھاؤنی بنانے کا فیصلہ کیا یہاں تک کہ سامرّا کو ہی اس نے دارالخلافہ بنا دیا۔ معتصم کی ترک نوازی کا اثر یہ ہوا کہ ترکستان کے علاقے میں لوگوں کی اسلام میں دلچسپی بڑھنے لگی۔ وہاں کے امراء اور سردار ترکستان سے نقل مکانی کر کے سامرّا میں آباد ہونے لگے۔ ان کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے زیر اثر ان کے علاقوں اور قبائل کے لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا یہاں تک کہ دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی تک ترکستان کی بیشتر آبادی مسلمان ہوگئی۔

معلومات کی جانچ

1. ترکوں کو اسلامی دنیا میں کس عباسی خلیفہ نے متعارف کرایا؟
2. خلیفہ معتصم نے بڑی تعداد میں فوج میں ترکوں کی کیوں کر بھرتی کی؟
3. خلیفہ معتصم نے ترکوں کے لئے بغداد سے علاحدہ سامرا کے مقام پر فوجی چھاؤنی بنانے کا فیصلہ کیوں کیا؟

20.6 مسلم دنیا میں ترکوں کا عروج

خلیفہ معتصم کے زمانے میں ترکوں پر جو خاص نوازش ہوئی اور جس طرح کی مراعات انہیں حاصل ہوئیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد فوج اور حکومت دونوں جگہوں پر ترکوں کا اقتدار بڑھتا گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد ترک حکومت پر پوری طرح چھا گئے۔ عباسی خلفاء ان کے ہاتھ میں پوری طرح بے دست و پا ہو گئے۔ اگر کسی نے ان کے خلاف مزاحمت کی کوشش کی تو یا تو وہ معزول ہوا یا پھر قتل کر دیا گیا۔ گویا کہ خلیفہ کا تخت ہی نہیں اس کی جان بھی ترکوں کے رحم و کرم پر ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوا کر ترکوں کو تو عروج ملا لیکن عباسی خلافت زوال پزیر ہوگئی۔ مختلف صوبوں کے گورنر آزاد و خود مختار ہو گئے۔ اور اپنی الگ حکومتیں قائم کر لیں۔ ان میں زیادہ تر حکومتیں یا تو ایرانیوں کی تھیں یا پھر ترکوں کی۔ یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں ہے ہم مختصر طور پر ترکوں کی ان حکومتوں کا ذکر یہاں کریں گے جن کا براہ راست تعلق ہمارے موضوع (عثمانی حکومت کا قیام) سے ہے۔

ترکوں کے زمانۂ عروج میں جو ترک حکومتیں قائم ہوئیں ان میں آل سلجوق کی حکومت، جو سلجوقی حکومت کہلاتی ہے، بہت ہی اہم ہے۔ پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) میں ترکوں کے ایک گروہ نے خراسان کے علاقے میں سلجوقی حکومت کی بنیاد رکھی، جس نے بہت جلد نہ صرف یہ کہ دارالخلافہ بغداد پر بھی سیاسی اقتدار و اختیار حاصل کر لیا بلکہ عباسی خلافت کے بیشتر علاقوں کو ایک سیاسی وحدت میں پرو دیا۔ آل سلجوق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق کاشغر کے قریب آباد ترکی قبائل سے تھا۔ ان کا مورث اعلیٰ دقاق انہیں قبائل کا ایک رئیس تھا۔ البتہ اس کا بیٹا سلجوق (جس کے نام سے اس خاندان کو شہرت ملی) اپنے غیر مسلم ترک حکمراں کو چھوڑ کر بخارا چلا آیا جو اس وقت اسلامی مملکت کا حصہ تھا۔ اس نے اور اس کے پیچھے اس کے پورے قبیلے نے بخارا آ کر اسلام قبول کر لیا اور بخارا سے قریب ہی جند کے علاقے میں آباد ہو گئے۔ یہیں سے انہوں نے اپنی فتوحات کا آغاز کیا جو آگے چل کر ایک بڑی حکومت کی تشکیل پر منتج ہوئیں۔ یہاں تک کہ بغداد بھی ان کے سیاسی اقتدار میں آ گیا اور پھر بغداد پر تاتاریوں کے حملے 656ھ/1258ء تک اس خاندان کو وہاں کے سیاسی فرماں روا کی حیثیت حاصل رہی۔

آل سلجوق کے سرداروں میں سے ایک قطلمش تھا، جس نے سلجوقی حکمراں الپ ارسلان کے خلاف بغاوت کی اور بعد میں مارا گیا۔ اس کا مہم جو بیٹا سلیمان تھا، باپ کی ہلاکت کے بعد وہ قسمت آزمائی کے لیے ایشیائے کوچک کے علاقے میں چلا آیا اور بازنطینی سلطنت کے بعض علاقوں پر قبضہ کر کے ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈالی جو سلاجقہ روم کے نام سے مشہور ہوئی۔ گیارہویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں میں اس نے ایشیائے کوچک میں ایک ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جو آیندہ ڈیڑھ سو برس سے زیادہ عرصے تک قائم رہی اور اسی وقت یہ بات بھی طے ہو گئی کہ آیندہ کے ایشیائے کوچک کی تاریخ اب ترکوں سے وابستہ ہے۔ کیونکہ اس خاندان کی حکومت کے زوال کے بعد بھی اس علاقے میں جو چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہوئیں وہ بنیادی طور پر ترک حکومتیں تھیں۔ انہیں حکومتوں میں سے ایک آل عثمان کی حکومت بھی تھی جسے آگے چل کر اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی حکومت بننے کا افتخار حاصل ہونے والا تھا۔

معلومات کی جانچ

1. عباسی خلافت میں ترکوں کے عروج کے نتیجہ میں کیا صورتحال پیش آئی؟

2. آل سلجوق کا تعلق کس قبیلہ سے تھا اور ان کے مورث اعلیٰ کون تھے؟

3. قطلمش کون تھا؟

20.7 عثمانی ترکوں کا تاریخی پس منظر

ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) میں عالم اسلام ایک عجیب کش مکش اور انتشار سے دوچار ہوا۔ اگر ایک طرف اس صدی کے آغاز میں شاہان خوارزم کو عروج حاصل ہوا اور انہوں نے اس وقت کی مسلم دنیا کے بڑے حصے پر حکومت قائم کر لینی چاہی تو دوسری طرف اس صدی کے وسط میں منگولیا سے اٹھنے والے چنگیز خان کے طوفان بلاخیز نے نہ صرف یہ کہ شاہان خوارزم کی عزت وسطوت خاک میں ملا دی بلکہ ممالک اسلامیہ کے دل بغداد کو اس طرح تاخت وتاراج کیا کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ لیکن جیسا کہ ذکر ہوا چنگیز خان کا حملہ ایک طوفان تھا جو آیا اور اپنے پیچھے تباہی و بربادی کے آثار چھوڑتا ہوا گزر گیا۔ اس میں شک نہیں کہ چنگیز خان کے حملے کے وقت مسلم دنیا کا افتراق وانتشار اپنے شباب پر تھا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تباہی و بربادی کے اس چنگیز خانی کھنڈر سے مسلم دنیا میں آل عثمان کی وہ مستحکم اور پائدار حکومت قائم ہوئی جو وسعت میں شاید بعض دوسری مسلم حکومتوں سے کم رہی ہو لیکن پائداری واستحکام میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

چنگیز خان کے حملے نے مسلم دنیا کے مختلف علاقوں خاص طور پر ترکستان کے علاقے کو بری طرح تباہ و برباد کیا۔ سلطنت خوارزم کی تباہی و بربادی کے بعد بہت سارے ترک قبائل وطن چھوڑ کر نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ ان میں سے زیادہ تر جنوب کی طرف بھاگے۔ کچھ نے ایران اور شام میں پہنچ کر قسمت آزمائی کی اور وہاں ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے دوران کسی قدر اقتدار حاصل کیا۔ کچھ اور تھے جو مزید جنوب کی طرف بڑھے اور مصر کے مملوک سلاطین سے، جو خود بھی نسلاً ترک تھے، معرکہ آرا ہوئے لیکن انہیں وہاں کامیابی نہیں ملی، مجبوراً واپس لوٹے اور ایشیائے کوچک میں سلاجقہ کی حکومت کے زیر سایہ پناہ لی۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں قبائل میں جو چنگیز خان کے حملے کے بعد اپنا وطن چھوڑ کر بھاگے تھے اور اب ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے عثمانیوں کے مورث اعلیٰ ارطغرل کا قبیلہ بھی تھا۔ یہ قبیلہ اوغوز ترکوں کی ایک شاخ تھا اور ارطغرل کا باپ سلیمان شاہ قبیلے کا سردار تھا۔ شام کی طرف جاتے ہوئے جب یہ قبیلہ دریائے فرات کو پار کر رہا تھا کہ اس کا سردار سلیمان شاہ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ قبیلہ منتشر ہو گیا۔ بہت تھوڑے لوگ بچے اور وہ ارطغرل اور اس کے بھائی دوندار کی قیادت میں ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوئے۔

ارطغرل اور اس کے قبیلے کی منزل مقصود ایشیائے کوچک میں سلطان علاء الدین سلجوقی کا دارالحکومت قونیہ کا شہر تھا۔ ابھی یہ قبیلہ قونیہ کے راستے میں ہی تھا کہ ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف اس قبیلے کی تقدیر بدل دی بلکہ آنے والی صدیوں میں آل عثمان کی عظیم سلطنت کے قیام کے لیے بنیاد کے پتھر کا کام کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب یہ لوگ ایشیائے کوچک میں انگورا کے قریب سے گزر رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ دو فوجیں آپس میں لڑ رہی ہیں— واضح رہے کہ اس وقت بھی مختلف تاتاری فوجیں مسلم علاقوں پر حملے اور لوٹ مار کیا کرتی تھیں —— قبیلے کا سرداران دونوں فوجوں میں سے کسی کو بھی جانتا نہیں تھا۔ البتہ اس وقت ترکوں میں پایا جانے والا مہم جوئی کا فطری جذبہ اس کے کام آیا۔ اس نے دیکھا کہ لڑنے والی فوجوں مین ایک تعداد میں کم اور کمزور ہے

جب کہ دوسری فوج تعداد میں زیادہ اور طاقت ور ہے۔ اس نے کمزور فوج کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا، اس کے ساتھ سواروں کا جو مختصر دستہ تھا، اس کی تعداد پانچ سو سے بھی کم تھی۔ ارطغرل نے اپنے سواروں کو ساتھ لے کر کمزور فریق کی طرف سے طاقتور فوج پر حملہ کیا۔ اس کا یہ حملہ اتنا شدید تھا اور اس کے سوار سپاہی اس جنگ میں اتنی جاں بازی سے لڑے کہ جنگ کا پانسہ ہی پلٹ گیا۔ دشمن کو نہ صرف شکست ہوئی بلکہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ جنگ کے خاتمے اور فتح حاصل ہو جانے کے بعد ارطغرل کو یہ معلوم ہوا کہ جس فوج کی اس نے بروقت پہنچ کر مدد کی تھی وہ ایشیائے کوچک کے سلجوقی حکمراں علاء الدین سلجوقی کی فوج تھی اور طاقت ور فوج جو اس کی فوج کو گھیرے ہوئے تھی حملہ آور تاتاریوں کی فوج تھی۔

ارطغرل اور اس کے قبیلے کا سوار دستہ اس وقت سلطان علاء الدین سلجوقی کے لیے فتح و نصرت کا فرشتہ بن کر نازل ہوا تھا۔ چنانچہ سلطان علاء الدین نے اس کے اس کارنامے اور مدد کے صلے میں ارطغرل کو ایک جاگیر عطا کی۔ یہ جاگیر سغوت کا زرخیز علاقہ تھا جو دریائے سقاریہ کے بائیں جانب بازنطینی حکومت کی سرحد کے قریب واقع تھا۔ جاگیر کے ساتھ ہی سغوت کا شہر یا قصبہ بھی سلطان علاء الدین نے ارطغرل کے حوالے کر دیا۔ سغوت کا علاقہ جاگیر میں دینے کا مقصد جہاں ایک طرف یہ تھا کہ ارطغرل کی مدد کا اعتراف کیا جائے وہیں دوسری طرف سلطان علاء الدین سلجوقی کے دل میں یہ خیال بھی رہا ہوگا کہ اس طرح ارطغرل جیسا بہادر سردار بازنطینی قلعہ داروں کی پیش دستیوں سے بھی اس کی سرحدوں کو محفوظ رکھے گا۔ ارطغرل اور اس کے قبیلے کے افراد جو اس کے ساتھ آئے تھے انہوں نے اس علاقے میں بود و باش اختیار کر لی۔ ارطغرل جو اپنی جاگیر کا سپہ دار بھی تھا، اس نے اپنی جاگیر کا انتظام و انصرام بہت اچھے طریقے سے کیا۔ چونکہ اس کی جاگیر بازنطینی سرحد پر واقع تھی، اس لیے اکثر بازنطینی قلعہ داروں سے لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ ارطغرل نے تھوڑے ہی دنوں میں ان پر اپنی بہادری اور شجاعت کا سکہ بٹھا دیا۔ بازنطینی سرداروں کے خلاف اس کی کامیابیوں کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے دوسرے ترکی قبیلے بھی جو پہلے سے ایشیائے کوچک میں آباد تھے، اس کے ساتھ آکر شامل ہو گئے۔ اس طرح ارطغرل کی قوت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا اور اس کی جاگیر ایک چھوٹی سی ریاست کی شکل اختیار کرنے لگی۔

سلطان علاء الدین سلجوقی کے لیے ایک جاگیردار کا اس طرح طاقت ور ہوتے چلا جانا تشویش کا سبب بن سکتا تھا، لیکن چونکہ ایشیائے کوچک میں خود اس کا اپنا اقتدار خطرے میں تھا۔ سرحدوں پر تاتاریوں اور عیسائیوں کے حملوں کے علاوہ اندرون مملکت بھی مختلف سرداروں نے اپنی خود مختار ریاستیں قائم کر لی تھیں۔ ایسے میں ارطغرل جیسے بہادر سردار کی بازنطینی سرحد پر موجودگی اس کے لیے تشویش کے بجائے یک گونہ اطمینان کا باعث تھی۔ چنانچہ جب ایک مرتبہ ینی شہر اور بروصہ کے درمیان ارطغرل نے سلطان علاء الدین سلجوقی کے نائب کے طور پر تاتاریوں اور بازنطینیوں کی ایک مشترکہ فوج کو شکست دی تو سلطان اس سے بہت زیادہ خوش ہوا اور اس کامیابی کے صلے میں اس نے ارطغرل کو اپنے مقدمۃ الجیش کا سپہ سالار مقرر کرنے کے علاوہ اس کی شہر کو بھی اس کی جاگیر میں دے دیا۔ البتہ ان علاقوں پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے لیے پہلے ارطغرل اور بعد میں اس کے جانشین عثمان خاں کو کافی محنت کرنی پڑی۔ اسی دوران ارطغرل نے ہلال کو جو سلطان علاء الدین کے علم کا نشان تھا، اپنے علم کے نشان کے طور پر اختیار کیا کیونکہ وہ سلطان کا نائب تھا۔ البتہ ہلال کا یہی نشان آگے چل کر عثمانی ترکوں کی عظمت کا قومی نشان بھی بن گیا۔ ارطغرل نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی جاگیر اور علاقے کا انتظام سلطان علاء الدین سلجوقی کے نائب کے طور پر کیا اور نوے سال کی عمر میں (687ھ/1288ء) اس کا انتقال ہوا اور سغوت کے قریب دفن ہوا۔

معلومات کی جانچ

1. سلطان علاء الدین سلجوقی کا دارالحکومت کہاں تھا؟

2. ارطغرل نے کس فوج کی مدد کی تھی؟

3. سلطان علاء الدین سلجوقی کی طرف سے ارطغرل کو سغوت کا علاقہ بطور جاگیر دینے کا مقصد کیا تھا؟

4. ارطغرل کا جانشین کون بنا؟

20.8 عثمانی حکومت کا بانی امیر عثمان خاں غازی

1288ء میں ارطغرل کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا عثمان خاں اس کی جاگیر کا وارث ہوا۔ یہی عثمان خاں آگے چل کر دولتِ عثمانیہ یا عثمانی حکومت کا بانی ہوا اور اسی کے نام پر یہ حکومت عثمانی کہلائی۔ عثمان خاں 656ھ / 1257ء میں سرگرت (سغوت) کے علاقے میں پیدا ہوا۔ وہ امیر ارطغرل کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ارطغرل کا قبیلہ ایشیائے کوچک میں داخل ہونے تک اپنے آبائی مذہب بت پرستی پر قائم تھا۔ ایشیائے کوچک میں داخلے اور سلطان علاء الدین سلجوقی سے ربط میں آنے کے بعد یہ قبیلہ اسلام میں داخل ہوا۔ مورخین اس بارے میں مختلف الرائے ہیں کہ آیا ارطغرل نے ایشیائے کوچک کی اسلامی فضا میں رہتے ہوئے علاء الدین سلجوقی کی صحبت سے اسلام قبول کیا یا پھر عثمان خان اس علاقے کے ایک خدارسیدہ بزرگ اوہ بالی کی تلقین وتبلیغ کی وجہ سے اسلام سے متاثر ہوا اور پھر اپنے پورے قبیلے کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔ بہر حال اتنا طے ہے کہ عثمان خاں اپنی نوعمری سے ہی مسلمان تھا اور اکثر بزرگ اوہ بالی کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا یہاں تک کہ ان بزرگ نے اپنی حسین اور خوبصورت بیٹی کی شادی عثمان خاں سے کر دی، جس کا نام مال خاتون تھا۔

مال خاتون سے عثمان خاں کی شادی کا واقعہ بڑا دل چسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ عثمان خاں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک چاند ہلال بن کر اوہ بالی کے سینے سے نکلا اور رفتہ رفتہ بدر کامل بن کر عثمان کے سینے میں اتر آیا۔ پھر اس کے پہلو سے ایک زبردست تناور درخت نمودار ہوا جو بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ اس کی شاخیں بحر و بر پر چھا گئیں۔ درخت کی جڑ سے نکل کر دنیا کے چار بڑے دریا دجلہ، فرات، نیل اور ڈینوب بہہ رہے تھے اور چار بڑے پہاڑ کوہ قاف، کوہ بلقان، کوہ طور اور کوہ اٹلس اس کی شاخوں کو سنبھالے ہوئے تھے، اچانک بہت ہی تیز ہوا چلی اور اس عظیم درخت کی پتیوں کا رخ جو شکل میں تلوار سے مشابہ تھیں ایک عظیم الشان شہر کی طرف ہو گیا۔ یہ شہر ایک ایسی جگہ واقع تھا جہاں دو سمندر اور دو براعظم ملتے ہیں اور ایک انگوٹھی کی طرح دکھائی دیتا تھا جس میں دو نیلم اور دو زمرد جڑے ہوئے تھے۔ عثمان اس انگوٹھی کو پہننا ہی چاہتا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ نیند سے بیدار ہونے کے بعد یہ خواب عثمان خاں نے اوہ بالی سے بیان کیا۔ خدارسیدہ بزرگ اوہ بالی نے اس خواب میں عثمان کے شاندار مستقبل کی تعبیر دیکھی نیز اسے ایک اشارہ غیبی سمجھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بیٹی مال خاتون سے اس کا نکاح کر دیا۔

بعد کے زمانے کی عثمانی تاریخی روایات میں عثمان خاں کے اس خواب کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اسے بہت اچھا سمجھا گیا اور اس کی تعبیر یہ بتائی گئی کہ خواب میں بیان کردہ چاروں دریا اور پہاڑ بعد میں قائم ہونے والی عظیم الشان عثمانی سلطنت کی وسعت کا اشارہ اور پیش گوئی تھے۔ اور دو براعظموں اور دو سمندروں کے اتصال پر واقع شہر فی الواقع قسطنطنیہ کا شہر تھا جسے عثمان خاں فتح نہیں کر سکا لیکن اس کی اولاد اسے بھی فتح کرنے اور اپنا دارالسلطنت بنانے میں کامیاب رہی۔ واقعہ یہی ہے کہ عثمان خاں کے بعد اس کی اولاد میں بڑے بڑے فاتح حکمراں پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی خدمات کے ذریعہ عثمان خاں کے خواب کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا۔

عثمان خاں کی تعلیم و تربیت اسلامی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ خدا ترس ہونے کے ساتھ نہایت ہی بہادر اور شجاع بھی تھا۔ ایشیاء کوچک کی سرحد پر جاگیر کا حکمراں اور اپنے قبیلے کا سردار بننے کے بعد نہ صرف یہ کہ اپنی جاگیر اور سلجوقی سرحد کا کامیابی کے ساتھ اس نے دفاع کیا بلکہ ایک ایسے زمانے میں جب آپسی انتشار کے سبب سلجوقی حکومت دم توڑ رہی تھی، سلجوقی امراء اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی خودمختاری کا اعلان کر رہے تھے، عثمان خاں سلجوقی حکمراں علاء الدین کا وفادار بھی رہا اور اپنی جاگیر اور اس سے متصل علاقوں کا انتظام و انصرام نہایت خوبی سے کیا۔ ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ عثمان خاں کی جاگیر بازنطینی سرحد پر واقع تھی اور بازنطینی قلعہ دار اور فوجی حکام اکثر اس کی سرحدوں پر حملہ آور بھی ہوتے رہتے تھے۔ سرداری کے پہلے ہی سال سلطان کے ایک نائب کی حیثیت سے اسے بازنطینی علاقے میں داخل ہونا پڑا اور اس نے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے قراجہ حصار کا قلعہ ان سے چھین لیا۔ اس کی فتح سے خوش ہو کر سلطان علاء الدین سلجوقی نے قلعہ اور اس کا پورا علاقہ عثمان خاں کے حوالے کر دیا۔ مزید اسے بک کا خطاب دے کر اپنا سکہ جاری کرنے اور جمعہ کے خطبے میں اپنا نام شامل کرنے کی اجازت بھی دے دی، گویا سلطان نہ ہوتے ہوئے بھی اسے سلطانی کا اعزاز مل گیا، لیکن عثمان خاں ایک وفادار اور بہادر ترک تھا۔ اس نے سلطان علاء الدین سلجوقی کی زندگی میں اپنی خودمختاری کا اعلان نہیں کیا۔

20.9 عثمانی حکومت کا قیام

عثمان خاں سلجوقی حکومت کے ایک امیر کے طور پر ایشیائے کوچک کے بازنطینی سرحد سے ملنے والے علاقوں پر 699ھ / 1300ء تک حکومت کرتا رہا یہاں تک کہ سلجوقی سلطنت پر تاتاریوں نے ایک بار پھر حملہ کر دیا۔ سلطان علاء الدین سلجوقی ان کے ساتھ جنگ میں مارا گیا اور قونیہ کی سلجوقی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ تاتاری سلطان علاء الدین کی شکست کے بعد لوٹ مار کرتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔ پہلے سے ہی انتشار کے شکار ایشیائے کوچک میں پورے طور پر طوائف الملوکی پھیل گئی اور جس علاقے میں جو امیر تھا وہ اس علاقے کا خودمختار حکمراں بن گیا۔ اس موقع کا فائدہ عثمان خاں نے بھی اٹھایا اور بازنطینی سرحد پر اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کی شہر کو اس نے اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ اس کے بعد آس پاس کی جو چھوٹی چھوٹی امارتیں تھیں ان کے امیروں کو شکست دے کر اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اور اس طرح مستقبل کی عظیم الشان عثمانی سلطنت کی بنیاد پڑی۔

عثمان خاں کی زندگی اور اس کے زمانے کے حالات کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بہادر فاتح ضرور تھا، لیکن صرف فتوحات اس کا مقصود نہ تھیں، اگر ایسا ہوتا تو وہ بھی ایشیائے کوچک کے دیگر ترک امراء کی طرح علاء الدین سلجوقی کی

کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی زندگی میں ہی اپنی خودمختاری کا اعلان کر چکا ہوتا اور ایک بڑے علاقے پر اپنی حکومت قائم کر لی ہوتی۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ جاگیر کا سربراہ بننے کے بعد اس نے جو بھی جنگیں لڑیں وہ زیادہ تر دفاعی تھیں اور ایک لمبے عرصے تک، جب کہ وہ چاہتا تو بازنطینی علاقوں میں اپنی جاگیر کو وسعت دے سکتا تھا، اس نے اپنی تمام تر توجہ انتظام و استحکام کی جانب مبذول رکھی۔ سلجوقی حکومت میں پہلے سے جو محکمے قائم تھے اور جس طرح افسروں کا تقرر ہوتا تھا، اس نے اپنے کنٹرول والے علاقوں میں اسی طرح کے محکمے قائم کیے اور ان میں ترک افسر مقرر کیے۔ خصوصیت کے ساتھ عام لوگوں کی فلاح و بہبود پر اس نے خاص توجہ دی، جس کی وجہ سے وہ اپنی رعایا میں بہت ہی مقبول تھا۔

عثمان خاں ابھی اپنے علاقوں کے انتظام و استحکام میں ہی مصروف تھا کہ سلجوقی حکومت کے خاتمے کے بعد پیدا ہونے والی طوائف الملوکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض ترک سرداروں نے بازنطینی قلعہ داروں کے ساتھ ایک اتحاد بنا کر اس کے علاقوں پر حملے شروع کر دیے، عثمان خاں نے ان حملوں کا نہ صرف یہ کہ دفاع کیا بلکہ ان کو زیر کرتے ہوئے آس پاس کے بہت سے بازنطینی قلعوں کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اسی دوران 701ھ/1301ء میں عثمان خاں کا مقابلہ نائیکومیڈیا سے قریب قیون حصار کے مقام پر قسطنطنیہ کے شہنشاہ کی باقاعدہ افواج سے ہوا۔ اس جنگ میں عثمان خاں نے شاندار کامیابی حاصل کی اور آنے والے چھ برسوں کے اندر اس نے مسلسل فتوحات کے ذریعہ اپنی ریاست کا دائرہ بڑھا کر بحر اسود کے ساحل تک پہنچا دیا۔ اس دوران ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ بازنطینی جواب خود عثمان خاں کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، انہوں نے تاتاریوں کو عثمان خاں کے علاقوں پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا، عثمان خاں نے اپنے لڑکے اورخاں (آرخاں) کو تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا، اس نے جنگ میں تاتاریوں کو سخت شکست دی اور انہیں اپنے علاقوں سے بھگا دیا۔

بروصہ ایشیائے کوچک میں بازنطینی سلطنت کا مشہور اور نہایت اہم شہر تھا۔ عثمان خاں نے 717ھ/1317ء میں اس شہر کا محاصرہ کیا۔ بروصہ والوں نے محصور ہو کر عثمان خاں کی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ عثمان کی فوجوں نے دس سال تک بروصہ کا محاصرہ جاری رکھا، یہاں تک کہ مجبور ہو کر محصورین نے عثمان خان کے لڑکے اورخاں کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور شہر ان کے لیے خالی کر دیا۔ اورخاں کی سرکردگی میں ترکی فوجیں بروصہ کے شہر میں 726ھ/1326ء میں فاتحانہ داخل ہوئیں لیکن ان کا محبوب حکمراں عثمان خان اس وقت بروصہ سے دور اپنی جائے پیدائش سغوت میں بستر مرگ پر زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اورخان بروصہ کی فتح کی خوش خبری لے کر اس کے پاس پہنچا۔ عثمان نے اورخان کی بہادری اور شجاعت کی تعریف کی، اسے اپنا جانشین مقرر کیا، رعایا کے ساتھ بلاتفریق عدل و انصاف اور بھلائی کرنے کی وصیت کی اور آخر میں یہ ہدایت بھی کی کہ موت کے بعد اسے بروصہ میں ہی دفن کیا جائے اور اسے عثمانی مملکت کا پایہ تخت بنایا جائے۔ چنانچہ اس کی وصیت کے مطابق 21رمضان 727ھ کو اس کی وفات کے بعد بروصہ ہی میں اسے دفن کیا گیا اور اس کی قبر پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

عثمان خاں نے موت سے قبل اپنے بیٹے اور جانشین اورخان کو جو وصیت کی وہ اس لائق ہے کہ اسے یہاں نقل کیا جائے:

> ''بیٹا اب میں موت کی آغوش میں جا رہا ہوں، مجھ کو اب کسی بات کا غم نہیں ہے کیونکہ تم سا لائق بیٹا اپنی جگہ چھوڑ رہا ہوں جو میری قائم مقامی اس دولت کی مجھ سے بہتر کر سکے گا''۔

بیٹا یہ وصیت یاد رہے کہ:

ظاہر اور باطن میں اللہ کا خوف رکھنا اور عدل گستری کو اپنا شیوہ بنانا کہ اسی سے سلطنت کی بنیاد مضبوط رہتی ہے۔ رعایا پر رحم کرنا کیونکہ ہمارے رب کی صفت رحم ہے۔ حقوق کے معاملے میں قوی اور ضعیف کو یکساں سمجھنا۔ شریعت حقہ کو رائج کرنا اور کتاب و سنت کے مطابق عمل رکھنا۔ اگر میری اس وصیت پر عمل کرو گے تو تم ان اولیاء میں سے ہو جاؤ گے جو رضائے الٰہی سے کامیاب ہوئے ہیں اور بیٹا آخری کہنا یہ ہے کہ بروصہ کو پایہ تخت بنانا اور وہیں مجھ کو دفن کرنا۔

عثمان خان ایک عالی حوصلہ، بہادر اور عقل مند حکمراں تھا۔ کسی بھی سلطنت کے بانی کے لیے جن اوصاف حمیدہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب کے سب عثمان خان کی ذات میں موجود تھے۔ وہ غیر معمولی ہمت اور شجاعت کا حامل تھا، اس میں قیادت کا خداداد ملکہ تھا۔ میدان جنگ میں اپنی بہادری سے وہ اپنے سپاہیوں کے اندر بے پناہ دلیری کی روح پھونک دیتا تھا۔ انتظام حکومت میں اس کی دانش مندی نے رعایا کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کرتا تھا اور اس حوالے سے اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جیسا کہ اس کی وصیت سے ظاہر ہے وہ خود بھی اپنی رعایا کے ساتھ برتاؤ اور عدل و انصاف میں کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھتا تھا۔ ترک، تاتار، مسلم، عیسائی اس کی نظر میں سب برابر تھے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا خواہاں رہتا تھا کہ رعایا کے حالات بہتر ہوں اور ان کے اندر زیادہ سے زیادہ خوش حالی آئے۔ اس نے خود کبھی دولت نہیں جمع کی۔ وہ بہت ہی سادہ اور نام ونمود سے پاک زندگی گزارتا تھا۔ جو بھی مال غنیمت اسے حاصل ہوتا اس میں سے یتیموں اور غریبوں کا حصہ نکالنے کے بعد اپنے فوجیوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ وہ فیاض، رحم دل اور مہمان نواز تھا۔ حکمراں ہونے کے باوجود اس نے اپنے لیے عیش و آسائش کا سامان جمع نہیں کیا، اس کا گھر معمولی قسم کا اور حکمرانی کے لوازمات سے خالی تھا۔ اوہ بالی کے فیض صحبت سے عثمان خاں پر درویشی کا جو رنگ زندگی کے ابتدائی حصے میں چڑھ گیا تھا اس کے اثرات تمام عمر باقی رہے۔ اپنی مجاہدانہ زندگی، انسان دوستی کے رویے اور غیر معمولی جرات وشجاعت کی خوبیوں کے سبب وہ نہ صرف اپنی زندگی میں ہر دل عزیز تھا بلکہ آج تک ترک اس کا نام عزت اور احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ اپنی حکومت کے ابتدائی دنوں میں ہی عثمان خاں نے اس کی شہر میں ایک مسجد تعمیر کروائی تھی جو کسی بھی عثمانی حکمراں کے ذریعہ تعمیر کی جانے والی پہلی مسجد تھی۔ عثمان خان کی انہیں خصوصیات اور اوصاف کے سبب اس کے بعد عثمانی خاندان میں یہ روایت پڑ گئی کہ جب کوئی حکمراں تخت نشین ہوتا تو عثمان کی تلوار (جواب تک محفوظ ہے) اس کی کمر سے باندھی جاتی اور ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کی جاتی تھی کہ خدا اس میں بھی عثمان خاں ہی جیسی خوبیاں پیدا کر دے۔

عثمان خاں عثمانی سلطنت کا پہلا حقیقی حکمراں اور بانی ہے اور اکثر اس کے نام کے ساتھ سلطان کا لقب بھی شامل کر دیا جاتا ہے، لیکن خود اس نے یا اس کے بعد اورخاں اور مراد اول نے بھی کبھی اپنے لیے سلطان کا لقب استعمال نہیں کیا بلکہ صرف امیر کہلاتے رہے۔ اپنے والد ارطغرل سے عثمان خاں کو سغوت، اس کی شہر اور آس پاس کا کچھ علاقہ جاگیر کے طور پر ورثے میں ملا تھا۔ عثمان خاں نے اپنی 38 سالہ امارت میں اس چھوٹے سے علاقے کو کافی وسعت دی اور ایک ایسی مملکت میں تبدیل کر دیا جس کی لمبائی 120 میل اور چوڑائی 60 میل تھی۔ عثمان خاں کے ذریعے قائم ہونے والی مملکت میں ترکوں کے علاوہ یونانی اور سلافی باشندے بھی کافی تعداد میں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عثمان خاں کے مقبوضات میں بیشتر بازنطینی حکومت کے ایشیائی علاقے شامل تھے۔ عثمان

خاں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں لوگوں کا نہ تو قتل عام کیا اور نہ ہی انہیں غلام بنایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے علاقوں میں اسلام بہت تیزی کے ساتھ پھیلا اور بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنی رعایا کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہیں کرتا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت جلد فاتح اور مفتوح ایک ہو گئے، ان کے درمیان آپس میں شادی بیاہ کے تعلقات بھی قائم ہو گئے اور پھر ان کے میل سے ایک نئی نسل تیار ہونے لگی جو ترکوں کے اقتدار والی دوسری ریاستوں سے قدرے مختلف تھی اور اپنے آپ کو عثمانی کہتی تھی۔

معلومات کی جانچ

1. قونیہ کی سلجوقی حکومت کا خاتمہ کیسے ہوا؟
2. عثمانی حکومت کا قیام کیسے عمل میں آیا؟
3. بازنطینی سلطنت کے ایک اہم شہر بروصہ کی فتح کیسے ہوئی؟
4. آرخان کو تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کے لئے کس نے بھیجا؟

20.10 عثمانی حکومت کے قیام واستحکام میں اہم رول ادا کرنے والے بعض دیگر حکمراں

اس میں شک نہیں کہ عثمانی حکومت کا بانی اول امیر عثمان خاں ہے جس نے اپنے باپ امیر ارطغرل کی چھوٹی سی جاگیر کو ایک باضابطہ مملکت کی شکل عطا کی۔ عثمان خاں کی قائم کردہ مملکت بہت چھوٹی اور مختصر تھی۔ اس کا نام جمعہ کے خطبے میں ضرور شامل ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنے لیے سلطان کا لقب اختیار نہیں کیا۔ یہ بعد میں آنے والے اس کے جانشین تھے جنہوں نے اس کی قائم کردہ چھوٹی سی ریاست کو ایک وسیع وعریض سلطنت میں تبدیل کر دیا جو ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے علاقے پر پھیلی ہوئی تھی۔

عثمان خاں کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کا چھوٹا بیٹا اورخاں (760ھ/1359ء-726ھ/1326ء) تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر اس وقت 42 برس تھی اور اپنے والد کی نگرانی میں اس وقت تک وہ حکمرانی کے اصول وآداب خاص طور پر فن سپہ گری میں کافی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ عثمان خاں کے دو بیٹے تھے، بڑا بیٹا علاء الدین اور چھوٹا اورخاں۔ عثمان خاں نے دونوں کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی تھی۔ علاء الدین کو علوم دینیہ سے دلچسپی تھی جبکہ اورخاں کو فنون سپہ گری سے خاص لگاؤ تھا اور وہ مملکت کے امور میں باپ کے ساتھ شریک رہتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عثمان خاں نے اپنی جانشینی کے لیے اورخاں کا انتخاب کیا۔ البتہ اورخاں نے باپ کے انتقال کے بعد بڑے بھائی کے سامنے یہ پیش کش رکھی کہ سلطنت کو باہم تقسیم کر لیا جائے۔ لیکن علاء الدین نے باپ کی وصیت اور اپنی عافیت پسند طبیعت کی بنا پر اس تجویز کو قبول نہیں کیا۔ البتہ اورخاں کے اصرار پر اس نے انتظام مملکت کی ذمہ داری قبول کر لی۔

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علاء الدین خاں گویا عثمانی حکومت کا پہلا وزیر تھا۔ بلاشبہ عثمانی حکومت کی توسیع اور استحکام میں اورخاں کی شجاعت اور بہادرانہ کارناموں کا بڑا اہم رول ہے۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت وزیر علاء الدین

نے مملکت کے نظم ونسق کو چلانے اور اسے منظم و مستحکم رکھنے کے لیے جو اصلاحات کیں اور جس طرح کے قدم اٹھائے فی الواقع وہی اصلاحات واقدامات عظیم الشان عثمانی سلطنت کی اساس اور بنیاد قرار پائے۔

باپ کی وصیت کے مطابق اورخاں نے حکومت سنبھالنے کے بعد بروصہ کو اپنی مملکت کا پایہ تخت بنایا۔ اور بہت جلد بازنطینی سلطنت کے باقی ایشیائی مقبوضات پر بھی قبضہ کرلیا، خاص طور پر نائیسا کا شہر جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے قسطنطنیہ کے بعد دوسرے درجے کا شہر تھا۔ 730ھ میں اسے بھی فتح کرلیا۔ ان فتوحات کے نتیجے میں عثمانی مملکت کا رقبہ پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہوگیا۔ اورخاں نے فتوحات کے سلسلے کو مزید وسعت دینے کے بجائے پہلے مفتوحہ علاقوں کے انتظام وانصرام پر توجہ دی۔ چنانچہ آئندہ طویل عرصے کے لئے اس کی حکومت میں کوئی جنگ نہیں ہوئی (اپنی عمر کے آخری حصے میں اس نے یورپ کی طرف توجہ کی اور اس کی قیادت میں مسلمان پہلی بار مشرقی یورپ میں فاتحانہ داخل ہوئے) جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اور اس کے حکام کو مملکت کے اندرونی معاملات کو سدھارنے، عوام کی فلاح و بہبود کے کام کرنے اور آئندہ اقدامات کے لیے خود کو تیار کرنے کا کافی موقع مل گیا۔

اورخاں کے بڑے بھائی اور اب عثمانی حکومت کے وزیر علاء الدین خاں نے بطور وزیر مملکت کے جن امور پر خاص طور پر توجہ دی اور جن کی وجہ سے عثمانی حکومت کو حقیقی استحکام نصیب ہوا، بنیادی طور پر وہ تین امور تھے جن کو علاء الدین کی اصلاحات کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ 1. سکہ 2. لباس 3. فوج۔

20.10.1 سکہ

اس سے پہلے ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ سلجوقی حکمراں سلطان علاء الدین کیقباد نے امیر عثمان خاں کو اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ وہ جمعہ کے خطبے میں اپنا نام شامل کرلے اور اپنے نام کا سکہ بھی جاری کرسکتا ہے۔ امیر عثمان خاں نے اپنے مزاج کی سادگی اور قناعت پسند طبیعت کی وجہ سے اور شاید اس وجہ سے بھی کہ اس وقت اس جیسے سادگی پسند حکمراں کے لیے سکہ ڈھالنے کی ٹکسال کا انتظام کرنا آسان کام نہیں تھا، اس نے اپنے نام کا سکہ جاری نہیں کیا تھا اور عثمانی علاقوں میں سلجوقی سکّے ہی رائج تھے۔ اب جب کہ سلجوقی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا، عثمانی حکومت ہی نہیں ایشیائے کوچک کی دوسری ریاستوں کو بھی سکے کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس کے ساتھ ہی مملکت میں سلجوقی سکوں کے جاری رہنے سے وہ دوسری ریاستوں سے ممتاز نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ علاء ال[illegible] نے وزارت کے ابتدائی دنوں ہی میں اس اہم معاملے کی طرف توجہ دی اور حکمرانی کے اس امتیاز کو اختیار کیا۔ اس نے دارالحکومت بروصہ میں طلائی اور نقرئی سکے ڈھالنے کے لیے ٹکسال قائم کی اور عثمانی حکمراں اورخان کے نام سے طلائی اور نقرئی دونوں طرح کے سکے جاری کر کے سلجوقی دور کے سکوں کے استعمال پر پابندی عائد کردی۔

20.10.2 لباس

لباس شناخت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اکثر افراد اور اقوام کی شناخت اور پہچان ان کے لباس سے بھی ہوتی ہے۔ عثمانی حکومت کے بانی عثمان خاں نے اس جانب بھی توجہ نہیں دی تھی اور اس کے زمانے میں عثمانی مملکت کے شہریوں کے لیے لباس کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ لوگ یکساں طور پر ایک ہی جیسا لباس پہنا کرتے تھے۔ اورخاں کے زمانہ حکومت میں وزیر علاء الدین نے

لباس کی جانب بھی توجہ دی اور مملکت میں رہنے والے مختلف طبقات کے لیے الگ الگ لباس کی نہ صرف تجویز دی بلکہ اسے قانون کے ذریعے عملاً نافذ بھی کیا۔ شہریوں اور دیہاتیوں کے لباس الگ الگ تھے اسی طرح مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لباس بھی الگ الگ مقرر تھے۔ گویا اس طرح مملکت کے مختلف طبقات میں آسانی کے ساتھ فرق و امتیاز کیا جاسکتا تھا۔

20.10.3 فوج

فوج کسی بھی مملکت وحکومت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر فوج مستحکم ہے تو مملکت وحکومت مستحکم رہتی ہے، اور اگر فوج افتراق وانتشار کا شکار ہو جائے تو پھر مملکت بھی منتشر ہو جاتی ہے اور حکومت ختم ہو جاتی ہے، اس لیے ہر مملکت وحکومت اپنے استحکام وبقا کے لیے فوج پر خاص توجہ دیتی ہے۔ عثمانی حکومت کے قیام کے زمانے تک باقاعدہ فوج کا انتظام نہیں تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ارطغرل یا عثمان خاں کے زمانے میں ان کی کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی۔ بلکہ ان کے زمانے تک یہ دستور تھا کہ جب بھی کوئی جنگ درپیش ہوتی تو عوام میں اس کا اعلان کر دیا جاتا اور جو شخص بھی لڑائی میں شریک ہونا چاہتا ہے وہ متعینہ تاریخ اور مقام پر حاضر ہو جاتا۔ گویا یہ ایک طرح کی رضا کار فوج ہوتی تھی جو بوقت جنگ یکجا ہو جاتی تھی اور لڑائی ختم ہونے کے بعد واپس چلی جاتی تھی۔ اس طرح کی فوج کو باقاعدہ تنخواہ یا معاوضہ نہیں ملتا تھا، بلکہ مال غنیمت کے طور پر جو کچھ ہاتھ آتا تھا وہی ان کی خدمت کا معاوضہ ہوتا تھا۔ ان فوجوں کا کوئی مخصوص لباس (وردی) بھی نہیں ہوتا تھا۔ عثمان خاں کے زمانے تک جب کہ مملکت زیادہ وسیع نہیں ہوئی تھی اس طرح کی غیر منظم فوج سے کام چل جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد اورخاں کے زمانے میں جب مملکت وسعت اختیار کرنے لگی اور اس کے استحکام کے مسائل پیش آنے شروع ہوئے تو یہ ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی کہ رضا کاروں کے علاوہ ایک باقاعدہ، مستقل اور منظم فوج بھی ہونی چاہیے، چنانچہ اس کے لائق بھائی اور وزیر علاء الدین خاں نے تنخواہ دار پیادوں پر مشتمل ایک باقاعدہ پیدل فوج ترتیب دی، جس کا نام 'پیادے' تھا۔ یہ فوج دس دس، سو سو اور ہزار ہزار کی ٹکڑیوں اور دستوں میں تقسیم تھی۔ اس فوج میں شامل فوجیوں کو باقاعدہ بڑی بڑی تنخواہیں ملتی تھیں اور فن سپہ گری میں باضابطہ ان کی تربیت ہوتی تھی۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد اس منظم فوج سے خودسری کا اظہار ہونے لگا جو اورخاں جیسے حکمراں کے لیے تشویش کا باعث تھا کیونکہ یہ فوج کسی بھی وقت خود اس کے لیے بھی خطرہ بن سکتی تھی چنانچہ اس نے علاء الدین اور شاہی خاندان کے ایک اور معزز رکن قراخلیل (قراخلیل کا عثمانی شاہی خاندان سے ازدواجی تعلق تھا اور علاء الدین خاں کے بعد یہ وزیر سلطنت ہو کر خیر الدین پاشا کے نام سے مشہور ہوا ہے) سے اس سلسلے میں مشورہ کیا۔ اس موقع پر قراخلیل نے اس کے سامنے جو تجویز رکھی اس نے نہ صرف یہ کہ اورخاں کو اپنی پیادہ فوج کی طرف سے مطمئن کر دیا بلکہ ایک ایسی فوج کے قیام کا راستہ ہموار کر دیا جو اپنے زمانے کی سب سے زیادہ منظم اور طاقت ور فوج تھی اور جس نے عثمانی حکمرانوں کے لیے فتوحات کا ایک ایسا دروازہ کھول دیا جو آنے والی تین صدیوں تک جاری رہا، اس دوران انہوں نے یورپ، ایشیا اور افریقہ میں نہ صرف یہ کہ تیز رفتار فتوحات حاصل کیں بلکہ اس فوج کی مدد سے عثمانی سلطنت کو مستحکم رکھنے میں بھی کامیاب رہے۔

انتظام اور بے مثال شجاعت و بہادری سے ایک وسیع وعریض سلطنت میں بدل دیا جو اپنے پہلے حکمراں عثماں خاں کے نام پر عثمانی سلطنت کہلاتی ہے اور جس کا ستارہ تین سو برس تک مسلسل عروج پر رہا اور جس نے اپنے عہد زوال میں بھی بار بار ایسے کارنامے انجام دیے کہ زوال کی رفتار تھم سی گئی اور اس کو ختم ہونے میں بھی تقریباً تین سو برس کا عرصہ لگ گیا۔

20.12 نمونے کے امتحانی سوالات

1. ترکوں میں اشاعت اسلام پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. مسلم دنیا میں ترکوں کے عروج کا جائزہ لیجیے۔
3. عثمانی ترکوں کے تاریخی پس منظر کو بیان کیجیے۔
4. عثمانی حکومت کے قیام واستحکام پر ایک مضمون لکھیے۔
5. عثمانی حکومت کے استحکام میں اروخاں اور اس کے وزیر بھائی علاء الدین خاں کی اصلاحات کا جائزہ لیجیے۔

20.13 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد دوم) — ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی
2. آل عثمان — مولانا اسلم جیراج پوری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی
3. دولت عثمانیہ (جلد اول، دوم) — ڈاکٹر محمد عزیر، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
4. تاریخ ملت (جلد سوم) — مفتی زین العابدین سجاد میرٹھی ومفتی انتظام اللہ شہابی، ادارہ اسلامیات، کراچی، پاکستان
5. مسلمانوں کا عروج اور زوال — مولانا سعید احمد ایم اے۔ فینس بکس، لاہور
6. اردو دائرہ معارف اسلامیہ، (متعلقہ مضامین) — دانش گاہ پنجاب، لاہور
7. ترکی میں مشرق ومغرب کی کش مکش، — خالدہ ادیب خانم (اردو ترجمہ، ڈاکٹر عابد حسین)

اکائی 21 : عثمانیوں کا نظام حکومت

اکائی کے اجزاء

21.1 مقصد

اس اکائی کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ عثمانی سلطنت کے نظام حکومت کا تعارف کرایا جائے۔ طالب علم کو یہ بتایا جائے کہ وہ کون سے ادارے تھے جن پر عثمانی سلطنت کا پورا نظام قائم تھا۔ اس نظام حکومت کی وہ کون سی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے یہ اپنے پہلے سے موجود نظام ہائے حکومت سے بہتر ثابت ہوا اور تقریباً پانچ سو برس تک عثمانی حکومت کے قائم رہنے میں معاون و مددگار بنا رہا۔ نیز اس اکائی میں یہ بھی جاننے کی کوشش کی جائے گی کہ عثمانیوں کے نظام حکومت میں مختلف اوقات میں کس طرح کی تبدیلیاں یا اصلاحات ہوتی رہیں۔

21.2 تمہید

عثمانی ترک منگولوں کے حملوں کے سبب بے گھر ہو کر ایشیائے کوچک میں داخل ہوئے تھے۔ اصلاً یہ ایک خانہ بدوش قوم تھی اور قبائل کی زندگی کے اوصاف ان میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے یعنی عثمانی ترک بہادری اور شجاعت جیسے اوصاف کے ساتھ ساتھ نظم و تنظیم کے لحاظ سے بھی نمایاں تھے۔ خانہ بدوشی کی زندگی نے ان میں نظم وضبط کی ایسی خوبی پیدا کر دی تھی کہ جب انہیں حکمرانی کا موقع ملا تو انہوں نے اپنی فوجی تنظیم، جمہوری مزاج اور اجتماعی نظام کے ذریعے ایک ایسے نظام حکومت کو فروغ دیا جو اپنے زمانے کا شاید سب سے بہتر نظام حکومت تھا اور جس کی بدولت ان کی حکمرانی کو نہ صرف یہ کہ پائداری اور استحکام حاصل ہوا بلکہ وہ

دنیا کی ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے اور تقریباً پانچ سو برس تک دنیا کے ایک بہت بڑے خطے پر حکمرانی کرتے رہے۔

اس میں شک نہیں کہ خانہ بدوش اقوام اپنی فطری شجاعت اور بہادری نیز قبائلی تنظیم کے ذریعہ بہت جلد متمدن اقوام اور سماج کو شکست دینے اور ان پر حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔لیکن ان کی یہ کامیابی بہت زیادہ دیرپا نہیں ہوتی۔اکثر ایسا ہوتا ہے کہ متمدن اقوام سے میل ملاپ میں ان کے امتیازات واوصاف کھو جاتے ہیں اور سو ڈیڑھ سو برس کے اندر ہی وہ زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔البتہ عثمانی ترک اس عموم سے مستثنیٰ ہیں۔انہوں نے ایشیائے کوچک میں داخل ہونے کے بعد ایک ایسی سلطنت کی بنیاد رکھی جو مسلسل تین سو برس تک وسعت، عروج اور استحکام کی طرف گامزن رہی۔اور دنیا کی وسیع ترین اور سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت بن گئی۔ایک موروثی بادشاہت جس کی رعایا میں مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگ شامل تھے۔بادشاہ بالکل مطلق العنان نہیں ہوتا تھا اور وہ خود کو سلطنت کے قوانین کا پابند سمجھتا تھا۔امور مملکت کی انجام دہی میں اپنے مشیروں سے مشورے لیتا تھا اور ان پر عمل بھی کرتا تھا۔ان سب سے بڑھ کر عثمانی سلطنت کی ترقی وکامیابی اور پائداری کا ضامن شاید اس کا وہ نظام تھا جس کے تحت ایک مخالف مذہب کے پیرو غلام نہ صرف یہ کہ غلامی سے آزاد کر دیے جاتے تھے، بلکہ تعلیم وتربیت کے ذریعہ انہیں اس لائق بنا دیا جاتا تھا کہ فوج کے عام سپاہی سے لے کر وزارت تک کسی بھی عہدے پر اپنی صلاحیت کے مطابق فائز ہو سکتے تھے یہاں تک کہ وہ درباری امیر اور شہزادیوں کے شوہر بھی بن سکتے تھے۔عثمانی حکام ان کے انتخاب میں ان کی نسل، مذہب اور زبان نہیں دیکھتے تھے، بلکہ ان کی جسمانی وذہنی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے اور پھر تربیت دے کر انہیں کندن بنا دیتے۔

21.3 عثمانیوں کا نظام حکومت آغاز وارتقاء

کوئی بھی نظام حکومت ہوا چانک وجود میں نہیں آجاتا، بلکہ ماضی کے تجربات، مقامی روایات اور پیش آمدہ حالات کسی بھی نظام حکومت کے وجود اور تشکیل میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ عثمانی ترک ایک خانہ بدوش قوم کی سطح سے اٹھے، اپنی صلاحیت، بہادری اور بہترین تنظیم کے ذریعے اس خاندان کے ابتدائی حکمرانوں نے ایشیائے کوچک میں بازنطینی سرحد پر واقع ایک چھوٹی سی جاگیر کو ایک وسیع وعریض سلطنت میں تبدیل کر دیا۔اس سے پہلے ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ اس خاندان کے پہلے امیر ارطغرل کی حیثیت سلجوقی سلطنت کے ایک معمولی جاگیردار سے کچھ زیادہ نہ تھی۔اس کے بعد اس کے بیٹے عثمان خاں نے اسے ایک باضابطہ ریاست کی شکل دی اور اسی وجہ سے اس کی قائم کردہ حکومت عثمانی حکومت کہلاتی ہے۔البتہ اس کی حکومت کا دائرہ بھی چونکہ بہت چھوٹا تھا اس لیے اس کے زمانے میں سابقہ سلجوقی نظام حکومت ہی عثمانی ریاست کی حدود میں بڑی حد تک جاری رہا۔نظام کی تبدیلی کے حوالے سے اس کے زمانہ حکومت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا کہ جمعہ کے خطبے میں اس کا نام بھی شامل ہو گیا تھا بصورت دیگر اس نے تو اپنے لیے سلطان کا لقب بھی نہیں استعمال کیا وہ صرف اور صرف امیر عثمان خان تھا۔

عثمان خان کی وفات کے بعد جب اس کا چھوٹا بیٹا اورخان اس کی وصیت کے مطابق حکمراں بنا۔اس کے زمانے میں فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا۔اپنے باپ کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اس نے بروصہ کے شہر کو اپنی حکومت کا پایہ تخت بنایا۔اسی طرح اس نے اپنے بڑے بھائی علاء الدین خاں کو جسے حکمرانی سے کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی، اپنا وزیر (صدر اعظم جس کا عہدہ وزیر اعظم کے

برابر ہوتا تھا) بنا کر اگر ایک طرف خود کو فوجی مہمات کے لیے فارغ کر لیا تو دوسری طرف مملکت کے اندرونی امور اور انتظام و انصرام کو اپنے بھائی کے حوالے کر کے گویا اسے بھی امور مملکت میں پوری طرح شریک کر لیا۔ اورخان کے زمانے میں ہمیں پہلی بار عثمانی حکومت کے نظام حکومت کے ابتدائی خدوخال اور نقوش ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں جب علاء الدین نے بعض اہم اصلاحات کا آغاز کیا۔ حالانکہ اس دوران بھی عثمانی مملکت میں بنیادی طور پر سابقہ سلجوقی حکومت کا نظام ہی جاری رہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی علاء الدین کی اصلاحات اور پھر قرا خلیل کی تجویز کے مطابق ینی چری (نئی فوج) کا قیام گویا اس بات کا اشارہ بھی تھا کہ اب ایک نئے نظام حکومت کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہوگا جو عثمانی نظام حکومت کے نام سے موسوم ہوگا اور جس پر آیندہ عثمانیوں کی عظیم الشان سلطنت کی عمارت قائم ہوگی۔

علاء الدین خان کی اصلاحات اس حوالے سے انتہائی اہمیت کی حامل ہیں کہ عثمانی حکومت کا وہ پہلا وزیر ہے جس نے اصلاحات کے توسط سے عثمانیوں کا اپنا نظام حکومت تشکیل دینے کی کوشش کی۔ اورخان کے نام کا عثمانی سکہ جاری کرنے کے علاوہ اس نے عثمانیوں کے زیر اقتدار علاقوں میں رہنے والے باشندوں کے لیے مختلف قسم کے لباس تجویز کر کے گویا ایک ممتاز مملکت اور ایک علاحدہ نظام حکومت کے خدوخال متعین کر دیے۔ اسی طرح پہلی باضابطہ، تنخواہ دار اور جنگ کے لیے ہمیشہ مستعد و تیار رہنے والی ایک پیادہ فوج تشکیل دے کر اس نے عثمانی نظام حکومت میں فوج کی اہمیت کو بھی گویا ایک طرح سے مستقل کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ قرا خلیل کی تجویز پر ینی چری (نئی فوج) کا قیام اورخان کے زمانہ حکومت کا ایک انقلابی اقدام تھا۔ لیکن اس کے ساتھ علاء الدین نے نظام حکومت کے استحکام اور فوج کی طاقت کو مزید مؤثر بنانے کے لیے ایک بے ضابطہ پیادہ فوج تشکیل دی جو تنخواہ دار نہ تھی۔ ایک فوج ایسی بنائی جو جاگیر کی مالک ہوتی تھی اور اس کے ذمے فوجی خدمت کے علاوہ اپنی جاگیروں سے متصل سڑکوں اور شاہراہوں کی مرمت بھی تھی۔ اسی طرح اس نے تنخواہ دار اور جاگیر دار دونوں طرح کے فوجیوں کا سوار دستہ بھی تشکیل دیا۔

اورخان کے زمانے میں ہی عثمانی حکومت میں پہلی مرتبہ پاشا کا خطاب رائج ہوا۔ سب سے پہلے اس نے یہ خطاب اپنے بھائی علاء الدین خاں کو دیا۔ پاشا کا خطاب ایک طرح سے ولی عہدی اور وزیر اعظم کے عہدے کی علامت تھا۔ علاء الدین کے بعد یہ خطاب اورخاں کے بڑے لڑکے سلیمان کو دیا گیا۔ بعد میں مراد کے زمانے سے پاشا کے خطاب سے ولی عہدی کی خصوصیت ختم ہوگئی۔ مزید آگے چل کر یہ خطاب بڑے بڑے فوجی اور ملکی عہدے داروں کو بھی دیا جانے لگا۔

اورخان کے بعد سلطان محمد فاتح ہمارے سامنے ایک ایسے عثمانی حکمراں کے طور پر آتا ہے جس نے عثمانیوں کے نظام حکومت کے لیے ایک باضابطہ آئین یا دستور مرتب کیا۔ اس کے وضع کیے ہوئے اسی 'قانون نامہ' کو سلطنت عثمانیہ کے بنیادی دستور کی حیثیت حاصل ہے۔ قانون نامہ کی رو سے سلطنت چار ستونوں پر قائم ہے۔ 1. وزراء سلطنت، یہ حکومت کے سب سے بڑے عہدے دار ہوتے تھے۔ 2. قضاۃ عسکر، ان کا تعلق علماء کی جماعت سے ہوتا تھا اور یہ عدالتوں کے سربراہ ہوتے تھے۔ 3. دفتر دار، اس کے ذمہ خزانے کا انتظام و انصرام ہوتا تھا۔ 4. نشانجی، یہ ایک طرح سے حکومت کا چیف سکریٹری ہوتا تھا۔ سلطنت کا سب سے بڑا ادارہ خود سلطان ہوتا تھا اور اسے عام طور پر باب عالی سے موسوم کیا جاتا تھا۔ سلطان کی کابینہ دیوان کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اسی طرح صوبے کے حکام آغا اور ضلع سطح کے حکام سنجق بے کہلاتے تھے۔ محمد فاتح کے 'قانون نامہ' میں ایک خونین قانون بھی تھا جس کے تحت حکومت کا جانشین امن و استحکام کی غرض سے اپنے بھائیوں کو قتل کر سکتا تھا۔

عثمانی حکمراں سلیمان اعظم (974ھ/1566ء-926ھ/1520ء) جسے سلیمان قانونی بھی کہا جاتا ہے، وہ سلطان ہے جس کے زمانے میں عثمانی سلطنت اپنی حد کمال کو پہنچ گئی۔ وہ بلاشبہ تین براعظموں کا شہنشاہ اور دو بحروں (سمندروں) کا مالک تھا۔ اس نے اپنے زمانہ حکومت میں خالص انتظامی نوعیت کی بہت سی اصلاحات کیں۔ مثلاً یہ کہ پوری سلطنت کو 21 ولایتوں (صوبوں) میں تقسیم کیا اور پھر یہ ولایتیں بھی 250 سنجقوں ضلعوں میں تقسیم تھیں۔ چونکہ عثمانی حکومت بنیادی طور پر ایک فوجی حکومت تھی۔ اس لیے اس نے فوج کی بہتر تنظیم کے لیے بھی متعدد اقدامات کیے۔ اسی طرح محصولات اور جاگیری نظام میں بھی اس نے اصلاحات کیں۔ قانون فوج داری قانون پولیس اور عام قوانین پر اس نے خاص توجہ دی۔ اور ایک ایسا مجموعہ قوانین تیار کروایا جس میں سلطنت عثمانیہ سے متعلق تمام ضروری قوانین کا احاطہ کرلیا گیا تھا۔ اسی طرح قانون رعایا، کے تحت غیر مسلم رعایا کے لیے بھی قوانین مرتب کرائے، غیر ملکی تاجروں کو تجارتی مراعات کے علاوہ قانونی تحفظ بھی فراہم کیا۔

سلطنت عثمانیہ کا زوال محمد فاتح کے بعد سے ہی شروع ہوگیا تھا۔ البتہ دنیا کی بہت ساری سلطنتوں کے زوال کے مقابلے عثمانیوں کا زوال کافی سست رفتار تھا۔ اور دور زوال میں بھی متعدد ایسے عثمانی سلطان گزرے ہیں جنہوں نے اپنی فراست، تدبر، حسن انتظام اور اصلاحات کے ذریعے نہ صرف یہ کہ ایک عرصے کے لیے زوال کی رفتار کو روک دیا بلکہ بڑے بڑے کارنامے بھی انجام دیے۔ سلطان سلیم ثالث (1222ھ/1807ء-1203ھ/1789ء) بھی عہد زوال کے ایسے ہی عظیم المرتبت عثمانی حکمرانوں میں سے ایک ہے۔ اس نے اپنے حسن تدبر سے نہ صرف یہ کہ سلطنت عثمانیہ کے زوال پر روک لگانے میں کامیابی حاصل کی بلکہ سلطنت کے نظم ونسق پر بھی خاص توجہ دی۔ سلطنت کی اساس عثمانی فوج میں اس کے زمانے تک بہت ساری خرابیاں پیدا ہوچکی تھیں، سلطان سلیم ثالث نے اس کی اصلاح کرنی چاہی۔ ولایتوں کے حکام یا پاشاؤں کے اختیارات میں تخفیف کی۔ جاگیری نظام کو درست کرنے کے اقدامات کیے وغیرہ۔

سلطان عبدالمجید خاں (1277ھ/1861ء-1255ھ/1839ء) آخری عثمانی حکمراں ہے جس نے فوجی و انتظامی اصلاحات کے ذریعہ سلطنت عثمانیہ کے روبہ زوال اقتدار کو بچانے کی کوشش کی۔ اس نے خط شریف گل خانہ (1839ء) اور دستور ثانی (1856ء) کے ذریعہ عثمانی سلطنت میں جو اصلاحات نظام حکومت میں متعارف کرائیں (یہ اصلاحات عرف عام میں تنظیمات یا تنظیمات خیر یہ کے نام سے مشہور ہیں) کہا جاتا ہے کہ بیرونی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا اگر شکار نہ ہو جاتیں تو ان اصلاحات کے توسط سے نہ صرف یہ کہ سلطنت عثمانیہ کا زوال رک جاتا بلکہ ان کے ساتھ ترکی بڑی آسانی کے ساتھ دور جدید میں داخل ہو جاتا اور عثمانی حکومت کا شیرازہ بھی بکھرنے نہیں پاتا۔

درج بالا سطور میں اختصار کے ساتھ اصلاحات کے حوالے سے سلطنت عثمانیہ کے نظام حکومت کے آغاز وارتقا پر گفتگو کی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ عثمانی حکمرانوں نے آغاز سلطنت سے ہی نظام حکومت کی اہمیت کو سمجھا اور اسے چست و درست رکھنے کی کوشش بھی کی۔ جب تک وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے اور ان کا نظام حکومت وقت اور حالات کے تقاضوں کا ساتھ دیتا رہا، وہ دنیا کی سب سے عظیم الشان سلطنت کے مالک ومختار بنے رہے اور جب نظام حکومت پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اس میں مختلف سطح پر خرابیاں در آئیں تو وہ بھی روبہ زوال ہوگئے۔

معلومات کی جانچ

1. عثمانی حکومت میں پہلی مرتبہ پاشا کا خطاب کس نے رائج کیا؟
2. سنجق بے کسے کہا جاتا ہے؟
3. قانون نامہ کی رو سے سلطنت کون سے چار ستونوں پر قائم ہے۔
4. عثمانی حکمراں سلیمان اعظم نے کیا کیا انتظامی اصلاحات کیں؟

21.4 عثمانی نظام حکومت

ایشیائے کوچک میں عثمانی ترکوں نے جس سلطنت کی بنیاد ڈالی وہ چھ سو سال تک قائم رہی۔ عثمانیوں کی یہ سلطنت اتنے طویل عرصے تک صرف اس وجہ سے قائم نہیں رہی کہ عثمانی ترک بہت زیادہ بہادر اور جنگ جوئی کی فطری خصوصیات سے متصف تھے، بلکہ ان کی سلطنت کی بقا کی ایک اہم اور بنیادی وجہ وہ نظام حکومت تھا جسے انہوں نے تشکیل دیا اور جو اپنے زمانے کا بہترین نظام حکومت تھا۔ اس نظام حکومت کی خاص بات یہ تھی سلطان بظاہر مختار مطلق ہونے کے باوجود بڑی حد تک سلطنت کے قانون کا پابند تھا۔ عثمانی سلطنت کا نظام حکومت بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم تھا۔ 1. ادارہ حکومت، جس کا سربراہ اعلی خود سلطان ہوتا تھا۔ شاہی خاندان کے افراد، حکومت کے انتظامی افسران، فوج کے حکام وغیرہ ادارہ حکومت کے لازمی اجزاء تھے۔ 2. ادارہ اسلامیہ، اس کا سربراہ شیخ الاسلام یا مفتی اعظم ہوتا تھا۔ اس ادارے کے ذمے سلطنت کے تمام مذہبی امور ہوتے تھے۔ عدالتوں کے قاضی، مفتی، مدرسوں کے اساتذہ، مکتبوں کے معلم اور مساجد کے ائمہ ومؤذنین کا تعلق ادارہ اسلامیہ سے ہوتا تھا۔ چونکہ عثمانی سلطنت بہت وسیع تھی اور اس کی رعایا میں ایک بڑی تعداد غیر مسلموں کی بھی شامل تھی۔ سلطنت کے ان غیر مسلموں کے لیے جو مختلف مذہبوں کے ماننے والے اور مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مذہبی امور کی انجام دہی اور ان کے مذہبی حقوق کی حفاظت کے لیے ایک جداگانہ نظام قائم تھا اور یہ ملت سسٹم یا نظام ملت کہلاتا تھا۔ آئندہ صفحات میں ہماری کوشش ہوگی کہ عثمانی نظام حکومت کے ان مختلف شعبہ جات پر الگ الگ اور تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جائے۔ سب سے پہلے ہم ادارۂ حکومت سے شروع کرتے ہیں:

21.4.1 ادارہ حکومت

عثمانی نظام حکومت کا سب سے اہم ادارہ حکومت تھا۔ اس ادارے کا سربراہ اعلی خود سلطان ہوتا تھا، اور وہ موروثی طور پر منتخب ہوتا تھا۔ البتہ سلطان کے علاوہ ادارہ حکومت کے جو بھی اور جتنے بھی ذمہ داران ہوتے تھے ان کا انتخاب محض اپنی صلاحیت کی بنیاد پر ہوتا تھا اور ان عہدوں یا ذمہ داریوں تک پہنچنے کے لیے انہیں بہت ہی سخت تربیت کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس ادارے میں سلطان اور اس کے اہل خاندان کے علاوہ حکومت کے انتظامی افسران، مستقل سوار اور پیدل فوج اور نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد جو فوجی خدمات، دربار اور حکومت کی ضروریات کے لیے زیر تعلیم وتربیت رہا کرتی تھی، شامل تھی۔ صدر اعظم جسے ہم وزیر اعظم سے تعبیر کر سکتے تھے اس ادارے میں سلطان کے بعد سب سے زیادہ بااختیار منتظم ہوا کرتا تھا۔ حکومت کی باگ ڈور پورے طور پر اس

ادارے کے ارکان وافراد کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ پوری سلطنت کا نظم وانصرام انہیں کے ذمہ ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے شرعی امور ادارہ اسلامیہ اور غیر مسلموں کے مذہبی امور ان کی ملتوں کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ ادارہ حکومت کی سب سے بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ارکان چند مستثنیات کو چھوڑ کر تمام کے تمام وہ لوگ ہوتے تھے جو عیسائی والدین کی اولاد تھے اور جو چاہے جس سب اور عہدے پر بھی فائز ہو جائیں ان کی حیثیت سلطان کے غلام کی ہوتی تھی۔

21.4.2 ادارہ حکومت میں داخلے کا طریقہ

ہمیں معلوم ہے کہ سلطان اور اس کے خاندان کے افراد موروثی طور پر ادارہ حکومت کے رکن ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ جو لوگ بھی اس ادارے میں شامل یا داخل کیے جاتے تھے وہ انتخاب کے ذریعے آتے تھے۔ ادارہ حکومت میں داخلے کے لیے انتخاب کے چار طریقے تھے۔ 1. یا تو وہ جنگ میں گرفتار کیے جاتے تھے۔ 2. یا خریدے جاتے تھے۔ 3. یا سلطان کے پاس بطور ہدیہ بھیجے جاتے تھے۔ 4. یا خراج میں حاصل کیے جاتے تھے۔ گویا ادارہ حکومت میں داخلے کا راستہ غلامی کے دروازے سے ہو کر گزرتا تھا۔ عام طور پر اس کے لیے چودہ سے اٹھارہ سال کے بچوں کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ خراج کے طریقے سے جن بچوں کو ادارہ حکومت کے لیے منتخب کیا جاتا تھا اسے ''دوشرمہ'' کہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے عموماً ہر چار سال کے بعد عہدے داروں کی ایک جماعت، جو لڑکوں کی صلاحیت وقوت کو پرکھنے میں خاص مہارت رکھتی تھی، حکومت کی طرف سے ان علاقوں میں بھیجی جاتی تھی جہاں سے خراج آتا تھا۔ جو والدین اپنے بچوں کو اس نظام میں داخل کرنا نہیں چاہتے تھے وہ بچپن میں ہی ان کی شادیاں کر دیتے تھے کیونکہ شادی شدہ بچوں کو اس کے لیے منتخب نہیں کیا جاتا تھا۔ البتہ ایسے والدین بھی بڑی تعداد میں ہوتے تھے جو خوشی خوشی اپنے بچوں کو ادارہ حکومت میں داخل کرنا چاہتے تھے کیونکہ اس طرح انہیں نہ صرف غربت وافلاس سے نجات مل جاتی تھی بلکہ وہ اپنی صلاحیت کے مطابق اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ بھی حاصل کر سکتے تھے۔ انہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بچے اپنی استعداد واہلیت کے مطابق اعلیٰ درجہ کی تربیت حاصل کریں گے اور پھر ترقی کر کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ بہت سے ترک ان پر رشک کیا کرتے تھے کیونکہ ادارہ حکومت میں مسلمانوں کے بچوں کی شمولیت کی اجازت نہیں تھی، ان میں سے بعض تو اپنے عیسائی پڑوسیوں کو رشوت دے کر کئی مرتبہ اس بات پر راضی کر لیتے تھے کہ وہ ان کے لڑکوں کو اپنا لڑکا بنا کر ادارہ حکومت میں بھرتی کروا دیں۔ عثمانی سلطنت کے دورِ زوال میں بھرتی کے اس طریقے میں بعض تبدیلیاں ہوئیں اور زوال میں معاون بنیں۔

21.4.3 ادارہ حکومت کا تعلیمی نظام

ادارہ حکومت اپنے وسیع تر مفہوم میں ایک تعلیمی وتربیتی ادارہ تھا جس میں بچوں کو تمام عمر کے لیے داخل کیا جاتا تھا۔ اس تعلیمی ادارے میں بچوں کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر توجہ دی جاتی تھی۔ ان کی جسمانی وذہنی دونوں طرح کی تربیت کا یکساں طور پر خیال رکھا جاتا تھا۔ ادارہ حکومت میں بچوں کی فوجی اور انتظامی امور کے لیے تربیت خاص طور پر پیش نظر ہوا کرتی تھی۔ انہیں سخت اصولوں اور ضابطوں کا پابند بنایا جاتا تھا بتدریج انہیں ترقی دی جاتی تھی اور لیاقت کے مطابق انعامات واعزازات بھی ملتے تھے۔ ادارے کے قواعد وضوابط کی خلاف ورزی پر بچوں کو سخت سزائیں بھی دی جاتی تھیں۔ ایک خاص سطح تک تمام بچوں کو ذہنی وجسمانی تربیت کے

مرحلے سے گزرنا ہوتا تھا۔ البتہ اس کے بعد ان کی ذہنی وجسمانی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ادارہ حکومت سے وابستہ ماہرین ان کا امتحان لیتے اور استعداد کے لحاظ سے انہیں دو مختلف گرپوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ جو بچے جسمانی اور ذہنی دونوں سطحوں پر اعلیٰ معیار اور کارکردگی کا مظاہرہ کرتے انہیں اعلیٰ تربیت کے لیے منتخب کرلیا جاتا۔ باقی بچوں کو جسمانی تربیت کے لیے فارغ کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ سلطنت کے دفاع کے لیے بہترین فوجی بن سکیں۔

ادارہ حکومت کے تعلیمی ادارے میں جو امیدوار اعلیٰ تربیت کے لیے منتخب کیے جاتے تھے، ان کی ایک بڑی تعداد کو ادرنہ، غلطہ اور استنبول کے شاہی محلوں میں سلطان کے زیر سایہ اور نگرانی میں اعلیٰ تربیت کے حصول کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ یہاں انہیں تعلیم و تربیت کا ایک بہت ہی جامع اور سخت نصاب پورا کرنا پڑتا تھا۔ انہیں عربی و فارسی کی اعلیٰ معیاری تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ ورزش، فنون حرب، شہسواری اور کوئی دست کاری بھی سکھائی جاتی تھی۔ تعلیم و تربیت کے اس مرحلے کی مدت بارہ سال میں ختم ہوتی تھی۔ آگے چل کر انہیں میں سے کچھ کو انتظامی امور کی تربیت کے لیے منتخب کرلیا جاتا تھا اور ان کی عملی تعلیم کے مقصد سے انہیں قصر سلطانی کی مختلف چھوٹی چھوٹی خدمتوں پر مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اس دوران اپنی لیاقت وصلاحیت کے اعتبار سے وہ جتنا زیادہ سلطان کی ذات سے قریب ہو جاتے تھے، مدت تعلیم کی تکمیل کے بعد انہیں اتنی ہی اہم ذمہ داریاں دی جاتی تھیں۔ پچیس سال کی عمر ہونے کے بعد ہی یہ مرحلہ مکمل ہو پاتا تھا۔ اعلیٰ تربیت کے لیے منتخب ہونے والے نوعمروں کی ایک اور تعداد کو تعلیم و تربیت کے لیے صوبوں کے گورنروں اور سلطنت کے اعلیٰ عہدے داروں کے پاس بھی بھیجا جاتا تھا۔ وہاں بھی ان کی تعلیم و تربیت اسی انداز اور طریقے پر ہوتی تھی جیسے کہ سلطان کی نگرانی میں۔ انتظامی خدمات کے لیے منتخب ہونے والے امیدواروں کے بعد طلبہ کی جو تعداد بچ رہتی تھی ان کی اکثریت باضابطہ سوار فوج میں ''جسے باب عالی کے سپاہی کہتے تھے'' داخل کر دی جاتی تھی۔ ان کے رخصت کرنے کی باضابطہ تقریب منعقد کی جاتی تھی اور سلطان اس میں بہ نفس نفیس شریک ہو کر ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

ادارہ حکومت کے تعلیمی نظام میں ماہرین کے ذریعہ تعلیم و تربیت کا ایک خاص مرحلہ مکمل کر لینے کے بعد طلبہ کے جو دو گروپ بنتے تھے ان میں سے پہلے کا ذکر اوپر کی سطروں میں ہو چکا۔ ان کے دوسرے گروپ کی تربیت زیادہ تر جسمانی، صنعتی اور فوجی نوعیت کی ہوتی تھی۔ ان امیدواروں کو ترکی زبان اور اسلامی اصول زبانی سکھائے جاتے تھے۔ ان کا جو منتخب حصہ ہوتا تھا انہیں ینی چری نئی فوج کی شکل دے دی جاتی تھی۔ پہلے ان امیدواروں کو اناطولیہ کے اندرونی علاقوں میں بھیج دیا جاتا تھا تاکہ وہاں رہ کر یہ لوگ ترکی زبان، ترکی معاشرت اور ترکی ثقافت سے واقفیت حاصل کرلیں۔ یہاں ان کی جسمانی مضبوطی کے لیے ان سے کھیتی کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ دو تین سال کے بعد ان کے معاینے کے لیے دارالحکومت سے افسر آتے تھے۔ ان میں سے جو اپنی تعلیم و تربیت میں کامیاب قرار پاتے تھے انہیں ترقی دے کر دارالحکومت بھیج دیا جاتا۔ وہاں ان میں سے کچھ کو بحری بیڑوں پر کام کرنے اور خدمات انجام دینے کے لیے بھیج دیا جاتا اور کچھ شاہی محلوں اور پبلک عمارتوں میں کام پر لگا دیے جاتے۔ اس دوسرے درجہ میں کام کرنے کے بعد ان کو انفرادی انتخاب کے ذریعے ینی چری کے دستوں میں بغرض تعلیم و تربیت بھیجا جاتا تھا اور جب انہیں فن سپہ گری میں مہارت حاصل ہو جاتی تو پھر انہیں باضابطہ ینی چری کا حصہ بنا دیا جاتا۔

21.4.4 ادارہ حکومت کے بنیادی اصول

سلطنت عثمانیہ کی قوت کا راز اس کے ادارہ حکومت کے زبردست نظام میں تھا۔ اس ادارے کے مخصوص اصول وضوابط تھے جن کی سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی تھی۔ اور جب تک ادارہ حکومت کی تنظیم میں ان اصولوں کی پابندی کی جاتی رہی۔ عثمانی دنیا کی عظیم ترین طاقت کے مرتبے پر فائز رہے۔ جب سے ان اصولوں میں نرمی برتی جانے لگی، ادارہ حکومت کی تنظیم کمزور پڑنے لگی اور عثمانیوں کا زوال شروع ہوگیا۔ ادارہ حکومت کے نظام کے بنیادی اصول یہ تھے۔

1. امیدواروں کا انتخاب بہت عمدہ طریقے پر ہوتا تھا۔
2. امیدواروں کی تعلیم وتربیت کی سخت نگرانی کی جاتی تھی۔
3. پرجوش مقابلے کے ساتھ ساتھ شدید ضبط وتادیب۔
4. کسی بھی امیدوار کو اپنی کوشش اور محنت کے ذریعے ترقی کرنے اور اونچے سے اونچا مرتبہ حاصل کرنے کے مواقع حاصل تھے۔ یہاں تک کہ وہ صدر اعظم بھی بن سکتا تھا۔
5. امیدوار کا سلطنت کی عیسائی رعایا کی اولاد میں سے ہونا ضروری تھی۔

ادارہ حکومت کے نظام میں داخلے کے ان اصولوں سے اگر کوئی مستثنیٰ تھا تو وہ صرف اور صرف عثمانی شاہی خاندان تھا یعنی شاہی خاندان کے افراد بغیر کسی انتخاب کے ادارہ حکومت میں شامل ہوسکتے تھے اور بلا مقابلہ وہ کوئی بھی عہدہ ومنصب حاصل کرسکتے تھے۔ ادارہ حکومت میں داخلے کے لیے یہ سخت شرطیں اور اصول شاید اس لیے تھے کہ شاہی خاندان کے علاوہ کوئی بھی دوسرا موروثی حکمراں طبقہ وجود میں نہ آسکے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ جب تک ادارہ حکومت میں داخلے کے ان اصولوں پر سختی کے ساتھ عمل درآمد جاری رہا۔ ادارہ حکومت پوری طرح مستحکم رہا لیکن سلیمان قانونی کے بعد جب ان اصولوں پر حکومت کی بندش ڈھیلی پڑگئی اور ارکان حکومت نے سلطان پر دباؤ ڈال کر اس سے یہ اجازت حاصل کرلی کہ ان کی اولاد ان کی جگہوں پر تقرر ہوسکتا ہے تو اس کے ساتھ ہی عثمانی نظام حکومت کا زوال شروع ہوگیا اور ان کی حکومت دھیرے دھیرے کمزور پڑتی چلی گئی۔

21.4.5 ادارہ حکومت کے ارکان کے حقوق

ادارہ حکومت کا ہر رکن، خواہ وہ کتنے ہی بڑے منصب اور عہدے پر فائز کیوں نہ ہو، سلطان کا غلام ہوتا تھا۔ قلی (غلام) کا لقب ان کے لیے اعزاز وامتیاز کا نشان ہوتا تھا اور ہر جگہ سلطان کے ان غلاموں کا احترام کیا جاتا تھا۔ ادارہ حکومت کے ان ارکان کو جو مراعات اور حقوق حاصل تھے وہ درج ذیل ہیں:

1. ادارہ حکومت کے تمام ارکان ٹیکس سے بری ہوتے تھے۔ یعنی ان سے کسی قسم کا ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا۔
2. وہ سلطان کے علاوہ اپنے اعلیٰ افسروں اور اپنے لیے مخصوص عدالتوں کے سامنے ہی جواب دہ ہوتے تھے۔
3. سلطان انہیں ضروریات زندگی کی تمام فکروں سے بے نیاز کردیتا تھا اور اس کی جانب سے انہیں اتنا نوازا جاتا تھا کہ وہ عیش وعشرت کی زندگی گزارتے تھے۔

4. انہیں شاہی خزانے سے بھاری تنخواہیں ملتی تھیں۔
5. ادارہ حکومت کے وہ ارکان جو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے سلطان کی جانب سے انہیں بڑی بڑی جاگیریں بھی دی جاتی تھیں۔

ان حقوق ومراعات کے ساتھ ادارہ حکومت کے ارکان بہت ہی خوش حال اور عیش وعشرت کی زندگی گزارتے تھے۔ شروع میں ان کے معاملات بھی ادارہ اسلامیہ کی عدالتوں سے تعلق رکھنے والے قاضیوں کی عدالتوں میں جاتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے سلطان سے یہ خاص رعایت حاصل کر لی کہ ان سے متعلق مقدمات صرف ان کے اپنے افسروں کی عدالتوں میں پیش ہوا کریں اور اس کے لیے ان کی الگ عدالتیں قائم کر دی گئیں۔

21.4.5.1 سلطان

ادارہ حکومت کا سب سے بڑا عہدے دار سلطان ہوتا تھا۔ اس کے اختیارات کی کوئی حد نہیں تھی، وہ اس ادارے کے تمام ارکان کے جان و مال کا مالک ہوتا تھا۔ ادارہ حکومت کے دیگر عہدے داروں کی طرح سلطان کا انتخاب اہلیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ موروثی طور پر ہوتا تھا اور صرف عثمانی شاہی خاندان کا کوئی فرد ہی سلطان بن سکتا تھا۔ سلطنت کے قیام کی ابتدائی صدیوں میں قانون وراثت یہ تھا کہ بیٹا باپ کا جانشین ہوتا تھا، بھائی اسی وقت تخت نشین ہوتا تھا جب سابق سلطان کا کوئی بیٹا اس کی وفات کے وقت موجود نہ ہوتا۔ تخت کے حصول کے لیے عثمانی شہزادوں میں جنگیں بھی ہوئیں۔ اور تخت نشین ہونے کے بعد بھائیوں کو قتل کرانا عام بات تھی۔ سلطان محمد فاتح نے تو قانون ہی بنا دیا تھا کہ جو بیٹا تخت نشین ہو وہ اپنے بھائیوں کو قتل کرا دے۔ سلیمان اعظم کے زمانے سے شہزادوں کو قتل کرانا تو بند کرا دیا گیا لیکن انہیں محل میں نظر بند رکھا جاتا تھا۔ 1617ء میں سلطان احمد کے انتقال کے بعد اس کے تمام لڑکے نوعمر تھے۔ اس لیے دیوان نے یہ فیصلہ کیا کہ تخت کا وارث آل عثمان کا وہ شہزادہ ہوگا جو عمر میں سب سے بڑا ہو۔ اس کے بعد سے عثمانی سلطنت کے خاتمے تک یہی قانون جاری رہا۔ صرف دو سلطان محمد رابع (1099ھ/1687ء-1058ھ/1648ء) اور عبدالمجید (1277ھ/1861ء-1255ھ/1839ء) ایسے ہوئے جو اپنے باپ کی جگہ تخت نشین ہوئے۔

چونکہ عثمانی سلطنت میں ادارہ حکومت ہی سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ادارہ تھا اور سلطان کی شخصیت کو اس میں مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ سلطان میں فہم وفراست، تدبیر وسیاست، عدل وانصاف اور رعایا پروری کے اوصاف اعلیٰ پیمانے پر موجود ہوں۔ عثمان خاں سے لے کر سلیمان اعظم تک عثمانی حکمرانوں میں یہ اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے۔ اس زمانے تک یہ رواج بھی تھا کہ حکمرانی کی تربیت کے لیے عثمانی شہزادوں کو مختلف صوبوں کا گورنر بھی بنایا جاتا تھا۔ سلیمان اعظم کے زمانے میں اس طریقے کی منسوخی کے بعد شہزادوں کو محل میں بند رکھنے کی روایت پڑ گئی۔ اس لیے بعد کے حکمراں نہ صرف یہ کہ حکمرانی کی تربیت سے محروم ہو گئے بلکہ محل کی رنگ رلیوں اور عیش وعشرت تک محدود ہو کر انہوں نے خود کو نکما کر لیا۔

اس میں شک نہیں کہ ادارہ حکومت کے سربراہ اعلیٰ کے طور پر سلطان کو لامحدود اختیارات حاصل تھے، لیکن مطلق العنان فرماں روا ہونے کے باوجود ادارہ حکومت کے باہر وہ شریعت، ملکی قوانین اور ترکوں کے قومی رسم ورواج کا پابند ہوتا تھا۔ عثمانی سلطنت میں چار طرح کے قوانین جاری تھے۔ 1۔ شریعت، 2۔ قانون یعنی عثمانی حکمرانوں کے تحریری فرامین، 3۔ عادت یا قومی وملکی رسم ورواج

جو قدیم زمانے سے چلا آتا تھا، 4۔ عرف یعنی موجودہ سلطان کا جاری کردہ قانون یا فرمان۔ ان میں شریعت کے قوانین سلطان سے بالاتر تھے۔ وہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی پابندی اس کے لیے لازمی تھی۔ حالانکہ اپنے پیش رووں کے بنائے ہوئے آئین و قانون کی پابندی سلطان کے لیے ضروری نہیں تھی تاہم وہ اتنے مفید اور کارآمد تھے کہ کوئی بھی سلطان انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ سلیمان اعظم جو ''قانونی'' کے لقب سے مشہور ہے۔ اس نے بھی اپنے قانون نامہ میں پرانے آئین و قوانین کو مرتب اور منضبط زیادہ کیا ہے، اس میں نئے قوانین بہت کم ہیں، ترکوں میں قدیم رواجوں کی پابندی بہت شدت سے کی جاتی ہے۔ ان میں وہ کسی طرح کی مداخلت بھی گوارا نہیں کرتے۔ اس لیے سلطان بالعموم ترک رسوم و رواج کی پابندی کرتا تھا۔

21.4.5.2 دیوان

عثمانی سلطان کی مجلس شوریٰ (جسے ہم کابینہ بھی کہہ سکتے ہیں) کو دیوان کہا جاتا تھا۔ یہ سلطان کے بعد سب سے زیادہ با اختیار مجلس تھی اور اس کے فیصلوں کو عام طور پر سلطان بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس مجلس شوریٰ یا دیوان کے ارکان مندرجہ ذیل ہوتے تھے:

1. صدر اعظم، اس کا مرتبہ وزیر اعظم کے برابر ہوتا تھا، اور اس کے ماتحت وزراء جن کی تعداد بالعموم تین ہوتی تھی۔
2. شیخ الاسلام، یہ ادارہ اسلامیہ کا سربراہ ہوتا تھا اور اسی حیثیت میں دیوان کا رکن بھی ہوتا تھا۔
3. قاضی عسکر اناطولیہ، یہ علماء کی جماعت سے ہوتا تھا اور عثمانی سلطنت کے ایشیائی مقبوضات کے عدالتی امور کا ذمہ دار ہوتا تھا۔
4. قاضی عسکر رومیلیا، یہ بھی علماء کی جماعت سے ہوتا تھا اور سلطنت عثمانیہ کے یورپی مقبوضات کے عدالتی امور اس کے حوالے ہوتے تھے۔
5. بیلر بے اناطولیہ۔ یہ اناطولیہ کے علاقوں کے صوبہ دار اعلیٰ ہوتا تھا۔
6. بیلر بے رومیلیا۔ یہ عثمانی سلطنت کے یورپی مقبوضات کا اعلیٰ صوبے دار ہوتا تھا۔
7. آغائے ینی چری، یہ ینی چری فوج کا سپہ سالار اعلیٰ ہوتا تھا۔
8. قپودان (کپتان) پاشا، عثمانی سلطنت کا امیر البحر ہوتا تھا۔
9. دفتر دار، عثمانی سلطنت کا وزیر مالیات ہوتا تھا۔
10. نشانجی، عثمانی سلطنت کا چیف سکریٹری ہوتا تھا اور سلطان کی مہر اس کے پاس ہوتی تھی۔

اسی طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ عثمانی سلطنت کا دیوان ایک طرح سے حکومت کے مختلف شعبوں کے اعلیٰ افسروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ دیوان کو سلطنت کی سب سے بڑی مشاورتی مجلس کی حیثیت حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ عدالت عالیہ کا مرتبہ بھی حاصل تھا۔ اس میں شیخ الاسلام اور قضاۃ عسکر کی شمولیت اسی حیثیت سے ہوتی تھی۔ دیوان کا اجلاس رمضان کے مہینے کے علاوہ تمام سال ہفتے میں چار دن ہوا کرتا تھا۔ شروع کے عثمانی سلطان خود ہی مجلس دیوان کی صدارت کیا کرتے تھے، البتہ سلیمان اعظم نے اس طریقے کو ترک کر دیا۔ وہ خود مجلس میں شریک ہونے کے بجائے اس کی کاروائی کی نگرانی دیوان خانے سے متصل ایک کمرے کی جالی دار کھڑکی کے

پاس بیٹھ کر کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد کے حکمرانوں نے اس نگرانی کو بھی چھوڑ دیا اور اب دیوان کا سارا کام صدر اعظم کے سپرد تھا۔ دیوان کی مجلسوں کی صدارت مستقل طور پر وہی کرنے لگا اور سلطان کے نمایندے کے طور پر اسے تمام ملکی، فوجی اور انتظامی اختیارات حاصل ہو گئے۔

21.4.5.3 صدر اعظم

یہ عثمانی سلطنت کا وزیر اعظم یا سب سے بڑا انتظامی عہدے دار ہوتا تھا۔ سلطان کے بعد سب سے زیادہ اختیارات صدر اعظم کو ہی حاصل ہوتے تھے۔ دیوان کی مجلس میں سلطان کے دائیں جانب اس کی نشست ہوتی تھی۔ سلطان سلیمان کے زمانے سے جب سلطان نے دیوان کی مجلس میں شرکت ترک کر دی تو سلطان کے نائب کی حیثیت سے صدر اعظم ہی دیوان کی مجالس کی صدارت کرتا تھا۔ ضرورت کے وقت صدر اعظم دیوان کے اجلاس اپنے گھر پر بھی طلب کر سکتا تھا۔ صدر اعظم کا عہدہ سلطان کے عہدے کی طرح موروثی نہیں تھا بلکہ اس کا انتخاب ادارہ حکومت کے ارکان میں سے اہلیت کی بنیاد پر ہوتا تھا۔

21.4.5.4 دیگر وزراء

ادارہ حکومت کو چلانے کے لیے صدر اعظم کے ماتحت تین دیگر وزیر ہوتے تھے۔

1. کحیا بے: اس کے ذمہ وزیر جنگ اور وزیر داخلہ کی انجام دہی تھی۔ کحیا بے ہی صدر اعظم کی غیر موجودگی میں اس کا قائم مقام ہوتا تھا۔ یعنی صدر اعظم کے بعد وزراء میں سے سب سے زیادہ با اختیار وزیر کحیا بے ہوا کرتا تھا۔
2. رئیس آفندی: اس کا پورا لقب رئیس الکتاب تھا۔ اسے عثمانی سلطنت کے وزیر خارجہ کی حیثیت حاصل تھی۔ بعد میں نشانجی کے اختیارات بھی رئیس آفندی کے پاس آجانے کی وجہ سے یہی اصل چیف سکریٹری قرار پایا۔ نشانجی کا عہدہ محض تعظیمی رہ گیا۔
3. چاوش باشی: اس وزیر کے ذمہ دربار کے انتظامات ہوتے تھے اور سلطنت کے وزیر پولس کے اختیارات بھی اسی کو حاصل تھے۔

دفتر دار اور نشانجی

دفتر دار اور نشانجی سلطنت عثمانیہ کی مالیات کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ درجے میں یہ وزراء کے برابر ہوتے تھے۔ دفتر دار وزیر مالیات کے فرائض انجام دیتا تھا۔ نشانجی کا کام تمام سرکاری کاغذات اور دستاویزات تیار کرنا تھا، جس دستاویز پر ضرورت ہوتی سلطان کا طغرا (یعنی مہر) بھی وہی ثبت کرتا تھا۔ حکومت کی کاروائی کی روداد مرتب کرنے کے لیے اس کے ماتحت مستقل عملہ ہوتا تھا۔ بعد میں رئیس آفندی کے اختیارات میں اضافے کے ساتھ نشانجی کی اہمیت کم ہوتی گئی اور یہ صرف ایک تعظیمی عہدہ رہ گیا اس کے تمام متعلقہ فرائض رئیس آفندی کو منتقل ہو گئے۔

21.4.5.5 بیلر بے:

بیلر بے کا عہدہ صوبے دار کے برابر ہوتا تھا۔ شروع میں عثمانی سلطنت کے تمام مقبوضات صرف دو حصوں میں تقسیم تھے۔ عثمانی مقبوضات کا ایشیائی حصہ اناطولیہ کہلاتا تھا اور اس کا یورپی حصہ رومیلیا کہلاتا تھا۔ شروع میں عثمانی سلطنت میں صرف دو بیلر بے ہوتے

تھے۔ایک ایشیائی مقبوضات کے لیے جو بیلر بے اناطولیہ کہلاتا تھا اور دوسرا یورپی مقبوضات کے لیے جو بیلر بے رومیلیا کہلاتا تھا۔ بعد کے ادوار میں ان کی تعداد بڑھا دی گئی اور یہ سلطنت کے مختلف صوبوں کے والی یا گورنر جنرل مقرر کر دیے گئے۔بیلر بے ایک طرح سے صوبوں میں سلطان کا نمائندہ ہوتا تھا اور صوبوں میں اسے وہ تمام ملکی اور فوجی اختیارات حاصل ہوتے تھے جو مرکز میں سلطان کو حاصل ہوتے تھے۔گویا وہ صوبے کے تمام انتظامی وفوجی عہدے داروں کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔عثمانی سلطنت میں صوبوں کو پہلے ایالت کہا جاتا تھا۔بعد میں انہیں ولایت کا نام دے دیا گیا۔ایالتیں ضلعوں میں تقسیم ہوتی تھیں جن کو سنجق یا لوا کہتے تھے، دونوں کے معنی پرچم کے ہیں، ان ضلعوں کے حاکم سنجق بے یا میرلوا کہلاتے تھے۔ہر صوبے کی ایک مجلس شوریٰ مرکزی دیوان کے طرز پر ہوتی تھی، جس کا صدر وہاں کا والی یا گورنر (بیلر بے) ہوتا تھا۔اس مجلس شوریٰ میں تمام ضلعوں کی عوامی نمائندگی ہوتی تھی اور اس کے ارکان صوبے کی حکومت کے مختلف شعبوں کے اعلیٰ افسران ہوتے تھے۔

معلومات کی جانچ

1. عثمانی حکومت کتنے سالوں تک قائم رہی؟

2. عثمانی سلطنت کا نظام حکومت بنیادی طور پر کن دو حصوں میں تقسیم تھا؟

3. عثمانی سلطان کی دیوان کے ارکان کون ہوتے تھے؟

4. ادارہ حکومت کے نظام کے بنیادی اصول کیا تھے؟

21.5 عثمانی فوج

عثمانی سلطنت ایک فوجی سلطنت تھی یعنی اس کے قیام سے لے کر استحکام اور عروج تک پہنچنے کے تمام مراحل میں فوج نے انتہائی اہم اور کلیدی رول ادا کیا تھا۔عثمانیوں کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی سلطنت کے ابتدائی تشکیلی مرحلے میں ہی ایک باضابطہ اور مستقل فوج تیار کر لی تھی۔عثمانیوں کی اس فوج کو نہ صرف یہ کہ باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی بلکہ یہ ایک ایسی فوج تھی جو ہمہ (ہر) وقت جنگ کے لیے مستعد اور تیار رہتی تھی۔اس فوج کی ایک دوسری نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سلطان اور فوج کے درمیان براہ راست تعلق ہوتا تھا۔ان کا فوجی جاسوسی کا نظام بھی بہت عمدہ تھا جس کی وجہ سے ان کی کامیابی کے امکانات بڑھ جاتے تھے۔اسی طرح عثمانی فوج اپنے زمانے کی دوسری فوجوں کے مقابلے نسبتاً ہلکے (کم وزن کے) اسلحے استعمال کرتی تھی جس کی وجہ سے اس کی نقل وحمل اور سفر کی رفتار بہت تیز ہو جاتی تھی۔عثمانی فوج کی یہ بعض وہ نمایاں خصوصیات تھیں جن کے سبب وہ اپنے زمانے کی سب سے زیادہ منظم اور باقاعدہ فوج باور کی جاتی تھی اور جب تک وہ ان خصوصیات کی حامل رہی، اس وقت تک ناقابل تسخیر رہی۔ عثمانی نظام حکومت میں فوج کو ہمیشہ اہم کردار حاصل رہا۔اس لیے اس نظام حکومت کو سمجھنے کے لیے فوج اور اس کی تنظیم کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔

21.5.1 ینی چری (نئی فوج)

عثمانی سلطنت کی طاقت اور قوت کا اصل دار و مدار اگر غور سے دیکھا جائے، تو اس کے فوجی نظام پر تھا۔ ینی چری عثمانیوں کی مستقل پیدل فوج تھی جس کا آغاز اورخاں کے زمانے میں ہوا اور جس کی حیرت انگیز شجاعت اور نظم وضبط نے تین سو برس تک یورپ کی بڑی بڑی حکومتوں کو لرزہ براندام رکھا۔ یہ وہ فوج تھی جس کا نام سنتے ہی ان کے ہوش اڑ جاتے تھے۔ عثمانی حکمرانوں نے جو بھی فتوحات حاصل کیں ان میں سے زیادہ تر اسی فوج کے زور بازو کا نتیجہ تھیں۔ سولہویں صدی تک ادارہ حکومت کے دیگر ارکان کی طرح ینی چری میں بھی صرف نوعمر عیسائی لڑکے بھرتی کیے جاتے تھے۔ چوں کہ کمسنی میں ہی انہیں اپنے گھروں سے الگ کر دیا جاتا تھا اس لیے ان کے دل والدین یا وطن کی محبت سے نا آشنا رہتے تھے۔ اور ان کی تمام تر توقعات سلطان کی ذات سے وابستہ رہتی تھیں۔ وہ سلطان کے غلام ہوتے تھے اور سلطان کی بے چون و چرا اطاعت کرنے سے ان کے لیے ترقی کے راستے کھلتے تھے۔ انہیں شادی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن سلیمان اعظم کے آخری زمانے میں ینی چری کے لڑکے بھی اس فوج میں داخل کیے جانے لگے تھے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ینی چری کے لیے تجرد کا لازمی قانون پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ یہ ایک ایسی بدعت تھی جو فوج کے اس نظام کے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ سلیمان کے زمانے میں ہی کچھ مسلمان لڑکے بھی ینی چری میں داخل کیے جانے لگے تھے یہاں تک کہ کئی بار فوج کا اعلیٰ افسر بھی کوئی ایسا شخص ہو جاتا جس کے والدین عیسائی کے بجائے مسلمان ہوتے تھے۔

سلیمان اعظم کے بعد ینی چری کا نظام بکھرنے لگا۔ 1574ء میں سلطان مراد ثالث سے ینی چری دستوں نے یہ رعایت حاصل کر لی کہ ان کے لڑکے بھی ینی چری فوج میں داخل کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے دس سال بعد 1584ء میں جب ایران کے ساتھ جنگ کا موقع پیش آیا تو اس جنگ کے لیے کافی سپاہی فراہم نہیں ہو سکے۔ لہذا عثمان پاشا نے مجبوراً مسلمانوں کو بھی ینی چری میں بھرتی کرنا شروع کیا۔ ینی چری کی بھرتی کے طریقے میں جیسے جیسے بے قاعدگیاں بڑھتی گئیں اس فوج میں عیسائی لڑکوں کی بھرتی میں کمی آتی گئی۔ دوسری طرف سلطان قلی (سلطان کے غلام) کو جو مراعات حاصل تھیں ان کو دیکھ کر ترک کسان بھی اپنے عیسائی ہمسایوں کو راضی کر کے اپنے لڑکوں کو عیسائی بتا کر فوج میں بھرتی کرا دیتے۔ کئی بار بھرتی کرنے والے افسران بھی دھوکا کھا جاتے تھے، چشم پوشی سے کام لیتے تھے یا پھر رشوت لے کر بھرتی کر لیتے تھے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سترہویں صدی عیسوی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے ینی چری کی ابتدائی نوعیت اور شکل بالکل بدل گئی۔ اس کی تعداد میں تو اضافہ ضرور ہوا لیکن اس کی قوت و دبدبہ کم ہو گیا۔ سلیمان اعظم کے زمانے میں ینی چری فوجیوں کی تعداد بارہ سے پندرہ ہزار تک تھی لیکن سترہویں صدی کے آخر میں جنگ ویانا (1683ء) میں یہ تعداد ستر ہزار تھی۔ ینی چری فوجیوں کی تعداد میں اضافے نے جہاں اور مسائل پیدا کیے وہیں ایک بہت بڑا مسئلہ یہ تھا کہ طاقت کے احساس نے ان کے اندر سرکشی پیدا کر دی۔ وقت بے وقت ان کی جانب سے مراعات میں اضافے کے مطالبے ہونے لگے۔ یہاں تک کہ یہ فوج خود سلطنت عثمانیہ کے لیے خطرہ بن گئی۔ بعد کے عثمانی سلاطین میں سے کئی نے وقت اور حالات کے تقاضوں کے تحت ینی چری کو از سر نو منظم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے خود سر رویے کی وجہ سے انہیں اس میں کامیابی نہیں ملی۔ یہاں تک کہ سلطان محمود نے 1826ء میں اپنے وزراء اور علماء کے متفقہ فیصلے سے ایک بار پھر ان کی تنظیم نو پر توجہ دی لیکن جب یہ اس پر آمادہ نہ ہوئے بلکہ الٹا بغاوت کر دی تو پھر سلطان محمود کے حکم سے انہیں ختم کر دیا گیا۔ اس طرح اپنے قیام کے تقریباً ساڑھے چار سو برس بعد ینی چری کا مکمل

خاتمہ ہوگیا۔ اور وہ فوج جس نے کسی زمانے میں اپنی بہادری اور شجاعت و تنظیم سے فتوحات کے علم گاڑے تھے، جب اس کی تنظیم بکھری تو خود قصہ پارینہ بن گئی۔

21.5.2 باب عالی کے سپاہی

باب عالی کنایہ ہے عثمانی حکومت وسلطنت کا جس کا سربراہ اعلی سلطان ہوتا تھا۔ جس طرح ینی چری (نئی فوج) عثمانی سلطنت کی مستقل پیدل فوج تھی اسی طرح باب عالی کے سپاہی، عثمانی سلطنت کی مستقل سوار فوج تھی۔ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ادارہ حکومت میں تعلیم و تربیت کے لیے جو عیسائی لڑکے داخل کیے جاتے تھے، ان کی بنیادی تعلیم کے بعد اہلیت کو دیکھتے ہوئے ان میں سے کچھ کو اعلی تربیت کے لیے منتخب کرلیا جاتا تھا۔ ان منتخب نوجوانوں میں تربیت کے دوران جو اپنی ذہنی و دماغی قابلیت کے لحاظ سے خود کو بہترین صلاحیت کا حامل ثابت کرتے انہیں حکومت کے انتظامی شعبوں کے لیے چن لیا جاتا۔ جو امیدوار باقی رہ جاتے تھے ان کا بڑا حصہ سلطنت کی باضابطہ سوار فوج میں داخل کرلیا جاتا۔ سلطنت کے یہی سوار دستے باب عالی کے سپاہی کہلاتے تھے۔ اس سوار فوجی دستے میں صرف انہیں تربیت یافتہ امیدواروں کو شامل کیا جاتا تھا جن پر کہ سلطان کو پورا پورا اعتماد ہوتا تھا۔ باب عالی کے سپاہی، نام سے موسوم اس مستقل سوار فوجی دستے کا نظم وضبط بھی ینی چری کی طرح بہت سخت تھا بلکہ اس دستے کے سپاہی عام حالات میں ینی چری سے زیادہ باصلاحیت ہوتے تھے۔ البتہ ینی چری کی طرح ہی اس سوار فوجی دستے میں بھی سلیمان اعظم کے بعد خرابیاں پیدا ہوگئیں۔ جس طرح کی بدعنوانیاں ینی چری کے نظام میں ہونے لگی تھیں اسی طرح کی بدعنوانیاں باب عالی کے سپاہی میں بھی شروع ہوگئیں۔ ینی چری کے ساتھ ہی اس فوجی دستے کا شیرازہ بھی منتشر ہوگیا۔ ینی چری کی طرح باب عالی کے سپاہی کا افسر اعلی بھی آغا کہلاتا تھا۔

21.5.3 جاگیری سپاہی

عثمانی فوج کا سب سے بڑا حصہ جاگیری سپاہیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ فوج ینی چری اور باب عالی کے سپاہی سے بھی قدیم تھی اور اس کو 'سپاہی' کہتے تھے۔ مختلف عثمانی صوبوں میں قدیم موروثی جاگیریں قائم تھیں۔ یہ جاگیریں ان لوگوں کی تھیں جن کے باپ دادا نے عثمانی پرچم تلے فتوحات حاصل کی تھیں اور ان کے صلے میں انہیں مفتوحہ علاقوں میں جاگیریں دی گئی تھیں۔ ان میں کچھ جاگیریں بڑی اور ان کی آمدنی زیادہ ہوتی تھی، ان کو زعامت کہا جاتا تھا۔ چھوٹی اور کم آمدنی والی جاگیریں تیمار کہلاتی تھیں۔ جاگیردار صوبوں میں ہوتے ہوئے بھی اپنی جاگیر میں عملاً خود مختار ہوتے تھے۔ البتہ فوجی معاملات میں حکومت کے عہدے داروں کی اطاعت ان کے لیے ضروری ہوتی تھی۔ ضرورت پڑنے پر ہر جاگیردار سوار سپاہیوں کی ایک متعین تعداد جنگ میں حصہ لینے کے لیے فراہم کرتا تھا۔ ان کے مصارف وہ جاگیر کی آمدنی سے ادا کرتا تھا۔ سلطان پر ان کی کوئی مالی ذمہ داری نہیں ہوتی تھی۔ عثمانی فوج کا بڑا حصہ انہیں جاگیری سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے عروج کے زمانے میں جاگیری سپاہی سواروں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ تھی۔ جاگیری سپاہی مسلمان ہوتے تھے اور ان کا استعمال بیرونی جنگوں کے علاوہ صوبوں کی بغاوتوں کو ختم کرنے کے لیے بھی ہوتا تھا۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے جاگیری سپاہی ادارہ حکومت سے خارج تھے اور ان کا تعلق ادارہ اسلامیہ سے تھا۔ لیکن چونکہ اس فوج کے تمام افسر ادارہ حکومت میں شامل تھے، یہ عیسائی والدین کی اولاد ہوتے تھے اور سلطان کے غلام کی حیثیت سے اس

ادارے میں داخل کیے جاتے تھے۔ اور وہیں فوجی تربیت پانے کے بعد انہیں سپاہیوں کا افسر بنا کر بھیجا جاتا تھا۔ اس لیے ہم نے اس فوج کا تذکرہ ادارہ حکومت کے تحت کیا ہے۔ ینی چری کی طرح سولہویں صدی عیسوی کے بعد جاگیری سپاہی فوج کا نظام بھی منتشر ہونے لگا۔ قصر شاہی کے مقربین نے بڑی بڑی جاگیریں حاصل کر لیں لیکن ان میں سپاہیوں کو منضبط کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ بالآخر سلطان محمود ثانی کے ہاتھوں ہی ینی چری کی طرح اس فوج کا خاتمہ بھی ہوا۔

21.5.4 عثمانی بحری فوج اور قپودان (کپتان) پاشا

جس طرح عثمانی اپنے دور عروج میں دنیا کی سب سے بڑی برّی (زمینی) طاقت تھے اور ان کی فوجی قوت کا مقابلہ ایشیا اور یورپ کی کوئی دوسری سلطنت نہیں کر سکتی تھی۔ اسی طرح بحری طاقت کے اعتبار سے بھی انہیں تمام دیگر طاقتوں پر برتری حاصل تھی۔ اسپین اور وینس کے بحری بیڑے یورپ کے بہترین بحری بیڑے باور کیے جاتے تھے لیکن عثمانی بحری بیڑے نے متعدد معرکوں میں انہیں شکست دی تھی۔ عثمانیوں نے متعدد جزیرے اور ساحلی علاقے اپنی مضبوط بحریہ کی وجہ سے فتح کیے۔ عروج کے زمانے میں عثمانی بحری بیڑہ تین سو جہازوں پر مشتمل تھا۔ یہ جہاز اپنے قد وقامت اور خصوصیات کے لحاظ سے قالیون، قادرغہ، قالیند، باشتردہ اور چیکیتری کہلاتے تھے۔ قالیون ان میں سب سے بڑا ہوتا تھا اور بادبان سے چلتا تھا۔ اس کے دونوں کناروں پر توپیں نصب ہوتی تھیں اور ہر جہاز میں دو ہزار سپاہی اور ملاح ہوتے تھے۔ عثمانی بحریہ کے افسر اعلی یا امیر البحر کو قپودان دریا (کپتان دریا) یا قپودان پاشا (کپتان پاشا) کہتے تھے۔ اس سے چھوٹے افسر کو رئیس کہتے تھے۔ یہ سلطنت عثمانیہ کے مستقل بحری بیڑے کے علاوہ متعدد جاگیری بحری بیڑوں کا بھی امیر ہوا کرتا تھا۔ سلطنت کے ساحلی علاقوں میں قپودان پاشا کو وہی اختیارات حاصل ہوتے تھے جو صوبوں میں بیلر بے کو حاصل ہوتے تھے۔ عثمانی بحریہ کے تمام افسران اور جہاز رانوں کا تعلق ادارہ حکومت سے ہوتا تھا جو عیسائی والدین کی اولاد اور سلطان کے غلام (قلی) ہوتے تھے۔ ادارہ حکومت کی حیرت انگیز تربیت کے سبب ان کی ہیبت سولہویں صدی عیسوی کے پورے یورپ پر طاری تھی۔ فتوحات کے علاوہ بحریہ کے افسران و حکام نے بعض علمی کارنامے بھی انجام دیے جو بحری اسفار کے لیے نہایت مفید تھے۔ البتہ بری فوجوں کی طرح سولہویں صدی کے بعد عثمانی سلطنت کی بحریہ میں بھی زوال شروع ہو گیا۔ ادارہ حکومت کے بنیادی اصولوں کی جس خلاف ورزی کے سبب عثمانی بری فوجیں اپنا معیار و کردار برقرار نہ رکھ سکیں وہی خرابیاں عثمانی بحریہ میں بھی در آئیں۔ تین سو برس بعد سلطان عبدالعزیز خاں نے اپنی شاہانہ توجہ اور شوق سے عثمانی بحری بیڑے کو اتنا طاقت ور بنا دیا کہ اس کا شمار یورپ کے بہترین بحری بیڑوں میں ہونے لگا لیکن مہم جوئی کی صفت جواب عثمانی حکمراں میں عنقا ہوتی جا رہی تھی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان عبدالحمید خاں کے زمانے میں اس بحری بیڑے کے جہازوں کو شاخ زریں سے بھی باہر نکلنے کی نوبت نہیں آئی اور وہیں پڑے پڑے وہ زنگ آلود ہو گئے۔

2.6 ادارہ اسلامیہ

سلطنت عثمانیہ کا نظام حکومت بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک ادارہ حکومت اور دوسرا ادارہ اسلامیہ۔ ادارہ حکومت کے بارے میں ضروری تفصیلات سے گزشتہ صفحات میں ہم واقفیت حاصل کر چکے ہیں۔ یہاں ہم ادارہ اسلامیہ پر گفتگو کریں گے۔

ادارہ اسلامیہ میں سلطنت عثمانیہ کے وہ تمام مسلمان شامل تھے جو ادارہ حکومت کا حصہ نہیں تھے یا اس سے باہر تھے اور جو کسی نہ کسی حیثیت سے عام سطح سے بلند تھے۔ ادارہ اسلامیہ کا سربراہ اعلیٰ بھی سلطان ہوتا تھا۔ ادارہ حکومت اور ادارہ اسلامیہ کے درمیان بنیادی فرق یہ تھا کہ ادارہ حکومت کے تمام ارکان تقریباً بغیر کسی استثنا کے، عیسائی خاندانوں سے لیے جاتے تھے (صرف سلطان اور اس کا خاندان اس سے بری تھا) جب کہ اس کے بالمقابل ادارہ اسلامیہ کے ارکان تمام تر مسلمان خاندانوں کے افراد ہوتے تھے۔ ادارہ اسلامیہ بنیادی طور پر علماء کے طبقے پر مشتمل تھا۔ ادارہ حکومت کی طرح ہی ادارہ اسلامیہ کا بھی اپنا الگ تعلیمی و تربیتی نظام تھا اور اس ادارے میں داخلے کے لیے ضروری تھا کہ اس کے تدریجی نظام تعلیم و تربیت سے گزرا جائے۔ چونکہ اس ادارے میں کلیدی اہمیت علماء کی جماعت کو حاصل تھی۔ اس لیے انہیں میں سے ادارے کی خاص خدمات: افتاء، قضاء، مذہبی علوم وغیرہ۔ کے لیے افراد تیار کیے جاتے تھے جو مخصوص سطح کی تعلیمی و تربیتی اہلیت حاصل کرنے کے بعد مدرس، مفتی یا قاضی بن سکتے تھے۔ علماء کی اسی جماعت کے ہاتھ میں سلطنت عثمانیہ کے علوم، مذہب اور قانون کا نظام تھا۔

21.6.1 ادارہ اسلامیہ کا تعلیمی نظام

عثمانی حکمرانوں کو تعلیم اور اس کے فروغ سے دلچسپی شروع سے ہی تھی، چنانچہ دوسرے عثمانی فرماں روا اورخاں نے بڑے پیمانے پر مکاتب اور مدارس قائم کیے تھے اور ان میں بہتر تعلیم کا انتظام کیا تھا۔ اورخاں کے بعد بھی عثمانی سلاطین نے تعلیم کے فروغ کے تسلسل کو جاری رکھا۔ البتہ سلطان محمد فاتح کو ان میں خاص اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ سلطنت میں تعلیم کی ترقی، اور اسے منضبط کرنے کے حوالے سے اس کی خدمات اپنے پیش رووں سے بہت زیادہ ہیں۔ سلطان محمد فاتح نے سلطنت کے تمام علاقوں میں خواہ وہ دیہی ہوں یا شہری بڑی تعداد میں مکاتب (ابتدائی تعلیم کے مدارس) کھولے۔ یہ مکاتب تمام قصبوں اور شہروں کے محلوں کے علاوہ بڑے بڑے دیہاتوں میں بھی کھولے گئے۔ عام طور پر مکاتب مسجدوں سے وابستہ ہوتے تھے اور ان کے اخراجات وقف کی آمدنی سے پورے کیے جاتے تھے۔ مکاتب میں تعلیم مفت تھی اور اکثر طلبہ کے طعام و قیام کا انتظام بھی وقف کی آمدنی سے ہوتا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے اسکولوں کے علاوہ محمد فاتح کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اعلیٰ تعلیم کے مدارس (ادارے) بھی بڑی تعداد میں سلطنت کے مختلف شہروں اور علاقوں میں قائم کیے۔ ان کے اخراجات کی تکمیل کے لیے بھی جائدادیں وقف تھیں۔ عثمانی دور کے یہ مدرسے آج کے زمانے کے کالجوں کی طرز پر تھے اور ان میں سائنسی، تکنیکی اور مذہبی ہر طرح کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے ان مدارس میں بھی طلبہ کو جزوی طور پر مالی امداد دی جاتی تھی۔

وہ تمام لوگ جو ادارہ اسلامیہ میں کوئی سرکاری عہدہ حاصل کرنا چاہتے تھے ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ سرکاری تعلیمی مدارس میں داخلہ لے کر ان کے نصاب کی تکمیل کریں۔ ان مدارس میں زیر تعلیم طلبہ کو 'سوفتہ' کہا جاتا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہیں دانش مند کی سند دی جاتی تھی۔ وہ طلبہ جو مکاتب کی مدرسی یا مساجد کی امامت کے خواہاں ہوتے تھے، ان کے لیے دانش مند کی سند کافی ہوتی تھی۔ البتہ وہ طلبہ جو مفتی یا قاضی بننا چاہتے تھے انہیں پہلے مرحلے کی تعلیم کی تکمیل کے بعد قانون (فقہ اور اصول فقہ) کا ایک اعلیٰ اور طویل نصاب مکمل کرنا ہوتا تھا۔ سلطنت کا مفتی اعظم خود ان طلبہ کا امتحان لیتا تھا پھر انہیں اعلیٰ تعلیم کے مدرسوں سے لے کر عدالتوں تک مختلف سرکاری نوکریوں میں ملازمت کی سند دی جاتی تھی۔

21.6.2 نظام افتاء

سلطنت عثمانیہ میں افتاء (فتوی جاری کرنا) کا شعبہ خاص اہمیت کا حامل تھا۔ علماء میں مفتی حضرات بہت اہم ہوتے تھے۔ ہر بڑے شہر کے قاضی کے ساتھ ایک مفتی بھی مقرر ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بیلر بے اور سنجق بے کے ساتھ بھی مفتی ہوا کرتے تھے۔ مفتی کا تقرر تمام عمر کے لیے ہوتا تھا۔ البتہ انہیں خود معاملات میں دخل دینے کا حق حاصل نہ تھا بلکہ جب کوئی قاضی، بے یا عام آدمی ان سے فتوی معلوم کرتا تو ان کا فرض تھا کہ مذہب حنفی کے مطابق فتوی دیں۔ عام طور پر مفتی کا درجہ قاضی کے بعد ہوتا تھا لیکن عثمانی دارالحکومت قسطنطنیہ میں صورت حال اس کے برعکس تھی۔ چونکہ وہاں سلطان اور حکومت کے اعلی حکام وافسران رہتے تھے اور انہیں اکثر اہم معاملات میں فتوی لینے کی ضرورت پیش آتی تھی اس لیے قسطنطنیہ کے مفتی کا درجہ قاضیوں سے بڑھا ہوا تھا اور یہ مفتی اعظم کہلاتا تھا۔

21.6.3 مفتی اعظم یا شیخ الاسلام

قسطنطنیہ کا مفتی دارالحکومت میں اپنے قیام اور سلطان و حکام کے ساتھ مسلسل ربط میں رہنے کی وجہ سے بہت ہی اہم ہوتا تھا کیونکہ سلطان اور حکام کو اکثر اس سے اہم امور میں فتوی لینے کی ضرورت پیش آتی رہتی تھی۔ اپنی اس حیثیت کی وجہ سے قسطنطنیہ کا مفتی، مفتی اعظم کہلاتا تھا۔ سلطان محمد ثانی (فاتح) نے مفتی اعظم کو شیخ الاسلام کا لقب عطا کیا جو بعد میں اس کا عام لقب بن گیا۔ مفتی اعظم یا شیخ الاسلام اپنی جماعت سے منتخب نہیں کیا جاتا تھا بلکہ سلطان اسے عموماً قاضیوں کی جماعت میں سے مقرر کرتا تھا۔ مفتی اعظم کے طور پر اسے سلطنت کے دوسرے تمام مفتیوں کو مقرر کرنے اور انہیں ترقی دینے کا حق حاصل تھا۔ سلطان سلیمان اعظم نے اپنے زمانے میں مفتی اعظم کو علماء کی جماعت کا سربراہ مقرر کر دیا اور اس حیثیت میں اس کا مرتبہ حکومت کے تمام عہدے داروں سے اونچا ہو گیا۔ سوائے اس کے کہ دیوان میں مفتی اعظم کی جگہ صدر اعظم کے بعد تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنے منصب کی اہمیت کے لحاظ سے مفتی اعظم قریب قریب سلطان کا ہمسر ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس حیثیت میں وہ قانون شریعت کا شارح، وکیل اور محافظ تھا اور سلطان شریعت کے دائرے سے باہر نہیں تھا۔ عثمانی دور میں شیخ الاسلام کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ کئی بار حکمرانوں کو محض شیخ الاسلام کی مخالفت کی وجہ سے اپنے فیصلے تک بدلنے پڑے۔

معلومات کی جانچ

1. ادارہ حکومت اور ادارہ اسلامیہ کے درمیان کیا فرق پایا جاتا ہے؟ وضاحت کیجیے۔
2. دور عثمانی میں مفتی اعظم کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

21.7 نظام عدالت

عثمانی نظام حکومت میں ادارہ اسلامیہ کے تحت جو دوسرا بڑا شعبہ کام کرتا تھا وہ عدالت کا شعبہ تھا۔ عدالت کے قاضی اور جج ادارہ اسلامیہ کے تعلیمی و تربیتی نظام سے گزر کر آتے تھے اور مختلف حالات میں ان کا دائرہ کار یا حلقہ اختیار ادارہ حکومت سے بھی زیادہ

وسیع ہو جاتا تھا۔مثال کے طور پر سلطنت عثمانیہ سے وابستہ وہ ریاستیں (کریمیا اور شمالی افریقہ وغیرہ کی) جو براہ راست مرکزی عثمانی حکومت کے انتظام میں نہیں ہوتی تھیں بلکہ محض وابستہ حکومتیں تھیں، مگر یہ ریاستیں بھی عثمانی نظام عدالت کے ماتحت تھیں۔عثمانی سلطنت کے قاضیوں کی عدالت میں دیوانی اور فوجداری ہر طرح کے مقدمات کے فیصلے کیے جاتے تھے۔ البتہ بعض جماعتیں اور گروپ ایسے تھے جو ان کے دائرہ اختیار سے باہر تھے مثلا سلطان قلی (ادارہ حکومت کے افراد)، سادات اور وہ غیر ملکی باشندے جنہوں نے اپنی نو آبادیاں عثمانی سلطنت میں قائم کر لی تھیں۔ان کی اپنی عدالتیں الگ ہوا کرتی تھیں۔اسی طرح سلطنت کی عیسائی رعایا کے مقدمات جن میں دونوں فریق عیسائی ہوا کرتے تھے، ان کی اپنی کلیسائی عدالتوں کے سپرد تھے۔ادارہ اسلامیہ کے قاضی ان تمام مقدمات کی سماعت کرتے تھے جو قانون شریعت سے متعلق ہوتے تھے اور جن میں دونوں فریق مسلمان یا ایک فریق مسلمان ہوتا۔جو شخص کہ کسی شہر کا قاضی ہوتا تھا اس کے دائرہ اختیار میں اس کے آس پاس کے علاقے بھی شامل ہوتے تھے۔عثمانی نظام عدالت میں ججوں (قاضیوں) کے پانچ خاص طبقے تھے: 1. بڑے درجے کے قاضی (مُلا) ۔2. چھوٹے درجے کے قاضی (ملا) ۔3. مفتش۔4. قاضی۔5. نائب۔قاضیوں کے لیے عام نام قاضی تھا مگر لوگ احتراماً انہیں ملا کے لقب سے پکارتے تھے۔

21.7.1 قضاۃ عسکر

ادارہ حکومت کے باب میں ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ عثمانی حکومت کے مختلف شعبوں کے حکام میں قضاۃ عسکر بھی شامل تھے اور اس حوالے سے وہ ادارہ حکومت کی سب سے اہم مجلس دیوان کے رکن بھی ہوتے تھے۔لیکن بایں ہمہ ان کا تعلق ادارہ حکومت سے نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ وہ ادارہ اسلامیہ کے رکن ہوا کرتے تھے۔عثمانی سلطنت میں قاضی عسکر سب سے بڑا عدالتی منصب ہوتا تھا۔لیکن جس طرح انتظامی مقصد کے تحت بیلر بے کی جغرافیائی تقسیم تھی یعنی ایک بیلر بے ایشیائی عثمانی مقبوضات کے لیے اور دوسرا بیلر بے یورپی عثمانی مقبوضات کے لیے، اسی طرح عثمانی سلطنت میں قاضی عسکر بھی دو ہوتے تھے۔

1. ایک قاضی عسکر اناطولیہ جو سلطنت کے ایشیائی مقبوضات کا چیف قاضی ہوتا تھا۔2. دوسرا قاضی عسکر رومیلیا جو سلطنت کے یورپی مقبوضات کا چیف قاضی ہوتا تھا۔ ہر قاضی عسکر کے نام سے ظاہر ہے ان قاضیوں کی اصلی حیثیت فوجوں کے ججوں کی تھی مگر بعد میں ان کے اختیارات وسیع کر دیے گئے یہاں تک کہ یہ اپنے حلقے کے تمام ججوں (قاضیوں) کے افسر اعلیٰ بن گئے۔سلطان سلیمان اعظم کے زمانے تک قضاۃ عسکر کو اپنے اپنے علاقوں میں علماء کی جماعت پر وہ تمام اختیارات حاصل تھے جو سلیمان نے اپنے زمانے میں مفتی اعظم (شیخ الاسلام) کو تفویض کر دیے۔

سلطان کے نمائندے کی حیثیت سے صدر اعظم ادارہ اسلامیہ کا بھی حقیقی سربراہ ہوتا تھا اور اس کی عدالت دیوانی کے تمام مقدمات کے لیے سب سے بڑی عدالت عالیہ تھی۔صدر اعظم کی عدالت عدالت عالیہ ہونے کے ساتھ ساتھ ابتدائی عدالت بھی تھی جس کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا رہتا تھا۔صدر اعظم یا تو فیصلے خود کرتا تھا یا اگر اسے فرصت نہ ہوتی تو کسی قاضی عسکر یا دوسرے قاضی کے سپرد ان مقدمات کو کر دیتا تھا تا کہ ان کا جلد فیصلہ کیا جا سکے۔عثمانی عدالتوں میں فیصلے کرنے کے لیے حنفی فقہ پر عمل درآمد ہوتا تھا۔

21.8 ملت سسٹم یا نظام ملت

عثمانی سلطنت میں مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب اور قوموں کے افراد بھی بڑی تعداد میں رہتے تھے اور وہ باضابطہ طور پر سلطنت کا حصہ تھے۔ ان کو مختلف حلقوں کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ادارہ اسلامیہ کی طرز پر ان حلقوں کا بھی الگ نظام تھا جو نظام ملت کہلاتا تھا۔ یہ ملتیں نہ صرف یہ کہ اپنے عائلی قوانین میں پوری طرح با اختیار اور خود مختار تھیں بلکہ اگر مقدمہ کے دونوں فریق ایک ہی ملت سے ہوتے تو ان کے دیوانی مقدمات کا فیصلہ بھی ان کی اپنی عدالتوں میں ہوتا تھا۔ عثمانی سلطنت کی یہ ملتیں اپنے مذہب کے افراد کے مذہبی فرائض انجام دینے کے علاوہ ان کی پیدائش، موت، نکاح اور وصیت ناموں وغیرہ کا ریکارڈ بھی رکھتی تھیں۔ اسی طرح یہ اپنے ہم مذہب افراد کے شخصی قوانین سے متعلق معاملات کے فیصلے بھی خود ہی کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ ان ملتوں کو اپنے اپنے حلقوں میں ٹیکس وصول کرنے کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ حالانکہ یہ وہ فرائض ہیں جو حکومتیں خود انجام دیتی ہیں لیکن عثمانی حکمرانوں نے نہ صرف یہ کہ ان اختیارات کو صراحت کے ساتھ ملتوں کو دے دیا تھا بلکہ ان کی بحسن وخوبی انجام دہی کے لیے اپنی فوجوں سے ان ملتوں کی مدد بھی کرتے تھے۔

عثمانی سلطنت میں جو ملتیں قائم تھیں ان میں سب سے بڑی اور اہم ملت، ملت روم تھی۔ ملت روم کے حلقے میں سلطنت کی وہ تمام عیسائی رعایا شامل تھی جو مشرقی یونانی کلیسا کی پیرو تھی۔ اس عیسائی فرقے کے لوگ خواہ سلطنت کے کسی بھی حصے میں آباد ہوں اور خواہ ان کی مادری زبان کچھ بھی ہو ملت روم کا حصہ تھے۔ اس ملت کا سب سے بڑا رہنما قسطنطنیہ کا بطریق ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ملت روم کے بطریق کو سلطنت عثمانیہ کے عروج کے زمانے میں اس سے زیادہ اقتدار حاصل تھا جتنا کہ بازنطینی عہد میں وہ چرچ کے ایک عہدے دار کی حیثیت سے رکھتا تھا۔ سلطنت عثمانیہ میں ملت روم کے علاوہ کچھ دوسری ملتیں بھی موجود تھیں جن کو کہ ملت روم جیسے ہی اختیارات حاصل تھے۔ مثلاً ملت ارمنی جو قسطنطنیہ کے گریگوری بطریق کے ماتحت تھی۔ ملت یہود، جس کا افسر اعلیٰ ربی اعظم ہوتا تھا۔ اسی طرح رومن کیتھولک عیسائیوں کی ملت بھی تھی جو پوپ کے ایک نمائندے کی نگرانی میں اپنے فرائض انجام دیتی تھی۔

سلطنت عثمانیہ میں ایسے بہت سے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ آباد تھے جو سلطنت کی رعایا تو نہ تھے لیکن تجارت وغیرہ مقاصد کے تحت ایک طول عرصے سے عثمانی حدود میں مقیم تھے۔ ان لوگوں کو بھی عثمانی حکومت کی جانب سے ان کے ملکوں کے سفیروں اور کونسلروں کے توسط سے اسی قسم کے اختیارات دیے گئے تھے جو کہ ملتوں کے افراد کو حاصل تھے۔

21.9 نئے نظام کی طرف

عثمانی حکمراں جب تک طاقتور رہے اور جب تک ان کے قائم کردہ ادارہ حکومت کے بنیادی نظام میں کمزوریاں پیدا نہیں ہوئیں۔ انہوں نے جس طرح کے حقوق و اختیارات مختلف ملتوں کو دیے تھے ان کی وجہ سے ان کی حکومت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ان کے نظام میں اصولوں کو نظر انداز کیا جانے لگا اور حکومت کے مختلف شعبوں میں کمزوریاں پیدا ہوئیں تو نہ صرف یہ کہ عثمانی حکومت زوال سے دوچار ہوئی بلکہ بیرونی سازشوں اور دباؤ کا شکار بھی ہوتی رہی۔ چنانچہ جب سلطنت عثمانیہ کو یورپ کی مغربی طاقتوں کے مقابلے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا تو سلطنت کی عیسائی رعایا نے بھی زیادہ خود مختاری کے

مطالبے شروع کر دیے اور مغربی ملکوں نے عثمانی حکمرانوں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ عیسائی آبادی والے صوبوں میں اصلاحات نافذ کریں۔ چنانچہ 1839ء کا خط گل خانہ شریف ہو یا 1854ء کا خط ہمایوں شریف۔ ان میں ان تمام اصلاحات کا اعلان کیا گیا جن کا مطالبہ مغربی ممالک کر رہے تھے۔ حالانکہ ان کے مطالبے تسلیم کر لیے گئے۔ اس کے باوجود انہوں نے عیسائیوں کی خفیہ مدد کر کے عثمانی سلطنت کو منتشر کرنے کا کام بھی کیا۔

غرض انیسویں صدی کے وسط میں تنظیمات کے نام سے عثمانی نظام حکومت میں اصلاحات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ تنظیماتی اصلاحات کے نتیجے میں قدیم عثمانی نظام حکومت بالکل بدل دیا گیا اور اس کی جگہ سلطنت عثمانیہ میں مغربی طرز کا جدید نظام حکومت قائم کیا گیا۔ اس جدید نظام حکومت کے تحت حکومت کے مختلف شعبوں کے لیے الگ الگ وزارتیں قائم ہوئیں اور ہر وزارت کے لیے ذمہ دار ایک وزیر بنایا گیا۔ جو اپنے شعبے کے امور کی نگرانی کرتا تھا۔ ان اصلاحات کے نتیجے میں حکومت کے تمام شعبے مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے یکساں طور پر کھول دیے گئے، بڑے بڑے عہدوں یہاں تک کہ وزارتوں اور سفارتی ذمہ داریوں تک پر عیسائیوں کا تقرر ہونے لگا۔ نئی اصلاحات کے تحت حکومت کے عدالتی نظام میں بھی تبدیلی لائی گئی۔ پہلے ادارۂ اسلامیہ کے تحت صرف شرعی عدالتیں ہوتی تھیں جن میں قاضی شریعت کے قانون کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرتے تھے۔ یہ عدالتیں شیخ الاسلام کے ماتحت ہوتی تھیں اور ان میں صرف ایک ہی قاضی یا جج ہوا کرتا تھا۔ تنظیماتی اصلاحات کے تحت عثمانی سلطنت کے طول وعرض میں مغربی طرز کی جدید عدالتیں قائم کی گئیں اور اب یہ وزیر انصاف کی نگرانی میں ہوتی تھیں اور ان عدالتوں میں اب مختلف فرقوں کے کئی جج ایک ساتھ کام کرتے تھے۔ حالانکہ شرعی عدالتوں کو بیک قلم موقوف نہیں کیا گیا لیکن اب ان میں مسلمانوں کے صرف عائلی قوانین کے مطابق وراثت اور نکاح وطلاق جیسے شخصی مقدمات کے فیصلے ہی ہوتے تھے۔ دیوانی کی جدید مغربی طرز کی عدالتوں کے ساتھ ساتھ تنظیماتی اصلاحات کے تحت مغربی طرز کی جدید فوجداری عدالتیں بھی قائم کی گئیں جن میں جرائم کی روک تھام اور سزاؤں کے لیے شریعت کے تعزیری احکام کے بجائے مغربی طرز کے تعزیری قوانین اپنائے گئے۔ اسی طرح ابتدائی عدالتیں اور مرافعہ کی عدالتیں الگ الگ قائم کی گئیں۔ اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ترکی میں بیرونی طاقتوں کے دباؤ، غیر مسلم رعایا کی تحریک اور مسلمانوں میں جدید رجحانات کے فروغ کے نتیجے میں انیسویں صدی کے وسط میں ہی نظام حکومت میں غیر معمولی مغربی طرز کی اصلاحات کا آغاز ہو چکا تھا۔ حالانکہ ان اصلاحات کے باوجود بھی ترکی کے عیسائی مقبوضات ایک ایک کر کے اس سے آزاد ہو گئے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اگر بیرونی ریشہ دوانیاں نہ ہوئی ہوتیں تو ترکی میں جس طرح اصلاحات کا عمل جاری تھا، اگر اسے جاری رہنے دیا جاتا، عثمانی سلطنت بکھرنے کے بجائے شاید متحد رہ جاتی۔

21.10 خلاصہ

خلاصہ یہ کہ ایشیائے کوچک میں عثمانی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی ایک عثمانی نظام حکومت وجود میں آیا جو اپنی تشکیل کے ابتدائی زمانے میں سابقہ سلجوقی نظام حکومت اور عثمانی ترکوں کی قبائلی روایات کا مجموعہ تھا۔ بعد میں مختلف عثمانی سلاطین کے زمانے میں عثمانی نظام حکومت کو ترقی اور فروغ حاصل ہوتا رہا۔ خاص طور پر دوسرے عثمانی فرماں روا اور خاں اور اس کے بھائی وزیر علاالدین نے اس کی بنیادیں استوار کیں۔ بعد کے حکمرانوں میں سلطان محمد فاتح اور سلطان سلیمان اعظم (قانونی) نے عثمانی نظام

حکومت کو مضبوط کر کے اور ترقی دے کر اپنے زمانے کا سب سے زیادہ مستحکم نظام حکومت بنا دیا۔ سلیمان اعظم کے بعد جب اس نظام حکومت میں کمزوریاں آنے لگیں اس وقت بھی بعض عثمانی حکمرانوں نے اسے سدھارنے کی کوشش کی۔ خاص طور پر سلطان محمود کی کوششیں اس حوالے سے بہت ہی اہم ہیں۔ بہر حال عثمانی نظام حکومت بنیادی طور پر دو اداروں میں تقسیم تھا۔ ایک ادارہ حکومت، جس کے افراد عثمانی سلطنت کی عیسائی رعایا سے لیے جاتے تھے اور دوسرا ادارہ اسلامیہ، جو کہ سلطنت کے مذہبی، تعلیمی اور عدالتی امور دیکھتا تھا اور اس کے ارکان مسلمان رعایا میں سے لیے جاتے تھے۔ سلطان ان دونوں مرکزی اداروں کا سربراہ اعلی ہوتا تھا۔ اس کے نیچے صدر اعظم ہوتا تھا جو اس کے نائب کے طور پر اہم حکومتی امور انجام دیتا تھا۔ عثمانی نظام حکومت میں فوج کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ خاص طور پر ینی چری کو ایک لمبے عرصے تک اس نظام حکومت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل رہی۔

21.11 نمونے کے امتحانی سوالات

1. عثمانی نظام حکومت کے آغاز وارتقاء سے بحث کریں۔
2. عثمانی نظام حکومت میں ادارۂ حکومت پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔
3. عثمانی فوج اور اس کے مختلف دستوں کا تعارف کرائیں۔
4. ادارۂ اسلامیہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔
5. عثمانی نظام حکومت میں اصلاحات کا مختصر جائزہ لیجیے۔

21.12 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد دوم) — ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی
2. آل عثمان — مولانا اسلم جیراج پوری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی
3. دولت عثمانیہ (جلد اول، دوم) — ڈاکٹر محمد عزیر، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
4. تاریخ ملت (جلد سوم) — مفتی زین العابدین سجاد میرٹھی و مفتی انتظام اللہ شہابی، ادارہ اسلامیات، کراچی، پاکستان
5. مسلمانوں کا عروج اور زوال — مولانا سعید احمد ایم اے۔ فینس بکس، لاہور
6. دائرہ معارف اسلامیہ، (متعلقہ ابواب) دانش گاہ پنجاب، لاہور
7. ترکی میں مشرق و مغرب کی کش مکش — خالدہ ادیب خانم (اردو ترجمہ، ڈاکٹر عابد حسین)

اکائی 22 : سماجی و معاشی حالات

اکائی کے اجزاء

22.1 مقصد

اس اکائی میں طلبہ کو یہ بتایا جائے گا کہ عثمانی دور کی سماجی و معاشی زندگی کیسی تھی۔ یہ جاننے کی کوشش کی جائے گی کہ عثمانی سماج میں مختلف طبقات کا رہن سہن کیسا تھا؟ لوگ کس طرح کی زندگی گزراتے تھے؟ لوگوں کے عادات واخلاق کیسے تھے؟ عثمانی سماج کے مختلف ادوار میں عورتوں کی کیا پوزیشن تھی؟ اسی طرح اس اکائی میں طلبہ کو یہ بتانے کی کوشش بھی کی جائے گی کہ عثمانی دور کے معاشی حالات کیا تھے؟ معیشت کس طرح چلتی تھی؟ حکومت کی آمدنی اور اخراجات کا نظام کیسا تھا؟ زراعتی، تجارتی اور صنعتی سرگرمیاں کس طرح کی تھیں؟ اس اکائی کے مطالعے کے بعد طالب علم اس کا اہل ہوگا کہ وہ عثمانی سماج اور معیشت کے بارے میں معلومات فراہم کر سکے۔

22.2 تمہید

عثمانی حکومت کے بارے میں یہ بات ہم پہلے ہی جان چکے ہیں کہ یہ بہت ہی وسیع رقبے اور طویل عرصے پر پھیلی ہوئی حکومت تھی۔ ایشیائے کوچک کی بازنطینی سرحد پر ایک معمولی سی جاگیر سے شروع ہونے والی یہ حکومت اپنے حوصلہ منداور بہادر حکمرانوں کے ذریعہ بہت جلد دنیا کی وسیع ترین سلطنتوں میں سے ایک بن گئی جو دنیا کے تین براعظموں (افریقہ، ایشیا اور یوروپ) میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسی طرح 1288ء میں اپنے قیام سے لے کر 1924ء میں خلافت کے خاتمے تک عثمانیوں کی حکومت چھ سو سال سے زائد عرصے کو محیط ہے۔ اتنے وسیع رقبے پر پھیلی اور اتنے طویل عرصے پر محیط کسی حکومت کے سماجی و معاشی حالات کو ایک مختصر سی اکائی میں بیان کر پانا بہت ہی مشکل امر ہے۔

عثمانیوں کی ابتدائی معاشرت اور معیشت کا اگر ہم ذکر کریں تو اس میں قبیلہ جاتی رنگ بہت ہی گہرا نظر آتا ہے۔ جیسے جیسے عثمانیوں کی سلطنت وسعت اختیار کرتی گئی اور ان کے روابط بازنطینی و دیگر اقوام سے استوار ہوئے ان میں ان اقوام کی معاشرتوں کے تکلفات شامل ہوتے چلے گئے۔ خاص طور پر حکمرانوں اور امیروں کے طبقے میں مفتوحہ اقوام کے تمدن کے اثرات صاف محسوس کیے جانے لگے۔ البتہ ترک عوام کا طبقہ وسیع فتوحات اور خوش حالی کے باوجود ایک طویل عرصے تک اپنی روایتی سادگی پر قائم رہا۔ اسی طرح عثمانی فتوحات کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ بڑے پیمانے پر حاصل ہونے والے مال غنیمت سے عثمانی سماج میں خوش حالی آئی بلکہ نئی نئی فتوحات کے نتیجے میں ان کے معاشی وسائل بھی روز بروز بڑھتے گئے۔ اس کے باوجود ترکوں میں وہ رذائل اخلاقیہ نہیں پیدا ہوئے جو معاشی خوش حالی کا اکثر نتیجہ ہوتے ہیں۔ ترک صرف بہادر ہی نہیں محنتی قوم بھی تھی، ان کی حکومت جس علاقے میں قائم ہوئی وہ بنیادی طور پر زرعی علاقہ تھا، وہاں زیادہ تر کھیتی باڑی کا کام ہوتا تھا۔ ترکوں نے اپنی محنت سے حکومت کی زرعی پیداوار میں بے پناہ اضافہ کیا اور اس کی خوش حالی کا سبب بنے۔ جب تک زراعت میں نئی ٹکنالوجی نہیں آئی تھی عثمانی ترک اس میں آگے رہے۔ البتہ نئی ٹکنالوجی کے سبب جب یورپی ممالک کی زرعی پیداوار کئی گنا بڑھ گئی اور ترک علاقوں میں یہ ٹکنالوجی نہیں اپنائی گئی تو ترکوں کی معیشت کو بھاری نقصان پہنچا۔ اسی طرح عثمانی حکومت کے آخری دور میں جو اصلاحات کی گئیں ان کے سبب حکومت کے اخراجات میں اضافہ ہوا۔ اسی طرح سلطنت کے مختلف علاقوں میں ہونے والی بغاوتوں کے فرو کرنے میں بھی کافی اخراجات ہوئے۔ جس کے لیے اسے بیرونی قرضے لینے پڑے۔ ان سب نے مل کر بیسویں صدی کے آغاز تک عثمانی ترکوں کی معیشت کو بدحال کر دیا تھا۔

22.3 عثمانی ترک معاشرت کا ارتقاء

ہمیں یہ معلوم ہے کہ عثمانی ترک بنیادی طور پر وسطی ایشیا کے رہنے والے تھے جنہیں تیرہویں صدی عیسوی کے سیاسی حالات نے مغربی ایشیا میں اناطولیہ (ایشیائے کوچک) کے علاقے تک پہنچا دیا۔ یہاں ان کے ایک بہادر سردار ارطغرل نے ایک جاگیر قائم کی جسے اس کے ہونہار بیٹے امیر عثمان خاں نے ایک چھوٹی سی ریاست میں تبدیل کر دیا اور پھر بعد کے اولوالعزم حکمرانوں نے اس میں اضافہ کر کے اپنے وقت کی بڑی سلطنتوں میں سے ایک بنا دیا۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو عثمانی ترکوں کی ابتدائی معاشرت نہ صرف یہ کہ بہت ہی سادہ تھی بلکہ اس میں قبائلی معاشرت کے تمام اوصاف موجود تھے۔ اگر ہم ابتدائی عثمانی حکمرانوں عثمان خاں اور اُورخاں کی معاشرت اور طرز زندگی کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ شروع کے زمانے میں دیہاتی قبائلی سرداروں کی

جیسی سادہ زندگی گزارتے تھے پھر جیسے جیسے ان کے حوصلوں اور عزائم میں اضافہ ہوتا گیا، ان کی مہم جوئیاں بڑھتی گئیں اور ان کی ریاست بھی وسیع سے وسیع تر ہوتی رہی۔ نتیجے میں ان کی معاشرت میں بھی بدلاؤ آنا شروع ہوا۔ شروع میں قبائلی جاگیر کے تمام باشندے ایک ہی قبیلے کے تھے، بعد میں ان کے ساتھ اس کے شہریوں میں یونانی اور سلافی باشندوں کا بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ان کی بڑی تعداد بہ خوشی اسلام میں داخل ہوگئی۔ ان کے اور ترکوں کے باہمی میل جول سے ایک نئی معاشرت اور سماج نے جنم لینا شروع کیا جو ماضی کے بازنطینی ایشیائی مقبوضات کے معاشرے سے بھی الگ تھا اور ترکوں کے معاشرے سے بھی۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ ایک نئی معاشرت نے جنم لیا بلکہ ایک نئی قوم بھی وجود میں آئی جو اپنے پہلے حکمراں عثمان خاں کے نام پر عثمانی کہلاتی ہے اور پھر اسی مناسبت سے اس نئی قوم کی معاشرت بھی عثمانی معاشرت کہلائی۔

چوں کہ عثمانی معاشرت اپنے آغاز میں ایک قبائلی معاشرت تھی۔ اس لیے شروع کے عثمانیوں میں نمود و نمائش کے بجائے سادگی ملتی ہے۔ امیر اور رعایا سب ایک ساتھ ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ امیر و مامور کے کام بھی یکساں تھے یعنی کھیتی باڑی کرنے کے ساتھ بھیڑوں کے غلّے پالتے تھے۔ امیر عثمان خاں کے بارے میں آتا ہے کہ اس کی نظر میں ترک، تاتاری، عیسائی اور مسلمان سب برابر تھے۔ ابتدائی عثمانی سماج کے شاہی خاندان کے مکانات بھی عام لوگوں کے مکانوں جیسے ہی ہوتے تھے۔ ان کے گھروں میں عام برتن ہی استعمال ہوتے تھے۔ سونے چاندی یا جواہرات یہ لوگ اکھٹا نہیں کرتے تھے۔ پہلا عثمانی امیر عثمان خاں بھی ایک معمولی کسان جیسی سادہ زندگی گزارتا تھا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں:

> ''اس کی شہر میں اس کے رہنے کا جو مکان تھا، اس میں سونے چاندی کے جواہرات کی قسم سے کوئی چیز بھی اس کے مرنے کے بعد نہیں ملی، صرف ایک کفتان، ایک سوتی عمامہ، لکڑی کا ایک چمچہ، ایک نمک دان، چند خالص عربی گھوڑے، زراعت کے لیے چند جوڑ بیل اور بھیڑوں کے کچھ گلّے، علم اور اسلحہ کے علاوہ بس یہی اس کی ساری کائنات تھی۔'' (دولت عثمانیہ، اول، ص۲۴)

اس سے ابتدائی عثمانی معاشرت کی سادگی کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شروع کے عثمانی سماج میں عورتوں کو وہ تمام آزادیاں حاصل تھیں جو کسی بھی قبائلی معاشرے میں انہیں حاصل ہوتی ہیں۔ وہ آزادی کے ساتھ سڑکوں پر نکلتی تھیں اور بازاروں میں خرید و فروخت بھی کرتی تھیں۔ البتہ جیسے جیسے عثمانیوں کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور مختلف قومیں ان کی سلطنت کی حدود میں شامل ہوتی گئیں۔ ان کے اثرات عثمانی ترکوں نے بھی قبول کرنے شروع کر دیے یہاں تک کہ 1453ء میں استنبول (اُس وقت قسطنطنیہ) کی فتح کے ساتھ ترکی کا سماج بھی دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ عام اور متوسط طبقے کا عثمانی سماج تو اپنی پرانی قدروں پر آئندہ کافی دنوں تک قائم رہا۔ البتہ حکمراں طبقے میں مفتوحہ اقوام کے طور طریقوں نے بہت جلد اپنے لیے جگہ بنالی۔ مثال کے طور پر عورتوں کے لیے علاحدہ مکان، خواجہ سرا کی روایت یا تعدد ازدواج کا رواج اس وقت تک عام عثمانی سماج میں نہیں تھا لیکن بازنطینی اثرات کے تحت نہ صرف یہ کہ یہ چیزیں حکمرانوں کی معاشرت میں شامل ہوئیں بلکہ ان میں داشتہ رکھنے کا چلن بھی عام ہوگیا۔

حالانکہ بعد کے دنوں میں ترکوں کے اندر مفتوحہ اقوام کے تمدنی اثرات نے کافی جگہ بنالی اس کے باوجود ان کی عام معاشرت کی روایتی سادگی اس وقت بھی برقرار رہی۔ وہ عالی شان مکان تعمیر کرنے کے بجائے اس کی وسعت، روشنی اور ہوا کے

گزر کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کھانے پینے میں بھی تکلفات سے زیادہ صحت مند اور زود ہضم کھانوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ دودھ اور مختلف قسم کے پھلوں کو صاف پانی میں ابال کر روٹی کے ساتھ کھاتے تھے۔ وہ اپنے مکانوں اور مکانوں کے باہر بھی صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ عہد زوال میں بھی عثمانی ترکوں کی معاشرت وضع و ترتیب اور سادگی کا بہترین نمونہ تھی۔ علامہ شبلی نعمانی نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ترکی کا سفر کیا تھا۔ ترکوں کی معاشرت کے حوالے سے ان کا مشاہدہ یہاں نقل کرنے کے لائق ہے:

> ''ترکوں کی معاشرت کا طریقہ نہایت پسندیدہ اور قابل تقلید ہے۔ امراء اور معزز عہدے دار ایک طرف معمولی حیثیت کا آدمی بھی جس صفائی اور خوش سلیقگی سے بسر کرتا ہے، ہمارے ملک میں بڑے بڑے امیروں کو وہ بات نصیب نہیں۔ میں نے دس ہزار کی تنخواہ سے لے کر بیس روپیہ کی آمدنی والوں تک کے مکانات دیکھے ہیں، اگر چہ دونوں حالتوں میں نہایت تفاوت تھا اور ہونا چاہیے تھا، تاہم خوش سلیقگی اور ترتیب و صفائی میں برابر تھے۔''

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شروع سے لے کر آخری زمانے تک عثمانی سماج میں رہن سہن کی سادگی، صفائی و ستھرائی، کھانے پینے میں نفاست وغیرہ خصوصیات برقرار رہیں۔ فتوحات اور دیگر اقوام سے میل جول کے نتیجے میں عثمانی سماج میں اچھائیوں کے ساتھ ساتھ بعض برائیاں بھی ضرور در آئیں۔ البتہ ان برائیوں کے اثرات عام طور پر حکمراں طبقات تک محدود رہے۔

22.4 عثمانی ترکوں کے سماجی حالات

عثمانی ترکوں کے نظام حکومت سے متعلق اکائی میں ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ بظاہر ایک معمولی سی جاگیر سے شروع ہونے والی عثمانی ریاست بہت جلد اپنے اولوالعزم حکمرانوں کے سبب ایک وسیع و عریض سلطنت میں تبدیل ہوگئی اور اس کے تحت ایک ایسا سماج اور معاشرہ وجود میں آیا جس میں مختلف رنگ و نسل اور زبان و مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے اور بستے تھے۔ حالانکہ سلطنت کی سب سے بڑی آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی لیکن اس میں بڑی تعداد میں عیسائی، یہودی اور بت پرست تاتاری بھی موجود تھے، خاص طور پر سلطنت کے یورپی مقبوضات میں بڑی تعداد عیسائیوں کی تھی۔ اسی طرح عیسائیوں کی ایک تعداد اناطولیہ کے سابقہ بازنطینی مقبوضات میں بھی آباد تھی۔

22.4.1 مسلمان

سلطنت عثمانیہ کی بڑی آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی اور وہ پوری سلطنت میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں ایک تو حکمراں طبقہ تھا جو بنیادی طور پر عثمانی خاندان اور ادارۂ حکومت کے اعلیٰ حکام پر مشتمل تھا۔ دوسرا طبقہ مسلمان جاگیرداروں اور امراء کا تھا جن کے پاس بڑی بڑی جاگیریں سلطنت کے اطراف و جوانب میں موجود تھیں، جو ان کے آباء و اجداد کو جنگی فتوحات یا دیگر بڑے کارناموں کے انجام دینے پر ملی تھیں۔ تیسرا طبقہ عام مسلمانوں کا تھا اور یہی اکثریت میں تھا۔ اسی طبقے میں عام ترک، عرب، یونانی، سلافی و دیگر سبھی مسلمان شامل تھے۔

22.4.1.1 حکمراں طبقہ

حکمراں طبقے میں سب سے زیادہ اہمیت عثمانی خاندان کے افراد کو حاصل تھی۔ یہ سلطنت کا سب سے زیادہ مراعات یافتہ طبقہ تھا۔ سلطنت کے کسی بھی فرد کے لیے کسی عہدے یا ذمہ داری پر فائز ہونے کے لیے ایک مخصوص صلاحیت کا حامل ہونا ضروری تھا لیکن عثمانی خاندان کے افراد اس کلیے سے مستثنیٰ تھے۔ سلطان سے لے کر حکومت کے کسی بھی انتظامی عہدے پر فائز ہونے کے لیے عثمانی خاندان سے تعلق کو کافی سمجھا جاتا تھا۔ شروع میں حکمراں عثمانی خاندان کے افراد بھی عام لوگوں کی سی ہی زندگی گزارتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جیسے جیسے فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور مختلف تمدنوں کے افراد و اقوام عثمانی سلطنت کا حصہ بنتے گئے حکمراں طبقے کے رہن سہن میں بھی تبدیلی آتی گئی یہاں تک کہ دھیرے دھیرے وہ عام عثمانی سماج سے بالکل الگ ہو گئے۔ خاص طور پر قسطنطنیہ کی فتح کے بعد حکمراں طبقے میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان میں سخت پردے کا رواج عام ہوا۔ عورتوں کی رہایش کے لیے علاحدہ مکان تعمیر ہونے لگے، گھروں کے اندر کام کرنے کے لیے خواجہ سرار کھے جانے لگے۔ نہ صرف یہ کہ تعدد ازدواج کو فروغ ملا بلکہ داشتہ رکھنے کی رسم کو بھی رواج ملا۔ عورتوں کو صرف عیش و آرام کا ذریعہ سمجھا جانے لگا۔ سماج سے ان کا تعلق ختم ہو گیا۔ حکمراں خاندان کے ساتھ ساتھ معاشرت کی یہ تبدیلیاں حکمراں طبقے سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ حکام کے گھروں میں بھی وقوع پزیر ہوئیں اور وہ بھی اسی رنگ میں رنگتا چلا گیا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ عثمانی سلطنت میں اعلیٰ حکام زیادہ تر ادارہ حکومت کے توسط سے آتے تھے اور یہ وہ نوجوان ہوتے تھے جنہیں تعلیم و تربیت اور اعلی سرکاری خدمات کے لیے سلطنت کی غیر مسلم (عیسائی) رعایا سے بھرتی کیا جاتا تھا۔

22.4.1.2 مسلمان جاگیردار اور امراء

سلطنت عثمانیہ میں رہنے والے مسلمانوں کا یہ وہ طبقہ تھا جس کی جاگیریں اور کاروبار وغیرہ پوری سلطنت میں پھیلا ہوا تھا۔ عام طور پر یہ بڑے جاگیردار اور امیر دارالحکومت استنبول یا صوبائی دارالحکومتوں اور بڑے شہروں میں مقیم رہتے تھے اور وہیں سے اپنی جاگیروں کا انتظام وغیرہ کرتے تھے۔ چونکہ یہ جاگیریں انہیں یا ان کے باپ دادا کو فوجی خدمات کے صلے میں ملی ہوئی ہوتی تھیں اس لیے مرکزی یا صوبائی حکومت ان سے کوئی محصول یا ٹیکس وغیرہ نہیں لیتی تھی۔ البتہ انہیں اپنی جاگیر میں رہنے والے کاشتکاروں یا آس پاس کے راستوں وغیرہ کا خود خیال رکھنا ہوتا تھا اور ضرورت پڑنے پر یہ جاگیردار عثمانی حکومت کو جنگ کے لیے فوج مہیا کرتے تھے۔ جاگیرداروں اور امراء کا طبقہ خوش حال ہوتا تھا اور اس کے سماجی حالات متوسط یا حکمراں طبقے سے قریب ہوتے تھے۔ حکمراں طبقے کے زیر اثر پردے کا کسی حد تک رواج ان میں بھی آ گیا تھا۔ کچھ خاص صورتوں کے علاوہ عورتیں خاندان کے باہر کے لوگوں سے نہیں مل سکتی تھیں۔ حالانکہ ان میں تعدد ازدواج عام نہیں ہوا تھا۔ البتہ لونڈیاں رکھنے کی روایت موجود تھی۔ لوگوں میں پائی جانے والی عام سادگی کے سبب ان کے مکانات عالی شان تو نہ ہوتے تھے لیکن وسیع ہوتے تھے اور اکثر باغوں کے بیچ میں ہوتے تھے۔ امراء اور جاگیرداروں میں باغوں اور حماموں کا خاص شوق پایا جاتا تھا۔

22.4.1.3 عام مسلمانوں کا طبقہ

اس طبقے میں نچلے متوسط درجے کے اور ادنیٰ درجے کے سبھی مسلمان شامل تھے۔ سلطنت کے مسلمانوں کی اکثریت انہیں پر

مشتمل تھی۔ سلطنت کے زوال تک عام طور پر اس طبقے کے افراد بھی خوشحال تھے ان میں چھوٹے جاگیردار، کاشتکار، کاروباری اور پیشہ ور سبھی مسلمان شامل تھے۔ یہ عام طور پر کھیتی باڑی، گلہ بانی، مختلف پیشوں اور چھوٹے کاروباروں سے وابستہ تھے۔ ان کی سماجی زندگی بالعموم تکلفات سے خالی ہوتی تھی۔ خوشحالی کے باوجود فضول خرچی سے گریز پایا جاتا تھا اور عام طور پر لوگ کفایت شعار ہوتے تھے۔ عام مسلمانوں کا یہ طبقہ شہروں اور دیہاتوں میں یکساں طور پر بکھرا ہوا تھا۔ اس میں نظم وضبط کی پابندی پائی جاتی تھی۔ چوری، ڈکیتی یا لوٹ مار جیسی سماجی برائیوں سے عام طور پر یہ طبقہ محفوظ تھا۔ عورتوں کو عموماً آزادی حاصل تھی وہ چہرے پر نقاب ڈال کر نہ صرف یہ کہ ضرورت کے تحت بازاروں میں جاتی تھیں بلکہ سیر وتفریح کے لیے بھی باہر نکلتی تھیں۔ بلکہ ادنی درجے کی خواتین کو عام حالات میں تو امور خانہ داری کی ذمہ داری ہی انجام دینی ہوتی تھی لیکن جب ان کے گھر کے مرد سرکاری حکم پر جنگوں میں شرکت کے لیے باہر چلے جاتے تھے تو انہیں کھیتوں وغیرہ کی دیکھ بھال بھی کرنی پڑتی تھی۔

22.4.2 عیسائی

عثمانی سلطنت میں سب سے بڑی آبادی مسلمانوں کے بعد عیسائیوں کی تھی۔ ان کی اکثریت یوں تو سلطنت کے یورپی مقبوضات میں آباد تھی لیکن ایک بہت بڑی تعداد اناطولیہ یا ایشیائے کوچک کے ان علاقوں میں بھی رہتی تھی جو کبھی بازنطینی سلطنت کا حصہ رہ چکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے کبھی بھی غیر مسلموں کو جبراً مسلمان نہیں بنایا۔ عثمانی سلطنت میں عیسائیوں کی بڑی تعداد کاشتکاروں پر مشتمل تھی۔ یہ کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے اور ایک متعینہ رقم خراج کے طور پر عثمانی حکومت کو ادا کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ مسلمان کوئی علاقہ فتح کر لیتے اور مفتوحہ زمینوں میں سے حکمران کی زمینوں کو چھوڑ کر بقیہ زمینیں ان کے اصل عیسائی مالکوں کے پاس ہی رہنے دیتے تھے اور بدلے میں ان سے خراج کے طور پر معمولی محصول وصول کرتے تھے جو بالعموم اس محصول سے کم ہوا کرتی تھی جو وہ اپنے سابقہ عیسائی حکمرانوں یا جاگیرداروں کو دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اوپر گزرا عثمانی سلطنت کے عیسائی دو حصوں میں تقسیم تھے۔ اناطولیہ کے علاقے میں آباد عیسائی عام طور پر مہذب اور شائستہ ہوتے تھے۔ ترکوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کی خوبیاں ان میں در آئی تھیں اور گو صفائی ستھرائی اور رہن سہن میں وہ ترکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے لیکن عثمانی سلطنت کے یورپی علاقوں میں رہنے والے اپنے عیسائی بھائیوں کے مقابلے وہ کہیں زیادہ بہتر تھے۔

22.4.3 یہودی اور تاتاری

سلطنت عثمانیہ میں یہودیوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ ان میں زیادہ تر وہ یہودی تھے جنھیں اسپین سے عیسائی حکومتوں نے نکال دیا تھا اور عثمانیوں نے انہیں پناہ دی تھی۔ استنبول کا ربّی اعظم سلطنت کے یہودیوں کے امور کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ عثمانی سلطنت کے یہودی زیادہ تر تجارت اور کاروبار سے وابستہ تھے۔ یہ عام طور پر بڑے شہروں میں آباد تھے اور تجارت کرنے کی وجہ سے ان میں خوشحالی بھی تھی۔ البتہ تمدنی سطح پر یہ مسلمانوں سے کافی پیچھے تھے۔ رہن سہن اور صفائی ستھرائی میں یہ مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

ایشیائے کوچک کے سرحدی علاقوں میں تاتاریوں کی بھی مختلف آبادیاں تھیں۔ ان کی ایک تعداد تو مسلمان ہو گئی تھی لیکن بعد کے زمانے تک بھی کچھ تاتاری اپنے آبائی مذہب (بت پرستی) پر قائم تھے۔ تاتاری عام طور پر کاشتکار یا کسان تھے۔

22.5 عثمانی ترکوں کی معاشرت

عثمانی سلطنت میں رہنے والے مختلف طبقات کے سماجی حالات جان لینے کے بعد اس عنوان کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم عثمانی ترکوں کی معاشرت یا رہن سہن، کھانا پینا، خواتین وغیرہ سے متعلق امور پر روشنی ڈالیں تاکہ ان کے سماجی حالات اور بھی نکھر کر ہمارے سامنے آجائیں اور عثمانی ترکوں کے سماج کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

22.5.1 معاشرت کی سادگی:

حالاں کہ عثمانی ترکوں کے اعلیٰ طبقے نے سابقہ بازنطینی تکلفات کسی حد تک اختیار کر لیے تھے اس کے باوجود عام ترکوں میں معاشرت کی سادگی کئی سو سالوں تک برقرار رہی۔ خواہ ان کے مکان ہوں یا لباس و غذا ہو ہر جگہ اس سادگی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

22.5.1.1 مکان

عثمانی ترکوں کی عمارتوں میں شان وشوکت سے پرہیز پایا جاتا ہے۔ ان کے مکان اگر چوروں سے محفوظ ہیں، گرمی، سردی اور بارش سے ان کی حفاظت کرتے ہیں تو پھر وہ زیادہ تکلفات میں نہیں پڑتے۔ البتہ وہ مکان بنانے کے لیے فطری طور پر خوبصورت جگہوں کو پسند کرتے تھے جہاں ان کو درختوں کا سایہ فراہم ہو سکے، ٹھنڈے اور میٹھے چشموں کا پانی میسر ہو اور آس پاس وسیع میدان ہوں۔ ان کے مکانوں کے ساتھ باغ، چمن یا صحن ضرور ہوتے تھے، ان میں شہتوت اور چنار کے درخت لگے ہوتے اور ہر مکان دوسرے مکان سے بالکل الگ ہوتا۔ متوسط طبقے کے ترکوں کے نہ صرف مکان وسیع ہوتے تھے بلکہ ان کے تین طرف صحن اور چمن کا ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ دیواریں گہرے سرخ رنگ کی ہوتی تھیں۔ چمن میں چنار اور شہتوت کے بلند درختوں کے علاوہ مختلف قسم کے پھل دار درخت بھی لگائے جاتے اور ایک حصے میں پھولوں اور سبزیوں (ترکاریوں) کی کاشت بھی ہوتی تھی۔ بیرونی حصے میں نیچے کے دو کمرے مردوں کے لیے مخصوص ہوتے تھے انہیں سلاملق کہا جاتا تھا۔ صاحب خانہ یہاں اپنے ملاقاتیوں سے ملتا تھا۔ مکان کا بالائی حصہ عورتوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا اور اس حصے میں کوئی مرد داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ترک اسے حرملق یا حرم کہتے ہیں۔ متمول عثمانیوں کے مکانوں میں حرم کا حصہ مردانہ حصہ سے الگ ہوتا تھا اور دونوں کو ایک غلام گردش ملاتی تھی جسے مقامی زبان میں مابین کہا جاتا تھا۔ ملاقات کا کمرہ یا ڈرائنگ روم اس طرح بنایا جاتا کہ اس میں پوری دیوار کے طول کے برابر دو ڈھائی فٹ چوڑے چبوترے بنے ہوتے تھے اور ان پر نرم روئی کے گدّے بچھے ہوتے تھے۔ فرش پر خوبصورت ترکی قالین بچھائے جاتے تھے۔ البتہ لوگوں کی آمد کی کثرت کے سبب قالین گندے نہ ہو جائیں قالینوں کے اوپر ڈیڑھ دو فٹ چوری کارپیٹ کی پٹیاں ڈال دی جاتی تھیں تاکہ آنے والے انہیں پر چل کر آئیں اور جائیں اور بقیہ قالین محفوظ رہے۔

22.5.1.2 غذا اور خوراک

عثمانی ترک جس طرح رہن سہن کے معاملے میں سادہ مزاج واقع ہوئے تھے ان کی غذا بھی تکلفات سے عاری تھی۔ مزے دار چیزوں اور چٹخارے کھانوں کا عام طور پر ترکوں کو شوق نہیں ہوتا تھا۔ عام طور پر وہ روٹی کو نمک لہسن یا پیاز ملا کر کھا لیا کرتے

تھے اور اگر انہیں ایک طرح کا ترش دودھ جسے وہ برغورت کہتے ہیں مل جاتا تو پھر وہ کسی دوسری چیز کی ضرورت کم ہی محسوس کیا کرتے۔ ترک اس ترش دودھ کو بہت ٹھنڈے پانی میں ملا کر اس میں روٹی کے ٹکڑے ڈال دیتے۔ وہ اس کا استعمال بہت زیادہ گرمی اور پیاس کی حالت میں بھی کرتے تھے کیوں کہ یہ خوش ذائقہ اور زود ہضم ہونے کے ساتھ ساتھ پیاس بجھانے کی بھی غیر معمولی خاصیت رکھتا ہے۔ عام طور پر عثمانی ترکوں میں ذائقے (Taste) کے لیے جو چیزیں استعمال ہوتی تھیں ان میں ترش دودھ کے علاوہ خشک آلو بخارا، شفتالو، سفرجل، انجیر، منقی اور شاہ دانہ عام تھیں۔ ان چیزوں کو وہ صاف پانی میں ابال کر مٹی کی بڑی بڑی کشتیوں میں رکھ لیتے اور حسب ضرورت ان پھلوں کو روٹی کے ساتھ چٹنی یا چاٹ کے طور پر استعمال کرتے۔ البتہ ان کی پر تکلف دعوتوں میں مختلف قسم کے عمدہ چاولوں اور بھیڑ، بکری اور چوزے کے گوشت کے علاوہ میٹھا کلچا اور بعض دوسری قسم کی مٹھائیاں بھی ہوتی تھیں۔

22.5.1.3 حمام

عثمانی ترک فطری طور پر نفاست پسند واقع ہوئے تھے۔ اسلام کی تعلیمات نے انہیں اور بھی زیادہ پاک باز بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر مکان کے ساتھ (اگر اس کے پاس تھوڑی بہت وسعت ہوتی تو بھی) ایک حمام کا ہونا ضروری تھا۔ سلطنت کے تمام بڑے شہروں میں عام حمام بھی بڑی تعداد میں موجود تھے جن میں ہر طبقے کے لوگ جاتے تھے۔ عام حمام عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ ہوتے تھے۔ یہ حمام ایک طرح کے کلب کی حیثیت رکھتے تھے جہاں لوگ نہانے اور غسل کرنے کے علاوہ Indoor تفریحات اور ملاقاتوں کے لیے بھی اکھٹا ہوتے تھے اور ان کی مناسب فیس بھی ہوتی تھی۔ غریبوں کے لیے مسجدوں اور دوسری رفاہی عمارتوں میں حمام بنے ہوتے تھے اور ان جگہوں پر وہ مفت غسل کر سکتے تھے۔ چونکہ حمام کلب کی طرح کام کرتے تھے اس لیے مردانہ حمام دن کے علاوہ شام میں بھی کھلے رہتے تھے۔ البتہ زنانہ حماموں کو شام میں بند کر دیا جاتا تھا لیکن دن کے وقت عورتوں کو ان حماموں میں جانے اور آپس میں ملاقاتیں کرنے کی آزادی تھی۔

22.5.1.4 قہوہ خانے

قہوہ خانے عثمانی ترکی معاشرت کا لازمی حصہ تھے جس طرح ہمارے یہاں برصغیر پاک و ہند میں چائے خانوں کو سماجی زندگی میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح عثمانی دور حکومت میں سلطنت کے ہر شہر، قصبے اور گاؤں میں قہوہ خانے عام تھے اور کثرت کے ساتھ ہر جگہ موجود تھے۔ جس طرح ہمارے ہاں چائے خانے عموماً چائے ملاقات کا کام کرتے ہیں اسی طرح عثمانی ترکوں کے لیے بھی قہوہ خانے ملاقات کی جگہیں ہوتی تھیں جہاں وہ باہم ملتے ہی نہیں تھے بلکہ مقامی، ملکی اور غیر ملکی سیاست سے لے کر خانگی معاملات تک ہر موضوع پر باتیں اور مباحثے ہوتے تھے۔ عام لوگوں کے لیے اپنے خیالات کے اظہار کا ایک طرح یہاں بہترین موقع فراہم ہو جاتا تھا۔ جس طرح ہمارے یہاں کسی بھی ملاقاتی کے لیے ضیافت کے طور پر چائے پیش کی جاتی ہے اسی طرح عثمانی ترکوں میں بھی ملاقاتیوں کو قہوہ اور سگریٹ پیش کرنے کا رواج عام تھا۔ دوکان دار بھی اکثر اپنے گاہکوں کو اخلاقاً قہوہ کی پیالی پیش کرتے تھے۔ سماجی اور سرکاری ملاقاتوں کے علاوہ خالص کاروباری ملاقاتوں کے دوران بھی قہوہ اور سگریٹ کا پیش کیا جانا لازمی آداب میں سے خیال کیا جاتا تھا۔ اور اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو اسے انتہائی بد اخلاق اور غیر مہذب سمجھا جاتا تھا۔

22.5.1.5 امن وامان کی صورت حال

عثمانی ترک معاشرے میں امن وقانون کی صورتحال بہت اچھی تھی۔ بہت کم ہی ایسے مواقع آتے تھے جب تنازعات کے تصفیے کے لیے پولیس کی ضرورت پیش آتی ہو۔ سڑکوں یا بازاروں میں عام طور پر جھگڑا اور فساد نہیں ہوتا تھا اور کبھی ہوتا بھی تو اس میں ترکوں کے بجائے زیادہ تر یونانی عیسائی، یہودی یا غیر ملکی ملاح وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ گزرگاہوں پر لوگوں کو راستہ دینا اخلاق کا حصہ تھا اور شراب کا استعمال ترکوں میں نہیں کے برابر تھا۔ مقامی کے علاوہ غیر ملکی خواتین بھی دن میں شہروں کے اندر آزادانہ اطمینان کے ساتھ گھوم پھر سکتی تھیں اور انہیں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا۔ رات کے وقت امن عامہ کا تحفظ بیگ چی (چوکیدار) کے سپرد ہوتا تھا وہ سورج ڈوبنے کے بعد سے لالٹین ہاتھ میں لیے صبح تک شہر میں گشت کرتا رہتا اور لوہے کی شام لگے ہوئے ڈنڈے کو وقفے وقفے سے سڑک پر کھٹکھٹاتا جاتا۔ غروب آفتاب کے بعد باہر نکلنے کے لیے شریف آدمی کے لیے ضروری ہوتا کہ وہ لالٹین ہاتھ میں لے کر نکلے، اس علامت کے بغیر نکلنے پر اسے قانون کے محافظوں کے سامنے جواب دہ ہونا پڑ سکتا تھا۔ امن وقانون ایسا تھا کہ چوری، نقب زنی اور ڈاکہ جیسے واقعات عثمانی ترکی سماج میں نہیں کے برابر پیش آتے تھے۔

22.5.1.6 عورتوں کے حالات

ترکی ہی نہیں پوری مسلم دنیا کے حوالے سے عورتوں کے بارے میں اہل یورپ کے خیالات اچھے نہیں ہیں۔ خاص طور پر حرم اور اس کی زندگی کو لے کر ان میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حرم مکان کا وہ حصہ ہوتا تھا جس میں بے شمار عورتیں رہتی تھیں اور وہ سب یا تو صاحب خانہ کی بیویاں ہوتی تھیں یا لونڈیوں اور داشتاؤں کی شکل میں اس کے تصرف میں رہتی تھیں۔ انہیں گھر کی چہار دیواری سے نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اور ان کا کام صرف اپنے مالک (صاحب خانہ) کو خوش رکھنا ہوتا تھا۔ حالانکہ جیسا کہ عرض ہوا یہ خیال صرف اور صرف غلط فہمی کی بنا پر ہے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بلا شبہ ترکی میں عورتوں کے رہنے کے حصے کو حرم کہتے تھے اور اس میں صاحب خانہ کی والدہ، بیوی، بہنیں، بیٹیاں اور دیگر محرمات (جو صاحب خانہ کے سامنے بلا پردہ آسکتی ہیں) داخل تھیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ گھر کے اس حصے میں صاحب خانہ کے علاوہ کسی اور مرد کو داخلے کی اجازت نہ ہو بلکہ والد، خسر اور نسبتی بھائی وغیرہ گھر کے اس حصے کے اندر آتے جاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ عثمانی دور کے امراء سے متعلق ترک سماج میں سخت پردہ تھا البتہ عورتوں کو گھروں کے اندر بالکل قید کر کے نہیں رکھا جاتا تھا۔ عورتیں تعلیم وتدریس کے لیے زنانہ مدرسوں میں جاتی تھیں۔ اسی طرح عورتوں کا ایک حرم سرا سے دوسری حرم سرا تک آنا جانا بھی رہتا تھا۔ خوشی ودیگر تقریبات کے موقعے پر گھر کے اندر گانا بجانا بھی ہوتا تھا۔ عورتوں میں مذہبی داستان گوئی کی روایت بھی موجود تھی اور اسے توجہ سے سنا جاتا تھا۔

عثمانی دور کی ترک عورتوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے مرتبے اور مقام کے مطابق گھر کے انتظامات اور امور خانہ داری کی نگرانی کریں گی یا انہیں انجام دیں گی۔ خوش حال گھروں میں نوعمر لڑکیوں کو گھریلو ذمہ داراریوں کے ساتھ سلائی کڑھائی کا ڈھنگ بھی سیکھنا ہوتا تھا اور اس کے لیے خاص معلمات اور استانیاں ہوتی تھیں۔ اسی طرح دور دراز دیہی علاقوں میں رہنے والی دہقانی عورتوں کو کئی بار گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ کھیتوں پر کام بھی کرنا پڑتا تھا، خاص طور پر اس وقت جب ان کے مرد کسی فوجی مہم

پر ہوتے تھے۔ دور آخر کے عثمانی سماج میں ہمیں یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ عورتیں بیرونی تفریحات کے لیے بھی نکلتی تھیں خاص طور پر زنانہ حمام محض غسل کرنے کے لیے نہیں بلکہ پوار کلب ہوتے تھے۔ عورتیں یہاں گروپ کی شکل میں آتی تھیں دوستوں اور سہیلیوں سے ملتیں اور نئی ملاقاتیوں سے رسم وراہ پیدا کرتیں اکثر پھل اور ناشتہ کی چیزیں بھی ان کے ساتھ ہوتی تھیں اور دن کا زیادہ تر حصہ وہ یہاں ہنسی مذاق، باتوں اور خبروں کو سننے میں گزار دیتیں۔ یہی نہیں عثمانی دور کی خواتین کھلی ہوا میں بھی تفریح کے لیے جاتی تھیں۔ خوب صورت پارک تقریباً ہر بڑے عثمانی شہر میں موجود تھے جہاں عورتوں کی ٹولیاں تفریح کے لیے جایا کرتی تھیں۔ البتہ غروب آفتاب کے ساتھ ان کا اپنے گھروں کو لوٹ جانا ضروری تھا۔

عثمانی ترکوں میں تعدد ازدواج کی روایت نہیں تھی۔ عام عثمانی سماج میں لوگوں کے یہاں ایک ہی بیوی ہوتی تھی۔ جو لوگ دولت منداور خوش حال ہوتے ان کے یہاں بھی ایک سے زیادہ بیویوں کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی تھی۔ اول تو یہ کہ عام سماج میں ہی ایک سے زیادہ شادی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ دوسری شادی کی صورت میں اخراجات بھی بہت زیادہ بڑھ جاتے تھے کیوں کہ نئی بیوی کے لیے ایک علاحدہ مکان کے علاوہ دیگر ضروریات کی چیزیں بھی الگ سے فراہم کرنی پڑتی تھیں۔ ترک سماج میں دوسری شادی کی ضرورت عام طور پر اسی وقت پیش آتی تھی جب پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہو لیکن ایسا کرنے کی صورت میں بھی بالعموم گھر کا ماحول خراب ہونے کا خطرہ رہتا تھا۔ لہٰذا زیادہ تر لوگ گریز ہی اختیار کرتے تھے۔ ایک انگریز خاتون لوسی گارنٹ انیسویں صدی کے اواخر میں ترکی کا سفر کیا تھا اور وہاں طویل عرصے تک قیام پذیر بھی رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے مشاہدات میں لکھا ہے کہ ترکی میں اپنے طویل قیام کے دوران میں ملک کے مختلف حصوں میں گئی اور وہاں اپنا وقت گزارا لیکن اس پورے عرصے میں صرف ایک بار مجھے ایک ایسے حرم (گھر) میں جانے کا اتفاق ہوا جس میں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔ اس سے یہ معلوم کرنا مشکل نہیں کہ ترکوں میں تعدد ازدواج کا رواج عام طور پر نہیں تھا۔

22.5.1.7 غلام اور کنیزیں

اسلام نے غلامی کی حوصلہ افزائی نہیں کی ہے بلکہ ایسے اقدامات کیے ہیں جن سے بتدریج یہ ادارہ ختم ہو جائے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام نے ایسا کیوں کیا اس پر طویل بحثیں ہوئی ہیں یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ عثمانی ترکوں کی سلطنت میں بھی غلاموں اور کنیزوں کا رواج تھا۔ بلکہ ان کے نظام حکومت میں ادارہ حکومت کے ارکان تقریباً سبھی غلاموں میں سے لیے جاتے تھے اور قلی سلطان (سلطان کا غلام) کہلانا ایک طرح سے فخر کی بات ہوتی تھی۔ لیکن سلطنت کے زوال کے آغاز کے ساتھ ہی جب عثمانی فتوحات کا سلسلہ رکا تو پھر غلاموں اور کنیزوں کی تعداد میں بھی کمی آئی کیوں کہ زیادہ تر غلام اور کنیزیں میدان جنگ سے ہی حاصل ہوتے تھے۔ بعد میں عثمانی سماج میں غلاموں اور کنیزوں کی اس کمی کو بردہ فروشی کے بازاروں سے پورا کیا جانے لگا۔ لیکن انیسویں صدی میں ہی عثمانی حکومت نے بردہ فروشی کو باضابطہ ممنوع قرار دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں غلاموں اور کنیزوں کی شدید قلت ہوگئی کیوں کہ گھر اور گھر سے باہر کے بہت سارے کام یہی لوگ انجام دیا کرتے تھے۔ غلاموں کی خرید و فروخت تو تقریباً بالکل ہی ختم ہوگئی اور ان کی جگہ تنخواہ دار ملازم یا مزدوری پر کام کرنے والے نوکر کام کرنے لگے۔ البتہ کنیزوں کا رواج بیسویں صدی کے آغاز تک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا اور ان کی خرید و فروخت بھی ہوتی رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عثمانی ترک جس

طرز زندگی کے عادی ہو چکے تھے اس میں حرم کی خدمت کے لیے کنیزوں کا ہونا بہت ضروری تھا۔ آزاد عثمانی عورت بغیر نقاب کے گھر سے باہر یا غیر مردوں کے سامنے نہیں جاسکتی تھی، کنیزیں اس پابندی سے آزاد تھیں۔ حالانکہ کنیزوں کی خرید وفروخت خلاف قانون تھی اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ خفیہ طور پر کنیزوں کی خرید وفروخت ہوتی تھی، چھ سے دس برس تک کی لڑکیوں کی مانگ زیادہ رہتی تھی کیوں کہ تعلیم وتربیت دینے کے بعد جب وہ سولہ سترہ برس کی ہو جاتی تو اس کی قیمت دس گنا تک زیادہ ملتی تھی۔ کنیزوں کو ستار اور دف بجانے، رقص کرنے اور کشیدہ کاری کی تعلیم دی جاتی تھی، اسی طرح انہیں عثمانی سماج کے آداب ورسوم بھی سکھائے جاتے تھے اور جب وہ بڑی ہو جاتیں تو گھر کے چھوٹے بڑے سبھی کام ان کے سپرد کر دیے جاتے تھے۔ انہیں کھانا وہی کھلایا جاتا تھا جو مالکہ خود کھاتی تھی، غلطیوں پر سزا کے طور پر گھروں سے باہر نہیں نکالا جاتا تھا۔ ان کی تمام ضروریات زندگی کی ذمہ دار مالکہ ہوتی تھی اور سات سال کی مدت (خدمت) کے بعد کنیز آزادی کی مستحق ہو جاتی تھی اور عام طور پر مالکہ اسے اس وقت آزاد کر کے کسی بھلے آدمی سے اس کی شادی کر کے رخصت کر دیتی تھی۔ کئی بار آزاد ترک بھی اپنے حالات کے سبب آزاد عورتوں کے بجائے ان عورتوں سے شادی کو ترجیح دیتے تھے جو کنیز رہ چکی ہوں۔ کیوں کہ اس طرح وہ شادی کے اخراجات سے بچ جاتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں ترکی کنیزوں کے حالات مغربی ملازماؤں سے بہتر تھے۔ عثمانی ترک سماج میں غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کرنا بہت ہی نیک کام سمجھا جاتا تھا۔ اکثر ترک مرد اور عورتیں بستر مرگ پر اپنے غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کر دیا کرتے تھے۔ بہت سے لاولد افراد اور بیوائیں اکثر اپنے خریدے ہوئے غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کر کے متبنیٰ (بیٹا یا بیٹی) بنا لیتی تھیں اور انہیں اپنا وارث قرار دے دیتی تھیں۔ آزاد ہونے کے بعد ترکی سماج میں غلاموں اور کنیزوں کو وہ تمام حقوق واختیارات حاصل ہو جاتے تھے جو عام آزاد عثمانی ترکوں کو حاصل ہوتے تھے۔

22.6 عام ترکوں کے اخلاق وعادات

عثمانی تاریخ کے مؤرخین اور وقائع نگاروں نے عام طور پر عثمانی ترکوں کے اخلاق وعادات کی تعریف کی ہے۔ بلاشبہ وسطی ایشیا سے کوچ کر کے ایشیائے کوچک کو اپنا وطن اور مسکن بنانے والے ترک بہادری اور راست بازی جیسی صفات عالیہ سے متصف تھے۔ لیکن ایشیائے کوچک میں داخلے کے بعد جب وہ اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے تو اسلامی تعلیمات نے ان کی ان صفات میں فرماں برداری اور پرہیز گاری کے ذریعہ چار چاند لگا دیے۔ شجاعت وبہادری، راست گوئی وراست روی، اطاعت شعاری و فرماں برداری اور پھر تقویٰ و پرہیز گاری نے مل کر ان کے اخلاق وکردار میں ایسی سلامت روی پیدا کی کہ ان کے دشمن بھی اہم معاملات میں انہیں پر بھروسہ کرتے تھے۔ عہد زوال کے عثمانی ترکی معاشرے میں بھی ترکوں کی ایمانداری اور راست روی کی ایسی چھاپ موجود تھی کہ عیسائی ودیگر مذاہب کے تاجر اور کاروباری بھی ان کی ایمان داری کی نہ صرف داد دیتے تھے بلکہ جب انہیں کوئی ایسا معاملہ کرنا پڑتا جس مین کامل ایمان داری کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنے ہم مذہب آرمینی ویونانی عیسائیوں یا یہودیوں پر ترک مسلمانوں کو ترجیح دیتے تھے اور انہیں کے ساتھ معاملہ کرتے تھے۔ ترکوں کے اخلاق کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی اپنے سفرنامہ مصر و شام وروم میں لکھتے ہیں:

"کچھ شبہ نہیں کہ ترکوں کے اخلاق نہایت وسیع اور فیاضانہ ہیں غرور ونخوت، ترفع اور کم بینی، ان میں نام کو نہیں۔ امیر وغریب، مزدور وعہدے دار، وضیع وشریف، جاہل وعالم ہر درجہ کے لوگوں سے مجھ کو سابقہ پڑا، لیکن خوش اخلاقی اور فیاض طبعی میں گویا سب ایک ہی مکتب کے شاگرد اور ایک ہی سانچے کے ڈھلے تھے۔
غازی عثمان پاشا جن کو پلونا کے واقعہ نے تمام دنیا میں روشناس کر دیا ہے اور درویش پاشا جن کا پوتا سلطان کی دامادی کا شرف رکھتا ہے، اس مرتبہ کے لوگ ہیں جیسے ہندوستان میں گورنر جنرل یا کمانڈر اِن چیف، میں دونوں سے ملا ہوں اور وہ جس تواضع اور خوش اخلاقی سے پیش آئے، اس کا اثر اب تک میرے دل میں ہے۔
ایک عام بات ہے کہ بازار میں چلتے چلتے تم جس شخص سے، گو وہ کسی رتبہ کا آدمی ہو، راستہ پوچھو وہ نہایت مہربانی سے تمہاری طرف متوجہ ہوگا اور تم کو راستہ بتائے گا، بعض موقعوں پر مجھ کو نہایت تنگ اور پیچ دار گلیوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا اور راستہ کے بھول جانے کی وجہ سے دیر تک حیران رہا، اتفاقاً کوئی ترک آنکلا تو اس نے راستہ بتانے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ساتھ ہو لیا اور جہاں مجھ کو جانا تھا وہاں تک پہنچا کر واپس آیا۔
فیاضی اور مہمان نوازی ترکوں کی عام صفت ہے اور نہایت ادنیٰ درجہ کے لوگ بھی نہایت سیر چشم اور فیاض ہیں، یہ عام طریقہ ہے کہ دو چار چشم آشنا کسی ہوٹل یا قہوہ خانہ میں اتفاق سے مل گئے تو قہوہ وغیرہ میں جو کچھ خرچ ہوگا ایک شخص سب کی طرف سے دے دے گا، گویا تمام لوگ اس شخص کے مہمان ہوتے ہیں اور وہ میزبان ہوتا ہے۔"

بلاشبہ عثمانی ترکوں نے دنیا کے ایک بہت بڑے رقبے پر طویل ترین حکمرانی کی لیکن اس کے باوجود ان کے اخلاق وعادات میں اس طرح کی خرابیاں نہیں پیدا ہوئیں جو عام طور پر حکمران قوموں میں بہت جلد پیدا ہو جاتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ چھ سو برس تک حکومت کرنے کے باوجود بحیثیت مجموعی ان کے اندر سے سپاہیانہ خوبیاں ختم نہیں ہوئیں اور اسی وجہ سے دور زوال میں بھی بار بار وہ سنبھالا لیتے رہے اور اس میں تقریباً تین سو برس کا عرصہ لگ گیا۔ عثمانی ترک شراب اور جوئے جیسی قبیح سماجی برائیوں سے عام طور پر محفوظ تھے اور صفائی ستھرائی میں بھی ہم سایہ قومیں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ جب ایک دیہاتی قہوہ خانے میں ایک عیسائی کسان سے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ہاتھ منہ دھو لینے کو کہا گیا تو اس کا جواب تھا کہ میں کوئی ترک ہوں کہ ہمیشہ خود کو دھوتا رہوں۔ غیر عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ تو دور کی بات رہی عثمانی ترک اپنی عورتوں سے بھی سڑک پر کھڑے ہو کر بات نہیں کرتے تھے۔ وہ عورتوں اور بچوں پر ہی نہیں جانوروں پر بھی مہربان ہوتے تھے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ عثمانی ترکوں کی زندگی پر اسلام کی تعلیمات نے گہرا اثر ڈالا تھا اور اسلامی اخلاقیات ان کی روزمرہ کی زندگی میں رچی بسی ہوئی تھی۔

22.7 عثمانی حکومت کے معاشی حالات

ہمیں یہ معلوم ہے کہ عثمانی حکومت کا آغاز ایشیائے کوچک میں جسے اناطولیہ بھی کہا جاتا ہے ایک چھوٹی سی جاگیر سے ہوا تھا۔ تیرہویں صدی عیسوی اور چودھویں صدی عیسوی کی دنیا پر اگر ہم نظر دوڑائیں، اور اس کے بعد بھی یورپ کے صنعتی انقلاب تک، تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس زمانے کی دنیا میں معیشت کی بنیاد زراعت یا کھیتی باڑی پر قائم تھی۔ عثمانی سلطنت کی معیشت بھی بنیادی طور پر

زراعت سے وابستہ تھی۔ یہاں تک کہ عثمانی سلطنت کے تقریباً سبھی حکمراں زرعی زمینوں کے مالک ہوتے تھے اور اس کے ذریعہ انہیں خاصی آمدنی بھی حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ پہلا عثمانی حکمراں امیر عثمان خاں نہ صرف یہ کہ زرعی زمینوں کا مالک تھا بلکہ انتقال کے بعد جو مختصر اثاثہ اس نے اپنے جانشین کے لیے چھوڑا اس میں کھیتی باڑی کے کام کے لیے چند جوڑے بیل بھی تھے۔

کسی بھی دوسرے ملک کی معیشت کی طرح عثمانی سلطنت کی معیشت کی بنیاد بھی آمدنی کے تین ذرائع پر تھی یعنی زراعت، تجارت اور صنعت۔ البتہ عثمانی سلطنت کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ وہ فتوحات بھی تھیں جو اس خاندان کے حوصلہ مند حکمرانوں کی قیادت میں تین سو برس سے بھی زیادہ عرصے تک جاری رہیں۔ جب تک فوجی مہمات اور ان کے نتیجے میں فتوحات کا سلسلہ جاری رہا، عثمانی حکومت کی آمدنی کا یہ سب سے بڑا ذریعہ رہیں۔ بعد میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں جب فتوحات کا سلسلہ رک گیا تو پھر اس کے ساتھ ہی آمدنی کا یہ بڑا ذریعہ بھی بند ہوگیا۔ ساتھ ہی حالات کے بدلنے اور فوج وحکومت میں نئی اصلاحات کے سبب حکومت کے اخراجات میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا جو عثمانی معیشت کے دوسرے شعبوں سے پورے نہیں کیے جاسکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عثمانی حکومت دھیرے دھیرے قرضوں کے بوجھ میں دبتی چلی گئی اور آخری ایام میں حکومت کی معاشی بدحالی نے بھی اس کے زوال میں اہم رول ادا کیا۔

جنگی فتوحات سے حاصل ہونے والی آمدنی کے علاوہ عثمانی حکومت کا معاشی نظام بنیادی طور پر زراعت اور اس سے وابستہ گلہ بانی وغیرہ کاموں پر قائم تھا۔ نظام حکومت کے تحت ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ سلطنت میں دو طرح کی جاگیریں تھیں۔ بڑی جاگیروں کو زعامت کہا جاتا تھا اور چھوٹی جاگیروں کو تیمار کہا جاتا تھا۔ یہ جاگیریں لوگوں کو جنگی فتوحات میں نمایاں کارناموں کے انجام دینے کی وجہ سے ملی ہوتی تھیں۔ ان کی آمدنی زیادہ تر جاگیردار خود استعمال کرتے تھے۔ البتہ اس کے بدلے میں وہ وقت ضرورت سلطنت کو جنگ کے لیے اپنی جاگیر کی وسعت کے اعتبار سے فوجی فراہم کرتے تھے، جنہیں کہ جاگیری فوجی کہا جاتا تھا۔ ان کی کوئی بھی ذمہ داری عثمانی حکومت پر نہیں ہوتی تھی جاگیرداران کی فراہمی کا ذمہ دار ہوا کرتا تھا۔ البتہ امن کے دنوں میں ان جاگیرداروں کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہوتی تھی کہ وہ اپنی جاگیروں اور آس پاس کے علاقوں سے گزرنے والی سڑکوں کی مرمت، دیکھ بھال اور حفاظت کا انتظام بھی کریں گے۔ ان سے عشر کے علاوہ عام طور پر کوئی دوسرا ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا۔

شمالی افریقہ، مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ کے علاقوں پر پھیلی ہوئی وسیع عثمانی سلطنت کے علاقوں پر اگر ہم نظر دوڑائیں تو پائیں گے کہ ان میں بہت بڑا زرخیز علاقہ شامل تھا اور ان کی پیداوار سلطنت کی غذائی ضروریات سے زیادہ تھی۔ حالانکہ فتوحات کے ذریعہ جو علاقے عثمانی حکومت کے زیر قبضہ آتے تھے ان میں زیادہ تر زمینیں ان کے اصل مالکوں کے پاس ہی چھوڑ دی جاتی تھیں اور بدلے میں ان سے خراج لیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ بہت زیادہ زمینیں وہ بھی ہوتی تھیں جو امراء اور حکام سے حاصل ہوتی تھیں۔ ان کا مالک عثمانی سلطان ہوتا تھا جو ان میں سے کچھ علاقے فوجی خدمات کے بدلے میں بطور جاگیر لوگوں کو عطا کردیتا تھا، اس کے بعد بھی جو علاقے رہ جاتے تھے وہ سلطان کی ملکیت ہوتے تھے۔ انہیں عام طور پر بٹائی (مشارکت) پر دے دیا جاتا تھا اس سے بھی سلطان اور حکومت کو کافی آمدنی ہوتی تھی — یہ بات ہمیں یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ عثمانی سلطنت کی آمدنی دو حصوں میں تقسیم تھی۔ ایک حصہ سلطان کی ذاتی ملکیت ہوتا تھا اور اس کے اہل خاندان کے زیر تصرف رہتا تھا جب کہ بڑا حصہ حکومت کا ہوتا تھا اور وہ حکومت

کے ملازموں اور رفاہی و دیگر کاموں پر خرچ ہوتا تھا— ہم نے ینی چری کے باب میں یہ پڑھا ہے کہ ینی چری فوجیوں کی ایک تعداد کو انتخاب کے بعد تربیت کے لیے دیہی علاقوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ جہاں وہ فوجی تربیت کے ساتھ کھیتی باڑی کے کام بھی کرتے تھے۔ تربیت کے دوران مستقبل کے فوجی نوجوانوں کی زراعتی کاموں میں مشغولیت انہیں سلطانی زمینوں پر ہوتی تھی۔

سلطنت کی زیادہ تر زمینیں چھوٹے کسانوں کے زیر تصرف تھیں اس میں سلطنت کی مسلمان اور غیر مسلم دونوں طرح کی رعایا شامل تھی۔ کسان ترک ہوں یا عیسائی دونوں بہت زیادہ محنتی ہوتے تھے۔ یہ لوگ کھیتی کی پیداوار بڑھانے کے لیے ان تھک کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ گلہ بانی اور مویشی پروری کا کام بھی کرتے تھے جس سے نہ صرف یہ کہ ان کی آمدنی میں اضافہ ہوتا تھا بلکہ اکثر یہ کافی خوش حال بھی ہوا کرتے تھے۔ عثمانی سلطنت ان کسانوں میں سے مسلمان کسانوں سے عشر اور نصف عشر کے علاوہ بہت معمولی ٹیکس لیا کرتی تھی اور غیر مسلم جو عام طور پر عیسائی کسان ہوا کرتے تھے ان سے خراج کی شکل میں ایک معمولی رقم لی جاتی تھی جو عام طور پر مسلمانوں سے لیے جانے والے عشر اور ٹیکس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ سلطنت کا بیشتر مالیہ (آمدنی) ٹیکس کے اسی نظام کے ذریعہ فراہم ہوتا تھا اور عام طور پر دور عروج میں یہ حکومت کی انتظامی اور رفاہی کاموں سے متعلق ضروریات کے لیے کافی ہوتا تھا سلطنت عثمانیہ کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ حرمین کے باشندوں سے کوئی ٹیکس وغیرہ نہیں لیتی تھی بلکہ اس کے برعکس مصر کے صوبے سے اسے جو آمدنی ہوتی تھی اس کا بڑا حصہ وہ حرمین اور وہاں کے باشندوں کی ضروریات کے لیے وقف رکھتی تھی۔

سلطنت عثمانیہ کی معیشت کا ایک اہم عنصر صنعت بھی تھی، دور عروج میں اس حکومت کی سب سے بڑی صنعت شاید فوجی ساز و سامان کی مصنوعات سے متعلق تھی۔ چوں کہ عثمانی حکومت ایک فوجی حکومت تھی اور دور عروج میں اس نے بڑی بڑی فوجی مہمات سر کی تھیں۔ نیز سلطنت کے وسیع علاقوں کو قابو میں رکھنے کے لیے بھی بہت بڑی فوج کی ضرورت تھی اس لیے یہاں پر فوجی ساز و سامان کی صنعت کو بہت زیادہ فروغ ملا اور یہاں کی فوجی استعمال کے لیے تیار کی جانے والی مصنوعات نہ صرف مملکت کے اندران کی مانگ ہوتی تھی بلکہ بیرون سلطنت بھی ان کی سپلائی (فراہمی) ہوتی تھی۔ سلطنت کے بعض علاقوں خاص طور پر بلقان کے علاقے میں مویشی پروری، وہاں کی اون اور کھال کی صنعت سے وابستہ تھی۔ اس علاقے میں اون اور چمڑے سے بنے ہوئے ملبوسات اور دیگر مصنوعات بڑے پیمانے پر تیار ہوتی تھیں۔ البتہ یہ کہا جائے گا کہ صنعت کی ترقی کے معاملے میں عثمانی حکومت کی دلچسپی کچھ زیادہ نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ یورپ میں صنعتی انقلاب آجانے کے بعد یورپی ممالک تو ترقی کے راستے پر کافی آگے نکل گئے اور عثمانی حکومت اپنی روایتی صنعتوں میں ہی الجھی رہ گئی اور نتیجے میں بہت پیچھے رہ گئی۔ اور یہ بھی اس کے زوال کا ایک سبب قرار پایا۔

استنبول یا قسطنطنیہ کی فتح کے بعد عثمانی سلطنت نہ صرف یہ کہ دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت بن گئی بلکہ اس کے ساتھ ہی عالمی تجارت کی شہ رگ بھی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ استنبول کا شہر مشرق اور مغرب کے درمیان ہونے والی تجارت کی سب سے بڑی اور اہم گزرگاہ تھا۔ نہ صرف یہ کہ دنیا کی بحری تجارت کے بیشتر سامان اس کے ساحلوں سے ہو کر گزرتے تھے بلکہ زمینی تجارت کے بھی اکثر کارواں اور قافلے استنبول سے ہو کر گزرتے تھے۔ استنبول کی اس اہمیت اور عثمانی تجارت کی اس ترقی کا راز یہ تھا کہ سمندر میں تجارتی جہازوں کی حفاظت کے لیے اس کا مضبوط بحری بیڑہ موجود رہتا تھا جس کے سبب بحری قزاق ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے تو دوسری طرف زمینی تجارت کے راستے پر پوری عثمانی سلطنت میں کارواں سرایوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ یہ

کارواں سرائیں مسافروں اور تاجروں کے ٹھہرنے اور آرام کا انتظام ہی نہیں کرتی تھیں بلکہ ان کی حفاظت اور راستوں کے امن و مان کی بھی ذمہ دار تھیں۔ پوری عثمانی سلطنت میں جس طرح کا امن قائم تھا اس کے سبب زمینی تجارت کو بڑے پیمانے پر فروغ حاصل ہوا۔ سلطنت کے اندر اور باہر جو تجارت ہوتی تھی اس میں ریشم، چائے، مسالہ جات، چمڑا، اونی ملبوسات، اناج، دالیں، خوشبو، شیشے کی مصنوعات، دوائیں وغیرہ اشیاء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حکومت عثمانی تجارتی سرگرمیوں کی صرف سرپرستی ہی نہیں کرتی تھی بلکہ اس نے تجارتی سامانوں کی درآمد اور برآمد سے متعلق اصول اور ضابطے بھی بنا رکھے تھے اور اس میں تاجروں کے مفادات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا۔ اندرون سلطنت بیرونی تاجروں کو تجارت کے لیے لائسنس فراہم کیا جاتا تھا۔ قیمتوں کی نگرانی کے لیے سلطنت کے قاضی وقتاً فوقتاً بازاروں کا معاینہ بھی کرتے رہتے تھے تاکہ دھوکہ دہی کو روکا جاسکے۔ اسی طرح اشیاء پر منافع کو دس فی صد تک محدود رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ دوسرے ملکوں کے تاجروں کو سلطنت کے اندر تجارت کرنے کے لیے نہ صرف یہ کہ تجارتی لائسنس اور اجازت نامے جاری کیے جاتے تھے بلکہ انہیں ہر طرح کا تحفظ بھی فراہم کیا جاتا تھا۔ ان کی الگ مخصوص آبادیاں قائم کی جاتی تھیں اور ان کے مذہبی معتقدات کا بھی خیال بھی رکھا جاتا تھا اور اگر ان کے درمیان باہمی کوئی تنازع ہو جاتا تو ان کے مذہبی قانون کے تحت ان کے مذہبی رہنماؤں کے ذریعہ ہی ان کا تصفیہ ہوتا تھا۔ تجارتی سرگرمیوں میں عثمانی حکام کی دلچسپی اور ان کے ذریعہ ان سرگرمیوں کی سرپرستی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب پندرہویں صدی کے آخر میں (1492ء) یہودیوں کو اسپین سے نکال دیا گیا تو انہیں پورے تحفظ کے ساتھ عثمانی سلطنت میں پناہ دی گئی یہاں تک کہ بہت جلد وہ عثمانی تجارت کے ایک بہت بڑے حصے پر چھا گئے۔ عثمانی حکمرانوں نے تجارت کے فروغ کے لیے دوسرے ملکوں کے ساتھ اشتراک اور معاہدے کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ سب سے پہلے فرانس کو سلطنت کے اندر تجارت کرنے کے لیے 1534ء میں تجارتی حقوق عطا کیے گئے۔ بعد ازاں اسی طرح کے تجارتی حقوق 1567ء میں برطانیہ کو بھی دیے گئے۔ لیکن ایک طرف عہد زوال میں سلطنت کے علاقوں پر حکومت کا کنٹرول کم ہوا۔ نتیجے میں راستے غیر محفوظ ہوئے اور تجارتی سرگرمیاں سرد پڑنے لگیں تو دوسری طرف تجارت کی سرپرستی جیسی پہلے کے حکمراں کرتے رہے تھے وہ سلسلہ جاری نہیں رہ سکا۔ اسی دوران حالات بدلے، بھاپ کی طاقت کی دریافت نے اہل یورپ کی تقدیر ہی نہیں ان کی مہم جوئی کی نئی تاریخ بھی رقم کی۔ دخانی جہازوں کے ذریعہ انہوں نے بحری تجارتی اسفار کو ہی نہیں آسان بنایا بلکہ تجارت کے نئے بحری راستے بھی دریافت کر لیے جس کے نتیجے میں استنبول کی سابقہ حیثیت ماند پڑنے لگی اور دھیرے دھیرے اس کی تجارتی اہمیت تقریباً ختم ہوگئی۔

معلومات کی جانچ

1. عثمانی سلطنت میں جاگیری فوج کسے کہا جاتا تھا؟

2. تجارتی راستوں کے لحاظ سے شہر استنبول کی کیا اہمیت تھی؟

3. عثمانی حکمرانوں نے تجارت کے فروغ کے لئے کن ملکوں سے معاہدہ کئے؟

22.8 خلاصہ

خلاصہ یہ کہ عثمانی عہد کا سماج ایک سادہ ترک سماج تھا۔ ابتدائی زمانے میں حکمرانوں اور عام رعایا کے طرز زندگی میں بہت زیادہ فرق نہیں تھا۔ اس کے حکمراں بھی دیہاتی قبائلی سرداروں جیسی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ جیسے جیسے ان کی سلطنت میں توسیع ہوتی گئی عثمانی سماج بھی پھیلتا چلا گیا نئے مقبوضات خاص طور پر بازنطینی سلطنت کے ایشیائی اور یورپی علاقوں میں عثمانی سلطنت کی توسیع نے ان علاقوں کے رہن سہن اور طور طریقوں کو بھی اپنی سماجی زندگی کا حصہ بنالیا۔ سماج میں حکمراں طبقے میں بھی خواتین کو وہ تمام آزادیاں حاصل تھیں جو کسی بھی قبائلی سماج کا خاصہ ہوتی ہیں یعنی وہ آزادی کے ساتھ سڑکوں پر نکلتی تھیں، بازاروں میں خرید و فروخت کرتی تھیں لیکن قسطنطنیہ کی فتح کے بعد معاملہ ایسا نہیں رہا اب عورتوں کے لیے سخت پردے کا اہتمام ہونے لگا، ان کے لیے علاحدہ مکان بنائے جانے لگے، خواجہ سرا کی روایت عام ہوئی اور تعدد ازدواج کی مثالیں بھی ملنے لگیں۔ لیکن تمدنی اثرات کی قبولیت کے باوجود عثمان ترک سماج میں سادگی برقرار رہی اور اسلامی تعلیمات کے زیر اثر عثمانی سماج اپنے عروج کی انتہائی بلندیوں پر بھی ان تمدنی برائیوں سے محفوظ رہا جو اکثر اس طرح کے سماجوں میں عام ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح عثمانی دور میں لوگوں کی معیشت کا زیادہ انحصار زراعت پر تھا۔ محنتی ترک کسانوں کے سبب سلطنت میں خوشحالی عام تھی۔ صنعت میں شروع کے دنوں میں فوجی استعمال کی چیزوں کے علاوہ اون سے بنے ہوئے کپڑے، چمڑے کی مصنوعات وغیرہ کو اہمیت حاصل تھی۔ تجارت کے معاملے میں عثمانی تاجر مشرق و مغرب کی تجارت پر چھائے ہوئے تھے۔ تمام بحری اور بری راستے دار الخلافہ استنبول سے ہو کر گزرتے تھے۔ اس لیے سلطنت میں تجارتی سرگرمیاں زوال سے پہلے تک عروج پر تھیں۔

22.9 نمونے کے امتحانی سوالات

1. عثمانی معاشرت کے ارتقاء پر ایک مضمون لکھیے۔
2. عثمانیوں کے سماجی حالات سے بحث کیجیے۔
3. عثمانی سماج میں عورتوں کے حالات پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
4. عثمانی حکومت کے معاشی حالات کا تفصیلی ذکر کیجیے۔

22.10 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد دوم) — ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی
2. آل عثمان — مولانا اسلم جیراج پوری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی
3. دولت عثمانیہ (جلد اول، دوم) — ڈاکٹر محمد عزیز، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
4. تاریخ ملت (جلد سوم) — مفتی زین العابدین سجاد میرٹھی و مفتی انتظام اللہ شہابی، ادارہ اسلامیات، کراچی، پاکستان
5. مسلمانوں کا عروج اور زوال — مولانا سعید احمد ایم اے۔ فینس بکس، لاہور
6. اردو دائرہ معارف اسلامیہ، (متعلقہ مضامین) — دانش گاہ پنجاب، لاہور
7. ترکی میں مشرق و مغرب کی کش مکش — خالدہ ادیب خانم (اردو ترجمہ، ڈاکٹر عابد حسین)

اکائی 23 : عثمانی تہذیب وتمدن

اکائی کے اجزاء

23.1 مقصد

عثمانیوں کی حکومت چھ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ قائم رہی۔ اس دوران عثمانی سلطنت میں جو تہذیب وتمدن پروان چڑھا، ذیل کی اکائی میں اختصار کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔ اس اکائی کو پڑھ کر طلبہ یہ جان سکیں گے کہ عثمانی تمدن کس طرح فروغ پایا؟ اس کی خصوصیات کیا تھیں؟ اس دور میں علم وادب کی صورت حال کیا تھی؟ مختلف علوم وفنون میں کس طرح کی ترقی ہوئی؟ اور کون سے ماہرین علوم وفنون اس دوران گزرے ہیں؟ اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ اس کے اہل ہوسکیں گے کہ وہ عثمانی دور کے علوم وادب، تمدن وثقافت اور تعمیرات وغیرہ کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرسکیں۔

23.2 تمہید

ہمیں معلوم ہے کہ عثمانی حکومت بنیادی طور پر ایک فوجی حکومت تھی۔ جب تک اس کی فوجی بالادستی قائم اور برقرار رہی عروج کی جانب اس کا سفر بھی جاری رہا۔ عثمانیوں کی حکومت ایشیائے کوچک کے علاوہ یورپ کے بھی ایک بڑے علاقے پر قائم تھی۔ اُس کے ایشیائی اور یورپی مقبوضات میں وہ علاقے بھی شامل تھے جو کسی زمانے میں بازنطینی سلطنت کا حصہ رہ چکے تھے جہاں بازنطینی تہذیب و تمدن کا چرچا تھا۔ عثمانیوں کی حکومت کے قیام کے بعد جب یہ علاقے مسلمانوں کے زیرنگیں آئے، تو اسلامی تہذیب جو اس وقت تک ایک اہم تہذیب کی شکل اختیار کر چکی تھی اور جس کے حامل عثمانی ترک تھے، اس کا ملاپ بازنطینی تہذیب سے ہوا۔ اور ان دونوں تہذیبوں کے ماننے والوں کے میل جول سے ایک ایسے تمدن اور تہذیبی روایت نے جنم لیا جو بنیادی طور پر اسلامی ہوتے ہوئے بھی بازنطینی تہذیب کے بہترین عناصر کو بھی شامل تھی اور جسے عثمانی اسلامی تہذیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ عثمانیوں کے زیرسایہ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے ایک بہت بڑے علاقے میں پروان چڑھی اور یہیں اسے فروغ بھی حاصل ہوا۔ ذیل کی اکائی میں عثمانی تہذیب وتمدن کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے بعض اہم عناصر کا تعارف کرانے کی کوشش کی جائے گی۔

23.3 عثمانی تہذیب وتمدن کا ارتقاء

دنیا میں کوئی بھی تہذیب وتمدن اچانک وجود میں نہیں آتا۔ کسی بھی تہذیب وتمدن کی تشکیل کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے اور اس دوران مختلف تہذیبی وتمدنی عناصر کے میل جول سے ایک نئی تہذیب تشکیل پاتی ہے، اور ایک نیا تمدن جنم لیتا ہے۔ عثمانی تہذیب وتمدن کا تشکیلی اور ارتقائی سفر بھی صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ تشکیل کے اس ارتقائی مرحلے میں اس نے مفتوحہ علاقوں اور وہاں کے باشندوں کے تہذیب وتمدن کو نہ صرف اثر انداز کیا ہے بلکہ ان سے اخذ واستفادہ اور ان میں بعض جزوی تبدیلیوں کے ذریعہ ایک نئے تہذیب وتمدن کے فروغ کا سبب بھی بنا ہے، جو اپنے حکمراں خاندان کے نام کی نسبت سے عثمانی تہذیب وتمدن کے نام سے موسوم ہے۔ گزشتہ اکائیوں کے مطالعے سے ہمیں یہ بات بخوبی معلوم ہو چکی ہے کہ عثمانی ترک بنیادی طور پر وسطی ایشیا کے رہنے والے تھے، جنھیں حالات اور زمانے کے الٹ پھیر نے ایشیائے کوچک پہنچا دیا۔ یہاں پر وہ اپنے اولوالعزم سرداروں اور حکمرانوں کی قیادت میں سلاجقہ روم کے جانشین ہوئے جن کی حکومت تو ایشیائے کوچک پر تھی، لیکن وہ بھی بنیادی طور پر ترک تھے اور ان کے پورے دور میں ہمیں ہر طرف ایرانی تہذیب وثقافت چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ صرف فارسی زبان کے ہی نہیں فارسی و ایرانی تہذیب وثقافت کے بھی امین تھے۔ ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کا جانشین ہونے کے ناطے اور پھر دیگر مسلم علاقوں میں مملکت کی توسیع کے نتیجے میں مختلف مسلم معاشروں کی لسانی وثقافتی روایات کے اثرات انھوں نے قبول کیے۔ خاص طور پر عربی وفارسی زبانوں اور ثقافتوں کے اثرات۔

ایشیائے کوچک میں بازنطینی سرحد پر واقع اپنی چھوٹی سی جاگیر کو وسعت دینے کا کام جب امیر عثمان خان اور اس کے جانشینوں نے شروع کیا تو اس کی توسیع دو جانب تھی۔ ایک طرف تو یہ سلاجقہ روم کے زوال کی وجہ سے ایشیائے کوچک میں وجود میں آجانے والی چھوٹی چھوٹی ترک و دیگر ریاستوں کی جانب تھی۔ اور دوسری طرف اناطولیا (ایشیائے کوچک) کے ان علاقوں کی طرف

بھی تھی جو ابھی تک بازنطینی ریاست کا حصہ تھے۔ بعد میں توسیع کا یہ عمل مسلم علاقوں میں افریقہ تک اور بازنطینی علاقوں میں یورپ تک پھیل گیا۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے عثمانی ایک اسلامی تہذیب وتمدن —— جو مجموعہ تھی عربی، فارسی اور ترکی زبان وثقافت کا —— کے حامل پہلے سے تھے۔ بازنطینی (رومی) علاقوں خاص طور پر یونان اور بلقان کی فتوحات نے اس میں یونانی تہذیب وثقافت کے اچھے اثرات بھی شامل کر دیے، یہاں تک کہ عثمانی چھ سو سال تک صرف سیاست وحکمرانی کے میدان میں ہی قائدانہ رول کے حامل نہیں رہے بلکہ تہذیب وتمدن کے میدان میں بھی دنیا کی رہنمائی کی۔ اس وقت کی پوری دنیا نے ان کی طاقت کا لوہا ماننے کے ساتھ ساتھ ان کے تہذیبی وتمدنی اثرات بھی قبول کیے۔

اس کی شہر اور سغوت جیسے چھوٹے مواضعات میں قائم ہونے والی عثمانی حکومت کا پایہ تخت بہت جلد بروصہ منتقل ہو گیا اور پھر ادرنہ (ایڈریانوپل) ہوتے ہوئے قسطنطنیہ (استنبول) ہمیشہ کے لیے عثمانیوں کا دارالحکومت بنا۔ بروصہ میں پہلے عثمانی حکمراں عثمان خاں کے مزار سے لے کر استنبول میں جامع سلیمانیہ تک عمارتوں اور تہذیب وثقافت کا ایک سلسلہ ہے جس کے ہر راستے پر عثمانی تہذیب وتمدن کے نقوش بکھرے پڑے ہیں۔ فن تعمیر ہو، خطاطی کی عظیم روایت ہو، شعر وادب ہو، علوم وفنون کی دیگر شاخیں ہوں یا فنون لطیفہ کی نقاشی وغیرہ جیسی اقسام ہر جگہ عثمانیوں نے اپنی الگ چھاپ ہی نہیں چھوڑی بلکہ اپنے زمانے میں تہذیب وتمدن کے ان استعاروں کو عروج تک پہنچانے کا کام بھی کیا۔ عثمانیوں کا دارالحکومت استنبول اپنے دور عروج میں حقیقی معنی میں اسلامی دنیا کے دل کی حیثیت رکھتا تھا۔ یورپ اور ایشیا کے تمام تجارتی راستے (بحری ہوں یا زمینی) استنبول سے ہو کر گزرتے تھے۔ تجارت کے ساتھ ساتھ تمام خطوں کی تہذیب وثقافت بھی استنبول پہنچتی تھی، جس میں سے کہ ''ترک دانا'' اچھی خصوصیات کو لے کر اسلامی عثمانی ثقافت کو آگے بڑھاتا رہا۔ خوبی قسمت سے عثمانیوں کے زیر تسلط جو مرکزی علاقے تھے انہیں بھی فیاض ازل کی جناب سے بے پناہ قدرتی حسن حاصل ہوا تھا۔ جس میں انسانی فنی مہارتوں نے ایسے چار چاند لگائے کہ وہ قدرتی اور انسانی کاریگری کا ملا جلا لازوال شاہ کار بن گئے۔ سلطنت میں ہر طرف مدرسے، شفا خانے، مسجدیں، سرائیں اور محل کثرت سے تعمیر ہوئے۔ یہ صرف فن تعمیر کے نمونے نہیں تھے بلکہ عثمانی دور کے زرخیز انسانی ذہن ودماغ کے مجسم پیکر بھی تھے، جن سے ان کی عالی دماغی، جدت طرازی، بلند خیالی، روشن فکری اور مختلف علوم وفنون میں مہارتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

عثمانی معاشرت اور رہن سہن کا ذکر ہم اس سے پہلے اکائی 3 میں سماجی حالات کے تحت کر چکے ہیں۔ عثمانیوں کی معاشرت سادگی و پرکاری کا بہترین نمونہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح فن تعمیر میں انہوں نے ایسے اضافے کیے اور معماری کے وہ شاہ کار دنیا کو دیے کہ آج بھی دنیا ان پر عش عش کرتی ہے۔ اسلام مصوری کے فن کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا، مسلمانوں کے اس جذبہ جمال نے خطاطی کو ایک مستقل فن بنا دیا۔ عثمانی دور میں فن خطاطی کے ایسے شاہ کار وجود میں آئے جن کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ شاعری اور ادب کی ترقی اور فروغ کے اعتبار سے بھی عثمانی دور اہمیت کا حامل ہے۔ علوم حکومت خاص طور پر علم جغرافیہ میں عثمانی ماہرین کی دین کی دنیا آج بھی قائل ہے۔ اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وسطی ایشیا کی ترک سادگی، ایران کی گل کاری، عربوں کے وقار کے آمیزے کو اسلامی تعلیمات کی چھلنی سے چھان لینے کے بعد جو مرکب تیار ہوا اسے دنیا نے عثمانی تہذیب وتمدن کا نام دیا۔

23.4 عثمانی تہذیب وتمدن کے مظاہر کا تعارف

عثمانی تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے بیان کے بعد اس عنوان کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ اس دور کے تہذیبی وتمدنی مظاہر، مثلاً علم وادب، فن تعمیر، فنون لطیفہ وغیرہ کے حوالے سے ایک ایک کر کے گفتگو کی جائے اور تمدن کے مختلف میدانوں میں عثمانی دور میں جو ترقیات ہوئیں ان کا الگ الگ اور ضروری تعارف دیا جائے۔ رہن سہن (جو تمدن کا ایک اہم عنوان ہے) کے حوالے سے پہلے یہ بات آچکی ہے کہ اس کا قدرے تفصیلی ذکر پچھلی اکائی میں سماجی حالات کے تحت ہو چکا ہے اس لیے اس سے کسی قدر اعراض کرتے ہوئے یہاں ہم تمدن کے دیگر مظاہر کا تعارف پیش کرتے ہیں:

23.4.1 عثمانی فن تعمیر

کسی بھی تہذیب وتمدن کا سب سے نمایاں اظہار اس کے فن تعمیر میں ہوتا ہے کیوں کہ پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک عظیم استاد، مورخ اور محقق) کے الفاظ میں عمارتوں کی بھی زبان ہوتی ہے اور ہر عمارت اپنی پرشکوہ خاموشی کے باوجود آپ سے کچھ کہتی ہے۔ وہ اپنے بنانے والے (یا والوں) کے ذہن ودماغ کی ہی عکاسی نہیں کرتی بلکہ اپنے دور اور گردوپیش کے حالات و واقعات کی بھی راوی ہوتی ہے، شرط صرف یہ ہے کہ اسے سننے کے لیے آپ کے پاس کان ہوں اور لکھنے اور بیان کرنے کے لیے الفاظ وزبان۔ عثمانی دور کی عمارتوں میں بھی ہمیں یہ سب کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ لیکن اس تفصیل میں جانے سے پہلے ہمارے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ جسے ہم عثمانی فن تعمیر کہتے ہیں وہ ہے کیا؟

سادہ اور صاف لفظوں میں اگر بیان کیا جائے تو عثمانی فن تعمیر، تعمیرات کے اس فن کو کہیں گے جس کا آغاز سلطنت کے پہلے حکمراں امیر عثمان خاں کے ذریعہ اس کے ابتدائی عہد حکومت میں اس کی شہر میں تعمیر کی جانے والی ایک مسجد سے ہوتا ہے۔ 'سلطنت عثمانیہ میں تعمیر کی جانے والی یہ پہلی مسجد تھی' اور جو آیندہ چھ سو سال سے زیادہ عرصے تک فروغ پذیر رہتے ہوئے 1924ء میں عثمانی خلافت کے خاتمے تک جاری رہا۔ اس فن تعمیر کے ابتدائی مظاہر ہمیں چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں بروصہ اور ادرنہ جیسے عثمانی سلطنت کے مرکزی شہروں میں مسجدوں، مقبروں، شفاخانوں، سرایوں اور محلوں وغیرہ کی شکل میں کثرت سے دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔ عثمانیوں کے ابتدائی فن تعمیر کا اگر ذکر کیا جائے تو اپنے آغاز میں یہ اپنے پیش رو سلجوقی فن تعمیر کا عکس نظر آتا ہے، جو بہت جلد سلطنت کے بازنطینی فتوحات کی وجہ سے بازنطینی فن تعمیر سے متاثر ہونے لگا۔ لیکن یہی نہیں اس نے ایرانی اور مملوک فن تعمیر سے بھی کافی کچھ استفادہ کیا۔

عثمانی فن تعمیر کو ماہرین نے یوں تو متعدد ادوار میں تقسیم کیا ہے لیکن طلبہ کی آسانی کے لیے یہاں ہم اسے دو بنیادی ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ 1. ایک فتح قسطنطنیہ سے پہلے کا دور جسے ہم بروصہ اور ادرنہ کا تعمیری دور بھی کہہ سکتے ہیں۔ 2. اور دوسرا فتح قسطنطنیہ کے بعد کا دور جو دور جدید پر آکر ختم ہوتا ہے۔

عثمانی فن تعمیر کا پہلا دور

ہمیں معلوم ہے کہ عثمانیوں کا تعلق اوغوز نام کے ترک قبیلے سے تھا۔ دیگر ترک قبائل کی طرح اس قبیلے کے لوگ بھی گلہ بانی

کرتے اور خیموں یا معمولی مکانوں میں رہتے تھے۔ عمارتیں تعمیر کرنے کا انہیں کچھ تجربہ نہیں تھا۔ لہذا جب ایشیائے کوچک میں عثمانیوں کی حکومت قائم ہوئی تو انہوں نے تعمیرات کے سلسلے میں اپنے پیش رو سلجوقوں کی نقل کی جو ایرانی فن تعمیر سے متاثر تھا اور جس نے بازنطینی اثرات بھی قبول کیے تھے۔ چنانچہ عثمانی دور کی ابتدائی تعمیرات میں، جو مسجدوں اور مدرسوں کی شکل میں زیادہ تر مذہبی عمارتیں ہوتی تھیں، ہمیں قبہ دار عمارتوں کے نقوش ملتے ہیں۔ یہ طرز تعمیر بنیادی طور پر بازنطینی کلیساؤں سے مستعار تھا، جسے عثمانیوں نے وسعت دے کر اور جس میں اہم اضافے کر کے فن تعمیر کے ایک نئے نمونے کی روایت ڈالی۔ اس دور کی عثمانی عمارتوں میں خاص طور پر مسجدوں میں ہمیں پانچ گنبدوں والی مساجد ملتی ہیں عثمانی فن تعمیر میں ہمیں مساجد اور دیگر عمارتوں کے سامنے مسقف (چھت دار) ڈیوڑھیوں کا خوبصورت اضافہ بھی ملتا ہے جن کے ستونوں کے درمیان محرابیں بنائی جاتی تھیں تا کہ ان کی خوبصورتی میں اضافہ ہو۔ عثمانی دور کی عمارتوں میں محرابی ستونوں پر قائم ڈیوڑھیوں کا رواج مسجدوں، مدرسوں، مقبروں وغیرہ میں ہر جگہ ملتا ہے۔ عثمانی فن تعمیر کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس کے تحت مسجدوں کے کردار کو زیادہ عوامی بنانے کی کوشش کی گئی۔ بلا شبہ عثمانی دور کی بعض مساجد خالص سلطانی ضرورتوں کے تحت تعمیر کی گئی تھیں۔ لیکن عام مسجدوں کو عوام سے اس طرح جوڑا گیا کہ ان کے ساتھ مذہبی تعلیم کے مدارس، شفا خانے، عوامی حمام وغیرہ بھی تعمیر کیے جاتے تھے۔

عثمانی فن تعمیر کا دوسرا دور

عثمانی فن تعمیر کا دوسرا دور سلطان محمد ثانی، جسے محمد فاتح کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، کے ذریعہ فتح قسطنطنیہ کے بعد شروع ہوتا ہے۔ استنبول یا قسطنطنیہ کا ذکر ہو اور ''ایا صوفیہ'' کا نام نہ آئے ناممکن ہے، یہ ایک گرجا گھر تھا، جسے قسطنطین اعظم نے 537ء میں تعمیر کرایا تھا۔ محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد اسے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ اس میں اس نے چار نوک دار میناروں کا اضافہ کیا، جس سے اس کا حسن دوبالا ہو گیا۔ اس کے بعد ہی نوک دار مینار عثمانی فن تعمیر کی ایک نمایاں خصوصیت بن گئے۔ خلافت کے خاتمے کے بعد مصطفی کمال پاشا نے مسجد کے بجائے اسے عجائب گھر میں تبدیل کر دیا۔ ترکی کی موجودہ حکومت ایک بار پھر اس کی مسجد کی حیثیت بحال کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ محمد فاتح نے استنبول میں مدرسے اور شفا خانے بھی تعمیر کرائے، اسی طرح اس نے شہر میں دو بڑی مسجدیں ایک جامع فاتح (جو اس کے نام سے منسوب ہے) اور دوسری جامع ایوب (جو میزبان رسول حضرت ابوایوب انصاریؓ کی یاد میں ان کی قبر کے ساتھ تعمیر کی گئی ہے جو حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں قسطنطنیہ کے محاصرے کے دوران انتقال کر گئے تھے) بھی تعمیر کروائیں۔

فتح قسطنطنیہ کے بعد عثمانی سلطنت کی وسعت بہت زیادہ بڑھ گئی اور تین براعظموں میں قائم اس حکومت نے ایک طرح کی آفاقیت حاصل کر لی۔ سلطنت کی وسعت اور آفاقیت کے اثرات اب اس دور میں تعمیر ہونے والی عثمانی عمارتوں میں بھی نظر آنے لگے۔ مسجدوں کے حوالے سے اگر بات کریں تو فتح قسطنطنیہ کے فوراً بعد تعمیر ہونے والی مساجد میں تو پرانا ہی رنگ غالب ہے لیکن بعد کے زمانے میں جو مساجد تعمیر ہوئیں، ان میں وسعت اور آفاقیت کے تصوّر کو اس طور پر دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اب ایسی مساجد تعمیر ہونے لگیں کہ عمارت ایک گنبد کی ہو، اس میں زیادہ سے زیادہ وسعت ہو، درمیانی اور خاص مرکزی حصہ اس طرح تعمیر کیا گیا ہو کہ ہر نمازی محراب قبلہ (جہاں امام نماز پڑھاتا ہے) اور منبر (جہاں سے امام خطبہ دیتا ہے) کو دیکھ سکے۔ اس دور میں عثمانی

حکومت کو عظیم معمار (Architect) خواجہ سنان کی خدمات حاصل ہوئیں، جو عثمانی یا مسلم دور کے ہی نہیں بلکہ دنیا کے عظیم ترین معماروں میں شمار ہوتا ہے۔ (سنان کا ذکر آگے تفصیل سے آئے گا) اس کی بنائی ہوئی عمارتوں میں شہزادہ جامع عثمانی فن تعمیر کے دوسرے دور کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ گو خود سنان نے اس مسجد کو اپنا ابتدائی کام بتایا ہے۔ لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک مرکزی گنبد کے علاوہ آس پاس چار نیم گنبد تھے۔ اس میں وسعت و آفاقیت کی وہ کیفیت تو نہیں پائی جاتی جو بعد کے عثمانی دور کا خاصہ بنی البتہ اس جانب (یعنی مکانی وحدت جس میں ہر نمازی کو محراب و منبر دکھائی دیں) پہلا قدم ضرور تھا۔ اس طرز تعمیر کا شاہکار خواجہ سنان کی تعمیر کردہ ادرنہ کی جامع سلیمیہ کو قرار دیا جا سکتا ہے، جو سلطان سلیم ثانی سے منسوب ہے۔ اور 1566ء سے لے کر 1574ء تک آٹھ برس کے عرصے میں مکمل ہوئی۔ یہ ایک عظیم الشان مسجد ہے۔ جس کا مرکزی گنبد ساڑھے اکتیس (31) میٹر عریض (چوڑا) ہے اور آٹھ بلند ستونوں پر قائم ہے۔ مسجد کی عمارت کا بیرونی حصہ ہشت پہلو ہے اور اس سے متصل چار بلند و بالا اور مرعوب کن چھریرے مینار کھڑے ہیں، بلندی پر واقع یہ مسجد پورے شہر پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے اور دور سے ہی نظر آتی ہے۔

گزشتہ سطور میں نوک دار بلند میناروں کو عثمانی فن تعمیر کی نمایاں خصوصیت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عثمانی ترکی مینار استوانہ نما (بلند نوک دار) ہوتا ہے۔ اور یہ سات حصّوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ دائرہ معارف اسلامیہ میں عثمانی فن تعمیر سے متعلق مضمون کے مصنف نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''کرسی (ترکی: کورسو) مینار کے پائے کا کام دیتی تھی اور یہ زیادہ تر مکعب کی ساخت کی ہوتی تھی۔ پائے سے عمود تک کے ٹکڑے کو پابوس کہتے تھے، جس کی شکل سنگ و خشت کی تعمیر کو ڈھلواں کرنے سے نمایاں ہوتی تھی۔ عمود (گردہ) کی چنائی سلجوقیوں کے زمانے میں زیادہ تر اینٹوں سے کی جاتی تھی۔ لیکن عثمانیوں کے دور میں پتھر استعمال کیا جانے لگا، جو کٹاؤ اور کھنڈاؤ سے خوبصورت بنایا جاتا یا ابھرواں ڈنڈے اور پٹیاں بنا دی جاتیں اور بعض اوقات پتھر کے پلندے سے باندھ دیے جاتے۔ گردہ (عمود) کے اوپر شرفہ بنایا جاتا جو گویا مؤذن کا نشستہ نشین تھا۔ یہ مینار سے ایک چھریرے سے عمود پر چھجے کی طرح بڑھا ہوتا۔ نیچے مقرنات نہایت مزین اور خوبصورت طریق پر نصب کیے جاتے۔ شرفہ کو مساجد سلطانی میں بڑھا کر تگنا کر دیا جاتا اور اسی کو پتک (Petek) کہتے تھے۔ چوٹی کے علم کے اوپر ہلال نصب کر دیا جاتا۔'' (ص:758)

استنبول کو مسجدوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ محمد فاتح اور سلیمان اعظم کے بعد بھی اس شہر میں خوبصورت اور عظیم الشان مسجدیں تعمیر ہوئیں، ان میں جامع سلطان احمد اور ینی جامع اہم ہیں۔

جامع سلطان احمد کی خاص بات یہ ہے کہ اسے مشہور عثمانی معمار خواجہ سنان کے ایک شاگرد خواجہ محمد آغا نے بنایا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس مسجد میں چار کے بجائے چھ مینار بنائے گئے ہیں۔ پوری مسجد میں رنگ و روغن اور نقش و نگار کے لیے چونکہ نیلے رنگ کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے اس لیے عرف عام میں اس کی شہرت ''نیلی مسجد'' کے نام سے ہے۔

ینی جامع استنبول کی ایک اور خوبصورت مسجد ہے۔ اس مسجد کو سلطان مراد چہارم (1623ء تا 1640ء) کی والدہ نے تعمیر کرایا تھا۔ اس لیے اس نسبت سے اسے ''والدہ جامع'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس مسجد کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں

صرف دو مینار تعمیر کیے گئے ہیں۔ البتہ اس میں گنبد بڑی تعداد میں بنائے گئے ہیں۔ فن تعمیر کے اعتبار سے اس مسجد کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک نمازی خواہ مسجد کے بالکل آخری حصے میں ہی کھڑا ہو کر کیوں نہ نماز ادا کر رہا ہو، اس کو امام مسجد کی قرأت اسی طرح سنائی دے گی جس طرح کہ پہلی صف میں کھڑے ہونے والے نمازیوں کو سنائی دیتی ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب لاؤڈ اسپیکر نہیں تھا۔ فن تعمیر کی اس خوبی نے نمازیوں کو کتنی راحت پہنچائی ہو گی اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

عثمانی دور میں مسجدوں، مدرسوں اور شفا خانوں کے علاوہ دیگر عوامی ضروریات و تفریحات کی عمارتیں بھی تعمیر ہوئیں۔ ان میں مسقّف (چھت دار) بازار خاصے کی چیز ہیں۔ موجودہ دور میں شاپنگ مالوں اور ایک چھت کے نیچے ضرورت کی تمام چیزوں کی فراہمی کا تصوّر بہت کچھ انہیں مسقّف بازاروں سے مستعار معلوم ہوتا ہے۔ اس کی بہترین مثال استنبول کا بڑا بازار جو کپالی چارشی کے نام سے مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ اس بازار کی بنیاد فاتح قسطنطنیہ سلطان محمد فاتح نے رکھی تھی۔ البتہ اس کی تکمیل سلیمان اعظم کے زمانے میں ہوئی۔ اپنے زمانے میں یہ بازار شان و شوکت میں اپنی نظیر آپ تھا۔ کپالی چارشی پورے کا پورا مسقّف ہے یعنی چھت دار ہے اور اوپر سے کھلا ہوا نہیں ہے۔ اس بازار میں چھوٹی بڑی پانچ ہزار دوکانیں ہیں جن میں معمولی معمولی چیزوں سے لے کر انتہائی قیمتی اور نایاب چیزوں تک سب کی سب ایک جگہ مل جاتی ہیں۔ اپنی طرز کا یہ دنیا کا واحد اور سب سے بڑا بازار ہے اور اپنی دلکشی کی وجہ سے دنیا بھر میں شہرت رکھتا ہے۔

عثمانی ترکوں کے سماجی حالات کے تحت ہم پڑھ چکے ہیں کہ عثمانی سماج میں سیر و تفریح کا عام رواج تھا۔ چنانچہ عثمانی فن تعمیر کا ایک اور اظہار ہمیں ان فواروں کی شکل میں دکھائی دیتا ہے جو بازاروں اور دیگر تفریحی مقامات پر تعمیر کیے گئے۔ مسجدوں کے صحن میں بھی فوارے تعمیر کیے جاتے تھے جن کے ساتھ وضو کے لیے ٹونٹیوں کی قطار بنی ہوتی تھی۔ شکل و نوعیت کے اعتبار سے عثمانی دور کے ان فواروں کو مختلف نام دیے گئے ہیں۔ عام فوارے چشمہ کہلاتے تھے۔ یہ فوارے طاق نما ہوتے تھے جن سے پانی کی دھار اچھل کر چھوٹے سے حوض میں گرتی تھی۔ یہ فوارے صرف لوگوں کی تفریح اور نظر کی تسکین کے لیے نہیں ہوتے تھے بلکہ ان سے نکلنے والا صاف پانی لوگوں کے مکانوں کو مہیا کیا جاتا تھا۔ فواروں کی ایک شکل سبیل کہلاتی تھی۔ یہ ایک شہ نشین ہوتی تھی جس میں جالی دار کھڑکیاں لگی ہوتی تھیں، ان جالیوں میں سے لوگ اپنے پیالوں میں پانی لے کر پیاس بجھاتے تھے۔ عام طور پر یہ فوارے بازاروں کے نکڑوں پر اہل خیر حضرات تعمیر کراتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی فواروں کی بعض شکلیں عثمانی دور میں رائج تھیں جو امراء کے گھروں اور باغوں وغیرہ میں تعمیر کیے جاتے تھے۔

عثمانی فن تعمیر کا ذکر نامکمل رہے گا اگر ان حماموں کا ذکر نہ کیا جائے جو پوری سلطنت میں عام تھے۔ بھاپ کے ان حماموں کو عام طور پر ترکی حمام کے نام سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔ ان حماموں میں گرم اور سرد دونوں طرح کے پانی سے لبریز فوارے لگائے جاتے تھے۔ یہ حمام عام طور پر تین یا چار کمروں پر مشتمل ہوتے تھے اور ان کی تعمیر مستطیل ہوتی تھی یعنی ایک کے بعد ایک کمرہ ہوتا تھا۔ ان کی تعمیر میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا کہ درجہ حرارت اچانک نہ تبدیل ہو۔ حمام میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ایک بڑا کمرہ ہوتا تھا، اس کا درجہ حرارت معمول کے مطابق یا اس سے بہت تھوڑا زیادہ ہوتا تھا۔ حمام میں نہانے والے یہاں کپڑے تبدیل کرتے تھے اور غسل کے بعد قہوہ بھی یہیں پیتے تھے (سماجی حالات کے تحت بیان کیا جا چکا ہے کہ عثمانی ترکی میں حمام کلب کا کام کرتے تھے اور انڈور (Indoor) تفریح خانے تھے۔) بڑے کمرے کے بعد ایک عبوری کمرہ ہوتا تھا جو کسی قدر گرم ہوتا تھا۔ اس کا

مقصد یہ ہوتا تھا کہ درجہ حرارت میں فوراً تبدیلی نہ واقع ہو۔ پھر اس عبوری کمرے کے بعد اصل گرم کمرہ (گرم خانہ) ہوتا تھا، جہاں پر ایک دلاک (Massager) غسل کے تمام مراحل طے کراتا تھا۔ اس کمرے کی ایک دیوار میں آتش دان نصب ہوتا تھا، جس کی دیکھ بھال باہر سے کی جاتی تھی۔ داخلے کے کمرے کے باہر عام طور پر ایک چھتری نصب کی جاتی تھی۔ حماموں کی ظاہری اور اندرونی آرائش کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ عام طور پر یہ حمام گنبد نما ہوتے تھے۔ اور کمروں کے لحاظ سے تین یا چار گنبد بنے ہوتے تھے۔

عثمانی فن تعمیر کا اظہار ان محلوں اور مکانوں میں بھی ملتا ہے جن میں عثمانی حکمراں، امراء اور عام لوگ رہتے تھے۔ عثمانی دور کے مکانوں میں لکڑی کا وافر استعمال ملتا ہے۔ چونکہ عثمانی ترک اسلام کے پیرو تھے اور اسلامی تعلیمات میں مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل ملاپ کو اچھا نہیں خیال کیا جاتا ہے۔ اس لیے عثمانی دور کے تمام تر مکانوں میں خواہ وہ حکمرانوں اور امیروں کے محلات ہوں یا عام لوگوں کے چھوٹے مکانات، مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ حصے تعمیر کیے جاتے تھے۔ مردانہ حصے کو سلاملق اور زنانہ حصّے کو حرم یا حرملق کہا جاتا تھا۔ خوش حال لوگوں کے مکان دو حصوں میں تعمیر ہوتے تھے اور دونوں کے بیچ ایک دیوار ہوتی تھی یا پھر دونوں کو جوڑنے والی ایک راہ داری تعمیر کی جاتی تھی۔ مکان کا نیچے کا حصہ عام طور پر خدّام اور نوکروں کے استعمال میں رہتا تھا، جب کہ بالائی حصّے پر خود صاحب خانہ کی رہائش ہوتی تھی۔ بالائی حصے میں ہی ملاقاتیوں کے کمرے بھی ہوتے تھے۔ عثمانی ترکوں کے رہائشی کمرے غیر ضروری سامان سے خالی ہوتے تھے۔ نشست کے کمروں میں دیوار سے لگی نشست گاہ کے علاوہ کوئی دوسرا فرنیچر نہیں ہوتا تھا۔ فرش پر قالین بچھائے جاتے تھے اور کمرے کی دیواروں پر طاقچوں میں خوش رنگ گلدان سجائے جاتے تھے۔ چھتوں کی نقاشی اور تزئین کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ اسی طرح دیواروں میں آرائشی تختے بھی جڑے جاتے تھے۔ استنبول میں عثمانی حکمرانوں کی رہائش گاہ توپ کاپی سرائے ترکی رہائشی مکانوں کی تعمیر کا اعلیٰ نمونہ فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک محل نہ ہوکر رہائشی مکانوں کا ایک مجموعہ ہے جنھیں کوشک (یعنی محل) کہا جاتا ہے ان میں اہمیت کی حامل سلطان محمد فاتح کی تعمیر کردہ چینی لی کوشک (چینی کاش کاری کا محل) ہے۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت ہے جس کے بیچ میں ایک بہت بڑا صحن ہے اور چاروں طرف رہائشی کمرے ہیں۔ نیچے کا حصہ سلطان کے محافظوں اور خادموں کے لیے تھا اور بالائی منزل پر سلطان اور اس کے اہل خانہ کی رہائش تھی۔

23.4.2 عثمانی دور کا عظیم معمار خواجہ سنان

عثمانی فن تعمیر کا کوئی بھی تذکرہ خواجہ سنان (895ھ/1489ء تا 986ھ/1588ء) کے ذکر کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا۔ خواجہ سنان کو سب سے بڑا ترک ماہر تعمیرات مانا جاتا ہے۔ خواجہ سنان پیدائشی طور پر یونانی نسل سے تعلق رکھتا تھا اور مشہور زمانہ عثمانی فوج ینی چری میں بطور انجینئر کام کرتا تھا۔ سلیمان اعظم کے زمانے میں خواجہ سنان نے بلغراد، رہوڈس اور ہنگری کی جنگی مہموں اور فتوحات میں بھی حصہ لیا تھا۔ بعد میں سلطان نے خواجہ سنان کی تعمیراتی مہارت کو دیکھتے ہوئے اسے سرکاری ادارۂ تعمیرات کا ناظم اعلیٰ یا میر تعمیر مقرر کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ خواجہ سنان نے اپنی زندگی میں تین سو سے زیادہ عمارتیں بنائیں۔ ان کی مختصر تفصیل اس طرح ہے:

مسجدیں	131	پل	8
مدرسے	55	مسقف نہریں	7
دارالقرآن	7	حمام	33

شفا خانے	3	محل	34
کارواں سرائے	13	خزانہ کی عمارتیں	3
عام مطبخ	16	مقبرے	19

خواجہ سنان کے ذریعہ تعمیر کی جانے والی یہ عمارتیں یوں تو پوری سلطنت عثمانیہ میں پھیلی ہوئی ہیں لیکن ان کی بڑی تعداد دارالحکومت استنبول میں تعمیر کی گئی۔ 1548ء میں تکمیل کو پہنچنے والی مسجد ''شہزادہ جامع'' گرچہ خواجہ سنان کے ابتدائی تعمیری کاموں میں ہے۔ لیکن ایک مرکزی گنبد کے تحت وسیع عمارت کی تعمیر کا سرآغاز بھی یہی مسجد ہے۔ اس کے بعد خواجہ سنان کی تعمیراتی مہارت اوراس کے اعلیٰ فن کا اظہار ہمیں سلطان سلیمان جامع یا جامع سلیمانیہ میں ملتا ہے۔ یہ استنبول کی سب سے بڑی مسجدوں میں سے ایک ہے۔ اس کی تعمیر میں خواجہ سنان نے مکانی وحدت (یعنی پوری مسجد ایک حصہ نظر آئے اور مسجد کا ہر نمازی محراب ومنبر کو براہ راست دیکھ سکے) کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس مسجد کو عثمانی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ خود خواجہ سنان کو اس مسجد کی تعمیر پر بڑا فخر تھا۔ کیوں کہ اس مسجد کی تعمیر سے پہلے وہ خود کو فن تعمیر کے ایک مبتدی طالب علم سے کچھ زیادہ نہ سمجھتا تھا۔ لیکن اس مسجد کی تعمیر کے بعد اسے خود یہ محسوس ہونے لگا کہ واقعتاً اس نے فن تعمیر میں کمال حاصل کر لیا ہے۔ البتہ خواجہ سنان کا سب سے بڑا تعمیراتی شاہ کار ادرنہ میں سلطان سلیم ثانی کی مسجد ہے جو 1566ء سے 1574ء کے درمیان تعمیر ہوئی (اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔) خواجہ سنان صرف مسجدیں تعمیر کرنے کے فن کا ہی ماہر نہیں تھا۔ بلکہ اس کی تعمیراتی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے محکمہ تعمیر کے ناظم اعلیٰ کے طور پر اس نے اپنے رفقاء، شاگردوں اور مددگاروں کے ساتھ مل کر عوامی و دیگر عمارتیں بڑی تعداد میں تعمیر کیں۔ توپ کاپی سرائے میں اس کی زیر نگرانی جو آرکٹیکچر کالج قائم تھا، اس میں 580 ماہر فن کارکام کرتے تھے۔ جن میں 61 نقاش اور زینت کار تھے۔ خواجہ سنان کے شاگردوں میں سے ایک بلکہ کہا جاتا ہے کہ اس کا سب سے اچھا شاگرد یوسف برصغیر ہندوستان آ گیا تھا۔ یہاں اس نے اکبر کے زمانہ حکومت میں لاہور، دہلی اور آگرہ میں متعدد شاندار عمارتیں تعمیر کیں۔

معلومات کی جانچ

1. ''آیا صوفیہ'' کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ بیان کیجئے۔
2. بنی جامع استنبول کی خصوصیات بیان کیجئے۔
3. شہزادہ جامع کس کی تعمیر کردہ ہے؟
4. خواجہ سنان کے اہم تعمیراتی خدمات پر روشنی ڈالئے۔

23.5 عثمانی دور میں علم وادب

عثمانی ترکوں سے پہلے ترکی زبان کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کے زوال کے بعد جب ترک امراء کی بعض چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئیں تو انہوں نے ترکی زبان (جو ان کی مادری زبان تھی) کی

سرکاری طور پر سرپرستی کی، اور انہیں کی وجہ سے ترکی زبان میں بعض کتابیں لکھی گئیں۔ عربی و فارسی زبانوں سے کچھ کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ عثمانیوں کو جب اقتدار ملا تو انہوں نے بھی ترکی زبان کی سرپرستی کی اور سرکاری سطح پر اس کے فروغ کے لیے کوششیں کیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عربی و فارسی کے شانہ بشانہ ترکی زبان بھی ترقی کی منزلیں طے کرنے لگی۔ اس وقت تک عربی کو مذہب کی زبان اور فارسی کو ادب کی زبان باور کیا جاتا تھا۔ عثمانی ترکوں کی زیرِ سرپرستی ترکی زبان میں مذہبی اور ادبی دونوں طرح کے علوم کے نہ صرف ترجمے ہوئے بلکہ ترکی زبان میں طبع زاد کتابیں بھی لکھی جانے لگیں۔ حکمرانوں کے مذاق کے مطابق دینی کتابیں خاص طور پر تفسیر، تصوّف، اولیائے کرام کے تذکرے، تاریخ اسلام اور طب وغیرہ علوم کی کتابیں سب سے پہلے منظرِ عام پر آئیں۔ اس حوالے سے سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ مدارس میں پڑھائی جانے والی درسی کتابوں کے ترکی زبان میں ترجمے ہوئے۔

عثمانی دور میں ترکی زبان و ادب کے فروغ کی ایک سب سے بڑی وجہ یہ رہی کہ آلِ عثمان کے تقریباً سبھی حکمراں علم و فن کے مربّی تھے۔ ان کے وزراء اور امراء بھی اس معاملے میں ان کی پیروی کرتے تھے۔ استنبول کی فتح سے پہلے بروصہ اور ادرنہ کے شہر ترکی زبان میں تصنیف و تالیف کے مرکز بن گئے تھے۔ جہاں ترکی زبان کے شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کی جاتی تھی۔ البتہ عثمانی سلطنت کی خاص بات یہ تھی کہ انہوں نے دوسری اہم زبانوں کو نظرانداز نہیں کیا، بلکہ سلطنت میں ترکی زبان کے ساتھ عربی و فارسی زبانوں کا رواج بھی برقرار رکھا۔ مذہبی اور علمی کتابیں زیادہ تر عربی زبان میں لکھی جاتی تھیں۔ تاریخی، جغرافیائی اور ادبی کتابیں ترکی زبان میں تصنیف ہوتی تھیں اور شاعری ترکی اور فارسی دونوں زبانوں میں کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عثمانی دور کے زیادہ تر علماء اور مصنّفین مذکورہ تینوں زبانوں کے ماہر ہوتے تھے۔

پندرہویں صدی کے وسط میں قسطنطنیہ کی فتح کے بعد جب عثمانیوں نے اسے اپنا دارالحکومت بنایا تو یہ شہر سیاسی دارالحکومت کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی مرکز کے طور پر بھی ابھر کر سامنے آیا اور گزشتہ صدیوں میں جو حیثیت دمشق، بغداد، قاہرہ اور ہرات کے شہروں کو علمی مراکز کے طور پر حاصل رہی تھی، استنبول (قسطنطنیہ) کو بھی وہی حیثیت حاصل ہوگئی۔ عثمانی حکمرانوں نے سلطنت کے ہر بڑے شہر میں مدرسے تعمیر کیے۔ ان کا دستور بن گیا تھا کہ ہر مسجد کی تعمیر کے ساتھ مدرسہ، اسپتال، لائبریری اور حمام بھی ضرور تعمیر کراتے۔ دارالحکومت استنبول میں مدرسوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اسے مدرسوں کا شہر کہا جا سکتا تھا۔ محمد فاتح کی مسجد جامع فاتح اور سلیمان اعظم کی مسجد جامع سلیمانیہ کے ساتھ جو مدرسے تعمیر کیے گئے تھے وہ اپنے زمانے کے اعلیٰ ترین تعلیمی ادارے ہونے کے ساتھ ایک جامعہ (یونی ورسٹی) کا منظر پیش کرتے تھے۔ جب بھی کوئی حکمراں کوئی بڑی مسجد تعمیر کراتا تو اس کے ساتھ ہی وہ مدرسہ، شفا خانہ اور کتب خانہ (لائبریری) بھی تعمیر کرتا اور عمارتوں کا یہ پورا مجموعہ کلیہ (کالج) کہلاتا تھا۔ استنبول، ادرنہ اور رزماسیہ کے شہروں میں ان میں سے بعض کلیے اب تک موجود ہیں۔

عثمانی سلاطین کی علم و ادب سے دلچسپی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سلطان سلیم اوّل ترکی زبان کے علاوہ فارسی زبان میں بھی شاعری کرتا تھا۔ سلطان سلیمان اعظم کو بھی شعر سے مناسبت تھی اور وہ شعر کہتا تھا۔ اس کا تخلّص محبّی تھا اور اپنے زمانے کے مشہور شاعر باقی کی غیر معمولی قدر کرتا تھا۔ اس کا وزیر اعظم (صدر اعظم) ابراہیم پاشا خود شاعر تھا اور متعدد شعراء کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔ علم و ادب کی سرپرستی کا یہ رجحان بعد کے حکمرانوں میں بھی باقی رہا۔ جس کے نتیجے میں ترکی زبان میں بڑے بڑے عالم اور اسکالر پیدا ہوئے۔ ثروت صولت نے ان میں سے بعض کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''ترک علماء میں غالباً پہلی ممتاز علمی شخصیت شمس الدین محمد فناری (751ھ تا 834ھ) کی ہے جو ملا فناری کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ ترکی کے پہلے شیخ الاسلام ہیں۔ اس عہدے پر ان کو سلطان مراد دوم نے مقرر کیا تھا۔ تفسیر، فقہ اور منطق پر انہوں نے عربی میں کئی کتابیں لکھیں۔ ان کا ذاتی کتب خانہ دس ہزار کتابوں پر مشتمل تھا''۔

حاجی بیرم ولی (753ھ/1352ء تا 833ھ/1429ء) ملا فناری کے ہم عصر تھے۔ ملا فناری کا مرکز بروصہ تھا تو حاجی بیرم ولی کا انقرہ۔ وہ تصوف کے سلسلۂ بیرامیہ کے بانی ہیں اور ترکی کے ممتاز اولیاء اللہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ محنت ومزدوری کر کے روزی کماتے تھے اور جود وسخا کی تلقین کرتے تھے۔ انہوں نے پوری زندگی شریعت کے مطابق گزاری۔ لیکن ان کے بعد ان کے بعض مرید گمراہی کے راستے پر چلے گئے۔

مشہور عالم آق شمس الدین (1389ء تا 1458ء) حاجی بیرم ولی کے مرید تھے۔ دینی علوم اور علم طب پر انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ استنبول کی فتح کے بعد حضرت ابوایوب انصاری کی قبر کی نشان دہی آق شمس الدین ہی نے کی تھی۔ ان کا شمار بھی ترکی کے اولیاء میں ہوتا ہے۔ خضر بیگ (810ھ/1407ء تا 863ھ/1458ء) ایک ممتاز عالم اور شاعر تھے اور ان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ استنبول کے پہلے قاضی تھے۔

ملا خسرو متوفی 1480ء خضر بیگ کے بعد استنبول کے دوسرے قاضی اور شیخ الاسلام تھے۔ فقہ میں ان کی دو کتابیں ''درالحکام'' اور ''مرقاۃ'' بہت اہم ہیں اور بعد میں ان پر کثرت سے حاشیے لکھے گئے۔

ثروت صولت نے اپنی کتاب ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم میں عثمانی دور کے دیگر علماء اور مصنفین کے بارے میں بھی ضروری معلومات فراہم کی ہے۔ یہاں ہم انہیں سے استفادہ کرتے ہوئے ان میں سے کچھ کا تعارف پیش کر رہے ہیں۔

1. کمال پاشازادہ (873ھ/1468ء تا 941ھ/1535ء)

عثمانی دور کی جو علمی شخصیات سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں ان میں ایک کمال پاشا زادہ ہیں۔ جنہیں ترکی میں ابن کمال کے نام سے بھی شہرت حاصل ہے۔ کمال پاشا زادہ عربی، فارسی اور ترکی تینوں زبانوں میں یکساں مہارت رکھتے تھے اور انہوں نے تینوں ہی زبانوں میں کتابیں لکھی ہیں۔ ان زبانوں میں ان کی تصانیف کی تعداد تین سو کے قریب ہے۔ کثیر التصانیف عالم ہونے کے ساتھ ہی کمال پاشا زادہ ایک اچھے اور باکمال شاعر بھی تھے۔ سلیمان اعظم کے زمانے میں وہ ترکی کے شیخ الاسلام بھی بنائے گئے۔ مختلف علوم خاص طور پر تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، ادب اور شاعری میں انہیں کمال حاصل تھا۔ علم وادب کی ان تمام اصناف میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اور تقریباً سبھی موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ البتہ تاریخ آل عثمان، جو ترکی زبان میں سلطنت عثمانیہ کے ابتدائی دور 886ھ سے 933ھ تک کی مستند تاریخ ہے۔ اس کتاب نے کمال پاشا زادہ کی ترکی ادب میں شہرت کو بام عروج تک پہنچا دیا اور اس کی اہمیت کے پیش نظر ہی انہیں عثمانی کلاسیکی دور کے پانچ سب سے بڑے مورخین میں پہلا مؤرخ شمار کیا جاتا ہے۔ کمال پاشا زادہ نے مشہور مصری مورخ تغری بردی کی تاریخ کا بھی ترکی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اسی طرح ادب کے میدان میں ان کی تصنیف ''نگارستان'' اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور شیخ سعدی کی گلستاں کی طرز پر لکھی گئی ہے۔

2. ابو سعود آفندی (896ھ/1490ء تا 982ھ/1574ء)

سلیمان قانونی (اعظم) کے زمانے میں سلطنت عثمانیہ کا عروج انتہائی کمال کو پہنچ گیا تھا۔ یہ عروج صرف سیاسی میدان میں ہی نہیں تھا بلکہ علمی میدان میں بھی تھا۔ اس دور کی سب سے ممتاز علمی شخصیت ابو سعود آفندی کی ہے۔ انہیں 1545ء میں سلطنت عثمانیہ کا شیخ الاسلام بنایا گیا اور تا حیات وہ اس منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ شیخ ابو سعود آفندی کی نظر حالات زمانہ پر بہت گہری تھی جس کا اثر ان کے فتووں میں بہت ہی نمایاں ہے۔ آج بھی ان کے فتوے اس زمانے کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی حالات کو جاننے کا اہم ذریعہ ہیں۔ البتہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ قانون سازی کے میدان میں ہے، جب انہوں نے عثمانی سلطنت کے قوانین اور نظام کو اسلامی شریعت کے مطابق بنایا۔ ابو سعود آفندی بھی اپنے زمانے کے بڑے علماء کی طرح عربی، فارسی اور ترکی تینوں زبانوں میں مہارت رکھتے تھے اور تینوں ہی زبانوں میں انہوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ قرآن مجید کی ان کی تفسیر ''ارشاد العقل السلیم'' ایک محققانہ تفسیر ہے۔ وہ شاعر بھی تھے اور خیر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انہوں نے اپنے آبائی شہر اور دارالحکومت استنبول میں بھی متعدد مسجدیں، مدرسے، پل، سبیلیں اور حمام تعمیر کروائے۔

3. حاجی خلیفہ (1017ھ/1608ء تا 1067ھ/1657ء)

عثمانی دور کے علماء اور دانش وروں میں حاجی خلیفہ کی شخصیت بہت ہی عظیم اور نمایاں ہے۔ ترک ان کو اپنی زبان میں کاتب چلپی کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ شروع کے زمانے میں حاجی خلیفہ عثمانی فوج میں شامل تھے اور اس کے تحت انہوں نے اس دور کی متعدد لڑائیوں میں بھی حصہ لیا۔ حاجی خلیفہ عثمانی حکمران سلطان مراد چہارم کی اس فوج کا بھی حصہ تھے جس نے بغداد کو فتح کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد ان کا دل فوج کی ملازمت سے اچاٹ ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے حج کیا اور ملازمت سے مستعفی ہو کر ذاتی طور پر تصنیف و تالیف کے کام میں لگ گئے۔ حاجی خلیفہ جامع الکمالات تھے۔ انہوں نے عربی اور ترکی زبانوں میں بیس سے زیادہ اعلیٰ درجے کی کتابیں مختلف علوم و فنون میں لکھیں، جن کی وجہ سے علمی دنیا میں ان کا نام غیر فانی ہو گیا۔ حاجی خلیفہ کی تصنیفات میں سب سے زیادہ شہرت ''کشف الظنون'' کو حاصل ہوئی۔ اس کتاب کی وجہ سے وہ پورے عالم اسلام میں مشہور ہو گئے۔ ان کی یہ کتاب تقریباً بیس برس میں مکمل ہوئی۔ اس میں انہوں نے آغاز اسلام سے اپنے زمانے تک کے ان تمام مصنفوں اور کتابوں کے بارے میں لکھا ہے جو عربی، فارسی یا ترکی زبانوں میں لکھی گئیں۔ حاجی خلیفہ کا ایک اور علمی کارنامہ ان کی تصنیف ''جہاں نما'' ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب علم جغرافیہ سے متعلق ہے۔ اس میں انہوں نے یورپ کے علاوہ امریکہ کا حال بھی لکھا ہے جس سے کہ اس وقت تک اسلامی دنیا کے غیر ترک جغرافیہ داں واقف نہیں تھے۔ جغرافیہ سے متعلق ہی ان کی ایک اور کتاب ''تحفۃ الکبار فی اسفار البحار'' ہے۔ جس میں حاجی خلیفہ نے ترکوں کی بحری جنگوں کی تاریخ لکھی ہے۔ ''دستور العمل'' کے نام سے ایک کتاب حاجی خلیفہ نے عثمانی دور کے حالات سے متعلق لکھی ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے حاجی خلیفہ کی سب سے اہم کتاب ''میزان الحق'' ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے حضرت خضرؑ کی موجودگی، غنا، رقص، صلواۃ و سلام، ابن عربی کے نظریات اور اس قسم کے دوسرے اختلافی مسائل پر اپنے خیالات بڑے ہی متوازن انداز میں پیش کیے ہیں۔ عثمانی ترکی کے جن پانچ بڑے مورخین کا تذکرہ گزشتہ سطور میں ہوا، ان میں تیسرے عظیم مورخ حاجی خلیفہ ہیں۔ (دوسرے مورخ خواجہ سعد الدین 943ھ/1536ء تا 1008ھ/1599ء ہیں جن کی

کتاب ''تاج التواریخ'' عثمانیوں کے آغاز سے سلطان سلیم اول کی 1520ء میں وفات تک مستند تاریخ ہے) ''فضلکتہ التواریخ'' اسلامی تاریخ پر ان کی اہم کتاب ہے جس میں انہوں نے تیرہ سو ماٰخذ سے مدد لی ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ ان کے علاوہ حاجی خلیفہ نے تفسیر قرآن، فقہ اور سوانح سے متعلق دوسری کتابیں بھی لکھی ہیں۔

4. مصطفیٰ علی چلپی (948ھ/1541ء تا 1008ھ/1600ء)

ترکی زبان کے بعض دانشور مصطفیٰ علی چلپی کو سولہویں عیسوی کا سب سے بڑا مؤرخ قرار دیتے ہیں۔ اس کی بنیاد علی چلپی کی مشہور زمانہ تاریخ ''کنہہ الاخبار'' ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اسلامی تاریخ تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ البتہ اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ترکوں کی تاریخ سے متعلق ہے۔ مصطفیٰ علی چلپی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے معاشرتی حالات پر بھی نظر ڈالی ہے اور ایک نقاد کا نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ لیکن راست گوئی اور حق بیانی کا دامن کہیں بھی چھوڑا نہیں ہے۔ ''مناقب ہنرواں'' علی چلپی کی ایک دوسری اہم تصنیف ہے۔ اس میں انہوں نے تقریباً ایک سو خطاطوں، مصوروں اور جلد سازوں کے حالات قلم بند کیے ہیں، اسی طرح ''فصول الحال'' کے نام سے ان کی تصنیف ترکی زبان میں اسلامی دنیا کی مختصر تاریخ ہونے کے باوجود ترکی کی مقبول ترین تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے۔

عثمانی دور کے دیگر نامور علماء میں ابراہیم حلبی (متوفی 956ھ/1549ء) فقہ کے ممتاز عالم تھے۔ سلیمان اعظم کے زمانے میں مجموعہ قوانین (جس کی وجہ سے وہ سلیمان قانونی کہلاتا ہے) انہیں نے مرتب کیا تھا۔ ایک دوسری علمی شخصیت بدرالدین بن قاضی سماونہ (760ھ/1358ء تا 819ھ/1416ء) کی ہے جو فقہ وتصوف کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے مشترکہ ملکیت کے نظریے کی تبلیغ کی اور ابن عربی کے تصورات کو فروغ دیا۔ عثمانی عہد عروج کے ایک مشہور مؤرخ احمد بن مصطفیٰ تاش کو پروزادہ (901ھ/1495ء تا 968ھ/1561ء) ہیں، جن کی تصنیف ''شقائق النعمانیہ'' میں پانچ سو بائیس (522) ترک علماء کے حالات لکھے گئے ہیں۔ قوجی بے سلطنت عثمانیہ کا شاید پہلا مؤرخ ہے جس نے ایک مختصر کتابچے میں، جو اس کے نام کی مناسبت سے قوجی بے کا رسالہ کہلاتا ہے، سلطنت کے زوال سے بحث کی ہے۔ یہ رسالہ اس نے سلطان مراد چہارم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

عثمانی سلطنت کے دوسرے علاقوں میں اس دوران جو بڑے اور نمایاں علماء گزرے ہیں۔ ان میں ایک حافظ ابن حجر مکی (متوفی 974ھ/1565ء) ہیں، جن کا قیام مکہ میں تھا اور فقہ شافعی کے بہت بڑے عالم تھے۔ شام میں عبدالوہاب شعرانی (متوفی 973ھ/1565ء) اپنے زمانے کے مشہور ولی اور عالم تھے۔ تفسیر، فقہ، تصوف، تاریخ، نحو اور طب میں انہوں نے متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ شام کے ممتاز مؤرخ احمد المقری (متوفی 1041ھ/1622ء) کا قیام بھی سلطنت عثمانیہ میں رہا۔ اندلس کی تاریخ، معاشرت، علوم وفنون اور صنعت وحرفت پر ان کی تصنیف ''نفح الطیب'' آج بھی ایک مستند ماخذ سمجھی جاتی ہے۔

23.5.1 عثمانی دور کی شاعری

شاعری بھی حالانکہ ادب کا حصہ ہے لیکن اہمیت کی وجہ سے اس کا ذکر الگ سے کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا عثمانی دور کے ترکی میں ترکی زبان کے علاوہ فارسی زبان میں بھی شاعری کی جاتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہو کہ عثمانی عہد کی ترکی

شاعری پر اس زمانے کی فارسی شاعری کے گہرے اثرات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی بیشتر ترکی شاعری میں وہی موضوعات اور خیالات پائے جاتے ہیں جو فارسی شاعری کا خاصہ تھے۔ شاعری صرف اعلیٰ طبقے کے مذاق کا آئینہ تھی اور اس میں تصنع و بے جا تکلّفات کے علاوہ عام لوگوں کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ چونکہ یہ شعراء عام طور پر ایک خود ساختہ ہالے سے باہر نہیں نکلتے تھے، اس لیے مضامین کا توارد بھی اکثر ملتا ہے۔ تصنع اور تکلف کی دنیا سے ترکی شاعری انیسویں صدی میں کہیں جا کر نکلنے میں کامیاب ہوسکی۔ بہر حال ترکی زبان میں جو شاعری اس دور میں ہوئی اس کا ایک مختصر تعارف یہاں درج کیا جاتا ہے۔

عثمانی عہد کی ترکی شاعری اپنے خیالات اور مضامین میں ہی نہیں بلکہ شکل اور اسلوب میں بھی بڑی حد تک فارسی شاعری کی طرح تھی (یا اس کا مثنیٰ تھی)۔ اس زمانے کے ترک شاعروں نے تقریباً ان تمام موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے جو فارسی شاعری میں رائج تھے مثلاً غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی اور مرثیہ وغیرہ۔ زمانے کا اگر لحاظ کیا جائے تو عثمانی دور کے ترک شعراء کا کلام فارسی یا مسلم دنیا کے دیگر علاقوں میں ہونے والی شاعری سے کسی طرح کم تر نہیں تھا۔ کیونکہ اس زمانے کی مسلم دنیا کی شاعری گلہ و لالہ اور زلف و گیسو سے ابھی باہر نکلنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ترکی زبان کے اولین شعراء میں یونس امرہ (متوفی 1320ء)، احمدی (متوفی 1413ء) اور نسیمی (متوفی 1418ء) قابل ذکر ہیں۔ یہ سب صوفی شاعر تھے۔ خاص طور پر نسیمی کی صوفیانہ غزلیں بڑی ہی پر اثر ہیں۔ ان کے بعد عثمانی ترکی شاعری کا کلاسیکی دور شروع ہوتا ہے۔ اس کا ذکر ثروت صولت نے اس طرح کیا ہے:

> ''اس دور کے پانچ سب سے بڑے شاعر فضولی متوفی 1556ء، باقی (1526ء تا 1600ء)، نفعی متوفی 1635ء، ندیم (1681ء تا 1730ء) اور شیخ غالب (1757ء تا 1799ء) ہیں۔ ان میں فضولی کو عام طور پر ترکی زبان کا سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ فضول کی مثنوی لیلیٰ مجنوں اور غالب کی مثنوی حسن و عشق، اسلوب بیان اور ندرت خیال کے لحاظ سے ترکی زبان کا اہم شاہ کار ہیں۔ باقی کو ترکی کا سب سے بڑا غزل گو اور نفعی کو ترکی زبان کا سب سے بڑا طنز نگار سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے بلند پایہ شاعروں میں خیالی (متوفی 1557ء) کو روم کا حافظ کہا جاتا ہے اور نامی متوفی 1712ء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی شاعری جذبات سے زیادہ ذہن کو اپیل کرتی ہے۔ شیخی متوفی 1428ء احمد پاشا برمعالی متوفی 1497ء، نجاتی متوفی 1509ء اور ذاتی متوفی 1546ء اس دور کے دوسرے اہم شاعر ہیں۔''

ترکی شاعری صرف دارالحکومت استنبول تک محدود نہیں تھی۔ بلکہ اس کا چرچا ملک کے طول و عرض میں ہر جگہ تھا۔ بغداد، قونیہ، بروصہ، ادرنہ اور اُسکوب وغیرہ شہروں میں عثمانی ترکی کے بڑے مراکز قائم تھے۔ دارالحکومت استنبول میں شعراء یا تو چھوٹی چھوٹی دو کانوں پر اکٹھا ہوتے تھے جہاں ان میں سے کچھ کا کاروبار ہوتا تھا، یا باغوں میں یا تکیوں اور امیروں کے گھروں پر ان کی محفلیں جمتی تھیں۔ بعد میں جب قہوہ نوشی کا رواج عام ہوا تو دارالحکومت کے قہوہ خانوں کو شعری مجالس کے حوالے سے مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ کیونکہ یہاں سماج کے سبھی طبقات کے لوگ آسکتے تھے۔ شاید اس کے بعد ہی ترکی شاعری نے عوامی رنگ اختیار کرنا شروع کیا یہاں تک کہ عہد تنظیمات میں جدید ترکی ادب وجود میں آیا۔

23.5.2 جدید ترکی ادب

جدید ترکی ادب انیسویں صدی میں وجود میں آیا، اس پر سب سے زیادہ اثر فرانسیسی ادب کا پڑا۔ چونکہ اس ادب کا تعلق تنظیمات کے دور سے ہے جب عثمانی سلطنت میں اہم اصلاحات ہوئیں، اسی لیے اس ادب کو عہد تنظیمات کا ادب بھی کہا جاتا ہے۔ انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے یورپ میں بیداری کی تحریک خاصی ترقی کرچکی تھی اور اس نے دیگر علاقوں پر بھی اثرات ڈالنے شروع کردیے تھے۔ چنانچہ عثمانی حکومت نے بھی 1822ء میں اپنے یہاں ترجمے کا ایک شعبہ قائم کیا جس کے تحت مغربی زبانوں خاص طور پر فرانسیسی سے ترکی زبان میں کتابوں کے ترجمے کیے جاتے تھے۔ اس دور میں عربی اور فارسی زبانوں سے بھی ترکی میں بکثرت ترجمے ہوئے۔ ان ترجموں کا اثر یہ ہوا کہ ترک ادیبوں اور شاعروں نے پرانا طریقہ چھوڑ کر ادب کے میدان میں نئے تجربے شروع کیے۔ نتیجے میں جدید ترکی ادب وجود میں آیا۔ اس دور کے ترک ادیبوں میں چند مشہور نام یہ ہیں: ابراہیم شناسی (1821ء تا 1871ء)، ضیا پاشا (1825ء تا 1880ء)، نامق کمال (1840ء تا 1888ء)، عبدالحق حامد (1852ء تا 1937ء) اور توفیق فکرت (1867ء تا 1915ء)۔ اس دور میں ترکی میں مغربی ادب کے زیر اثر ناول نویسی، افسانہ نگاری اور ڈراما نویسی وغیرہ کا آغاز ہوا۔ اس دور کے بعض نامور ادیب و شاعر یہ ہیں۔

ابراہیم شناسی کو عہد تنظیمات کے ادب کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اسے عربی، فارسی اور ترکی کے ساتھ فرانسیسی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ فلسفہ، سائنس اور ادب کا اس نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ترکی ادب میں شناسی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ترکی میں جدید طرز کے ترکی اخبار کی بنیاد ڈالی اور 1860ء میں ''ترجمان احوال'' کے نام سے ترکی کا پہلا غیر سرکاری اخبار نکالا۔ بعد میں اس نے ایک اور اخبار ''تصویر افکار'' نکالا اور ترکی میں جدید افکار کی تشہیر میں اہم رول ادا کیا۔ ترکی صرف ونحو کی ایک کتاب کے علاوہ شناسی کا سب سے بڑا کارنامہ ترکی لغت ہے، جس میں اس نے ہر لفظ کا ماخذ اور محل استعمال بتایا ہے۔ یہ لغت صرف بیں حروف تک ہی لکھا جاسکا۔

عہد تنظیمات کا دوسرا بڑا ادیب ضیا پاشا ہے۔ یہ فرانسیسی ادب سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ اس نے روسو اور مولیر کی کتابوں کا ترکی زبان میں ترجمہ کر کے وطنی تحریک کو تقویت پہنچائی۔ پیرس اور لندن میں اس نے جلا وطنی کے دن بھی گزارے اور لندن سے ''حریت'' کے نام سے ایک اخبار بھی نکالا۔ ضیا پاشا قدیم ترکی ادب کا ماہر تھا۔ البتہ اس کا خیال تھا کہ ادب کو عوام کی زبان اور خیالات کا آئینہ ہونا چاہیے۔

جدید ترکی ادب میں نامق کمال کا نام اس لیے نمایاں ہے کہ وہ اس ادب کی ہر نئی صنف میں پیش رو کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ آزادی و حریت کا شیدائی اور اتحاد اسلامی کا علم بردار تھا اور اس کوشش میں قید و بند اور جلا وطنی کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ تاریخ، شاعری، ڈرامہ، ناول اور تنقید تمام میدانوں کا وہ ماہر تھا اور مستقبل کے ترکی ادب پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ اس کی نظم، قصیدۂ حریت، حبّ وطن اور انسانی حقوق کے حوالے سے ترکی ادب کا شاہ کار ہے۔

عبدالحق حامد کو جدید ترکی نظم کا بانی باور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس نے ترکی حکومت کی جانب سے ایک طویل مدت بمبئی، میڈرڈ اور لندن میں ترکی کے سفیر کے طور پر گزاری۔ لیکن اس نے اپنی تحریروں میں ظلم واستبداد کے خلاف آواز بلند کی۔ اس نے نظم ونثر میں کئی ڈرامے لکھے جو بڑے فکر انگیز ہیں۔

معلومات کی جانچ

1. کمال پاشازادہ کی علمی خدمات بیان کیجئے۔
2. جدید ترکی ادب کے کسی تین مشہور ادیبوں کا نام بتائیے۔
3. عہد تنظیمات کے ادب کا بانی کسے سمجھا جاتا ہے۔
4. نظم ''قصیدہ حریت'' کس کی ہے۔

23.6 عثمانی دور میں بعض دیگر علوم وفنون

علوم وفنون کی ترقی کے اعتبار سے عثمانی دور سیاسی اور فوجی میدان میں اپنی کامرانیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ عثمانیوں کو علوم سے دلچسپی نہیں تھی یا وہ جہالت کے دلدادہ تھے۔ بلکہ اس کی بنیادی وجہ مسلم دنیا میں وقوع پذیر ہونے والا وہ علمی زوال تھا جس کے تحت ایک ترکی ہی کیا بلکہ تمام مسلم دنیا میں علمی ترقی کی رفتار چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی کے بعد رک سی گئی تھی۔ چونکہ عثمانی ترکوں کا بیشتر تعلق اسی عہد سے ہے، اس لیے ان کے دور میں بھی کچھ زیادہ علمی ترقیات نہیں ہوئیں تو اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے بھی عثمانی حکومت بنیادی طور پر ایک فوجی حکومت تھی۔ اور جس طرح کے توسیع پسندانہ عزائم وہ رکھتی تھی اس کے چلتے اگر اس کے حکمرانوں کو علمی سرپرستی کا زیادہ موقع نہیں ملا تو بھی کچھ تعجب خیز بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عثمانی دور میں جو علمی کام ہوا، اس کا مقابلہ عباسی دور سے نہیں کیا جاسکتا۔ جن علوم کی طرف عثمانی ترکوں نے خاص طور پر توجہ کی ان میں ایک علم طب ہے۔ علم طب سے دلچسپی صرف عثمانی حکمرانوں کو ہی نہیں تھی بلکہ عثمانی دور کے وزیروں اور امیروں نے بھی اس علم کے فروغ میں خاصی دلچسپی لی۔ مملکت کے طول وعرض میں بڑی تعداد میں ایسے شفاخانے قائم کیے جن کی حیثیت آج کے زمانے کے میڈیکل کالجوں جیسی تھی، یعنی وہاں مریضوں کے علاج کے ساتھ اطباء (طب کے ماہرین) طلبا کو تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔ عثمانی دور کے ترک طبیبوں نے دماغی امراض اور موروثی بیماریوں کے علاج کی طرف خاص توجہ دی اور اس حوالے سے نئی نئی تحقیقات بھی کیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس دور کے طبیبوں کو امراض چشم یعنی آنکھوں کی بیماریوں کے علاج میں خاص مہارت حاصل تھی۔ وہ ان امراض کا بہت اچھا علاج کیا کرتے تھے۔ عثمانی دور کے ترک طبیبوں میں سب سے زیادہ شہرت جن طبیبوں کو حاصل ہوئی ان میں ایک نمایاں نام حاجی پاشا (متوفی 820ھ/1417ء) کا ہے۔ انہوں نے دینی علوم پر کتابیں لکھنے کے علاوہ عربی اور ترکی زبانوں میں علم طب پر بھی کئی کتابیں لکھی تھیں۔

طب کی طرح علم ہیئت میں بھی عثمانی دور کے ترکی میں کافی کام ہوا اور اس علم کے بڑے بڑے ماہرین وہاں پیدا ہوئے۔ ان میں ایک نمایاں نام قاضی زادہ رومی (1337ء تا 1412ء) کا ہے۔ انہیں ریاضی اور علم ہیئت دونوں میں مہارت حاصل تھی۔ خاص طور پر علم ہیئت میں ان کی کتاب ''الملخص فی الھیت'' کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح ایک ممتاز ریاضی دان علی کوشجو (متوفی 1474ء) گزرے ہیں جن کا علم ہیئت میں ایک رسالہ ''رسالہ فی الھیت'' اس علم کی اہم تصنیف شمار ہوتا ہے۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عثمانی دور میں جیسی ترقی ان علوم میں ہونی چاہئے تھی نہیں ہوئی۔ جن ماہرین اور ان کی کتابوں کا ذکر اوپر گزرا ان کا بھی گہرائی سے اگر جائزہ لیا جائے تو ان کا تعلق بھی چودھویں پندرھویں صدی عیسوی سے ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ترقیات بھی سابقہ دور کی ترقیات کا نتیجہ تھیں۔ کیونکہ ان کے بعد ان علوم میں عثمانی ترکی میں کوئی اضافہ ہمیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔

البتہ علم جغرافیہ اور جہاز رانی ایک ایسا علم ہے جس میں عثمانی ترکوں نے اپنے پیش رو عربوں کی ترقیاتی روایت کو باقی اور جاری رکھا اور یورپ میں بھاپ کی طاقت کی دریافت سے پہلے تک اس میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے۔ مشہور عثمانی حکمراں سلطان سلیمان اعظم 'جو سلیمان قانونی بھی کہلاتا ہے' کے زمانے میں ایک مشہور ترک جہاز راں پیری رئیس (متوفی 1552ء) گزرا ہے۔ جغرافیہ اور جہاز رانی کے علم میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔ اس نے اپنے تجربات کی روشنی میں ''بحریہ'' کے نام سے ترکی زبان میں ایک کتاب لکھی جو اپنے موضوع پر اپنے زمانے کی انتہائی اہم کتاب تھی۔ اس کتاب میں اس نے اپنی ذاتی معلومات اور تجربات کی بنیاد پر بحیرہ ایجین اور بحیرہ روم کے سمندروں کے پانی کے دھاروں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے علاوہ ان کے ساحلی علاقوں، بندرگاہوں اور ساحل پر لنگر انداز ہونے کے لیے مناسب مقامات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پیری رئیس نے بحری سفر سے متعلق ایک نقشہ بھی ترتیب دیا تھا جس میں امریکہ کے مشرقی ساحل، یوروپ اور افریقہ کے مغربی ساحل کو دکھایا گیا تھا۔ اس زمانے کا ایک دوسرا عظیم جہاز راں سیدی علی رئیس (متوفی 970ھ/1562ء) گزرا ہے۔ اس نے بحر ہند میں جہاز رانوں کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے ایک کتاب ''کتاب المحیط'' کے نام سے لکھی ہے۔ اس کتاب میں اس نے ایک طرف قدیم عربی کتابوں اور مآخذ سے استفادہ کیا ہے تو دوسری طرف اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدے شامل کر کے کتاب کی اہمیت کو دوچند کر دیا ہے۔ کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ایک باب امریکہ سے متعلق بھی ہے۔ سیدی علی جہاز رانی کے علاوہ علم ہیئت میں بھی خاص مہارت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس علم میں بھی دو کتابیں لکھی ہیں۔ اس نے اپنی مہم جوئی کے حوالے سے ایک مختصر سفرنامہ گجرات سے استنبول تک کا لکھا ہے، اس سفر میں سیدی علی کا گزر احمد آباد، دہلی، لاہور، کابل اور ایران کے علاقوں سے ہوا، اس نے سفر کی روداد بڑے ہی دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔

خطاطی خوش نویسی کی وہ قسم ہے جس میں پیکر کو لفظ کی ایسی شکل دے دی جاتی ہے کہ وہ اس میں اپنی تمام جمالیات کے ساتھ عیاں ہو جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں مصوری اور پیکر تراشی کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے خطاطی جو پیکر کو لفظ کی حسین شکل میں ڈھالنے کا نام ہے، میں ان کا یہ ذوق جمال زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ مسلمانوں نے خطاطی کو وہ عروج بخشا کہ دنیا میں کسی بھی دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

عثمانی دور میں بھی خطاطی کے فن کا عروج جاری رہا ہے اور عثمانی حکمراں اس فن کی بھرپور سرپرستی کرتے رہے۔ عثمانی دور میں خطاطی کے شاہ کار صرف قرآن مقدس کی کتابت کی شکل میں ہی ہمارے سامنے نہیں آتے بلکہ اس دور میں خطاطی کے نمونے ہمیں فن تعمیر، برتن سازی اور قالین بافی کے فن میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ خاص طور پر فن تعمیر میں، ابتدائی عثمانی عہد کی عمارتوں میں خطاطی کے ایرانی طرز کے اعلیٰ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسی طرح مساجد اور مقبروں وغیرہ میں بھی اس کے اعلیٰ نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

خط دیوانی، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ دفتری ضروریات کے تحت وجود میں آیا، عربی خط کا شکستہ عثمانی طرز کتابت ہے جس میں تحریر خوش خط ہوتے ہوئے بھی تیزی کے ساتھ لکھی جاسکتی ہے اور اس کی نقل کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عثمانی دور میں دفتری ضروریات کے تحت خطاطی کی یہ شکل سولہویں اور ابتدائی سترہویں صدی عیسوی کے دوران عثمانی دفاتر میں پروان چڑھی۔ اس خط کا موجد حسام رومی کو بتایا جاتا ہے اور سلیمان قانون کے زمانے میں یہ فن اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا۔ مشہور عثمانی خطاطوں میں سید قاسم غباری، سید حمداللہ، احمد قرہ حصاری اور حافظ عثمان کے نام نمایاں ہیں۔

عثمانی دور کی برتن سازی خواہ وہ عام استعمال کے ہوں یا آرائش کی ضروریات کے لیے، پر گہرا ایرانی اثر ہے۔ جس میں کہ بعد میں مشرقی بازنطینی عناصر بھی شامل ہو گئے۔ اسی طرح قالین بافی کی صنعت عثمانی سلطنت میں آرائش کے ایک اہم فن کی حیثیت رکھتی تھی۔ قالین کا استعمال صرف ضرورت کے تحت ہی نہیں بلکہ آرائش کے لیے بھی ہوتا تھا۔ قالین بافی کا فن عثمانی ترکوں کو وسطی ایشیائی ورثے کے طور پر ملا تھا جو قبائلی سماج کی ضرورت کے تحت وجود میں آیا تھا، کیونکہ قالین آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیے جاسکتے ہیں، اور بہت جلد ایشیائے کوچک میں پھیل گیا۔ ترک قالین کو فرش پر بچھانے اور اس کی زینت کو بڑھانے کے لیے ہی نہیں استعمال کرتے تھے، ان کا استعمال دیواروں کی آرائش اور دروازوں کی سجاوٹ کے لیے بھی ہوتا تھا۔ زیورات میں عثمانی زیادہ تر سونے اور چاندی کا استعمال کرتے تھے اور ان کی بناوٹ پر ایرانی اور بازنطینی اثرات نمایاں تھے۔ رقص اور موسیقی کی عثمانی سماج میں کوئی عام روایت نہیں ملتی۔ سابقہ بازنطینی اثرات کے تحت موسیقی و رقص امراء کے ایک محدود طبقے تک محدود تھا اور عام طور پر ان چیزوں کو اچھا نہیں خیال کیا جاتا تھا۔

23.7 خلاصہ

خلاصہ یہ کہ عثمانی تہذیب وتمدن اچانک وجود میں نہیں آیا بلکہ کسی بھی تہذیب وتمدن کی طرح عثمانی تہذیب وتمدن بھی مرحلہ وار ارتقاء کا سفر طے کرتا رہا اور مختلف اوقات و مرحلوں میں مختلف تہذیبی وتمدنی عناصر نے اسے متاثر بھی کیا اور اس نے ان سے استفادہ بھی کیا۔ ہمیں معلوم ہے کہ عثمانی بنیادی طور پر ترک تھے جنہیں حالات نے وسطی ایشیا سے ایشیائے کوچک (اناطولیہ) پہنچا دیا تھا۔ یہ ترکوں کے سادہ تمدن کے وارث تھے اور متمدن اقوام کی تہذیبی آنچ سے کافی دور تھے۔ البتہ چوں کہ ایشیائے کوچک میں یہ سلاجقہ روم کے سیاسی وارث تھے اس لیے ابتدائی دور میں عثمانی علاقے بھی سلجوق تہذیب وثقافت کے امین تھے۔ بعد میں بازنطینی علاقوں میں ان کی فتوحات نے اس میں بازنطینی تہذیب وتمدن کے مظاہر بھی شامل کر دیے۔ چوں کہ عثمانی حکومت ایشیا، افریقہ اور

تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی اس لیے اس حکومت میں جس تہذیب وتمدن کو فروغ حاصل ہوا اس میں ان علاقوں میں رہنے بسنے والی مختلف اقوام وملل کے تہذیبی وتمدنی اثرات شامل تھے۔ البتہ اس کی خاص بات یہ تھی کہ عثمانی تہذیب وتمدن نے اخذ واستفادہ چاہے جہاں سے بھی کیا ہو، اسے اسلامی تعلیمات اور حدوود کے دائرے میں رکھ کر فروغ دینے اور پروان چڑھانے کی کوشش کی۔

23.8 نمونے کے امتحانی سوالات

1. عثمانی تہذیب وتمدن کے ارتقاء پر ایک مضمون لکھیے۔
2. عثمانی فن تعمیر کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔
3. عثمانی دور میں علم وادب کی ترقی پر ایک مضمون لکھیے۔

23.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد دوم) — ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی
2. آل عثمان — مولانا اسلم جیراجپوری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
3. دولت عثمانیہ (اول، دوم) — ڈاکٹر محمد عزیر، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
4. تاریخ ملت (جلد سوم) — مفتی زین العابدین سجاد میرٹھی ومفتی انتظام اللہ شہابی، ادارہ اسلامیات، کراچی، پاکستان
5. مسلمانوں کا عروج وزوال — مولانا سعید احمد ایم اے، فیمس بکس، لاہور، پاکستان
6. اردو دائرہ معارف اسلامیہ، (متعلقہ مضامین) — دانش گاہ پنجاب، لاہور، پاکستان
7. ترکی میں مشرق ومغرب کی کش مکش — خالدہ ادیب خانم (اردو ترجمہ، ڈاکٹر عابد حسین)

بلاک 24 : عثمانی حکومت کا زوال

اکائی کے اجزاء

24.1 مقصد

24.2 تمہید

24.3 عثمانی حکومت کا زوال

24.4 عثمانی حکومت کے زوال کے اسباب

24.4.1 سلطان کی مجلس دیوان سے علیحدگی

24.4.2 اعلیٰ عہدوں پر تقرری کے اصول میں تبدیلی

24.4.3 رشوت ستانی کی گرم بازادی

24.4.4 وزراء وامراء کی شاہانہ زندگی

24.4.5 امور مملکت میں حرم کی دخل اندازی

24.4.6 عثمانی شہزادوں کی محل تک تحدید

24.4.7 ولی عہدی کا طریقہ

24.4.8 اجنبی عورتوں سے شادی

24.4.9 فوج کی سرکشی

24.4.10 امراء اور وزراء کی مفاد پرستی

24.4.11 مذہبی علماء کا جمود

24.4.12 ترک قوم پرستی

24.4.13 عربوں کی بغاوت

24.4.14 اقتصادی بدحالی

24.4.15 معاصر اقوام کی بیداری اور عثمانی حکومت کے خلاف سازشیں

24.5 عثمانی حکومت کے زوال کو روکنے کی کوششیں

24.6 خلاصہ

24.7 نمونے کے امتحانی سوالات

24.8 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

24.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو عثمانی حکومت کے زوال کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ہے کہ وہ کون سے حالات اور اسباب تھے جن کے تحت اور جن کی وجہ سے ایک ایسی حکومت جو اپنے زمانے کی سب سے وسیع ،مضبوط اور طاقت ور حکومت رہ چکی تھی اور جس کے حکمرانوں نے چھ سو سال سے زیادہ عرصے تک دنیا کے طول وعرض پر حکومت کی تھی، زوال کا شکار ہوئی، زوال کا آغاز کب ہوا، اس کا ادراک عثمانی حکمرانوں کو ہوا یا نہیں، اگر ہوا تو زوال اور اسباب زوال کے تدارک کی کوششیں کی گئیں یا نہیں اور انہیں کامیابی ملی یا نہیں اور نہیں ملی تو کیوں نہیں ملی ۔ان تمام پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔

24.2 تمہید

اس سے پہلے کی اکائیوں میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ عثمانی ترک غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ خانہ بدوشی کی اعلی خصوصیات ان میں شہری زندگی اختیار کرنے کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک باقی اور قائم رہیں۔ اسلامی تعلیمات نے ان خصوصیات کو مزید صیقل کر کے انہیں اعلیٰ اخلاق و کردار کا حامل بنا دیا تھا۔ ایک وسیع اور مستحکم حکومت قائم کرنے کے باوجود عثمانی حکمراں ایک طویل زمانے تک ان برائیوں اور خرابیوں سے دور رہے جو بالعموم بہت جلد دوسری اقوام کے حکمرانوں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ عثمانی حکومت کا یہ کردار خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ زوال کا آغاز ہو جانے کے بعد بھی انہوں نے نہ صرف یہ کہ بہت دنوں تک اپنے اقتدار کو بچائے رکھا بلکہ وقفے وقفے سے ان میں کئی ایسے اولوالعزم حکمراں بھی پیدا ہوئے جنہوں نے زوال پر بند باندھنے کی کوشش کی ، یہ الگ بات ہے کہ اپنی اس کوشش میں وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ وہ زوال کی رفتار کو سست کرنے میں کامیاب رہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری اقوام جو زوال کے آغاز کے بعد پچاس، سو سال کے اندر ہی اپنے خاتمے کو پہنچ گئیں، عثمانی زوال کے آغاز کے بعد بھی تین سو سال تک اپنی حکومت کا کامیاب دفاع کرتے رہے۔

24.3 عثمانی حکومت کا زوال

کہاوت مشہور ہے ''ہر عروجِ را زوال'' (ہر عروج کے لیے زوال ہے)۔ اس کا اطلاق شخص کی انفرادی زندگی سے لے کر اقوام کی اجتماعی زندگی تک ہر سطح پر ہوتا ہے۔ یہی قانون فطرت بھی ہے۔ دنیا کی جن قوموں کو بھی تاریخ کے کسی دور میں ترقی اور عروج کا موقع ملا، عروج کی ایک خاص سطح اور مرحلے پر پہنچنے کے بعد ان کا زوال شروع ہو گیا۔ عروج، ترقی اور خوش حالی کے

زمانے میں قوموں کے ارباب اختیار کی جانب سے جو بے اعتدالیاں ہوتی ہیں، اگر وقت پر ان کے تدارک کے اقدامات نہیں کیے جاتے تو بہت جلد وہ مرض کا پیکر اختیار کر لیتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ توجہ اور دیکھ بھال کے مناسب حال یہی مرض ان کی ہلاکت کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ عثمانیوں کی حکومت بھی عروج و زوال کے اس فطری قانون سے مستثنیٰ نہیں تھی۔ ان کی حکومت کا آغاز ایشیائے کوچک میں بازنطینی سرحد کے قریب ایک چھوٹی سی جاگیر سے ہوا۔ اس خاندان کے اولوالعزم حکمرانوں نے بہت جلد اس چھوٹی سی جاگیر کو ایک وسیع و عریض سلطنت میں بدل دیا، جو ایشیا، یورپ اور افریقہ تین براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی۔ پوری اسلامی تاریخ میں عثمانی حکومت تنہا ایک ایسی حکومت ہے جس میں کسی ایک خاندان نے چھ سو سال سے زیادہ عرصہ حکومت کی ہو۔ مسلم دنیا میں کسی خاندان کی حکومت کو اتنا عروج نہیں حاصل ہوا جتنا کہ عثمانی خاندان کی حکومت کو۔ تقریباً تین سو سال تک عثمانی حکومت مسلسل ترقی اور عروج کی جانب گامزن رہی، اس کے بعد بھی سو، سوا سو سال تک اس کی سطوت اور حکمرانی کا جلوہ تمام دنیا میں قائم رہا اور جب زوال ہوا تو بھی ان کا زوال عام خاندانوں کی حکومتوں جیسا نہیں تھا۔ اس میں بھی ان کو تین سو سال لگ گئے۔ اس دوران متعدد عثمانی حکمرانوں نے نہ صرف یہ کہ اصلاح احوال کے لیے کوششیں کیں بلکہ انہوں نے اپنی ایک ایک انچ زمین کے لیے خون بہائے اور اسے آسانی کے ساتھ دشمنوں کے قبضے میں جانے نہیں دیا۔

عثمانی حکومت کی اس پائداری اور استحکام پر اگر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کا راز زیادہ تر ان کے اس نظام حکومت میں تھا جو انہوں نے رائج کیا اور جو اپنے زمانے کے حالات کے لیے بہت ہی مناسب اور موزوں تھا۔ خاص طور پر عثمانی حکمرانوں نے قانون کی پاسداری کی جو روایت قائم کی، اور حکومت کے کاموں میں مشورے کی اہمیت کا باب عالی اور دوسرے اداروں کے حوالے سے جس طرح خیال رکھا، اس نے ان کی حکومت کو مضبوطی بھی عطا کی اور استحکام بھی بخشا۔ ینی چری بظاہر ان کی منظّم فوج کا نام تھا، لیکن اس کے انتخاب کے طریقے نے ایک منظّم ادارے (ادارۂ حکومت) کی شکل اختیار کر لی، جس کے ذریعے فوجی سپاہیوں اور حکام سے لے کر انتظامیہ کے اعلیٰ حکام (صدر اعظم) تک کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ ادارہ حکومت کے تحت فوجیوں اور انتظامیہ کے حکام کی بہترین تربیت کی جاتی تھی، جس کی وجہ سے ینی چری اگر اپنے زمانے کی منظّم ترین اور باضابطہ فوج تھی، جو ایک لمبے عرصے تک ناقابل شکست باور کی جاتی تھی تو دوسری طرف عثمانیوں کی انتظامیہ کو بھی بہترین منتظم میسر آئے، جنہوں نے اپنی صلاحیتوں سے اس کے عروج و ترقی میں اہم رول ادا کیا۔ ان سب چیزوں سے بڑھ کر عثمانی حکمرانوں اور حکمراں طبقے کے وہ ذاتی اوصاف تھے جو انہیں اس زمانے کی برائیوں، مثلاً جوا، شراب، بےحیائی، بددیانتی، خودغرضی وغیرہ سے باز رکھتے تھے، بلکہ ترکوں کی روایتی شجاعت ان کے حکمرانوں کو میدان جنگ میں بھی سرگرم عمل رکھتی تھی۔ لیکن جیسے جیسے عثمانیوں کے ان اوصاف میں انحطاط آتا گیا، محکوم اقوام کی برائیاں اور بےحیائیاں ان کے حکمراں طبقے میں عام ہونے لگیں۔ حکمراں شجاعت و بہادری اور تدبّر جیسے اوصاف سے محروم ہونے لگے، عثمانی حکومت کو بھی زوال آتا گیا۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، حکمرانوں کی معمولی بے اعتدالیاں جو شروع میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں رفتہ رفتہ ایسی غلطیوں کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں جو کسی بھی خاندانی حکومت کو زوال کے راستے پر ڈالنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ عثمانی حکومت کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ مثال کے طور پر غیر ترک اور غیر مسلم عورتوں کی عثمانی حکمرانوں کے حرم میں شمولیت کا آغاز بالکل ابتدائی دور میں ہی ہو

گیا تھا۔ چونکہ ابتدائی عثمانی حکمراں نہایت قابل اور باصلاحیت تھے اس لیے اس کے اثرات ان کی حکومت پر شروع کے دور میں نہیں پڑے۔ لیکن جب حکومت کی باگ ڈور نسبتاً کمزور عثمانی حکمرانوں کے ہاتھ میں آئی تو امور حکومت میں حرم کا دخل روز بروز بڑھنے لگا، جو عثمانی حکومت کے زوال کے بنیادی اسباب میں شامل ہے۔ اسی طرح ابتدائی دور کے عثمانی حکمراں براہ راست نہ صرف جنگوں میں شرکت کرتے تھے بلکہ امور حکومت کی انجام دہی کی تربیت کے لیے عثمانی شہزادے سلطنت کے مختلف علاقوں میں مامور بھی ہوتے تھے۔ سلیمان اعظم کے زمانے سے اس روایت کو بدل دیا گیا اور شہزادوں کو محل کے اندر رکھا جانے لگا۔ محل کے اندر عیش وعشرت کی زندگی کے جو نتائج نکلتے ہیں ان سے عثمانی شہزادے بھی محفوظ نہیں رہے۔ وہ عیش وعشرت میں پڑ کر ناکارہ ہو گئے اور عثمانی حکومت کے زوال کا سبب بنے۔ حالانکہ بظاہر شہزادوں کو محل میں رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح ہر حکمراں کے انتقال کے بعد مختلف علاقوں میں موجود شہزادوں کے درمیان حکومت کے حصول کے لیے جو کش مکش ہوتی ہے اسے روکا جائے۔ لیکن ایک احتیاطی تدبیر حکمرانی کے جوہر کے خاتمے کا سبب بن گئی۔

24.4 عثمانی حکومت کے زوال کے اسباب

اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطان محمد فاتح کی فتح قسطنطنیہ اور بعد ازاں سلطان سلیمان اعظم (قانونی) کی فتوحات نے عثمانی حکومت کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عروج وترقی کی اسی عظمت وشوکت کے بطن سے عثمانی حکومت کے زوال نے بھی جنم لینا شروع کیا اور ''دولت عثمانیہ'' کے مؤلف ڈاکٹر محمد عزیز کے مطابق اب سے بہت پہلے بلکہ سلیمان اعظم کے سو سال بعد ہی ایک ترک مؤرخ قوچی بے نے 1663ء میں سلطنت عثمانیہ کے زوال پر ایک کتاب لکھی تھی۔ حالانکہ اس وقت اس کی باتوں پر دھیان نہیں دیا گیا۔ لیکن اس نے اپنی کتاب میں دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے زوال کی بنیاد سلیمان اعظم کے عہد حکومت میں ہی پڑ چکی تھی، اور اس نے اسباب زوال کو بھی اپنی کتاب میں ذکر کیا تھا۔ اسی طرح مشہور ترک ادیبہ خالدہ ادیب خانم نے بھی عثمانی حکومت کے زوال کا سرِ آغاز سلیمان اعظم کے دور حکومت کو ہی قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق اگرچہ سلیمان اعظم کی حکومت دنیا کے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی اور وہ اتنی طاقت ور فوج کا سربراہ اعلیٰ تھا جو یورپ کی مشترکہ افواج کو بحر و بر دونوں میں بیک وقت شکست فاش دے سکتی تھی لیکن خود اس کی اقلیم قلب و دماغ پر اس کی روسی بیگم سلطانہ خرم، جسے اہل مغرب Roxalane (روکسلین) کے نام سے یاد کرتے ہیں، کا راج قائم تھا اور اس مملکت دل میں صرف اسی کا سکہ چلتا تھا۔ اسی طرح عثمانی حکومت کے زوال کے اسباب کی چھان بین کے وقت ہمیں سلطان محمد فاتح کے اس خونیں قانون کو بھی نہیں بھلانا چاہیے جس کے تحت جانشین حکومت کے لیے ضروری قرار پایا کہ وہ اپنے بھائیوں کو قتل کروادے۔ خود سلطان محمد فاتح نے بھی اپنی حکومت کا آغاز اپنے شیر خوار بھائی کے قتل سے کیا تھا۔ ذیل میں ہم عثمانی حکومت کے زوال کے اسباب کا ایک ایک کر کے ذکر کرتے ہیں۔

24.4.1 سلطان کی مجلس دیوان سے علیحدگی

عثمانیوں کے نظام حکومت کے تحت ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ عثمانی حکومت کی سب سے زیادہ بااختیار اور سب سے بڑی انتظامی مجلس اس کا دیوان تھا، جس کے اجلاس کی صدارت خود سلطان کرتا تھا اور جس میں عثمانی انتظامیہ، فوج اور عدلیہ کے اعلیٰ حکام،

وزراء اور ذمہ داران شامل ہوتے تھے۔ سلطان سلیمان اعظم سے پہلے دستور یہ تھا کہ سلطان خود مجلس دیوان میں بیٹھتا اور اس کا صدر نشین ہوا کرتا تھا۔ سلطان دیوان کی ہر مجلس میں خود موجود رہتا تھا اور سلطنت کے وزیروں اور اعلیٰ حکام سے مختلف امور میں مشورے کرتا تھا۔ سلیمان اعظم نے اپنے عہد حکومت میں مجلس میں سلطان کی موجودگی کے اس دستور کو موقوف کر دیا۔ وہ دیوان کے بجائے اس سے متصل ایک علاحدہ کمرے میں بیٹھنے لگا اور وہیں جالیوں سے مجلس کی تمام کارروائیوں کو سنا کرتا تھا۔ سلیمان کے بعد اس کے جانشینوں نے متصل کمرے میں بیٹھنے اور وہاں سے مجلس کی کارروائی پر نظر رکھنے کی زحمت کو بھی کنارے لگا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیوان کی تمام کارروائی صدر اعظم (وزیر اعظم) کے سپرد ہوگئی اور اسے تمام ملکی، فوجی اور عدالتی اختیارات حاصل ہو گئے۔ البتہ اس تبدیلی کا خطرناک پہلو یہ تھا کہ سلطان اب مجلس دیوان کے مشوروں سے محروم ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد کے سلاطین زیادہ مطلق العنان ہونے لگے۔ سلیمان کے زمانے میں دستور کی اس تبدیلی کے بُرے نتائج اس لیے ظاہر نہیں ہوئے کہ وہ خود باتدبیر اور عالی دماغ سلطان تھا، اس لیے وہ بہترین فیصلے کر سکتا تھا۔ لیکن بعد کے سلاطین جو ان خصوصیات کے حامل نہیں تھے، ان کے زمانے میں اس تبدیلی کے مضر اثرات سامنے آنے لگے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے وہ ایک طرف تو باصلاحیت اور اہل افراد کے مشوروں سے محروم ہوئے، دوسری طرف ان کے اردگرد تملق پسندوں، چاپلوسوں اور خود غرض افراد کا حصار تنگ ہونے لگا۔ اسی طرح سلاطین کی کارکردگی اور فیصلوں پر حرم کی خواتین بھی اثر انداز ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عثمانی حکومت روبہ زوال ہونے لگی۔

24.4.2 اعلیٰ عہدوں پر تقرری کے اصول میں تبدیلی

عثمانی نظام حکومت کے مطالعے کے دوران ہم یہ بھی جان چکے ہیں کہ اس حکومت میں انتظامیہ کے تمام اعلیٰ عہدوں پر تقرری ادارۂ حکومت کے تحت انتخاب و تربیت کے ایک مشکل عمل کے ذریعہ ہوتی تھی، جس کی وجہ سے حکومت کو چلانے کے لیے بہترین اور اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل افراد کار مہیا ہوتے تھے۔ کم صلاحیت کے لوگ اعلیٰ عہدوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ سلطان سلیمان اعظم نے اپنے زمانہ حکومت میں ایک نئی روایت یہ ڈالی کہ کچھ ایسے لوگ جنہوں نے انتخاب و تربیت کے تدریجی مراحل نہیں طے کیے تھے، صرف اپنی مردم شناسی کی وجہ سے اس نے ان کا تقرر اعلیٰ عہدوں پر کر دیا۔ بلاشبہ سلیمان اعظم کو مردم شناسی کا خاص ملکہ حاصل تھا اور اس نے سلطنت کے عام اصول کو نظر انداز کر کے کئی بہترین مدبر اپنی حکومت کے لیے حاصل کیے۔ مثال کے طور پر اس کے وزیر اعظم ابراہیم پاشا کو پیش کیا جا سکتا ہے، جسے اس نے محض اپنی مردم شناسی کی بنیاد پر اپنی حکومت کے اعلیٰ ترین منصب صدر اعظم (وزیر اعظم) پر مقرر کر دیا۔ (کہا جاتا ہے کہ ابراہیم اصلاً یونانی نسل کا تھا اور ایک لڑائی میں گرفتار ہو کر غلام بنا لیا گیا تھا۔ اسے ایک دولت مند ترک بیوہ نے خریدا اور اس کی ذہانت و فطانت کو دیکھتے ہوئے بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ ابراہیم فن موسیقی کا بھی ماہر تھا، ایک سفر میں سلیمان کی نظر اس پر پڑی اور وہ اسے لے کر قسطنطنیہ آ گیا۔ یہاں آ کر اس کے دوسرے جوہر بھی کھلے۔ سلیمان اعظم اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کا نکاح اپنی بہن سے کر دیا اور اسے اپنا وزیر اعظم بنا لیا) سلیمان اعظم نے اپنی مردم شناسی سے کئی دوسرے لوگوں کو بھی اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا جو بلاشبہ اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان سے سلطنت کو فائدہ بھی پہنچا۔ لیکن مردم شناسی کی جو صلاحیت سلیمان اعظم کو حاصل تھی وہ اس کے بعد کے عثمانی سلاطین میں نہیں پائی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روایت جس کو سلیمان اعظم نے سلطنت کی بھلائی کے لیے توڑا تھا، اس کے جانشینوں کے دور میں اس کا استعمال تملق پسندوں کے انتخاب اور حرم کی بیگمات

کو خوش کرنے کے لیے ہونے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اعلیٰ عہدوں پر بے صلاحیت افراد کا تقرر ہونے لگا اور جو باصلاحیت افراد ادارۂ حکومت کے انتخاب و تربیت کے مراحل طے کر کے ان مناصب کے امیدوار ہوتے تھے ان میں بے چینی پیدا ہونے لگی۔ یہ بھی عثمانی حکومت کے زوال کا ایک اہم سبب بنا۔

24.4.3 رشوت ستانی کی گرم بازاری

عثمانی حکومت کے زوال کا ایک بنیادی سبب سلطنت میں جاری رشوت ستانی کی گرم بازاری بھی تھی۔ عہد زوال کے عثمانی حکمرانوں کے دور میں حکومت کی ملازمتیں اور نوکریاں صلاحیتوں کی بنیاد پر لوگوں کو نہیں ملتی تھیں بلکہ انہیں نیلام کیا جاتا تھا اور جو شخص زیادہ بولی لگاتا تھا وہ اس کا حق دار قرار پاتا تھا۔ عثمانی حکومت کے زوال کے اس اہم سبب کا سرِ آغاز بھی ہمیں سلیمان اعظم کے زمانے میں ہی ملتا ہے۔ عثمانی حکومت میں اس بدعت اور بڑی خرابی کا آغاز سلیمان اعظم کے دوسرے وزیر اعظم رستم پاشا نے کیا۔ یہ شخص سلیمان کا داماد تھا اور سلطان کی چہیتی ملکہ سلطانہ خرم کا منظور نظر تھا۔ اس کی سفارش سے بلکہ سازش سے وزارت عظمیٰ کے عہدے تک پہنچا تھا۔ وہ پندرہ سال تک عثمانی حکومت میں وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہا۔ وہ شاہی خزانہ کے لیے رقم حاصل کرنے کے ہنر سے خوب اچھی طرح واقف تھا اور اسی کی آڑ میں اس نے عثمانی سلطنت میں رشوت کے چلن کو عام کیا۔ وزیر اعظم کے طور پر اس کا طریقہ یہ تھا کہ سلطنت کے انتظامی عہدوں پر جو لوگ مقرر کیے جاتے تھے ان سے ان کے تقرر کے موقع پر رستم پاشا عہدے کی مناسبت سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا تھا۔ سلیمان کے زمانے میں اس خرابی کے آثار زیادہ نمایاں اس لیے نہیں ہوئے کہ اس کے عہد میں رقم کی مقدار عہدے اور منصب کی تنخواہ کی مناسبت سے طے کی جاتی تھی اور ایک متعین رقم سے زیادہ نہیں ہوسکتی تھی۔ اسی طرح یہ روایت صرف انتظامی عہدوں تک محدود تھی، بری و بحری افواج کی ملازمتیں اس سے مستثنیٰ تھیں۔ لیکن سلیمان اعظم کے بعد اس کے جانشینوں کے دور میں نہ صرف یہ کہ رقم کی متعین مقدار کی حد ختم کر دی گئی بلکہ انتظامی عہدوں کی قید بھی باقی نہیں رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کی ملازمتوں کے بدلے لوگوں سے موٹی موٹی رقمیں وصول کی جانے لگیں۔ سلطنت کی تمام فوجی و انتظامی ملازمتیں نیلامی کے لیے پیش ہونے لگیں۔ عہدے اور منصب انہیں لوگوں کو ملنے لگے جو اپنے تقرر کے وقت سب سے بڑی بولی لگا سکتے تھے، گویا ملازمتیں صلاحیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ پیسوں کی بنیاد پر حاصل کی جانے لگیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بڑے بڑے حاکموں سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ملازمین تک ہر سطح پر رشوت کی گرم بازاری عام ہوگئی۔ لوگ عہدے اور ملازمتیں حاصل کرنے کے لیے جا و بے جا تمام طریقے استعمال کرنے لگے۔ اس طرح سلطنت عثمانیہ سلیمان اعظم کے زمانے کے بعد باصلاحیت حکام اور ملازمین سے محروم ہونے لگی اور یہ بھی اس کے زوال کا ایک اہم سبب بنا۔

24.4.4 وزراء و امراء کی شاہانہ زندگی

سلطان سلیمان اعظم کے زمانے تک، جب کہ اعلیٰ عہدوں کے تقرر میں تبدیلی نہیں ہوئی تھی، وزراء اور اعلیٰ حکام کا تقرر ادارۂ حکومت سے ہوتا تھا اور چونکہ ان کی وفاداری خالص سلطان کی ذات تک محدود ہوتی تھی اور ان کے لیے سلطان قلی (سلطان کا غلام) سے بڑھ کر کوئی دوسرا اعزاز نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے مال و دولت ان کے لیے ثانوی (دوسرے درجے کی) حیثیت رکھتے

تھے۔ سلیمان اعظم کی ایک عادت یہ تھی کہ دوسرے مطلق العنان حکمرانوں کی طرح وہ بھی جس وزیر یا حاکم سے خوش ہوتا تھا، اسے بے تحاشا انعام واکرام سے نوازتا تھا۔ یہی نہیں وہ خواہ کتنا ہی مال و دولت جمع کرلیں ان سے کوئی پرسش نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ اس کے دور حکومت میں پہلے ابراہیم پاشا جو تیرہ سال تک وزیراعظم رہا اور رستم پاشا جو پندرہ سال تک وزیراعظم رہا، دونوں نے بے انتہا دولت جمع کی اور انہوں نے شاہ خرچی اور شاہانہ زندگی کا ایک ایسا معیار قائم کیا جس نے انہیں سلطان کا تقریباً ہم پلّہ بنادیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابراہیم پاشا کے زوال کا ایک سبب محلاتی سازش کے علاوہ اس کی شاہانہ زندگی بھی بنی۔ دوسرے وزیروں اور اعلیٰ عہدے داروں نے بھی انہیں کی پیروی کرنے اور انہیں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اعلیٰ معیار زندگی کے فراق میں انہوں نے جاوبے جا تمام طریقے مال و دولت کے حصوں کے لیے استعمال کرنے شروع کردیے، جو سلطنت عثمانیہ کے زوال میں معاون ہوئے۔

24.4.5 امور حکومت میں حرم کی دخل اندازی

تاریخ میں حرم کی بہت سی خواتین ایسی گزری ہیں جن کے صایب اور مناسب مشوروں سے حکمرانوں نے نہ صرف فائدہ اٹھایا ہے بلکہ کئی باران کے مشورے حکومت کی پائداری اور استحکام کا سبب بھی بنے ہیں۔ لیکن جب مشورے حرم کی سازشوں کی شکل اختیار کرلیتے ہیں اور امور حکومت میں حرم کی خواتین کی دخل اندازی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو محلاتی سازشوں کے نتیجے میں کتنی ہی حکومتیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ سلطنت عثمانیہ کے زوال میں ایک اہم سبب حکومت کے امور میں حرم کی بے جا دخل اندازی اور سازشیں بھی بنیں۔ بلکہ اسے ایک قوی سبب کہنا مناسب ہوگا۔ اوپر مذکور دیگر اسباب زوال کی طرح امور حکومت میں حرم کی عورتوں کی مداخلت اور سازشوں کا آغاز بھی سلطان سلیمان اعظم کے زمانے میں ہی ہوا، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا سلیمان اعظم کی روسی بیوی سلطانہ خرم یا روکسلین (Roxalane) کو سلطان کے مزاج میں خاص دخل تھا۔ وہ اپنے بیٹے سلیم کو سلیمان کے بعد سلطنت عثمانیہ کے تخت وتاج کا وارث بنانا چاہتی تھی جب کہ سلیمان کا بڑا بیٹا مصطفیٰ، جو دوسری بیوی سے تھا، نہایت ہی لائق اور بہادر تھا۔ اس کے مقابلے سلیم عمر میں چھوٹا ہونے کے علاوہ عیش پسند بھی تھا، لیکن سلطانہ خرم نے سلیمان کے کان بھر کر اسے شہزادہ مصطفیٰ سے بدظن کر دیا۔ نتیجے میں سلیمان اعظم نے خود اپنے سامنے اپنے بیٹے کو گلا گھونٹ کر مروادیا۔ سلیمان کے دوسرے بیٹے بایزید اور اس کے بیٹوں کے قتل کے پیچھے بھی سلیمان کی اسی روسی حرم کا ہاتھ تھا۔ یہاں تک کہ سلیمان کے لائق وزیراعظم ابراہیم پاشا کا خون بھی سلطانہ خرم کی سازش کا نتیجہ تھا۔ جو اپنے داماد رستم پاشا کو اس کی جگہ وزیراعظم بنوانا چاہتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلیمان کے حسن تدبّر کی وجہ سے زوال کے آثار اس کے زمانے میں بلکہ اس کے بعد بھی ایک زمانے تک بہت زیادہ نمایاں نہیں ہوئے۔ لیکن سلیمان کے بعد امور حکومت میں حرم کی خواتین کی دخل اندازی اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور محلاتی سازشوں نے ایسی شکل اختیار کرلی کہ حکمرانوں کا عروج وزوال سب کچھ محل کی سازشوں کے تحت ہونے لگا۔ اس طرح امور حکومت میں حرم کی خواتین کی بے جا دخل اندازی بھی عثمانی حکومت کے زوال کا ایک اہم اور بنیادی سبب بنی۔

24.4.6 عثمانی شہزادوں کی محل تک تحدید

جہاں گیری و جہاں بانی کے اصول و آداب درس گاہوں کی چہار دیواری کے اندر نہیں بلکہ کوہ و بیابان میں سکھائے جاتے ہیں۔ ابتدائی دور کے عثمانی حکمرانوں کی طاقت کا راز اس میں پنہاں تھا کہ ان میں کا ہر ایک حکمراں بہترین مرد میدان بھی ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنی فوجوں کی کمان خود اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے میدان جنگ میں بھی موجود رہتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں اپنے زمانے کے بڑے بڑے فاتح پیدا ہوئے۔ عثمانی شہزادوں کی تربیت شاہی محل کے بجائے جنگ کے میدانوں اور صوبوں کے دارالحکومتوں میں ہوا کرتی تھی۔ جہاں انہیں حکمرانی کا براہ راست تجربہ حاصل ہوتا تھا۔ سلیمان اعظم کے زمانے میں حرم کی خواتین خاص طور پر سلطانہ خرم کے زیر اثر طرز حکمرانی میں جہاں اور دوسری بدعات کو رواج حاصل ہوا وہیں ایک انتہائی مہلک بدعت یہ رائج ہوئی کہ عثمانی شہزادوں کو محل کے اندر ہی ایک طرح سے قید میں رکھ کر ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جانے لگا۔ اس کے زمانے میں شہزادوں کو قید رکھنے کا جو قانون بنایا جو روایت پڑی، اس نے کافی دنوں کے لیے عثمانی حکمرانوں کی شان و عظمت پر گہن لگا دیا۔ کیونکہ نئی روایت کے مطابق عثمانی شہزادوں کو مختلف زبانوں اور علوم و فنون کی تعلیم تو دی جاتی تھی لیکن ان کی جسمانی تربیت اور عملی تجربہ حاصل کرنے کا نظم نصاب سے خارج ہوگیا۔ شہزادوں کو قصر شاہی سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عثمانی خاندان میں اب ایسے حکمراں پیدا ہونے لگے، جنہوں نے تخت نشینی سے پہلے تک شاہی محل سے باہر کی دنیا کو نہیں دیکھا تھا۔ بند محل کے اندر کی تعلیم اور عیش و عشرت کی زندگی نے جفاکش عثمانی خاندان کے شہزادوں کو آسایش اور آرام پسند بنا دیا اور وہ حکومت کے کاروبار سے غافل ہوگئے۔ یہی وجہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ سلیمان اعظم کے بعد عثمانی خاندان میں معدودے چند قابل اور باصلاحیت حکمراں پیدا ہوئے۔

24.4.7 ولی عہدی کا طریقہ

عثمانی حکومت کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ ایک خاندان کی خالص موروثی حکومت تھی جس میں حکومت ایک ہی خاندان میں محدود رہتی ہے خاص طور پر باپ کے بعد بیٹا اس کی حکومت کا وارث ہوتا ہے۔ خاندانی یا موروثی حکومتوں میں صلاحیت و قابلیت کے بجائے اصل اہمیت حکمراں خاندان سے تعلق کو ہوتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں کئی بار ایسے لوگوں کو حکمرانی مل جاتی ہے جو کسی بھی طور پر اس کے اہل نہیں ہوتے اور پھر اس خاندان کی حکومت کے زوال کا سبب بن جاتے ہیں۔ موروثی حکومتوں کے اس کلیے سے آل عثمان کی حکومت بھی مستثنیٰ نہیں تھی۔ وہاں بھی رواج یہی تھا کہ باپ کے بعد بیٹا اس کا جانشین ہوتا تھا۔ بہت بعد میں جا کر 1617ء میں سلطان احمد اوّل کے انتقال کے بعد قانون وراثت میں یہ تبدیلی آئی کہ آل عثمان کا وہ شہزادہ تخت کا وارث ہوگا جو عمر میں سب سے زیادہ ہوگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اکثر بڑا بیٹا، خواہ وہ کتنا ہی نااہل کیوں نہ ہو، اپنے آپ کو تخت و تاج کا وارث خیال کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے ولی عہدی کے زمانے سے ہی اس کے اردگرد تملق پسندوں اور چاپلوسوں کا ایک ایسا حصار قائم ہو جاتا تھا جو صرف اس کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے تھے۔ نتیجے میں اسے اس کی کمزوریاں معلوم ہی نہیں ہو پاتی تھیں پھر جب وہ تخت نشین ہو کر حکمراں بن جاتا تھا تو ان غرض کے بندوں کی بن آتی تھی اور وہ اسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتے تھے اور اس طرح فتنہ و فساد کا سبب بنتے تھے۔ موروثی اور خاندانی حکومت کا اس سے بھی خطرناک پہلو یہ ہے کہ شہزادوں کے درمیان اقتدار کے حصول کے لیے

چپقلش پیدا ہو جاتی ہے، محل کے اندر اور باہر مختلف گروہ بن جاتے ہیں اور ہر طرف سازشوں کا جال بُنا جانے لگتا ہے اور نتیجہ کئی بار شہزادوں کے درمیان قتل و خوں ریزی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ عثمانی حکومت بھی موروثی حکومتوں کی اس کمزوری سے محفوظ نہیں تھی۔ محمد فاتح جیسا عظیم فاتح اور حکمران بھی اس بیماری سے نہیں بچا، اس نے اس خوف سے تخت نشینی کے فوراً بعد اپنے دودھ پیتے (شیر خوار) بھائی کو حوض میں غرق کر کے مروا دیا کہ کہیں وہ اس کے برابر نہ ہو جائے۔ یہی نہیں اس نے ایک ایسا قانون بنا دیا جس کی رو سے حکومت حاصل کرنے والے عثمانی فرماں روا کے لیے لازمی قرار پایا کہ وہ اپنے بھائیوں کو قتل کرا دے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ولی عہدی کے رواج سے ہونے والے خون خرابے اور اس کے لیے ہونے والی محلاتی شازشوں نے بھی سلطنت عثمانیہ کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں اہم رول ادا کیا اور اس کے زوال کا سبب بنیں۔

24.4.8 اجنبی عورتوں سے شادی

عثانی حکومت کے زوال کے اسباب میں ایک سبب عثانی حکمرانوں کی اجنبی (غیر مسلم) خواتین کے ساتھ شادی بھی تھا۔ غیر مسلم خواتین کے ساتھ شادیوں کے معاملے میں عثانی حکمراں اپنے ابتدائی دور سے ہی غیر محتاط رہے تھے۔ آل عثمان کا دوسرا حکمراں اورخاں تھا، اس نے ایک عیسائی شہزادی سے شادی کی تھی اور اسے اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت دی تھی۔ اس کے بعد سلطان مراد اور بایزید یلدرم نے بھی غیر مسلم عیسائی عورتوں سے شادیاں کر رکھی تھیں۔ سلیمان اعظم کی روسی بیوی کے بارے میں ہم پہلے ہی پڑھ چکے ہیں۔ متعدد عثانی حکمراں ایسے گزرے ہیں جن کی مائیں غیر مسلم تھیں۔ شادیوں کے علاوہ بھی حکمرانوں کے محل میں کنیزوں اور باندیوں کی شکل میں غیر مسلم خواتین کی ایک بڑی تعداد موجود رہتی تھی۔ اور مختلف مواقع پر یہ امور سلطنت پر بھی اثر انداز ہوتی تھیں۔ ایک مورخ نے عثمانیوں کے اسباب زوال سے بحث کرتے ہوئے اسے بھی زوال کے بنیادی اسباب میں شمار کیا ہے۔ اس کے مطابق:

> ''آل عثمان کے انحطاط کا ایک جوہری سبب یہ ہے کہ عیسائی باندیوں اور کنیزوں کی کثرت کی وجہ سے سلطانی خون بہت زیادہ بدل گیا تھا''۔ (الاسلام والحضارۃ العربیۃ۔ ج2، ص499)

بلاشبہ اسلام نے اہل کتاب خواتین کے ساتھ ازدواجی رشتے قائم کرنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن جب اس طرح کے رشتے سماجی تانے بانے کو متاثر کرنے لگیں یا حکومتوں کی کارکردگی پر اثر انداز ہونے لگیں تو مصلحت اس میں ہے کہ اس سے گریز کیا جائے۔ خود عہد صحابہ میں اس طرح کی مثالیں موجود ہیں جب خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو کتابیات کے ساتھ شادی سے منع کر دیا تھا۔

24.4.9 فوج کی سرکشی

ہم پڑھ چکے ہیں کہ عثمانیوں کی کامیابی کا اصل دارومدار اور راز ان کی منظم اور باضابطہ فوج میں تھا۔ عہد زوال میں جب درباری سازشیں بڑھیں تو اس کا اثر فوج پر بھی پڑا۔ عثانی فوج جواب تک ہر طرح کے لالچ سے الگ تھی اس کے لیے نشان امتیاز سلطان قلی کہلانا تھا، رفتہ رفتہ اس کے اندر سے بھی سلطان کی محبت کا جذبہ مفقود ہونے لگا اور اطاعت و فرماں برداری کا ان کا نمایاں وصف ختم ہو گیا۔ ینی چری کے طریقہ انتخاب میں اور ان فوجیوں کی اولاد کی فوج میں بھرتی کے حوالے سے قوانین میں جو نرمی برتی گئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ بہادر فوج نہ صرف یہ کہ اپنا وقار کھو بیٹھی بلکہ یہ بھی دنیاوی آسایشوں میں پڑ گئی۔ ہر سلطان کی تاج پوشی کے

موقع پر ان کی جانب سے تنخواہوں میں اضافے اور دیگر مراعات کا مطالبہ ہونے لگا۔ یہ فوج اتنی زیادہ جری ہوگئی تھی کہ جب بھی اس کے مطالبات پورے نہیں ہوتے بغاوت پر آمادہ ہو جاتی۔ اس نے انتظامی معاملات میں بھی مداخلت کرنی شروع کردی۔ سلطنت کے مختلف عہدوں پر تقرر کے معاملے میں بھی اس کا عمل دخل بڑھ گیا یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ عثمانی سلاطین کا عزل ونصب ایک طرح سے ان کے ہاتھ میں چلا گیا۔ فوج کا کام سرحدوں کی حفاظت اور ملک میں امن وامان کا قیام ہے اگر وہ سلطنت کے امور میں دخل اندازی کرنے لگے تو پھر اس کا کردار مجروح ہو جاتا ہے اور وہ سرکش قرار پاتی ہے۔ اس طرح عثمانی فوج کی سرکشی بھی اس حکومت کے زوال کا ایک اہم سبب بنی۔

24.4.10 امراء اور وزراء کی مفاد پرستی

کہا جاتا ہے کہ سماج میں بگاڑ ہمیشہ اعلیٰ طبقات سے شروع ہوتا ہے۔ ایسا ہی کچھ عثمانی سماج کے ساتھ بھی ہوا۔ جب حکمرانوں کے اخلاق وکردار میں بگاڑ آیا تو ان کے نزدیکی امیروں اور وزیروں کے اخلاق بھی خراب ہوگئے۔ ان کو صرف اپنے ذاتی مفادات سے غرض رہنے لگی، سلطنت کے مفادات کو انہوں نے پس پشت ڈال دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سلطنت کے مخالفین اور دشمنوں کے ساتھ مل کر اس کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ مختلف مواقع پر ان امیروں اور وزیروں نے سلطان کے ساتھ وفاداری کے بجائے غداری کا ثبوت دیا۔ یا تو وہ دشمن کے ساتھ جا ملے یا پھر ایسے طریقے اختیار کیے جن کا فائدہ بالواسطہ یا بلاواسطہ عثمانی سلطنت کے دشمنوں کو پہنچا۔ اس طرح عثمانی امراء اور وزراء کی مفاد پرستی بھی سلطنت کے زوال کا ایک اہم سبب بنی۔

24.4.11 مذہبی علماء کا جمود

عثمانی ترکوں کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ شروع دور سے ہی وہ مذہب اور مذہبی علماء کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کی بڑی بڑی فتوحات کی پشت پر بڑی حد تک مذہبی جذبہ بھی کارفرما تھا۔ سلطان اپنی تمام تر خودمختاریوں کے باوجود خود کو شریعت و مذہب سے بلند نہیں سمجھتا تھا۔ سلطنت میں شیخ الاسلام یا مفتی اعظم جیسا موقر اور اہم عہدہ جو صدر اعظم کے عہدے کے تقریباً برابر تھا، عثمانی سلطنت میں علماء کی حیثیت کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن جب عثمانی ترکوں کا عمومی زوال شروع ہوا تو علماء کا طبقہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہا۔ اس دور کے علماء ذہنی وفکری جمود کا شکار ہوگئے۔ ہر نئی چیز کی مخالفت وہ محض اس بنیاد پر کرنے لگے کہ اس کی نظیر اسلامی شریعت کے پہلے سے موجود مذہبی سرمایہ میں نہیں تھی۔ عثمانی دور کے عہد زوال کے علماء نے ان حکمرانوں اور ان کی اصلاحات کی کھل کر اور پرزور مخالفت کی جو اصلاحات کے ذریعہ عثمانی حکومت کو اس کا کھویا ہوا وقار واپس دلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ سلطان سلیم ثالث نے جب عثمانی فوج کی اصلاح کرنی چاہی اور اسے جدید انداز میں منظم کرنے کی کوشش کی تو اس وقت کے شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی نے نہ صرف یہ کہ اس کی مخالفت کی بلکہ یہ فتویٰ دے دیا کہ جدید قسم کا فوجی لباس پہننا شعائر اسلام کے خلاف ہے۔ یہاں تک کہ انہی علماء نے سلطان سلیم کی معزولی کا شرعی جواز بھی فراہم کیا۔ اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مذہبی علماء کا جمود بھی عثمانی حکومت کے زوال کا ایک اہم سبب بنا۔

24.4.12 ترک قوم پرستی

عثمانی سلطنت میں ترکوں کے علاوہ مختلف نسلوں اور قومیتوں کے لوگ بھی آباد تھے۔ حالانکہ عثمانی حکمرانوں کی جانب سے ایسے اقدامات نہیں ہوئے جنہیں ہم ترک قوم پرستی کی طرف لے جانے والا کہیں۔ لیکن اس وقت کے یورپ میں قومی بیداری کی جو لہر چلی رہی تھی اس سے عثمانی سلطنت کے ترکوں میں بھی ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جو ترک قوم پرستی کا حامی تھا۔ عثمانی حکومت کے زوال میں اس عنصر نے بھی اپنا رول ادا کیا اور بالآخر اسی کے ذریعہ عثمانی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

24.4.13 عربوں کی بغاوت

عثمانی سلطنت ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ جب عثمانیوں کا زوال شروع ہوا تو مرکز کمزور ہو گیا۔ نتیجے میں مختلف علاقوں میں مقامی حکام کے ذریعہ عام لوگوں پر زیادتیاں بھی ہوئیں، جس سے لوگ عثمانی حکومت کے مخالف ہو گئے۔ اس کا سب سے نمایاں اظہار عربوں کی بغاوت کی شکل میں ہوا۔ حالانکہ عثمانی حکمراں اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود حرمین اور آس پاس کے عرب علاقوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ لیکن عربوں کو یورپی طاقتوں نے خود مختاری کا سبز باغ دکھا کر ان کو عثمانی حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ عربوں کی بغاوت نے بھی عثمانی حکومت کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔

24.4.14 اقتصادی بدحالی

مختلف وجوہ سے عثمانی حکومت نئے حالات اور تقاضوں کا ساتھ دینے سے قاصر رہی۔ یورپ کے صنعتی انقلاب سے ترکوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، جب کہ جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جس پیمانے پر رقم کی ضرورت تھی، وہ پرانے نظام کے تحت نہیں فراہم ہو رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی پر قرضوں کا بوجھ بڑھتا گیا اور وہ اقتصادی بدحالی کا شکار ہو گیا۔ چنانچہ اقتصادی بدحالی نے بھی اس کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔

24.4.15 معاصر اقوام کی بیداری اور عثمانی حکومت کے خلاف سازشیں

ایک طرف عثمانی ترکی کی حالت یہ تھی کہ وہ لکیر کا فقیر بنا رہا تو دوسری طرف اس کی ہم سایہ قوموں نے علوم وفنون سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف یہ کہ ان میں ترقی کی بلکہ اس ترقی کے ذریعہ نئی نئی ایجادات کیں جو ان کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بن گئیں۔ علمی وسیاسی انقلاب کے ساتھ صنعتی انقلاب نے مل کر ترکی کی ہم سایہ قوموں کو بہت زیادہ طاقتور بنا دیا۔ انہوں نے عثمانیوں سے یورپی علاقوں کو چھیننے کا منصوبہ بنایا۔ نیز دوسرے علاقوں کے بھی حصے بخرے کرنے کے لیے سازشیں کیں۔ اس طرح یہ بھی عثمانی حکومت کے زوال کا ایک سبب بنا۔

معلومات کی جانچ

1. مجلس دیوان میں سلطان کی موجودگی کا دستور کس نے موقوف کیا؟
2. اعلیٰ عہدوں پر تقرری کے اصول میں تبدیلی سے کیا نتائج برآمد ہوئے؟
3. عثمانی حکومت کے زوال کے اسباب میں سے پانچ اسباب بتائیے۔

24.5 عثمانی حکومت کے زوال کو روکنے کی کوششیں

اکائی کے شروع میں ہم یہ بات لکھ چکے ہیں کہ مسلم دنیا میں سب سے طویل حکومت کا سہرا عثمانی خاندان کے سر ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عثمانیوں کا زوال دوسری خاندانی حکومتوں کی طرح بالکل اچانک سو پچاس برس کے اندر نہیں ہوگیا۔ بلکہ زوال کے آغاز کے بعد بھی اپنے مخصوص نظام حکومت کی وجہ سے عثمانیوں نے سو برس سے زیادہ عرصے تک اپنے دبدبے کو برقرار رکھا اور اس کے بعد بھی دو سو برس کے عرصہ زوال میں متعدد ایسی کوشش عثمانی حکمرانوں کے ذریعہ ہوتی رہیں جن کا مقصد زوال کو روکنا تھا۔ اکائی کے اس حصے میں ہم ان کوششوں کا ذکر کریں گے جو مختلف عثمانی حکمرانوں نے حکومت کے زوال کو روکنے کے لیے کیں۔

عثمانی دور زوال میں سلطان محمود اول (1730ء تا 1754ء) شاید پہلا عثمانی حکمراں ہے جس نے اپنے فوجی نظام کی کمزوری کو سمجھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ترکوں کی شکست کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی فوجوں کی تنظیم یورپ کی فوجوں کے مقابلے میں اچھی نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے پاس جو ہتھیار ہیں وہ یورپی افواج کے ہتھیاروں کے مقابلے کمتر ہیں۔ عثمانی فوج کی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے محمود اول نے یورپی ملک فرانس کی مدد لی اور فرانسیسی فوجی ماہرین کی خدمات حاصل کیں۔ ان ماہرین کی کوشش اور توجہ سے عثمانی فوج کی تنظیم میں بہتری آئی اور اس کے بعد پیش آنے والے مختلف معرکوں میں اس نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ بھی کیا۔

البتہ سلطنت عثمانیہ کے زوال کو روکنے یا کم از کم اس کی رفتار کو سست کرنے کے لیے جس عثمانی حکمراں کی کوششیں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں وہ سلطان سلیم ثالث (1789ء تا 1807ء) ہے۔ اس نے سلطنت کے اندر تعلیم کے فروغ اور جدید علوم کی اشاعت پر خاص توجہ دی۔ بری اور بحری عثمانی فوجوں کو از سر نو منظم کر کے اسے تنظیم جدید کا نام دیا۔ جنگ کے فن سے متعلق فرانسیسی کتابوں کا ترکی زبان میں ترجمہ کرایا۔ اسی طرح توپ تیار کرنے کے نئے کارخانے قائم کیے گئے۔ نظام جاگیرداری میں اصلاح کی گئی اور امور سلطنت میں جمہوری مزاج پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن سلطان سلیم ثالث اپنی ان کوششوں میں زیادہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ ثروت صولت نے اسے اس طرح بیان کیا ہے:

> "مفاد پرست اور تنگ نظر لوگ سلیم کے خلاف ہوگئے۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ینی چری فوج جو کسی زمانے میں ترکی کی سب سے منظم اور طاقت ور فوج تھی نظام جدید کے خلاف تھی اور وہ اپنی اجارہ داری قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ینی چری کے سپاہیوں نے جدید یورپی اسلحہ رکھنے اور جنگی طریقوں کو اختیار کرنے سے بھی انکار کردیا۔ شیخ الاسلام اسعد آفندی اصلاحات کے حامی تھے لیکن 1807ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ نئے شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی ینی چری کے زیر اثر تھے۔ "جاہل صوفیوں" تنگ نظر علماء نے جو دین کے علم اور اس کی روح سے قطعاً بے بہرہ تھے، مذہب کے نام پر اصلاحات کی مخالفت کی۔ یورپی طرز پر فوجوں کی تنظیم کو بے دینی سے تعبیر کیا، جدید فوجی وردیوں کو تشبہ بالنصاریٰ (عیسائیوں کی مشابہت) قرار دیا، سنگین تک کے استعمال کی اس لیے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے اسلحے استعمال کرنا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ سلیم کے خلاف یہ کہہ کر نفرت پھیلائی گئی کہ وہ کفار کے طریقے رائج کر کے اسلام کو خراب کر رہا ہے۔ شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی نے فتویٰ دیا کہ ایسا بادشاہ جو قرآن کے خلاف عمل کرتا ہو بادشاہت کے لائق نہیں۔ آخر کار

1807ء میں سلیم کو معزول کر کے قتل کر دیا گیا۔'' یہ پہلا موقع تھا کہ مذہبی پیشواؤں نے اپنی حمایت اور تاریک خیالی سے اسلام کے مانع ترقی ہونے کا غلط تخیل پیدا کیا۔'' (ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ۔ دوم 49-448)

عثمانی حکومت کے زوال کو روکنے کی کوششوں میں سلطان محمود ثانی (1808ء تا 1839ء) کی خدمات سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اس کی جاری کردہ اصلاحات بروئے کار آنے دی جاتیں اور اس کی اور اس کے بعد سلطان عبدالمجید خاں کی کوششوں کو بیرونی طاقتیں اپنی مداخلت سے سبوتاژ نہیں کرتیں تو شاید عثمانی حکومت کا زوال نہیں ہوتا اور وہ جمہوری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے نئے دور میں داخل ہو جاتی۔ سلطان محمود نے سب سے پہلے اندرونی استحکام پر توجہ دی۔ کیونکہ وہ بدامنی اور سرکشی کے حالات میں برسرِاقتدار آیا تھا۔ استحکام حاصل ہوتے ہی اس نے اصلاحات کے کام کا آغاز کیا، اس حوالے سے اس کا بڑا کارنامہ ینی چری کا خاتمہ ہے جو اس وقت عثمانی حکومت کے لیے مصیبت بن گئی تھی۔ اس نے جدید طرز پر ایک نئی فوج تیار کی، جس کی وردی اور ٹوپی یورپی طرز کی تھی۔ جاگیرداری نظام کی اصلاح کی۔ اس نے دیوان کی مجلسوں میں پھر سے شرکت کرنی شروع کی (جو سلیمان اعظم کے زمانے سے ختم ہو گئی تھی)۔ سلطان محمود ثانی نے اصلاحات کا ایک پروگرام تیار کیا تھا اور اسے نافذ بھی کرنا چاہتا تھا لیکن بیرونی مداخلتوں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ ان اصلاحات کو اس کے انتقال کے فوراً بعد اس کے جانشین سلطان عبدالمجید خاں نے نافذ کیا اور ترکی میں ان اصلاحات کی شہرت ''تنظیمات خیریہ'' کے نام سے ہوئی۔ اصلاحات کے اس پروگرام کے ذریعہ سلطنت کی رعایا کو جان و مال اور آبرو کی ضمانت دی گئی۔ مذہب وملت کی کسی بھی تفریق کے بغیر سب کے ساتھ یکساں سلوک کا وعدہ کیا گیا۔ سلطنت کی حدود میں قانون کی بالادستی قائم کی گئی۔ انتظامی، فوجی اور تعلیمی میدانوں میں اصلاحات کی گئیں۔ اسی طرح سلطنت سے غلامی کے رواج کے خاتمے کا بھی قانونی طور پر اعلان کیا گیا۔ سلطان محمود کا تیار کردہ اصلاحات کا پروگرام جسے سلطان عبدالمجید خاں نے جاری کیا اس کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:

یہ امر بخوبی معلوم ہے کہ حکومت عثمانیہ کے ابتدائی دور میں قرآن مجید کے احکام اور سلطنت کے قوانین کا احترام ہمیشہ کیا جاتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کی طاقت وعظمت میں ترقی ہوتی گئی اور بلا استثنا اس کے تمام باشندوں میں بہت زیادہ خوش حالی اور فارغ البالی پھیل گئی۔

ڈیڑھ سو برس سے مسلسل حادثات اور مختلف اسباب سے شرع شریف اور قوانین سلطنت کی پابندی جاتی رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قوت اور خوش حالی ضعف اور افلاس سے بدل گئی ہے کیوں کہ جو سلطنت اپنے قوانین کی پابندی ترک کر دیتی ہے اس کا سارا استحکام بھی رخصت ہو جاتا ہے۔

ہم ابتدا ہی سے ان امور پر غور کر رہے ہیں اور تخت نشینی کے روز سے آج تک فلاحِ عامہ، صوبوں کی اصلاحِ حال اور قومی بار کی تخفیف ہماری توجہ کا مرکز ہے، اگر ہم عثمانی صوبوں کے جغرافی حالات، زمین کی زرخیزی اور باشندوں کی موزونی طبع اور ذکاوتِ فہم کو پیشِ نظر رکھیں تو ہمیں یقین آجائے گا کہ موثر طریقوں کے دریافت اور استعمال کرنے پر امید ہے کہ خدا کی مدد سے خاطر خواہ نتیجہ چند ہی سالوں میں حاصل ہو جائے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی مدد اور نبی کریم ﷺ کی دعا پر پورا اعتماد کر کے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ جدید قوانین کے ذریعہ سلطنت عثمانیہ کے صوبوں میں عمدہ نظم ونسق پیدا کرنے کی کوشش کریں، یہ قوانین خصوصیت کے ساتھ مندرجہ ذیل امور سے متعلق ہوں گے۔

(1) رعایا کی جان، آبرو اور مال کے کامل تحفظ کی ضمانت۔

(2) محاصل کی وصولی کا ایک باقاعدہ نظام۔

(3) فوج کی بھرتی اور اس کی مدتِ ملازمت کی تعیین کے لیے بھی ایسا ہی باقاعدہ نظام۔

محاصل کی تشخیص کا انتظام نہایت درجہ اہم ہے کیوں کہ سلطنت کو اپنے علاقوں کی حفاظت کرنے میں مختلف اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں اور فوجوں نیز دوسری ملازمتوں کے لیے روپیہ کی ضرورت رہتی ہے، جس کے حاصل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ رعایا پر چندے (ٹیکس) لگائے جائیں۔

اگر چہ خدا کی عنایت سے ہماری رعایا کچھ عرصہ سے اجاروں کی مصیبت سے نجات پا چکی ہے جن کو اب تک غلطی سے آمدنی کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا، تاہم ایک مہلک دستور اب بھی جاری ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں یعنی وہ مراعات جو 'التزامات' کے نام سے مشہور ہیں۔

اس نظام کے تحت صوبہ کا ملکی اور مالی انتظام کسی ایک شخص کی مطلق العنانی کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو بعض اوقات نہایت سخت گیر اور حریص ثابت ہوتا ہے کیوں کہ حاکم اگر نیک نہیں ہے تو وہ اپنے فائدے کے علاوہ کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔

لہٰذا ضروری ہے کہ آیندہ ملت عثمانیہ کے ہر فرد پر اتنا ہی محصول لگایا جائے جتنا اس کی حیثیت کے موافق ہو اور اس سے زیادہ کا مطالبہ اس سے نہ کیا جائے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ بری اور بحری فوجوں کے اخراجات کی تعیین خاص قوانین کے ذریعہ کر دی جائے، اگر چہ ملک کی حفاظت کا خیال سب پر مقدم ہے اور تمام باشندوں کا فرض ہے کہ اس مقصد کے لیے سپاہی فراہم کریں، تاہم ضروری ہے کہ وقت کی ضرورت کے لحاظ سے فوجی دستوں کے لیے جو ہر طبع مہیا کرے قوانین مقرر کر دیے جائیں، نیز فوجی سپاہیوں کی مدتِ ملازمت کم کر کے چار یا پانچ سال کر دی جائے، کیوں کہ ضلع کی آبادی کا لحاظ کیے بغیر کسی ضلع سے زیادہ اور کسی سے کم سپاہیوں کا بھرتی کرنا ناانصافی کے علاوہ ملک کی زراعت اور صنعت وحرفت کو ایک مہلک صدمہ پہنچانا ہے، اسی طرح سپاہیوں کو تمام عمر فوجی خدمت میں رکھنے کے لیے ان کے اندر مایوسی پیدا ہو جاتی ہے اور ملک کی آبادی بھی کم ہونے لگتی ہے۔

مختصر یہ کہ ان مختلف قوانین کے بغیر جن کی ضرورت تسلیم کر لی گئی ہے، سلطنت میں نہ قوت رہ سکتی ہے نہ دولت، نہ خوش حالی نہ امن، برخلاف اس کے ان جدید قوانین کی موجودگی سے یہ تمام باتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

لہٰذا آیندہ ہر ملزم کے مقدمہ کی سماعت علانیہ طور پر ہمارے شرعی قانون کے مطابق ہوا کرے گی اور جب تک باضابطہ فیصلہ نہ سنا دیا جائے کسی شخص کو اختیار نہ ہوگا کہ دوسرے کو خفیہ طور پر یا علانیہ زہر دے کر یا کسی دوسرے طریقے سے مار ڈالے۔

کسی کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ دوسرے کی آبرو پر حملہ کرے خواہ وہ کوئی بھی ہو، ہر شخص اپنے ہر قسم کے مال واسباب پر قابض رہے گا اور پوری آزادی کے ساتھ اسے فروخت یا منتقل کر سکے گا کسی کو اس میں مزاحمت کا حق نہ ہوگا، مثلاً کسی مجرم کے بے گناہ ورثہ اپنے قانونی حقوق سے محروم نہ کیے جائیں گے اور نہ اس مجرم کا مال واسباب ضبط کیا جائے گا۔

یہ مراعات ہماری تمام رعایا کے لیے خواہ وہ کسی مذہب یا فرقہ سے تعلق رکھتی ہو یکساں طور پر جاری ہوں گی اور وہ بلا استثنا ان سے مستفید ہوگی۔

پس جیسا کہ ہماری مقدس شریعت کے قانون کا تقاضا ہے سلطنت کے تمام باشندوں کو ان کی جان، آبرو اور مال کی نسبت ہماری طرف سے کامل ضمانت عطا کی جاتی ہے۔

دوسرے امور کے لیے چوں کہ ضروری ہے کہ اہل الرائے کے اتفاق سے طے کیے جائیں، اس لیے ہماری مجلس عدل (Council of Justice) جس میں متعین دنوں میں ہمارے وزرا اور اعیانِ سلطنت بھی شریک ہوا کریں گے، جان و مال کی حفاظت اور محاصل کی تشخیص کے متعلق بنیادی قوانین مرتب کرنے کی غرض سے منعقد ہوتی رہے گی، ان مجالس میں ہر شخص اپنے خیالات وآرا کا اظہار آزادی سے کرے گا۔

جو قوانین فوجی ملازمت سے متعلق ہوں گے ان پر مجلس حربی میں بحث ہوگی جس کا اجلاس سرعسکر کے محل میں ہوا کرے گا جس وقت کوئی قانون طے کر لیا جائے گا وہ فوراً ہمارے سامنے پیش کیا جائے گا اور اس غرض سے کہ وہ ہمیشہ کے لیے قایم اور قابل نفاذ ہو جائے ہم اس کی منظوری اپنے دستِ خاص سے اس کے اوپر لکھ دیں گے۔

چونکہ ان قوانین کا مقصد تمام تر مذہب، حکومت، قوم اور سلطنت کا احیا ہے، اس لیے ہم عہد کرتے ہیں کہ کوئی بات ایسی نہ کریں گے جو ان کے مخالف ہو۔

اپنے اس عہد کی ضمانت کے طور پر ہمارا ارادہ ہے کہ اس فرمان کو سلطنت کے تمام علما اور اعیان کی موجودگی میں اس ایوان میں رکھ دینے کے بعد جس میں نبی کریم ﷺ کے تبرکات رکھے ہوئے ہیں قادر مطلق کے نام پر خود بھی اس کی پابندی کا حلف لیں اور علما و اعیان کو بھی اس کا حلف دلوائیں۔ اس کے بعد علما یا اعیان میں سے کوئی شخص یا کوئی اور جو بھی ان قوانین کی خلاف ورزی کرے گا اسے بلا لحاظ اس کے رتبہ یا شہرت کے وہ سزا دی جائے گی جو جرم کے ثابت ہونے کی حالت میں مقرر ہے، اس کے لیے تعزیری قوانین کا ایک مجموعہ منضبط کیا جائے گا۔

چونکہ آج سے سلطنت کے تمام عہدہ داران کو معقول تنخواہیں دی جائیں گی اور جن لوگوں کی خدمات کا معاوضہ اس وقت کافی نہیں ملتا انھیں بھی ترقی دے دی جائے گی، اس لیے رشوت ستانی کے خلاف جس کی ممانعت قوانین الٰہی میں آئی ہے اور جو زوالِ سلطنت کے خاص اسباب میں سے ایک سبب ہے، سخت قانون نافذ کیا جائے گا۔

ان قوانین سے چونکہ قدیم دستوروں کی مکمل تجدید ہوتی ہے اور وہ بالکل بدل جاتے ہیں، اس لیے یہ فرمانِ سلطانی قسطنطنیہ اور ہماری سلطنت کے تمام شہروں میں شایع کر دیا جائے گا اور حلیف طاقتوں کے تمام سفیروں کو جو قسطنطنیہ میں مقیم ہیں اس کی نقلیں باضابطہ طور پر بھیج دی جائیں گی تاکہ وہ ان قوانین کی مراعات کے شاہد رہیں جو خدا کے فضل و کرم سے ہمیشہ قایم رہیں گی۔

خدائے قدیر ہم سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے جو لوگ ان قوانین کے خلاف کوئی بات کریں ان پر عذابِ الٰہی نازل ہو اور وہ ہر قسم کی خوشی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں۔''

دستور ثانی 1856ء

21/فروری 1856ء کو سلطان عبدالمجید نے حکومت عثمانیہ کے دوسرے اہم دستور کا اعلان کیا، اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

''تمام رعایا کی جان و مال اور عزت وآبرو کی ضمانت جو''خط شریف گلخانہ'' (اصلاحات) میں کی گئی ہے اس کی توثیق کی جاتی ہے، اس باب میں رعایا کے مراتب و مذاہب میں کسی قسم کا امتیاز جائز نہ ہوگا۔

ان تمام حقوق و مراعات کی جو نصاریٰ اور سلطنت کے دوسرے فرقوں کو دئے گئے ہیں از سرِ نو توثیق کی جاتی ہے، ان حقوق و مراعات پر بلا تاخیر نظر ثانی کر کے زمانہ اور سوسائٹی کی ضروریات کے مطابق انھیں ترقی دی جائے گی اور اس غرض سے بطریق کے زیر صدارت ایک مجلس منعقد کی جائے گی، جو مذکورہ بالا اصلاحات پر بحث کر کے اپنی رائے باب عالی میں پیش کرے گی، سلطان محمد فاتح اور اس کے جانشینوں نے جو حقوق بطریق کو عطا کیے تھے ان میں اس جدید حق کا اضافہ کیا جائے گا اور آئندہ بطریق کا انتخاب تمام عمر کے لیے ہوا کرے گا۔

نصاریٰ اور دوسرے فرقوں کے بطریقوں، اسقفوں اور مذہبی عہدہ داروں کو باب عالی کے تجویز کردہ طریقہ کے مطابق وفاداری کا حلف لینا پڑے گا۔

وہ تمام محصول اور چندے جو مختلف فرقوں کے پادری اپنی جماعتوں سے وصول کیا کرتے تھے ممنوع قرار دئے جاتے ہیں، مقررہ تنخواہیں، بطریقوں، اسقفوں اور تمام چھوٹے بڑے مذہبی عہدہ داروں کو ان کے مراتب اور خدمات کے لحاظ سے دی جائیں گی، پادریوں کی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

موجودہ کلیساؤں، مدرسوں، ہسپتالوں اور قبرستانوں کی مرمت کی عام اجازت ہے لیکن اگر کسی جدید کلیسا، مدرسہ، قبرستان یا ہسپتال کے تعمیر کرنے کی ضرورت ہوگی اور بطریق یا اس فرقہ کا مذہبی پیشوا اسے منظور کرے گا تو ہر جدید تعمیر کا نقشہ باب عالی میں پیش کیا جائے گا، اگر کوئی وجہ مانع نہ ہوگی تو سلطان نقشہ کو ملاحظہ فرما کر تعمیر کی منظوری خود صادر فرمائے گا۔

ہر فرقہ کو اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔

وہ تمام القاب و امتیازات جن سے رعایا کے بعض طبقے اعلیٰ اور بعض ادنیٰ شمار ہوتے ہیں ہمیشہ کے لیے شاہی دفتر سے خارج کیے جاتے ہیں، اسی طرح عہدہ داروں اور عام لوگوں کو بھی دل آزار اور اہانت آمیز کلمات کے استعمال سے سختی سے روکا جاتا ہے، اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے سزا کے مستوجب ہوں گے۔

چونکہ تمام مذاہب کو آزادی حاصل ہے، اس لیے کوئی شخص اپنے مذہب کی وجہ سے ستایا نہ جائے گا اور نہ کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

24.6 خلاصہ

خلاصہ یہ کہ دیگر خاندانی حکومتوں کی طرح عثمانی حکومت بھی ایک خاندانی اور موروثی حکومت تھی۔ اور موروثی حکومتوں کی تمام خرابیاں جو کسی بھی دوسری حکومت میں ہوسکتی ہیں عثمانیوں کے حصے میں آئیں۔ اور یہی خرابیاں اس حکومت کے انحطاط وزوال کا بنیادی سبب بھی بنیں۔ جب عثمانی حکمرانوں نے مشورے کی اہمیت کو نظرانداز کرنا شروع کیا، اعلیٰ عہدوں پر نااہلوں کا تقرر کرنے لگے، مملکت کے امور میں حرم کی خواتین کو بے جا دخل اندازی کا موقع فراہم کیا گیا، فوج سرکش ہوگئی، جانشین ناکارہ ہونے لگے اور مذہبی علماء کی قیادت بھی جمود کا شکار ہوگئی تو عثمانی حکومت کے لیے زوال اس کا ایک طرح سے مقدر بن گیا۔ البتہ عثمانی چوں کہ اپنے زمانے کے اعتبار سے ایک بہترین نظام حکومت کے وارث تھے، شجاعت و بہادری ان کو ورثے میں ملی تھی، عہد زوال میں بھی عہد عروج کے بہت سارے ادارے نہ صرف قائم تھے بلکہ وہ اپنا کردار بھی ادا کرتے رہے، اس لیے ان کا زاول اچانک عمل میں نہیں آیا بلکہ زوال کی رفتار کافی سست رہی، جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عہد زوال کے دوران بھی عثمانی خاندان میں متعدد ایسے حکمراں پیدا ہوئے جو انتہائی قابل اور باصلاحیت تھے۔ انہوں نے اپنی کوششوں سے عثمانی حکومت کے زوال پر روک لگانے کی کوشش کی، لیکن اندرونی اور بیرونی مختلف وجوہ سے وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوسکے اور بالآخر بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں عثمانی حکومت کا پوری طرح زوال ہوگیا۔

24.7 نمونے کے امتحانی سوالات

1. عثمانی حکومت کے اسباب زوال میں سے تین اسباب پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
2. امور مملکت میں حرم کی دخل اندازی اور عثمانی شہزادوں کی محل تک تحدید کس طرح عثمانی حکومت کے زوال میں معاون ہوئے۔ واضح کریں۔
3. عثمانی حکومت کے زوال کو روکنے کی کوششوں پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. تنظیمات خیریہ کے نام سے عثمانی اصلاحات کے پروگرام کی بعض اہم دفعات پر روشنی ڈالیے۔

24.8 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (جلد دوم) — ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی
2. آل عثمان — مولانا اسلم جیراج پوری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی
3. دولت عثمانیہ (جلد اول، دوم) — ڈاکٹر محمد عزیر، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
4. تاریخ ملت (جلد سوم) — مفتی زین العابدین سجاد میرٹھی و مفتی انتظام اللہ شہابی، ادارہ اسلامیات، کراچی، پاکستان
5. مسلمانوں کا عروج اور زوال — مولانا سعید احمد ایم اے۔ فیمس بکس، لاہور
6. اردو دائرہ معارف اسلامیہ، (متعلقہ مضامین) — دانش گاہ پنجاب، لاہور
7. ترکی میں مشرق ومغرب کی کش مکش — خالدہ ادیب خانم (اردو ترجمہ، ڈاکٹر عابد حسین)